الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

جلد (۳۹) بابت ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۹۱ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۷۱ء شمارہ (۱)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحات
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	معارف الحدیث	مولانا محمد منظور نعمانی	۵
۳	دامانِ کوہ سے ایک آواز بازگشت	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۲۳
۴	شریعت پر استقامت	مولانا محمد منظور نعمانی	۲۹
۵	حضرت رائے پوریؒ کی تدفین کا قضیہ اور مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا بیان	〃 〃 〃	۴۳
۶	رمضان و عید وغیرہ کے بارہ میں ایک اہم سوال	〃 〃 〃	۵۴

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو. براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ اپریل تک آجائے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہمکو اطلاع بھیجدیں۔ جن حضرات نے ہمارے خط کے جواب میں لکھا ہو کہ رسالہ برابر مل رہا ہو صرف ان ہی حضرات کو رسالہ بھیجا جا رہا ہو باقی حضرات کا رسالہ فی الحال بند رہے گا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہو۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجائے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

(از ــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی)

پاکستان میں نراج ولاقانونیت کی جس لہر کو، جنرل ایوب خاں نے مارچ سنہ ۶۹ء میں اپنا استعفےٰ پیش کر کے طوفان بن جانے سے پہلے ٹھنڈا کر دیا تھا، ٹھیک دو سال کے بعد یہ دبی ہوئی لہر ایک بار پھر اُٹھی اور جنرل ایوب خاں کے جانشین جنرل یحییٰ خاں اسے طوفان بن جانے سے نہیں روک سکے۔ پاکستان ان سطروں کی تحریر کے وقت ایک ایسے گرداب بلاخیز میں ڈوبا ہوا ہے جس سے وہ جان بچا کر نکل آنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو یہ وہ پاکستان بہرحال نہیں ہوگا جو فروری سنہ ۷۱ء کے آخر تک تھا۔ یہ خانہ جنگی کے زخموں سے چور چور اور باہمی نفرت و عداوت میں جلتا ہوا ایک پاکستان ہوگا، جسکے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ زخم بھر بھی سکیں گے اور یہ آگ بجھ بھی سکے گی!

اسی جنوری میں پاکستان نے عوامی انتخابات کا وہ مرحلہ بڑی خوش اسلوبی سے طے کیا تھا جس کے لیے وہاں کے لوگ اب تک ترستے رہے تھے، جنرل یحییٰ خاں نے اپنے مختصر دورِ صدارت میں یہ وہ کام کیا تھا جس نے پاکستان کے سب ہی لوگوں کے دل میں اُن کی بڑی عزت پیدا کر دی تھی۔ مگر ان انتخابات کے نتائج سے جو ایک بڑی پیچیدگی آگے کے مرحلے میں اُبھر آئی تھی، افسوس ہے کہ اُس پیچیدگی سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کا ثبوت یحییٰ خاں نہیں دے سکے۔ یا کہیے کہ حالات کی مجبوری نے انھیں اس کا ثبوت دینے نہیں دیا۔

انتخابات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان سے نیشنل اسمبلی کی (دو کو چھوڑ کر) تمام سیٹیں عوامی لیگ کے قبضے میں آگئیں جو صرف مشرقی پاکستان ہی کی نمائندہ جماعت تھی۔ اور مغربی پاکستان سے سخت شکایتوں کے ساتھ مشرقی پاکستان کے لیے قریب قریب خود مختاری کا درجہ اُس کا نصب العین تھا۔ عوامی لیگ کے قبضے میں آنے والی سیٹیں اگرچہ صرف مشرقی پاکستان سے تھیں پھر بھی یہ پاکستان نیشنل اسمبلی کی کل سیٹوں کے نصف سے زائد تھیں اس لیے کہ مشرقی پاکستان کو آبادی کے لحاظ سے اکثریت کی بنا پر اٹھاون ۵۸ فی صدی نشستیں الاٹ ہوئی تھیں۔ نتیجۃً

عوامی لیگ کو نیشنل اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کا درجہ بھی مل گیا اور اس طرح یہ اسمبلی جسے دستور سازی کا کام بھی کرنا تھا اس شکل کے ساتھ وجود میں آئی کہ نہ صرف مشرقی پاکستان کو اس میں بالادستی حاصل تھی بلکہ اس بازو کے بھی اُن لوگوں کو جو مغربی بازو کے خلاف فریق کی حیثیت رکھتے تھے۔

قدرتی بات تھی کہ مغربی پاکستان کے لوگوں کو اس سے پریشانی لاحق ہو، اُن کو بھی جو مخلصانہ طور پر ایک متحدہ پاکستان کے تصور سے محبت رکھنے کی بنا پر، ایک ایسی پارٹی کے ہاتھ میں دستور سازی کی طاقت آجانے کو خطرناک سمجھتے ہوں جو علاقائی جذبات کی وکیل ہے۔ اور اُن کو بھی جو اب تک کی صورت حال میں مشرقی پاکستان سے بہت ناروا فائدے اٹھاتے رہے تھے اور اس نئی اسمبلی کے ذریعے بنائے گئے دستور کے بعد وہ ان مواقع کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ صرف بلوچستان کے حامیوں کا استثنار کیا جا سکتا ہے ورنہ سبھی مغربی پاکستان والوں کے لیے اپنے نقطۂ نظر سے یہ ایک پریشانی کی بات تھی۔

عوامی لیگ کو جن خطوط پر دستور سازی کرنا تھی وہ اس کے انتخابی منشور میں ایک چھ نکاتی پروگرام کی شکل میں موجود تھے اور ان کا مطلب تھا ایک کمزور گرفت والا مرکز جس کے ماتحت صوبے قریب قریب خود مختار ہوں۔

مغربی پاکستان میں سب سے بڑی پارٹی کے لیڈر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے آواز اٹھائی کہ دستور سازی کے بنیادی نکات پر مشرق اور مغرب کے نمائندوں کے درمیان، اسمبلی میں جانے سے پہلے کوئی مفاہمت ہو جانی چاہیے۔ اور اس پر جب وہ عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو راضی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو پہلے تو انھوں نے اسمبلی کے بائیکاٹ کا اعلان کیا اور پھر اس کو بھی کارگر نہ دیکھ کر صدر یحییٰ خاں پر زور دیا کہ اسمبلی کے اجلاس کی جو تاریخ مقرر کی جا چکی ہے اسے فی الحال منسوخ کر دیں تاکہ مفاہمت کی کوششوں کیلئے وقت مل سکے۔

مسٹر بھٹو کی ابتدائی تجویز میں کوئی خرابی نہیں تھی اس کی ناکامی کے بعد بائیکاٹ کا فیصلہ کر لینے کا بھی انھیں حق تھا۔ مگر تیسری تجویز کا نہ تو وہ کوئی حق رکھتے تھے اور نہ صدر پاکستان کے لیے مناسب تھا کہ وہ اسے مانیں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ تجویز مان لی گئی اور ۳ مارچ جو اسمبلی کے ابتدائی اجلاس کے لیے مقرر کی جا چکی تھی صدر یحییٰ خاں نے اس کی غیر معینہ مدت کے لیے منسوخی کا حکم صادر کر دیا۔

یہ واقعات جس طرح پیش آئے اور اُن کے آگے پیچھے جو مزید تفصیلات ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے اس بارے میں کوئی شبہ مشکل ہی سے رہ سکتا ہے کہ صدر یحییٰ خاں کا ابتدا ذہن بالکل ایسی جمہوری انداز پر عمل (؟) تھا

جس کے ماتحت انھوں نے نہایت ایمان داری کے ساتھ وعدہ کے مطابق انتخابات کرائے۔ مشرقی پاکستان کو اس کی آبادی کے مطابق زیادہ نشستیں دیں اور انتخابات کے بعد کافی وقت تک شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ وہ رویہ رکھا جو ایک منتخب اکثریتی پارٹی کے لیڈر کے ساتھ ایک نامزد صدر مملکت کو رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ابتداءً ان کا رویہ مسٹر بھٹو کی ان باتوں کے ساتھ اعتنا کرنے کا نہیں تھا جو وہ اپنے حق سے آگے بڑھ کر چاہیں۔ یا جن کا مقصد شیخ مجیب الرحمن پر بے جا دباؤ ڈالنا ہو۔ ابتداء میں جب مسٹر بھٹو نے اسمبلی کو اس وقت تک مؤخر رکھنے کی بات بائیکاٹ کی دھمکی کے ساتھ کہی تو یحییٰ خاں کا جواب یہ تھا کہ اسمبلی مؤخر نہیں کی جائے گی جس کو نہ شریک ہونا ہو وہ نہ شریک ہو۔ بلکہ ایک مرحلہ پر انھوں نے خود یا ان کے کسی ترجمان نے مسٹر بھٹو کے روز روز کے ناٹک کا توڑ کرنے کے لیے ایک ایسے قانون کا بھی اشارہ دیا جس کے ماتحت ان ممبران اسمبلی کی رکنیت ختم ہو جائے گی جو اسمبلی شروع ہونے پر ایک مقررہ مدت کے اندر رکنیت کا حلف نہیں لے لیتے۔

لیکن پھر اللہ ہی جانے کیا ہوا کہ یحییٰ خاں ایک دم بدل گئے اور یہیں سے پاکستان کی وہ بدقسمتی شروع ہوئی جس پر رنج ظاہر کرنے کو الفاظ نہیں ملتے۔ اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ ملتوی کر دی گئی۔ عوامی لیگ نے اس پر احتجاج کے لیے ہڑتال اور حکومت سے عدم تعاون کا نعرہ دیا جس کے مؤثر نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان میں سب کچھ ٹھپ ہو گیا۔ یحییٰ خاں اپنے بدلے ہوئے رخ پر ایک قدم اور آگے بڑھے اور ایک سخت تقریر کے ساتھ اسمبلی کے لیے ایک نئی تاریخ (۲۵ مارچ) کا اعلان انھوں نے کیا۔ عوامی لیگ نے چار شرطیں اس کے جواب میں رکھیں، کہ ان کے بغیر اب وہ اسمبلی کے کاروبار سے کوئی سروکار نہ رکھے گی اور حکومت سے عدم تعاون اور ہڑتال کی تحریک چلتی رہے گی۔

یہ معاملات کا ایک بہت ہی سخت اور خطرناک موڑ تھا۔ مشرقی پاکستان علیحدگی کی طرف چل کھڑا ہوا تھا۔ دار السلطنت اور اصل فوجی مرکز سے کم از کم ایک ہزار میل کا فاصلہ ہوتے ہوئے طاقت کے زور سے اب اسے نہیں روکا جا سکتا تھا۔ افہام و تفہیم اور اپنی غلطی کی تلافی یا کم از کم وقت گزاری ہی وہ راستہ تھا جس سے کامیابی کی کچھ امید کی جا سکتی تھی۔ ایسا نظر آیا کہ یحییٰ خاں نے اس حقیقت کو سمجھا ہو۔ کیونکہ انھوں نے سلسلہ جنبانی کی اور پھر ڈھاکہ پہونچ کر گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑ لیا۔ خبریں امید افزا آنے لگیں۔ اور پھر دسویں گیارھویں دن اخبارات نے بتایا کہ یحییٰ خاں بات چیت مکمل کر کے رات کو اسلام آباد لوٹ رہے ہیں اور وہاں سے کل سمجھوتے کا اعلان ہو جائے گا —— مگر جتنی اچھی امید تھی اتنا ہی

(باقی ص ۵۲ پر)

کِتَابُ الْمُعَاشَرَۃِ وَالْمُعَامَلَاتِ

مَعَارِفُ الْحَدِیْث

(مُسَلسَل)

مجلس میں گفتگو، ہنسی و مزاح، چھینک اور جمہائی وغیرہ کے بارے میں ہدایات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو اس بارہ میں بھی واضح ہدایات دی ہیں کہ بات چیت میں کن باتوں کا لحاظ رکھا جائے، اور ظرافت و مزاح اور کسی بات پر ہنسنے یا چھینک اور جمہائی آنے کے جیسے موقعوں پر کیا رویہ اختیار کیا جائے ـــــ اس سلسلہ کی آپ کی ہدایات و تعلیمات کی رُوح یہ ہے کہ بندہ اپنے فطری اور معاشرتی تقاضوں کو وقار اور خوبصورتی کے ساتھ پورا کرے۔ لیکن ہر حال میں اللہ کو اور اس کے ساتھ اپنی بندگی کی نسبت کو اور اُس کے احکام اور اپنے عمل اور رویہ کے اُخروی انجام کو پیش نظر رکھے۔

زبان کے استعمال اور بات چیت کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا کافی حصہ اسی سلسلہ معارف الحدیث کی دوسری جلد (کتاب الاخلاق) میں درج ہو چکا ہے، سچ اور جھوٹ، شیریں کلامی اور بدزبانی، چغلخوری و عیب چینی، یاوہ گوئی، غیبت اور بہتان وغیرہ کے متعلق احادیث وہاں گزر چکی ہیں، اس لیے گفتگو اور زبان کے استعمال کے سلسلہ میں چند باقی مضامین کی حدیثیں ہی یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

بے ضرورت، بات کو لمبا نہ کیا جائے:۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهٗ قَالَ يَوْمًا وَّقَامَ رَجُلٌ فَاَكْثَرَ الْقَوْلَ فَقَالَ عَمْرٌو لَوْ قَصَدَ فِيْ قَوْلِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَقَدْ رَاَيْتُ اَوْ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اَتَجَوَّزَ فِي الْقَوْلِ فَاِنَّ الْجَوَازَ هُوَ خَيْرٌ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن جبکہ ایک شخص نے (ان کی موجودگی میں) کھڑے ہو کر (وعظ و تقریر کے طور پر) بات کی اور بہت لمبی بات کی تو آپ نے فرمایا کہ اگر یہ شخص بات مختصر کرتا تو اس کے لیے زیادہ بہتر ہوتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں ——— یا آپ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہے کہ بات کرنے میں اختصار سے کام لوں کیونکہ بات میں اختصار ہی بہتر ہوتا ہے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) تجربہ شاہد ہے کہ بہت لمبی بات سے سننے والے اکتا جاتے ہیں۔ اور دیکھا ہے کہ بعض اوقات کسی تقریر و وعظ سے سامعین شروع میں بہت اچھا اثر لیتے ہیں لیکن جب بات حد سے زیادہ لمبی ہو جاتی ہے اور لوگ اُکتا جاتے ہیں تو وہ اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔

منھ سے نکلنے والی کوئی بات وسیلۂ فوز و فلاح بھی ہو سکتی ہے اور موجب ہلاکت بھی:۔

عَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الْخَيْرِ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا رِضْوَانَهٗ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الشَّرِّ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا يَكْتُبُ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْهِ سَخَطَهٗ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ ——— رواہ فی شرح السنۃ وروی مالک والترمذی وابن ماجۃ نحوہ

بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی زبان سے کبھی خیر اور بھلائی کی کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جسکی پوری برکت اور قدر و قیمت وہ خود بھی نہیں جانتا، کہ اللہ تعالیٰ اسی ایک بات کی وجہ سے اپنے حضور میں حاضری تک کے لیے اُس بندہ کے واسطے اپنی رضا طے فرما دیتا ہے۔ اور (اسی طرح) کبھی آدمی کی زبان سے شر کی کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جسکی برائی اور خطرناکی کی حد وہ خود بھی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اسی بات کی وجہ سے اس آدمی پر آخرت کی پیشی تک کے لیے اپنی ناراضی اور اپنے غضب کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔

(شرح السنہ للبغوی)

[اور ایسی ہی حدیث امام مالک نے موطا میں اور امام ترمذی نے اپنی جامع میں اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کی ہے۔]

(تشریح) حدیث کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ اللہ اور آخرت کے انجام سے غافل و بے پروا ہو کر باتیں نہ کرے، منھ سے نکلنے والی بات ایسی بھی ہو سکتی ہے جو بندہ کو اللہ تعالیٰ کی خاص رضا و رحمت کا مستحق بنا دے اور (خدا اپنا پناہ میں رکھے) ایسی بھی ہو سکتی ہو جو اس کو رضا و رحمتِ الٰہی سے محروم کر کے جہنم میں پہونچا دے۔

کسی کی تعریف کرنے میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے:-

کسی کی تعریف کرنا در اصل اُس کے حق میں ایک شہادت اور گواہی ہے جو بڑی ذمہ داری کی بات ہے، اور اُس سے اس کا بھی خطرہ ہے کہ اُس آدمی میں اعجابِ نفس اور خود پسندی پیدا ہو جائے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں سخت احتیاط کی تاکید فرمائی ہے۔ ——— افسوس ہے کہ اس تعلیم و ہدایت سے فی زمانا ہمارے دینی حلقوں میں بھی بڑی بے پروائی برتی جا رہی ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا!

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ اَثْنٰی رَجُلٌ عَلٰی رَجُلٍ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ وَیْلَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ اَخِیْكَ ثَلٰثًا ——— مَنْ

كَانَ مِنكُم مَادِحاً لَا مَحَالَةَ فَلْيَقُلْ اَحْسِبُ فُلَاناً وَاللّٰهُ حَسِيبُهُ اِنْ
كَانَ يَرىٰ اَنَّهُ كَذَالِكَ وَلَا يُزَكِّي عَلَى اللّٰهِ اَحَداً ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک صاحب نے ایک دوسرے صاحب کی تعریف کی (اور اس تعریف میں بے احتیاطی کی) تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے اپنے اس بھائی کی (اس طرح تعریف کر کے) گردن کاٹ دی. (یعنی ایسا کام کیا جس سے وہ ہلاک ہو جائے) ۔ یہ بات آپ نے تین بار ارشاد فرمائی ۔ (اس کے بعد فرمایا) جو کوئی تم میں سے (کسی بھائی کی) تعریف کرنا ضروری ہی سمجھے اور اس کو اس تعریف و مدح کا مستحق سمجھے تو یوں کہے کہ میں فلاں بھائی کے بارہ میں ایسا گمان کرتا ہوں (اور میری اس کے بارہ میں یہ رائے ہے) اور اس کا حساب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے (جس کو حقیقت کا پورا علم ہے) اور ایسا نہ کرے کہ خدا پر کسی کی پاکیزگی کا حکم لگائے (یعنی کسی کے حق میں ایسی بات نہ کہے کہ وہ بلاشبہ اور یقیناً اور عنداللہ پاک اور مقدس ہے، کیونکہ یہ خدا پر حکم لگانا ہے اور کسی بندہ کو اس کا حق نہیں ہے)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَيْتُمُ الْمَدَّاحِيْنَ فَاحْثُوْا فِيْ وُجُوْهِهِمُ التُّرَابَ ۔

رواہ مسلم

حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم "مدّاحین" (بہت زیادہ تعریفیں کرنے والوں) کو دیکھو تو اُن کے منھ پہ خاک ڈال دو ۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں "مدّاحین" سے غالباً وہ لوگ مراد ہیں جو لوگوں کی خوشامد اور چاپلوسی کے لیے اور پیشہ ورانہ طور پر اُن کی مبالغہ آمیز تعریفیں اور اُن کی قصیدہ خوانی کیا کرتے ہیں، اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے اور وہ تمھارے

منہ پر تمہاری مبالغہ آمیز تعریفیں کریں تو اُن کے منہ پر خاک ڈال دو' ——— اس کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اظہار ناراضی کے طور پر اُن کے منہ پر حقیقۃً خاک ڈال دو، دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں کسی قسم کا انعام و اکرام کچھ نہ دو گویا منہ پہ خاک ڈالنے کا مطلب انھیں کچھ نہ دینا اور محروم و نامراد واپس کر دینا ہے۔ اور بلاشبہ یہ بھی ایک محاورہ ہے' ——— تیسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُن مداحین سے کہہ دو کہ تمہارے منہ میں خاک! گویا یہ کہنا ہی ان کے منہ میں خاک ڈالنا ہے ——— حدیث کے راوی حضرت مقداد بن الاسود سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے ان کی موجودگی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کی تعریف کی تو انھوں نے اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے مٹی زمین سے اُٹھا کے اس شخص کے منہ پر پھینک ماری ——— زمانہ مابعد کے بعض اکابر سے بھی اسی طرح کے واقعات مروی ہیں ——

واضح رہے کہ اگر اچھی نیت اور کسی دینی مصلحت سے کسی بندۂ خدا کی سچی تعریف اس کے سامنے یا اس کے پیچھے کی جائے اور اس کا خطرہ نہ ہو کہ وہ اعجاب نفس اور اپنے بارے میں کسی غلط قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے گا تو ایسی تعریف کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ انشاء اللہ اچھی نیت کے مطابق وہ اس پر اجر و ثواب کا مستحق ہوگا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کی اور بعض صحابہ کرام نے بعض دوسرے صحابیوں کی جو مدح و تعریف کبھی کی ہے وہ اسی قبیل سے ہے۔

شعر و سخن :-

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اور اس سے پہلے بھی شعر و شاعری عام تھی اور شاذ و نادر ہی ایسے لوگ تھے جو اس کا ذوق نہ رکھتے ہوں، لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بالکل مناسبت نہ تھی، بلکہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی نے خاص حکمت کے تحت آپ کو اس سے بالکل محفوظ رکھا تھا۔ سورہ یٰسین شریف میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ　　ہم نے اپنے نبی کو شعر و شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ ان کے لیے مناسب اور سزاوار نہیں تھا۔

(یٰس۔ ع ۵)

علاوہ ازیں جس قسم کی شعر و شاعری کا وہاں عام رواج تھا اور یہ شاعر جس سیرت و کردار کے ہوتے تھے قرآن مجید میں اس کی مذمت کی گئی ہے ـــــ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ ٥ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ٥ وَاِنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ٥ (الشعراء۔ ع ۱۱)

اور اُن شاعروں کا حال یہ ہے کہ بے راہ اور بدچلن لوگ ہی اُن کی راہ چلتے ہیں کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ کہتے ہیں۔

بعض صحابہ نے شعر و شاعری کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا وہ مطلقاً قابلِ مذمت ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اگر شعر کا مضمون اچھا ہے تو وہ اچھا ہے اور اگر برا ہے تو وہ بُرا ہے ـــــ اور بعض موقعوں پہ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بعض اشعار تو بڑے حکیمانہ ہوتے ہیں ـــــ اس سلسلہ کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے!

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ ذُكِرَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الشِّعْرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ كَلَامٌ فَحَسَنُهُ حَسَنٌ وَقَبِيْحُهُ قَبِيْحٌ ـــــ رواہ الدارقطنی وروی الشافعی عن عروۃ مرسلاً

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شعر کے بارے میں ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ شعر بھی کلام ہے۔ اس میں جو اچھا ہے وہ اچھا ہے اور جو برا ہے وہ برا ہے۔ (سنن دارقطنی)

[اور امام شافعی نے اسی حدیث کو حضرت عائشہ صدیقہ کے بھانجے حضرت عروہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔]

عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً ـــــ رواہ البخاری

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض شعر (اپنے مضمون کے لحاظ سے) سراسر حکمت ہوتے ہیں۔

(صحیح بخاری)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَصْدَقُ کَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ کَلِمَةُ لَبِیْدٍ اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ"

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے زیادہ سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے وہ لبید بن ربیعہ شاعر کی یہ بات (یعنی یہ مصرع) ہے۔ "اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ" (آگاہی ہو کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے) (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تشریح یہ لبید زمانۂ جاہلیت کا مشہور و مقبول شاعر تھا، لیکن اس کی شاعری اس زمانہ میں بھی خدا پرستانہ اور پاکیزہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مصرعہ اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ" کو "شعر کی دنیا کا سب سے سچا کلمہ" اس لیے فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے اس ارشاد کے بالکل ہم معنی ہے "کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" ——— اس کے ساتھ کا دوسرا مصرع یہ ہے "وَکُلُّ شَیْءٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلُ" (یعنی یہاں کی ہر نعمت ایک دن ختم ہو جانے والی ہے)

یہ شعر لبید کے جس قصیدہ کا ہے وہ انھوں نے اپنے دور جاہلیت ہی میں کہا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے قبولِ اسلام کی توفیق عطا فرما دی ــ روایات میں ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد شعر شاعری کا مشغلہ بالکل چھوٹ گیا اور کہا کرتے تھے کہ "یَکْفِیْنِیْ الْقُرْاٰنُ" (بس اب قرآن میرے لیے کافی ہے) اللہ تعالیٰ نے بہت طویل عمر بھی عطا فرمائی، حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ۱۵۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔[۱] رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِیْدِ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ رَدِفْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَوْمًا فَقَالَ هَلْ مَعَكَ مِنْ شِعْرِ اُمَیَّةَ بْنِ الصَّلْتِ

---

[۱] فتح الباری صفحہ ۴۲۹ جزء ۱۵

شِعْرٌ ؟ قُلْتُ نَعَمْ ، قَالَ هِيهِ فَأَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيهِ ثُمَّ أَنْشَدْتُهُ بَيْتًا فَقَالَ هِيهِ ثُمَّ أَنْشَدْتُهُ مِائَةَ بَيْتٍ ——— رواہ مسلم

وزاد فی روایۃ لَقَدْ كَادَ يُسْلِمُ فِي شِعْرِهِ ۔

عمرو بن شرید اپنے والد شرید بن سُوید ثقفی سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دن (سفر میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آپ ہی کی سواری میں سوار تھا، آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کیا تمھیں اُمیّہ بن الصلت کے کچھ شعر بھی یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں یاد ہیں، آپ نے فرمایا سناؤ! تو میں نے ایک بیت آپ کو سنایا، آپ نے فرمایا اور سناؤ، میں نے ایک اور بیت سنایا، آپ نے پھر فرمایا اور سناؤ، تو میں نے سَو بیت سنائے۔ (اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اُمیّہ اپنے اشعار میں اسلام سے بہت قریب ہوگیا تھا) (صحیح مسلم)

(تشریح) اُمیّہ بن الصلت ثقفی بھی جاہلی شاعر تھا لیکن اُس کی شاعری خدا پرستانہ تھی، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا اس کے اشعار سے دلچسپی تھی اور آپ نے اس کے بارہ میں فرمایا "لَقَدْ كَادَ يُسْلِمُ فِي شِعْرِهِ" (جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اسلام سے بہت قریب ہوگیا تھا) ——— اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے ایک دفعہ اُمیّہ بن الصلت کے اشعار سُن کر فرمایا "آمَنَ شِعْرُهُ وَكَفَرَ قَلْبُهُ" (اس کی شاعری مسلمان ہوگئی اور اس کا قلب کافر رہا)۔ اُمیّہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور دین کی دعوت بھی پہونچی مگر ایمان کی توفیق نہیں ہوئی۔[1]

ظرافت و مزاح

ظرافت و مزاح بھی انسانی زندگی کا ایک خوش کن عنصر ہے اور جس طرح اس کا حد سے متجاوز ہونا نازیبا اور مضر ہے اسی طرح آدمی کا اس سے بالکل خالی ہونا بھی ایک نقص ہے اور

---

[1] فتح الباری صفحہ ۴۳ جز ۱۵

یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی بلند پایہ اور مقدس شخصیت کی طرف سے چھوٹی اور معمولی حیثیت کے کسی آدمی کے ساتھ لطیف ظرافت و مزاح کا برتاؤ ہو تو وہ اس کے لیے ایسی مسرت اور عزت افزائی کا باعث ہوتا ہے جو کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں کی جا سکتی ——— اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی اپنے جاں نثاروں اور نیاز مندوں سے مزاح فرماتے تھے اور یہ ان کے ساتھ آپ کی نہایت لذت بخش شفقت ہوتی تھی، لیکن آپ کا مزاح بھی نہایت لطیف اور حکیمانہ ہوتا تھا۔

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ تُدَاعِبُنَا قَالَ اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا ——— رواہ الترمذی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بعض صحابہ نے حضور سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ ہم سے مزاح فرماتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں (مزاح میں بھی) حق ہی کہتا ہوں (یعنی اس میں کوئی بات غلط اور باطل نہیں ہوتی)

(جامع ترمذی)

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا اِسْتَحْمَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ حَامِلُكَ عَلٰی وَلَدِ نَاقَةٍ فَقَالَ مَا اَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَةِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهَلْ تَلِدُ الْاِبِلُ اِلَّا النُّوْقُ۔

——— رواہ الترمذی وابو داؤد

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کے لیے اونٹ مانگا تو آپ نے ارشاد فرمایا ہاں میں تم کو سواری کے لیے ایک اونٹنی کا بچہ دوں گا ——— اس شخص نے عرض کیا کہ میں اونٹنی کے بچہ کا کیا کروں گا؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اونٹ اونٹنیوں ہی کے تو بچے ہوتے ہیں۔ ——— (یعنی ہر اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہے، جو اونٹ بھی دیا جائے گا وہ اونٹنی کا بچہ ہی ہوگا

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِامْرَأَةٍ عَجُوْزٍ اِنَّهٗ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ فَقَالَتْ وَمَا لَهُنَّ؟ وَكَانَتْ تَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ

فَقَالَ لَهَا اَمَا تَقْرَئِيْنَ الْقُرْآنَ اِنَّا اَنْشَأْنَاهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ اَبْكَارًا ـــــــ رواہ رزین

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے فرمایا کہ "کوئی بوڑھی جنت میں نہیں جائے گی" اس (بیچاری) نے عرض کیا کہ ان میں (یعنی بوڑھیوں) میں کیا ایسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ جنت میں نہیں جا سکیں گی؛ وہ بوڑھی قرآن خواں تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھتی ہو "اِنَّا اَنْشَأْنَاهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ اَبْكَارًا" جس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کی عورتوں کی ہم نئے سرے سے نشو و نما کریں گے اور ان کو نوخیز دوشیزائیں بنا دیں گے۔ (مسند رزین)

تشریح) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لطیف مزاح کی مثالیں ہیں ـــــ بعض حدیثوں میں مزاح کی ممانعت بھی وارد ہوئی ہے۔ لیکن ان حدیثوں ہی میں اس کا قرینہ موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوۂ حسنہ اس بارہ میں مندرجۂ بالا حدیثوں سے معلوم ہوا وہ بھی اس کا قرینہ بلکہ اس کی واضح دلیل ہے کہ ممانعت اسی مزاح کی فرمائی گئی ہے جو دوسرے آدمی کے لیے ناگواری اور اذیت کا باعث ہو۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ ـــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی سے جھگڑا ٹنٹا نہ کرو، اور اس سے مزاح (یعنی مذاق) نہ کرو اور اس سے ایسا وعدہ نہ کرو جس کی تم وعدہ خلافی کرو۔

(جامع ترمذی)

تشریح) جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس حدیث میں مزاح کی ممانعت جس سیاق و سباق میں کی گئی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ اسی مزاح کی ممانعت ہے جو ناگواری اور اذیت کا باعث ہو۔

ضحک و تبسّم (ہنسنا اور مسکرانا)

ہنسی کے موقع پر ہنسنا یا مسکرانا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اس میں قطعاً کوئی خیر نہیں ہے کہ آدمی کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ بھی نہ آئے، اور وہ ہمیشہ "عبوساً قمطریراً" ہی بنا رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ اللہ کے بندوں اور اپنے مخلصوں سے ہمیشہ مسکرا کر ملنے کی تھی، ظاہر ہے کہ حضور کا یہ رویہ اور برتاؤ اُن لوگوں کے لیے کیسی قلبی و روحانی مسرت کا باعث ہوتا ہوگا اور اس کی وجہ سے اُن کے اخلاص و محبت میں کتنی ترقی ہوتی ہوگی۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل چند حدیثیں پڑھیے!

عَنْ جَرِيْرٍ قَالَ مَا حَجَبَنِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْذُ اَسْلَمْتُ وَلَا رَآنِي اِلَّا تَبَسَّمَ ـــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب سے مجھے اسلام نصیب ہوا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (خدمت میں حاضری سے) روکا ہو اور جب بھی مجھے دیکھا تو آپ نے تبسّم فرمایا (یعنی ہمیشہ مسکرا کر ملے) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح "مَا حَجَبَنِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ جب کبھی میں نے حاضر خدمت ہونا چاہا تو آپ نے اجازت عطا فرمائی اور شرف ملاقات بخشا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے منع فرما دیا ہو۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ اَحَدًا اَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

ـــــــــ رواہ الترمذی

عبداللہ بن الحارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مسکرانے والا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔

(جامع ترمذی)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعًا ضَاحِكًا حَتّٰى أَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ۔

رواہ البخاری

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے حضور کو کبھی پوری طرح (کھل کھلاتے) ہنستا ہوا نہیں دیکھا کہ آپ کے دہن مبارک کا اندرونی حصہ نظر پڑ جاتا (یعنی آپ اس طرح کھل کھلا کر اور قہقہہ لگا کر کبھی نہیں ہنستے تھے کہ آپ کے دہن مبارک کا اندرونی حصہ نظر آ سکتا، بس تبسم فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) بعض روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنسنے کو "ضحک" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے بھی مراد وہی ہنسنا ہے جو آپ کی عادت شریفہ تھی یعنی مسکرانا، البتہ کبھی کبھی جب ہنسی کا غلبہ ہوتا تو آپ اس طرح بھی مسکراتے تھے کہ دہن مبارک کسی قدر کھل جاتا تھا، چنانچہ بعض روایات میں ہے "ضَحِكَ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ" (آپ کو ایسی ہنسی آئی کہ اندر کی ڈاڑھیں ظاہر ہو گئیں)۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْمُ مِنْ مُصَلَّاهُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ فِيْهِ الصُّبْحَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ وَكَانُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ فَيَأْخُذُوْنَ فِيْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ فَيَضْحَكُوْنَ وَيَتَبَسَّمُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

رواہ مسلم

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ فجر کی نماز جس جگہ پڑھتے تھے آفتاب طلوع ہونے تک وہاں سے نہیں اٹھتے تھے، پھر جب آفتاب طلوع ہو جاتا تو کھڑے ہو جاتے۔ اور (اس اثنا میں) آپ کے صحابہ زمانۂ جاہلیت کی باتیں (بھی) کیا کرتے اور اس سلسلے میں خوب ہنستے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس مسکراتے رہتے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام کبھی کبھی مسجد نبوی میں اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں بھی زمانۂ جاہلیت کی ایسی لغویات و خرافات کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے جن پر خوب ہنسی آتی تھی۔ اور جامع ترمذی کی اسی حدیث کی روایت میں یہ الفاظ مزید ہیں۔ "وَيَتَنَاشَدُونَ الشِّعْرَ" (یعنی اس سلسلۂ گفتگو میں اشعار بھی پڑھے اور سنے سنائے جاتے تھے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ سنتے اور اس پر تبسم فرماتے تھے۔

ناچیز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کرام کے ساتھ اس طرح کا بے تکلفی کا برتاؤ نہ کرتے تو ان حضرات پر آپ کا ایسا رعب چھایا رہتا جو استفادہ میں رکاوٹ بنتا۔ حضرات مشائخ صوفیہ کی اصطلاح میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول تھا، اس کے بغیر مقصد رسالت کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔

صحابہ کرام کے باہم ہنسنے ہنسانے کے اس تذکرہ کے ساتھ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمر اور ایک بزرگ تابعی بلال بن سعد کے دو بیان پڑھ لینا بھی انشاء اللہ موجب بصیرت ہوگا۔ یہ دونوں بیان مشکوٰۃ المصابیح میں "شرح السنۃ" کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں۔

قتادہ تابعی نے بیان فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہنسا بھی کرتے تھے؟ — انھوں نے فرمایا

نَعَمْ وَالْإِيمَانُ فِي قُلُوبِهِمْ أَعْظَمُ مِنَ الْجَبَلِ۔

ہاں بے شک وہ حضرات (ہنسنے کے موقع پر) ہنستے بھی تھے لیکن اس وقت بھی ان کے قلوب میں ایمان پہاڑوں سے عظیم تر ہوتا تھا۔

(یعنی ان کا ہنسنا غافلین کا سا ہنسنا نہیں ہوتا تھا جو قلوب کو مردہ کر دیتا ہے)

اور بلال بن سعد کا بیان ہے

أَدْرَكْتُهُمْ يَشْتَدُّونَ بَيْنَ الْأَغْرَاضِ وَيَضْحَكُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ فَإِذَا كَانَ اللَّيْلُ كَانُوا رُهْبَانًا

میں نے صحابہ کرام کو دیکھا ہے وہ مقررہ نشانوں کے درمیان دوڑا بھی کرتے تھے (جس طرح بچے اور نوجوان کھیل اور مشق کیلئے

دوڑ میں مقابلہ کیا کرتے ہیں) اور باہم
ہنستے ہنساتے بھی تھے، پھر جب رات
ہوجاتی تو بس درویش ہوجاتے۔

چھینکنے اور جمہائی لینے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات:۔

چھینکنا اور جمہائی لینا بھی انسانی فطرت کے لوازم میں سے ہے، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے!

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَلْیَقُلْ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلْیَقُلْ اَخُوْہُ اَوْصَاحِبُہٗ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ فَاِذَا قَالَ لَہٗ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ فَلْیَقُلْ یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ۔

رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے چاہیے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہے اور اس کا جو بھائی یا آپ نے فرمایا کہ اس کا جو ساتھی اس کے پاس ہو وہ کہے "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" (تم پر خدا کی رحمت) اور جب یہ بھائی "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" (کا دعائیہ کلمہ) کہے تو چاہیے کہ چھینکنے والا (اس کے جواب میں یہ دعائیہ کلمہ) کہے "یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ" (اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت سے نوازے اور تمہارے حالات درست فرمادے) (صحیح بخاری)

تشریح) چھینک آنے کے ذریعہ ایسی رطوبت اور ایسے ابخرات دماغ سے نکل جاتے ہیں جو اگر نہ نکلیں تو کسی تکلیف یا بیماری کا باعث بن جائیں اس لیے صحت و اعتدال کی حالت میں چھینک کا آنا گویا اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے اس لیے ہدایت فرمائی گئی کہ جس کو چھینک آئے وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہے اور جو کوئی اس کے پاس ہو وہ کہے "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" (یعنی یہ چھینک تمہارے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنے) اور پھر چھینک آنے والا اس دعا دینے والے بھائی کو کہے "یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ

وَ يُصْلِحُ بَالَكُمْ۔

ذرا غور کیا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم و ہدایت نے ایک چھینک کو اللہ کی کتنی یاد اور کتنی رحمتوں کا وسیلہ بنا دیا۔

عَنْ اَبِي مُوسٰى قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا عَطَسَ اَحَدُكُمْ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتُوْهُ وَاِنْ لَّمْ يَحْمَدِ اللّٰهَ فَلَا تُشَمِّتُوْهُ

رواہ مسلم

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے اور وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰه" کہے تو تم کو چاہیئے کہ اس کو "يَرْحَمُكَ اللّٰه" کہہ کر دعا دو، اور اگر وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰه" نہ کہے (اور خدا کو یاد نہ کرے)، تو تم بھی "يَرْحَمُكَ اللّٰه" نہ کہو (یعنی الحمد للہ نہ کہنے کی وجہ سے وہ تمہاری اس دعا اور رحمت کا حقدار نہیں رہا۔) (صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ عَطَسَ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَمَّتَ اَحَدَهُمَا وَلَمْ يُشَمِّتِ الْاٰخَرَ فَقَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ شَمَّتَّ هٰذَا وَلَمْ تُشَمِّتْنِيْ قَالَ اِنَّ هٰذَا حَمِدَ اللّٰهَ وَلَمْ تَحْمَدِ اللّٰهَ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (بیٹھے ہوئے) دو آدمیوں کو چھینک آئی، تو آپ نے ایک کو "يَرْحَمُكَ اللّٰه" کہہ کر دعا دی اور دوسرے کو آپ نے "يَرْحَمُكَ اللّٰه" نہیں کہا، تو اس دوسرے آدمی نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے ان (بھائی) کو "يَرْحَمُكَ اللّٰه" کہہ کے دعا دی اور مجھے یہ دعا نہیں دی، — آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان (بھائی) نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰه" کہا تھا اور تم نے نہیں کہا (اس لیے خود تم نے "يَرْحَمُكَ اللّٰه" کا حق کھو دیا)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَطَسَ

رَجُلٌ عِنْدَهٗ فَقَالَ لَهٗ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، ثُمَّ عَطَسَ اُخْرٰى فَقَالَ الرَّجُلُ مَزْكُوْمٌ

رواہ مسلم

وفی روایۃ للترمذی اَنَّهٗ قَالَ فِی الثَّالِثَةِ اَنَّهٗ مَزْكُوْمٌ۔

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (بیٹھے ہوئے) ایک شخص کو چھینک آئی تو آپ نے "یَرْحَمُكَ اللّٰہ" کہہ کے اُن کو دُعا دی، اُن کو دوبارہ پھر چھینک آئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ زکام میں مبتلا ہیں۔ (صحیح مسلم)

[اور جامع ترمذی کی اسی حدیث کی روایت ہے کہ آپ نے تیسری دفعہ چھینکنے پر یہ فرمایا تھا کہ ان کو زکام ہے۔]

تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر نزلہ زکام کی وجہ سے کسی کو بار بار چھینک آئے تو اس صورت میں ہر دفعہ "یَرْحَمُكَ اللّٰہ" کہنا ضروری نہیں۔ آگے درج ہونے والی حدیث میں اس بارہ میں واضح ہدایت آرہی ہے۔

عَنْ عُبَيْدِ بْنِ رِفَاعَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ شَمِّتِ الْعَاطِسَ ثَلٰثًا فَمَا زَادَ فَاِنْ شِئْتَ فَشَمِّتْهُ وَاِنْ شِئْتَ فَلَا۔

رواہ ابوداؤد والترمذی

عبید بن رفاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا کہ چھینکنے والے کو تین دفعہ تو "یَرْحَمُكَ اللّٰہ" کہو اور اس سے زیادہ چھینکیں آئیں تو اختیار ہے چاہے "یَرْحَمُكَ اللّٰہ" کہو، چاہے نہ کہو۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

عَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلًا عَطَسَ اِلٰى جَنْبِ ابْنِ عُمَرَ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ قَالَ ابْنُ عُمَرَ وَاَنَا اَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَيْسَ هٰكَذَا، عَلَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَقُوْلَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ۔

رواہ الترمذی

حضرت نافع سے روایت ہے کہ ایک شخص کو جو حضرت عبداللہ بن عمر کے برابر میں بیٹھے تھے چھینک آئی تو انھوں نے کہا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" تو حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ میں بھی کہتا ہوں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" (یعنی یہ کلمہ بجائے خود مبارک ہے اور میں بھی کہتا ہوں) لیکن (چھینکنے کے وقت) اس طرح نہیں کہا جاتا، ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ" کہا کریں۔ (جامع ترمذی)

تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چھینک آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہنا تعلیم فرمایا ہے، اسی طرح "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ" کی بھی تعلیم دی ہے ــــــ حضرت عبداللہ بن عمر کے اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص موقعوں کے لیے ذکر یا دعا کے جو مخصوص کلمے تعلیم فرمائے ہیں اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کرنا چاہیئے اگرچہ معنوی حیثیت سے وہ اضافہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا عَطَسَ غَطّٰی وَجْهَهٗ بِیَدِهٖ اَوْ ثَوْبِهٖ وَغَضَّ بِهَا صَوْتَهٗ (رواہ الترمذی وابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چھینک آتی تھی تو آپ اپنے ہاتھ یا کپڑے سے چہرہ مبارک ڈھک لیتے تھے اور اس کی آواز کو دبا لیتے تھے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چھینک آنے کے وقت کے آداب میں یہ بھی ہے کہ اُس وقت منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لیا جائے اور چھینک کی آواز کو بھی حتی الوسع دبا لیا جائے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا تَثَاءَبَ اَحَدُکُمْ فَلْیُمْسِكْ بِیَدِهٖ عَلٰی فَمِهٖ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ یَدْخُلُ ــــــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا جب تم میں سے کسی کو جمائی آئے تو چاہیئے کہ وہ اپنا ہاتھ رکھ کے منھ بند کر لے، کیونکہ شیطان داخل ہو جاتا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) واقعہ یہ ہے کہ جمائی لینے میں آدمی کا منھ بہت بدنما انداز میں کھل جاتا ہے اور ہا ہا کی مکروہ آواز منھ سے نکلتی ہے اور چہرہ کی قدرتی شکل بدل کر ایک بدنما ہیئت ہو جاتی ہے۔ ان چیزوں کے انسداد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ہدایت فرمائی ہے کہ جب جمائی آئے تو ہاتھ سے منھ کو بند کر لینا چاہیئے۔ اس طرح کرنے سے منھ کھلے گا بھی نہیں اور وہ مکروہ آواز بھی پیدا نہیں ہو گی اور چہرہ کی ہیئت بھی زیادہ نہیں بگڑے گی۔ —— حدیث کے آخر میں شیطان کے داخل ہونے کا جو ذکر فرمایا گیا ہے، شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ اس سے اس کا حقیقی داخلہ بھی مراد ہو سکتا ہے (جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے) اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی حالت میں شیطان کو وسوسہ اندازی کا زیادہ موقع ملتا ہے —— حضرت شاہ ولی اللہ رح نے اس کی شرح یہ کی ہے کہ جب جمائی لیتے وقت آدمی کا منھ پوری طرح کھل جاتا ہے تو شیطان کسی مکھی مچھر جیسی چیز کو اڑا کر اس کے منھ میں داخل کر دیتا ہے[۱] واللہ اعلم

[۱] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۰۷ ج ۲ (آداب الصحبہ)

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۲)

شریف میں ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ بندوں کو خود پکارتا ہے کہ آؤ اور میری رحمت سے بھرپور حصہ لے لو، اور بھئی بالکل آخری بات یہ ہے کہ ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرو اور جب کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو سچے دل سے اللہ کے حضور میں توبہ کرو اور معافی مانگ لیا کرو —— اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب حضرات کو عمل کی توفیق دے۔ اگر ان باتوں پر ہم نے عمل کر لیا تو انشاء اللہ ہم بھی اُن مبارک بندوں کے ساتھ شامل کر دیے جائیں گے جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

دامانِ کوہ سے ایک مردِ حق آگاہ کی آوازِ بازگشت

اِرشادات

حضرت خواجہ محمد عثمان دامانی نقشبندی مجددیؒ

ترجمہ و تلخیص از ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

حضرت خواجہ محمد عثمان دامانیؒ قصبہ موسیٰ زئی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں (پنجاب) کے رہنے والے تھے، اُن کے پیر و مرشد حضرت حاجی شاہ دوست محمد قندھاریؒ کی خانقاہ موسیٰ زئی ہی میں تھی اور وہ حضرت شاہ احمد سعید مجددیؒ کے خلیفہ تھے ـــ اٹھارہ سال سے زائد عرصہ کسبِ سلوکِ باطن اور خدمتِ پیر و مرشد میں گزارا ـــ بعد وصالِ مرشد ۱۲۸۴ھ میں مسندِ ارشاد پر فائز ہوئے اور مرشد کی خانقاہ کو چار چاند لگا دیے۔ آپ کی شخصیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا حسین علی شاہ نقشبندیؒ جیسا محدث و مفسرِ درویش، قطب الوقت حضرت محدث گنگوہیؒ کی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر فیوضِ عثمانی حاصل کرنے کے لیے دامنِ عثمانی سے وابستہ ہوتا اور بالآخر اجازت و خلافت حاصل کرتا ہے ـــ حضرت خواجہ محمد سراج الدین دامانیؒ آپ ہی کے صاحبزادے تھے۔ جنھوں نے کمالاتِ باطن حاصل کر کے اپنے والد ماجد سے خلافت حاصل کی تھی ـــ حضرت مولانا ابو السعد احمد خانؒ اُن ہی صاحبزادے کے خلیفہ مجاز تھے ـــ خانقاہ سراجیہ کُندیاں ضلع میانوالی انھیں کے نام پر ہے ـــ حضرت خواجہ محمد عثمان دامانیؒ نے ستر سال کی عمر پائی۔ ۲۲ شعبان المعظم ۱۳۱۴ھ کو انتقال فرمایا ـــ فوائد عثمانی مؤلفہ سید محمد اکبر علی مجددیؒ مطبوعہ مطبع اسلامی دہلی سے انتخاب و ترجمہ کر کے چند ملفوظات پیشِ ناظرینِ "الفرقان" کر رہا ہوں۔ آخر میں یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ مؤلف فوائد عثمانی دہلی کے باشندے تھے ـــ

خانقاہ مرشد کی خدمت اور حاضری کی آسانی کی وجہ سے مع اہل و عیال قصبہ موسیٰ زئی میں مقیم ہو گئے تھے۔

سید محمد اکبر علی نقشبندی مجددی دہلوی جامع ملفوظات خواجہ محمد عثمان دامانی رحمہ "فوائد عثمانی" میں تحریر فرماتے ہیں ـــــ ایک دن فدوی حاضر خدمت ہوا اپنے باطن کے کچھ حالات لکھ کر پیر و مرشد کے سامنے پیش کیے۔ حضرت والا نے کچھ دیر کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا 'وہ احوالِ فقیری جو بزرگوں نے کتابوں میں لکھے ہیں اس اخیر زمانے میں پائے نہیں جاتے۔ گو اِس وقت ہر شخص اپنے حوصلے اور استعداد کے مطابق کوشش کرتا ہے ـــــ موجودہ زمانے کے حالات دیکھتے ہوئے یہ بھی غنیمت ہے ـــــ اور یہ جو دوکاندار پیروں نے آج کل دوکانداری شروع کر رکھی ہے اللہ تعالیٰ ایسی پیری سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے ـــــ پھر فرمایا کہ روز بروز جہاں کی کثرت ہوتی جا رہی ہے اور یوماً فیوماً حالِ زمانہ ابتر ہوتا جا رہا ہے ـــــ محض رسمِ فقیری باقی رہ گئی ہے۔ فقیری کہاں ہے؟ ـــــ

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ کے توکل و قناعت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیشہ عادت شریفہ یہ تھی کہ برائے خرچ خانقاہ، قرض لیتے تھے اور درویشوں پر صرف کرتے تھے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ کئی ہزار روپیہ نان بائی کا اُن پر قرض ہو جاتا تھا۔ جب فتوحات پہونچتی تھیں تو اوّل، قرضۂ سابقہ ادا فرماتے تھے اور بقیہ کو خانقاہ شریف کے اخراجات میں لاتے تھے۔ جب وہ رقم ختم ہو جاتی تھی پھر قرض لینا شروع کرتے تھے ـــــ پھر فرمایا کہ عیالدار شخص کو توکل و قناعت بہت دشوار ہے۔ اگر وہ اپنے نفس پر قادر ہو کر توکل اختیار کر بھی لے تو اُس کے زن و فرزند متوکل نہیں ہوتے ...... چاہیے کہ وہ کوئی سا جائز کسب یا ہنر اختیار کرے جس سے اکلِ حلال کی صورت نکل آئے ـــــ یہی سنتِ پیغمبران ہے۔ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

مکتوباتِ حضرت خواجہ محمد معصومؒ کا درس شروع فرمایا۔ اثنائے درس میں حضرت والا نے فرمایا ـــــ فقہاء نے حالت رکوع و سجدہ میں الصاقِ کعبین کو لکھا ہے۔ انھوں نے اُس حدیث کی مُراد کو جو اس باب میں وارد ہوئی ہے ملحوظ نہیں رکھا ـــــ مُرادِ حدیث محاذات

اور تسویۂ صفوف ہے۔ اِس مسئلے کے بارے میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی مہاجرؒ نے مکۂ معظمہ سے ایک مکتوب اِس فقیر اور مولوی غلام حسین صاحب کے نام بھیجا ہے۔

درسِ مکتوباتِ حضرت امام ربانی شروع ہوا۔ اثنائے درس میں حضرت والا نے فرمایا کہ زمینِ ہندوستان[عله] کو ایک شرف و امتیاز حاصل ہے کہ وہاں کا ادنیٰ جاہل بھی فہم و ذکاء اور عقل و فکر میں اِس جگہ کے پڑھے لکھے سے فوقیت رکھتا ہے۔ اس ملک (سرحد) کے اکثر طلباء تحصیل علم کے لیے ہندوستان جاتے ہیں اور عرصۂ قلیل میں تحصیل علم کر کے واپس آتے ہیں۔

ایک مرتبہ، بکمالِ کسر نفسی بیان فرمایا کہ میں گنہگار ہوں، کوئی عمل اپنے پاس نہیں رکھتا ہوں بعد ازاں جوش کے ساتھ یہ دو شعر (عراقی کے) پڑھے ؎

بزمین[عه] چو سجدہ کردم ز زمین ندا بر آمد — کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی
بطوافِ کعبہ[عه] رفتم بحرم رہم ندادند — کہ بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

ایک دن مکتوباتِ حضرت خواجہ محمد معصومؒ کا درس شروع فرمایا۔ جب مکتوب بنام جاناں بیگم[عه] آیا تو حضرت والا نے فرمایا کہ ہندوستان کو حق تعالیٰ نے فہم و ذکاء اور علم و دانائی کی دولت عطا فرمائی ہے۔ وہاں کے اکثر باشندے ذکی الطبع ہوتے ہیں (وہاں کی اکثر مستورات بھی ذکاوت اور علمی ذوق رکھتی ہیں) فقیر جس وقت ہندوستان گیا تھا اُس وقت مستوراتِ

عله باشندگانِ سرحد تقسیم ملک سے پہلے بھی ہندوستان بولکر دہلی، دوآبہ اور اضلاع یوپی مراد لیتے تھے۔

عه جب میں نے سجدہ کے لیے سر رکھا تو زمین سے یہ آواز آئی کہ اے شخص تو نے اپنے ریاکاری کے سجدے سے مجھے خراب کر دیا۔ عه میں کعبۃ اللہ کا طواف کرنے کے لیے چلا تو مسجد الحرام میں جانے کے لیے (قضا و قدر کی طرف سے) راستہ نہیں دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ تو نے باہر رہ کر کیا اچھے اعمال انجام دیے ہیں جو اندر آنے کی جرأت کر رہا ہے۔ عه جاناں بیگم، عبدالرحیم خانخاناں کی صاحبزادی تھیں۔ علم و کمال کے اُس درجے پر پہونچی ہوئی تھیں جس پر بہت سے مرد بھی نہیں پہونچ سکتے۔ فارسی میں شعر کہتی تھیں ایک تفسیر قرآن بھی انھوں نے لکھی ہو۔ ۱۰۷۰ھ میں جاناں بیگم کا انتقال ہوا۔ ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ۵۔ فوائد عثمانی سے معلوم ہوتا ہو کہ حضرت خواجہ دامانیؒ ایک سفر میں دہلی تشریف لائے اور وہاں سے سنبھل ضلع مراد آباد آئے۔ محمد امتیاز علی خاں راجپوت رئیس سنبھل کے مکان پر قیام فرمایا۔ سنبھل سے عبدالشکور خاں صاحب راجپوت رئیس دھرم پور کی درخواست پر دھرم پور تشریف لے گئے۔ غالباً چند مقامات اور بھی گئے ہیں جن کو نوٹ نہیں کر سکا۔ محمد امتیاز علی خاں سنبھلی مرحوم کے نام حضرت خواجہ دامانیؒ کا ایک مکتوب بھی فوائد عثمانی میں درج ہے۔

ہندوستان کے مراسلات (بغرض اصلاح) فقیر کے پاس آتے تھے۔ اُن کی عبارت عمدہ اور شائستہ ہوتی تھی اور الفاظ علمیہ اُن میں مندرج ہوتے تھے۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں ـــ ایک روز یہ خادم حاضرِ خدمت ہوا۔ حضرت والا نے تذکرہ مقام فنا فرمایا ـــ میں نے عرض کیا کہ انسان کو جب اوّل درجے میں فنا کا مقام حاصل ہوگیا پھر اُس کے بعد معرفتِ الٰہیہ کس طور سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ فنا سے مُراد یہ ہے کہ طالب، دنیا کی خوشی سے شاد اور دنیا کی غمی سے غمگین نہ ہو اور اپنے تمام اعمال اور اپنی ذات نیز جمیع ممکنات کو کچھ نہ جانے نیست و نابود سمجھے اسی فنا کے میسر آجانے کا نام معرفتِ الٰہیہ ہے۔

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں ایک دن حضورِ فیضگنجور میں حاضر ہوا۔ ارشاد فرمایا تم نے مراسلات کے جوابات لکھ لیے ہوں تو لاؤ ہمیں دکھاؤ ـــ حسب ارشاد جواباتِ مرقومہ ملاحظہ کے لیے پیش کیے۔ اُن میں ایک خط حضرت حافظ محمد یار صاحب کے نام تھا جس میں میں نے فارسی زبان میں تعزیتی عبارت لکھی تھی (جس کا ترجمہ یہ ہے)

"واقعۂ جانگداز انتقالِ حضرت لعلشاہ صاحب مرحوم نے اس قدر غم و الم پہونچایا کہ حدِ تقریر و تحریر سے باہر ہے اور اس واقعے نے جان و دل پر ایسی آگ بھڑکا دی ہے کہ اُس کا بجھنا ممکن نہیں"۔

اس عبارت کو ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا آئندہ اس طرح کے مبالغہ آمیز الفاظ کبھی نہ لکھنا اور خود اپنے دست مبارک سے اُس عبارت کی بجائے ایک عبارت لکھی جس کا مفہوم ہے

"الحق، انتقالِ حضرت شاہ صاحب مرحوم (پسماندگان کے لیے) ایک مصیبت ہے سخت ـــ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ بحرِ غفران فرمائے اور پسماندگان کو فیوض اولیاء کرام سے کامیاب کرے ـــ (آمین) ـــ

پھر فرمایا کہ فقیر نے کئی سال خدمتِ تحریر جواب خطوط، پیر و مرشد (حضرت حاجی دوست محمد قندھاریؒ) کی خانقاہ میں، انجام دی ہے۔

ایک دن میں نے ایک خط کے جواب میں ایک غریب و نامانوس لفظ استعمال کر دیا تھا (جس کو جامع نے لکھا ہے مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لغت ہے)، اس پر میرے پیر و مرشد نے

فرمایا کہ خبردار آئندہ اس طرح کا غریب و نامانوس لفظ مت لکھنا۔

ایک روز زبانِ گوہر فشاں سے ارشاد فرمایا کہ اس زمانے کے (بعض) علماء سمجھتے ہیں کہ علم دین اور ہے اور علمِ تصوف اور ہے۔ علم پڑھتے ہیں اور سمجھتے نہیں کہ تمام فقہاء نے کتب فقہ میں متابعتِ خدا و رسول کا مضمون لکھا ہے بس اُس پر کما حقہٗ عمل کرنا یہی عین فقیری اور کمالِ تصوف ہے۔

ایک دن ایک شخص نے حضرت والا سے عرض کیا کہ فلاں جگہ ایک بزرگ ہیں وہ اپنے پاس کسی کو ملاقات کے لیے نہیں آنے دیتے۔ یہ سُن کر اور تھوڑی دیر توقف کر کے فرمایا ——

ہمارے پیر و مرشد (حضرت حاجی دوست محمد قندھاریؒ) ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے۔ خادموں نے عرض کیا قبلہ اگر بعد نماز عشاء کوئی شخص آپ کی ملاقات کو نہ آئے تو بہتر ہے تاکہ آپ کے آرام میں کوئی خلل نہ آنے پائے۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ جو بھی ملاقات کرنے آتا ہے اس کو کسی وقت بھی منع نہ کرو۔ خلق اللہ میں سے جو لوگ بھی برائے ملاقاتِ فقراء آتے ہیں وہ اپنے اخلاص کے مطابق فیض حاصل کرتے ہیں۔ جو شخص اخلاص زیادہ لاتا ہے وہ فیض زیادہ حاصل کرتا ہے جو اخلاص کم لاتا ہے وہ فیض کم لے جاتا ہے اور جو بالکل اخلاص سے خالی ہوتا ہے وہ فیض سے بھی خالی ہاتھ جاتا ہے۔ پھر ایک مثال بیان فرمائی کہ جو لوگ بازار میں جاتے ہیں اپنی استطاعت و حیثیت کے مطابق سامان خریدتے ہیں جس کے پاس رقم زیادہ ہوتی ہے وہ زیادہ اشیاء خریدتا ہے اور جو کم دام رکھتا ہے وہ اشیاء بھی کم خریدتا ہے اور جو بالکل خالی ہاتھ ہوتا ہے وہ چیزوں سے خالی ہاتھ واپس ہوتا ہے۔

شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

اے تہی دست رفتہ در بازار — ترسمت پُر نیاوری دستار

(یعنی اے وہ شخص کہ تو خالی ہاتھ بازار گیا ہے مجھے ڈر ہے کہ تو اپنے کپڑے کو چیزوں سے بھر کر نہیں لا سکے گا)

ایک روز حضرت والا حاضرینِ مجلس سے سخنانِ نصیحت آمیز فرما رہے تھے۔ اثنائے کلام میں حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ کے چند کلماتِ طیبات بھی پیش کیے جن کا

ترجمہ یہ ہے۔ "اے بھائی! ہوس اور چیز ہے، جانبازی اور چیز ہے۔ آج کل درویشی کیا ہے؟ لقمہ فروشی ہے۔ خدائے تعالیٰ ایسی درویشی سے جو دین فروشی ہو توبہ نصیب کرے۔ بس سب سے پہلے میں صحیح مسلمان ہو جاؤں پھر درویشی اختیار کروں۔"

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ فقیر عید الضحیٰ کے دن حاضر خدمت ہوا ارشاد فرمایا کہ روزِ عید، عبادت مولیٰ کا دن ہے اور اس دن لوگ صبح سے شام تک فقیر کے پاس برائے مبارکبادی آتے ہیں۔ وقتِ فقیر خواہ مخواہ ضائع کرتے ہیں۔ کیا کروں کہ اس دن لوگوں سے روگردانی بھی مناسب نہیں سمجھتا۔

فرمایا کہ درویشانِ خانقاہ کو کبھی کبھی خدمتِ خانقاہ کے کام میں مشغول رکھتا ہوں۔ اس زمانے کے درویش جو علم تصوف سے نا آشنا اور کوتاہ فہم ہیں۔ ان کی سمجھ میں اس مشغول رکھنے کا فائدہ نہیں آتا۔ خانقاہ کے درویش گیہوں کی روٹی مع سالن کے صبح و شام بکی پکائی کھاتے ہیں اور کپڑا بھی بلا محنت و مشقت خانقاہ سے حاصل کر کے پہنتے ہیں۔ غرضیکہ ان کو خوراک و پوشاک کی کوئی فکر نہیں کرنی پڑتی ایسی صورت میں اندیشہ ہے کہ ماسوی اللہ کے خطرات و وساوس ان کے قلوب میں پیدا ہو جائیں۔ اسی لیے میں ان کو کبھی کبھی کارِ خدمتِ خانقاہ میں مصروف رکھتا ہوں کہ ان کے دل کسی دوسری طرف مائل نہ ہونے پائیں۔

شریعت پر استقامت

(مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو گزشتہ شعبان میں پانولی ضلع بھڑوچ کے مدرسہ "محمدیہ عربیہ" میں ہوئی تھی اور ساتھ ساتھ مولانا احمد مولات گجراتی نے قلمبند کی تھی)

گزشتہ شعبان میں یہ عاجز بمبئی گیا تھا وہاں بالکل اچانک ماریشس (افریقہ) کے ایک نہایت مخلص محب مولانا اسماعیل صاحب سے ملاقات ہوگئی، اُن کا قدیم وطن تو ضلع بھڑوچ کی ایک بستی دیوا ہے لیکن طویل عرصہ سے ماریشس ہی کو وطن بنالیا ہے، اب سے تین چار سال پہلے اُن ہی کی دعوت پر یہ عاجز ماریشس گیا تھا ــــــ وہ میرے بمبئی پہونچنے سے ایک ہی دن پہلے وہاں پہونچے تھے، بمبئی اُترتے ہی اُنھیں معلوم ہوا کہ میں فلاں ٹرین سے بمبئی آرہا ہوں وہ خود اسٹیشن تشریف لائے، میرے لیے اُن کی اور اُن کے لیے میری بے سان گمان یہ ملاقات نعمت غیر مترقبہ تھی، انھوں نے اسٹیشن ہی پر فرمایا کہ میں کل ہی آیا ہوں اور مجھے فوراً ہی اپنے گھر "دیوا" جانا تھا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ آج بمبئی آرہے ہیں تو میں یہاں ٹھہر گیا اور اب آپ کو میرے گھر چلنا ہوگا، میں نے ان کو اپنی مجبوری بتائی کہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی تاریخیں بالکل قریب ہیں اور مجھے وہاں پہونچنا ہے اور اُسی حساب سے واپسی کے لیے سیٹ بھی پہلے سے ریزرو کرالی گئی ہے ــــ انھوں نے کہا میں اس کا کوئی حل نکال لوں گا آپ کو بہرحال میرے گاؤں چلنا ہے۔

وہ مجھ سے رخصت ہو کر چلے گئے اور شام کو آکر بتایا کہ میں نے آپ کی واپسی کے لیے ہوائی جہاز میں سیٹ ریزرو کرادی ہے اب آپ ریلوے کا ریزرویشن کینسل کرادیں اور بس وہ وقت مجھے دیدیں جو ریل کے ذریعہ بمبئی سے لکھنؤ اور پھر وہاں سے دیوبند جانے

کی صورت میں صرف ہوتا۔ میں نے خوشی کے ساتھ ان کی اس تجویز کو قبول کر لیا۔ چنانچہ بمبئی سے روانہ ہو کر دیوا پہونچ گئے۔

وقت تو بہت ہی تنگ تھا لیکن بھائی مولانا اسماعیل صاحب کو اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔ انھوں نے اس تھوڑے ہی سے وقت کو بہت کارآمد بنایا۔ دیوا میں قیام کا وقت بہت محدود رکھا اور اُس علاقہ کے اُن تمام مقامات کے دورہ کا پروگرام بنا لیا جو دینی اہمیت و مرکزیت رکھتے ہیں۔ اور جہاں سے اس عاجز کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ مسلسل گردش کی وجہ سے سفر تو بہت متعب رہا، لیکن خوب رہا۔ اس سلسلہ میں ڈابھیل اور ترکیسر بھی حاضری ہوئی، بلکہ دوپہر کا کھانا ڈابھیل میں جامعہ تعلیم الدین کے مہتمم حضرت مولانا محمد سعید بزرگ کے یہاں کھایا اور وہیں کچھ آرام بھی کیا جس کی وقت میں گنجائش نہیں رکھی تھی اور اُسی کی وجہ سے راندیر کے لیے وقت میں گنجائش نہیں رہی جس کا اس عاجز کو خاص طور سے قلق رہا۔

اس دورہ کے پروگرام میں پالَن‌پور بھی شامل تھا ٹھیک دوپہر کو وہاں پہونچے یہاں بھی ایک بڑا دینی مدرسہ ہے جو بڑے عزائم کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔ اب سے چند سال پہلے جب اس کی نہایت وسیع اور شاندار جدید عمارت تیار ہوئی تھی تو افتتاح کی تقریب سے بہت بڑے پیمانہ پر جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا، اس کے لیے اس عاجز سے وعدہ لے لیا گیا تھا اور میں نے وعدہ کر لیا تھا لیکن عین وقت پر کسی مجبوری کے پیش آجانے کی وجہ سے مجھے عذر کر دینا پڑا تھا اور وہ وعدہ گویا مجھ پر قرض رہ گیا تھا ۔۔۔ تو جب ہم لوگ اُس دن کسی سابقہ اطلاع کے بغیر بالکل اچانک وہاں پہونچ گئے ۔۔۔ تو بستی کے لوگوں نے شدید اصرار کیا کہ رات تک ہم وہیں قیام کریں اور مدرسہ میں تقریر کر کے چند سال پہلا قرضہ ادا کیا جائے، ہم لوگوں نے وقت کی تنگی اور اپنی مجبوری کی معذرت کی لیکن وہ حضرات کسی طرح قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور کار کو گھیر کر کھڑے ہو گئے چونکہ اُن کا یہ اصرار خلوص و محبت سے بھرا ہوا تھا اس لیے میں اس کے لیے آمادہ ہو گیا کہ ڈابھیل اور ترکیسر وغیرہ جن جن مقامات پر پہونچنے کا پروگرام بنایا گیا ہے ان تمام مقامات سے فارغ ہو کر ہم لوگ

مغرب تک واپس آجائیں ، اور اسی وقت میں کچھ کہدوں اور اس قرضہ سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔

اس وقت اس کا خیال بالکل نہیں آیا کہ دن بھر کے مسلسل سفر کے بعد اپنے میں تقریر کرنے کی سکت بھی ہوگی یا نہیں ۔۔۔۔ اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے جن مقامات پر جانا تھا اگرچہ دو ایک ان میں سے حذف کر دینا پڑا پھر بھی واپسی میں اندازہ کے لحاظ سے بہت زیادہ دیر ہو گئی اور بجائے مغرب کے عشاء کے وقت پہونچ سکے۔ اور اس عاجز کا حال یہ تھا کہ دن بھر کے سفر نے بالکل ہی خستہ اور چور چور کر دیا تھا، کچھ طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی، حلق کی خرابی سے بولنا بھی مشکل تھا اس لیے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ مدرسہ محمدیہ عربیہ پالنوی کے مخلصوں سے اپنا حال عرض کر کے معذرت کر لوں گا اور اسی وقت سورت چلے جانے کی اجازت لے لوں گا کیونکہ اسی رات میں سورت سے بمبئی کے لیے روانہ ہونا تھا کہ وہاں سے دہلی کے لیے ہوائی جہاز پکڑا جا سکے۔

لیکن .... پالنوی پہونچکر دیکھا کہ بہت بڑا مجمع ہے، معلوم ہوا کہ دوپہر جب ہم لوگ مغرب تک واپسی کا وعدہ کر کے چلے گئے تو یہاں سے بہت سے لوگ قرب وجوار کی دوسری بستیوں میں اطلاع کرنے کے لیے مختلف سواریوں سے نکل گئے اور دور دور تک دعوت دے آئے، اسی کے نتیجہ میں یہ اتنا بڑا مجمع ہے اور اس میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو دور دراز مقامات سے آئے ہیں اور مغرب سے اب تک اسی طرح ہمارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد معذرت کرنے کی ہمت نہیں رہی اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کے ان حضرات کے سامنے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کہلوایا کہدیا۔

ہمارے عزیز و مکرم بھائی مولانا احمد مولات صاحب گجراتی جو شیخ الحدیث مخدومنا حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کے خاص خادم اور خطوط نویس ہیں اور کسی گفت گو یا تقریر کو ساتھ ساتھ اور بڑی حد تک لفظاً بہ لفظاً قلمبند کرنے کے بڑے مشاق ہیں وہ بھی اتفاق سے سہارنپور سے اپنے وطن آئے ہوئے تھے اور میری آمد کی اطلاع پر یہاں تشریف لے آئے تھے، انھوں نے یہ تقریر اسی وقت اور ساتھ ساتھ قلمبند کی۔ اور پھر جب کچھ

عرصہ کے بعد سہارنپور میں ملاقات ہوئی تو مجھے عنایت فرمائی تاکہ میری نظر سے گزر جانے کے بعد الفرقان میں شائع کر دی جائے۔ اُس وقت سے اب تک یہ مسودہ میرے بیگ میں رکھا رہا۔ اب اُن کی فرمائش کے مطابق اس کو دیکھنے کے بعد اُن کے شکریہ کے ساتھ "الفرقان" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اصل مقصد کے پیش نظر کہیں کہیں کچھ حذف و اضافہ اور لفظی ردوبدل بھی کیا گیا ہے ——— محمد منظور نعمانی

شریعت پر استقامت

خطبۂ مسنونہ اور اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا تَدَّعُونَ، نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ۝

میرے دینی بھائیو اور دوستو! اس وقت میرا حال یہ ہے کہ کچھ کہنے اور بولنے کی ہمت اور سکت بالکل نہیں ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ حلق سے آواز تک نہیں نکل رہی ہے ——— واقعہ یہ ہوا کہ آج دوپہر میں یہاں حاضر ہوا تھا، مدرسہ دیکھا، اُس وقت جو حضرات تشریف رکھتے تھے انھوں نے اصرار فرمایا کہ میں قیام کروں اور رات کو مدرسہ میں تقریر بھی کروں، انھوں نے یاد دلایا کہ یہ مجھ پر اُن کے مدرسہ کا قرض ہے۔ مجھے آج ہی دن میں ڈابھیل اور کئی دوسری جگہوں پر جانا تھا، اس لیے اس وقت میں نہیں ٹھہر سکا لیکن اُن کے مخلصانہ اصرار سے متاثر ہو کر یہ وعدہ کر لیا کہ مغرب تک ہم پھر یہیں واپس آجائیں گے اور اُس وقت کچھ عرض بھی کر دیا جائے گا۔

——— لیکن اب میرا احساس یہ ہے کہ اُس وقت اس فیصلہ میں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اپنی کمزور حالت اور طبیعت کی ناسازی کو دیکھتے ہوئے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ سارے دن سفر کے بعد کیا میں اس قابل رہوں گا کہ آپ حضرات کے سامنے کوئی تقریر کر سکوں ——— میں نے یہاں پہنچنے سے پہلے سوچا تھا کہ آپ حضرات کے سامنے اپنی حالت عرض کر کے معذرت کر لوں گا اور معافی

چاہوں گا اور آپ حضرات عنایت فرماکر معافی دیدیں گے ــــ لیکن یہاں آکے مجھے معلوم ہوا کہ آپ حضرات نے دور دور تک اطلاع کردی اور اللہ کے بہت سے بندے دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں اس لیے اب معذرت کرتے ہوئے خود مجھے شرم آتی ہے ــــ آپ حضرات دُعا فرمائیں اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائے اور کوئی ایسی بات کہلوادے جو میرے لیے بھی اور آپ حضرات کے لیے بھی نفعمند ہو اور آپ کا آنا کارآمد ہو۔

ابھی قاری صاحب نے قرآن مجید کی جو تلاوت فرمائی ہے، اُس میں انھوں نے سورۂ "حٰم سجدۃ" کی چند آیتیں پڑھی تھیں، ان ہی میں سے شروع کی دو تین آیتیں میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں۔

ــــ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ایک عالم اور ایک زندگی تو یہ ہے جس میں ہم آپ رہ بس رہے ہیں، اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کا سرد گرم چکھ رہے ہیں ــــ آپ اس کو دنیا کہہ لیجئے! یہ بلاشبہ ایک حقیقت ہے کوئی خواب و خیال نہیں ہے، اسی دنیا میں اللہ نے پیغمبر بھیجے اور اسی میں کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ اسی دُنیا کی چیزوں کے بارہ میں حلال و حرام وغیرہ کے احکام دیے ہیں ــــ الغرض یہ عالم اور یہ دُنیا ایک حقیقت ہے ــــ پھر ہم اور آپ جانتے ہیں کہ اس میں تکلیفیں اور مشقتیں بھی ہیں اور راحتیں اور لذتیں بھی ہیں اور ان تکلیفوں اور راحتوں، لذتوں کا ہم نے آپ نے خود تجربہ کیا ہے ــــ تو ایک عالم اور ایک زندگی تو یہ ہے۔ اور ایک اور عالم اور ایک دوسری زندگی ہے جو اس کے بعد آنے والی ہے۔ ہم نے اُس کو خود نہیں دیکھا ہے، اس کی خبر ہمیں اللہ کے پیغمبروں اور اُس کی کتابوں نے دی ہے اور سب سے آخر میں اللہ کے آخری پیغمبر سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اللہ کی آخری کتاب قرآن پاک نے دی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح اس عالم اور اِس زندگی میں یعنی دنیا میں تکلیفیں بھی ہیں اور راحتیں اور لذتیں بھی ہیں اسی طرح آگے آنے والے اُس دوسرے عالم اور دوسری زندگی میں بھی یہ دونوں چیزیں ہیں، بلکہ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہاں کی تکلیفیں اور مصیبتیں یہاں کے مقابلہ میں ہزاروں لاکھوں گنا بڑھی ہوئی ہیں اور اسی طرح وہاں کی راحتیں اور لذتیں اور بہاریں بھی یہاں کے مقابلہ میں بےحد و حساب زیادہ ہیں،

بلکہ یہاں کی تکلیفوں اور راحتوں، لذتوں کو وہاں کی تکلیفوں اور راحتوں لذتوں سے کوئی نسبت ہی نہیں ــــــ اور اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ حضرات انبیاء علیہ السلام نے اور اللہ کی مقدس کتابوں نے اور سب سے آخر میں سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور قرآن مجید نے اس کے بارہ میں جو کچھ بتلایا ہے وہ بالکل حق ہے اور اس عالم کی زندگی ختم کر کے اُس دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد ہم سب اپنی آنکھوں سے اُس سب کو اسی طرح دیکھ لیں گے جس طرح آج اس دنیا کی چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔

آپ اس کو یوں سمجھیے کہ ہم آپ سب اس دنیا میں آنے سے پہلے کچھ مہینے اپنی ماؤں کے پیٹ میں رہے ہیں وہ ہماری زندگی کا سب سے پہلا مرحلہ تھا اور پہلا عالم تھا، اس وقت اگر ہم سے کوئی کہتا کہ اے ننھے بچے آج تو اس تنگ اور تاریک دنیا میں ہے، کچھ دنوں کے بعد تو ایک دوسری بہت بڑی دنیا میں پہنچ جائے گا، جو لاکھوں میل کی لمبی چوڑی دنیا ہے، وہاں زمین ہے اور آسمان ہے، اور پہاڑ ہیں اور بڑے بڑے دریا ہیں اور سمندر ہے اور اس میں جہاز چلتے ہیں اور زمین میں ریلیں، اور موٹریں دوڑتی ہیں اور وہاں سورج ہے اور چاند ہے اور بجلی کی روشنی ہے اور کھیت ہیں اور باغات ہیں اور طرح طرح کے پھول اور پھل ہیں اور وہاں بڑی بڑی راحتیں اور لذتیں ہیں اور بڑی نفیس نفیس کھانے اور پینے کی چیزیں ہیں ــــــ اور وہاں بڑی بڑی تکلیفیں بھی ہیں، لوگ آگ میں جل جاتے ہیں اور بم سے اُڑا دیے جاتے ہیں اور مجرم پھانسیوں پر چڑھائے جاتے ہیں ــــــ تو اگر ایک ایسے بچہ سے جو ابھی ماں کے پیٹ والی دنیا میں ہے، کوئی یہ باتیں کہے اور فرض کرو کوئی ایسا آلہ ایجاد ہو جائے کہ وہ بچہ ان باتوں کو سُن بھی لے ــــــ تو ظاہر ہے کہ نہ تو وہ بچہ ان حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ سکے گا اور نہ اُس کی ننھی سی عقل ان باتوں کو قبول کر سکے گی، لیکن وہی بچہ اس دنیا میں آنے کے بعد خود ان سب چیزوں کو دیکھ لیتا ہے ــــــ بالکل اسی طرح سمجھیے کہ جب تک ہم اس عالم اور اس دنیا میں ہیں، آگے آنے والا عالم اور آگے آنے والی دنیا ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور ہم اُسے نہیں دیکھ سکتے اور وہاں کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے ــــــ لیکن جب اس دنیا اور اس عالم سے منتقل ہو کر اُس آنے والے عالم میں اور آنے والی دنیا میں یعنی عالم

آخرت میں ہم پہنچ جائیں گے تو اُن سب چیزوں کو جن کی اطلاع انبیاء علیہم السلام نے اور اللہ کی کتابوں نے دی ہے' اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لینگے کہ جسطرح ماں کے پیٹ والی چھوٹی سی تنگ و تاریک دنیا کے مقابلہ میں ہماری یہ دنیا تکلیف اور راحت اور دکھ سکھ ہر لحاظ سے بے حد و حساب وسیع اور ترقی یافتہ ہے اسی طرح آنے والا عالم یعنی عالم آخرت ہماری اس دنیا کے لحاظ سے بے حد وسیع اور ترقی یافتہ ہے وہاں ایسی نعمتیں اور عیش و راحت کے ایسے سامان ہوں گے جن کا اس دنیا میں کسی نے تصور بھی نہ کیا ہوگا اور اللہ پناہ میں رکھے! وہاں دوزخ میں عذاب کی ایسی شکلیں ہوں گی اور تعذیب کے ایسے سامان ہوں گے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی تکلیف اور مصیبت کو بھی اُن سے کوئی نسبت نہ ہوگی ۔۔۔

میرے بھائیو اور دوستو اور عزیزو! اللہ تعالیٰ میں ہر صفت بدرجہ کمال ہے' اُس کی قدرت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ اُس کی رحمت کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور اس کے جلال اور قہر کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ انسان جب اپنی زندگی کی سب سے پہلی منزل یعنی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے جب بھی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا اُس سے تعلق ہوتا ہے لیکن یہ تعلق حکمت کے مطابق بہت ہلکے پیمانہ پر ہوتا ہے ۔ پھر ہماری اِس دنیا اور اِس زندگی میں ان صفات کا ظہور ماں کے پیٹ والی دنیا کے مقابلہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے جیسا کہ ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ لیکن اِن صفات کا کامل ظہور عالم آخرت میں ہوگا' شانِ رحمت اور شانِ جمال کا کامل ظہور جنت میں ہوگا اور شانِ قہر و جلال کا کامل ظہور دوزخ میں ہوگا۔

دوزخ میں اللہ تعالیٰ کے قہر و جلال کو سمجھنے کے لیے صرف اس پر غور کرنا کافی ہوگا کہ یہاں اگر کسی آدمی کو دہکتی آگ میں ڈالدیا جائے تو وہ بیچارہ چند منٹ میں جل بھُن کر اور تڑپ تڑپ کر ختم ہو جائے گا' اُس کی جان نکل جائے گی اور تکلیف اور اذیت کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا' لیکن جو مجرم آخرت میں دوزخ میں ڈالے جائیں گے وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلیں گے' بھُنیں گے اور اُن کی جان نہیں نکلے گی' یہاں تک کہ وہ خود موت مانگیں گے جہنم کے فرشتہ سے کہیں گے "لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ" مطلب یہ کہ ہم چاہتے ہیں کہ

خدا ہمارا خاتمہ کر دے اور ہمیں موت آجائے۔ لیکن جواب ملے گا "اِنَّکُمْ مَاکِثُوْن" یعنی تمہیں موت نہیں دی جائے گی، تم ہمیشہ اسی طرح پڑے رہو گے ــــ ذرا سوچیے! یہ اللہ کی قدرت قاہرہ اور اُس کے قہر و جلال کا کیسا ظہور ہوگا۔ اللہ کی پناہ! اللہ کی پناہ!! اللہ کی پناہ!!!

اور جنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے فضل و احسان کا کچھ اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی ایک آیت کافی ہے جو میں نے شروع میں تلاوت کی تھی جس میں اہل جنت کے حق میں فرمایا گیا ہے۔ "وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ" اس میں جنتیوں سے کہا گیا ہے کہ جنت میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے اور جو کچھ تم طلب کرو گے وہ سب تمہیں ملے گا اور تمہارے جی کی ہر چاہت اور ہر خواہش پوری کی جائے گی ــــ ذرا اس کی وسعت پر تو غور کیجیے، آدمی ایسی زندگی چاہتا ہے کہ کبھی موت نہ آئے، ایسی صحت چاہتا ہے کہ کبھی بیماری نہ ہو، ایسی جوانی چاہتا ہے کہ کبھی بڑھاپا نہ آئے، ایسی خوبصورتی چاہتا ہے جو کبھی زائل نہ ہو، اس کے علاوہ ہر طرح کی لذت اور مسرت چاہتا ہے، اُس کی روح اپنے خالق کی رضا چاہتی ہے، اُس کا قرب چاہتی ہے ـ قرآن پاک کی اس آیت میں فرمایا گیا کہ یہ سب تمہیں عطا ہوگا، اور تمہیں اُس کے لیے وہاں کچھ کرنا نہیں پڑے گا، سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح پیش ہوگا جس طرح کسی کریم میزبان کی طرف سے عزیز مہمان کے لیے پیش ہوتا ہے۔ "نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ" ــــ یہی بات ایک دوسری آیت میں ان لفظوں میں فرمائی گئی ہے "فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ" یعنی جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کو جی چاہے، اور جس سے آنکھوں کو سرور و لذت حاصل ہو، آگے فرمایا گیا ہے "وَاَنْتُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ ۝" اور تم ہمیشہ ہمیشہ اُس جنت میں رہو گے ــــ یہی وہ چیز ہے جسے میں نے کہا کہ اللہ کی رحمت اور اس کے فضل و احسان کا کامل ظہور آخرت میں اور جنت میں ہوگا۔ ہماری یہ دنیا جس میں ہم رہ بس رہے ہیں اس میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت یا اس کے قہر و جلال کا یہاں پورا ظہور ہو سکے یہاں کے زمین و آسمان اُس کو سہار ہی نہیں سکتے۔ قرآن مجید میں ہے کہ ایک پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کے جلال کی ذرا سی تجلی ہوئی تھی وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ جیسے

طاقتور پیغمبر، جن کے ایک تھپڑ سے ایک جوان قبطی کا دم نکل گیا تھا، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ "فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا"۔ اسی طرح ہماری یہ دنیا اور یہاں کے زمین و آسمان اللہ کی جمالی تجلی کو برداشت نہیں کر سکتے ___ تو اللہ کے قہر و جلال اور اسی طرح اس کی کامل رحمت اور اُس کے جمال کا کامل ظہور آخرت میں، جنت اور دوزخ میں ہو گا۔

میرے دینی بھائیو اور دوستو! اپنے اپنے زمانہ میں اللہ کے سب پیغمبروں نے اور سب سے آخر میں اُس کے آخری رسول سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آخری کتاب قرآن مجید نے اُس طریقہ کی دعوت دی ہے جس پر چل کر اللہ کے بندے اُس کے قہر و جلال سے بالکل محفوظ ہو جائیں اور دنیا میں بھی اُس کے فضل کے اور آخرت میں اس کی اُس کامل رحمت کے مستحق ہو جائیں جس کا ظہور آخرت اور جنت ہی میں ہو گا ___ اسی طریقہ کا نام شریعت ہے، اللہ تعالیٰ نے شریعت اس لیے نازل نہیں کی ہے کہ اُس کو ہمارے پابند کرنے سے کوئی دلچسپی ہے یا ہمارے شریعت پر چلنے سے اُس کا ذرہ برابر کوئی نفع ہے وہ "غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ" ہے ___ ایک حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ اگر سارے بندے شیطان کی طرح اللہ کے سخت نافرمان ہو جائیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی شان عظمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آئے گا ___ شریعت تو اللہ تعالیٰ نے صرف اس لیے نازل کی ہے اور ہمیں اس پر چلنے کا صرف اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ ہم اُس کی رحمت کاملہ کے مستحق ہو جائیں ___ تو شریعت تو ہمارے لیے سراسر رحمت ہے اور اس سے ہماری بھلائی ہی مقصود ہے۔

میں نے سورۂ "حٰمٓ سجدہ" کی جو دو تین آیتیں پڑھی تھیں اُن میں بڑے پیارے انداز میں استقامت کے ساتھ شریعت پر چلنے کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان استقامت والوں کو ہم کیا کچھ دیں گے اور ان پر کیسی نوازشیں ہوں گی۔

سنیئے! ___ ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" ___ یعنی جن بندوں نے اس کا اقرار کر لیا اور مان لیا کہ ہمارا رب بس اللہ ہے، پھر استقامت کے ساتھ اس پر چلتے رہے ___ "رَبُّنَا اللّٰهُ" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو اپنا مالک و معبود

مان کر اس کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گزارنے کا جنھوں نے اقرار کر لیا، یعنی اللہ کے دین اسلام کو قبول کر لیا اور اس کی شریعت پر چلنا طے کر لیا "ثم استقاموا" پھر اس اقرار و فیصلہ کے مطابق زندگی گزاری، استقامت کے ساتھ شریعت پر چلتے رہے ــــ ان کے لیے فرمایا گیا ہے تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ٥ یعنی اللہ کے ان بندوں پر فرشتے اترتے ہیں اور ان کو خوش اور مطمئن کرنے کے لیے انھیں یہ خوشخبری سناتے ہیں ــــ کہ کسی طرح کا خوف نہ کرو اور بالکل غم نہ کھاؤ اور اس جنت کی خوشخبری لو جس کا تم سے رسولوں کی زبانی وعدہ کیا جاتا تھا ــــ آپ غور کریں انسان کی زندگی کے دو ہی کانٹے ہیں ایک خوف اور دوسرا غم، آنے والی مصیبت کا خوف ہوتا ہے اور جب مصیبت آجائے یا آکر گزر جائے تو اس کا غم ہوتا ہے، انسانوں کی ساری پریشانیاں یا خوف کے قسم کی ہوں گی یا غم کے قسم کی ــ قرآن پاک کی اس آیت میں فرمایا گیا کہ جو بندے استقامت کے ساتھ اللہ کی بندگی کے راستہ پر یعنی شریعت پر چلتے رہیں انھیں فرشتے یہ پیام پہنچاتے ہیں کہ مطمئن ہو جاؤ، تمہارے لیے کوئی خوف اور کوئی غم کی بات نہیں ــ "لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا" یعنی آگے تمہارے لیے کوئی ڈر اور خوف کی بات نہیں ہو خیر ہی خیر ہے۔ اللہ کی رحمت ہے، اللہ کا پیار ہے، اور کوئی رنج و غم کی بات بھی نہیں ہے یعنی جب اللہ کی رحمت ہے اور آگے جنت ہے اور اللہ کی رضا ہے تو پھر کیا غم اور کس بات کا غم! "لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥" اسی کے ساتھ فرشتے یہ بھی کہتے ہیں "نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ" یعنی فرشتے جنت کی خوشخبری سنانے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی ہماری تمہاری رفاقت رہے گی۔

بہت سے مفسرین نے ان آیتوں کا مطلب یہ تبلایا ہے کہ جو بندے استقامت کے ساتھ اللہ کی بندگی کے راستہ پر یعنی شریعت پر چلتے رہتے ہیں انھیں موت کے وقت فرشتے یہ تسلی دیتے ہیں اور خوشخبری سناتے ہیں یا قبر میں اور حشر میں سنائیں گے ــ لیکن کچھ محققین کی رائے

یہ ہے کہ اس کو مرنے کے وقت کے ساتھ اور قبر یا حشر کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو بلکہ اس دنیوی زندگی میں بھی اصحاب استقامت کے قلوب میں فرشتے یہ خیالات ڈالتے ہیں جس سے انھیں اطمینان اور شرح صدر کی دولت نصیب ہوتی ہیں اور اپنے رب کریم اور محسن حقیقی کے ساتھ ان کی محبت میں اور اضافہ ہوتا ہے، اور پھر موت کے وقت اور قبر اور حشر میں بھی خوشخبریوں اور تسلیوں کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اسی آیت میں آگے جو یہ فرمایا گیا ہے "نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ" اس سے اسکی تائید ہوتی ہو، کہ اہل استقامت کو یہ بشارت فرشتے اس دنیوی زندگی میں بھی دیتے ہیں۔

آگے فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے یہ فرشتے یہ بشارت بھی سناتے ہیں وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ یعنی اے اللہ کے وفادار اور اطاعت شعار بندو تمہارے واسطے جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کو تمہارے جی چاہیں اور جو تم طلب کروگے ــــ اور کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے تم کو کچھ کرنا نہیں پڑے گا۔ درخواست بھی نہیں لکھنی پڑے گی، سب رب کریم اور غفور رحیم کی طرف سے مہمانی کے طور پر ملے گا، تم اسکے عزیز اور پیارے مہمان ہوگے اور وہ تمہارا پیارا اور کریم میزبان ہوگا نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۔

یہ آیت دراصل اللہ تعالیٰ کا منشورِ رحمت ہے۔ میں سب سے پہلے اپنے نفس سے اور اس کے بعد آپ سب بھائیوں اور دوستوں سے کہتا ہوں کہ اس کو اپنا حال بنالو! ــــ صحابہ کرام نے، ان کے بعد تابعین عظام نے ان کے بعد ہمارے اس زمانہ تک کے اولیاء امت نے جو کچھ پایا ہے اسی راستہ پر چل کر اور اس طریقہ کو اپنا کر پایا ہے، انھوں نے دل اور زبان سے کہا رَبُّنَا اللّٰهُ یعنی ہمارا رب بس اللہ ہے اور ہم اس کے بندے ہیں اس لیے بندگی والی زندگی گزاریں گے ــــ اور پھر استقامت کے ساتھ اسی راستہ پر چلتے رہے اور اللہ کی رحمت اور اس کے پیار کے مستحق ہوگئے۔

میرے بھائیو! اللہ تعالیٰ میرا اور آپ کا رب مجھے اور آپ کو بھی اسی طرف بلا رہا ہے ــــ طے کر لو کہ انشاء اللہ یہ مقام ہمیں حاصل کرنا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اس راستہ

کا پہلا مرحلہ تو ہم نے طے بھی کر لیا ہے، یعنی ہم سب نے دل اور زبان سے "ربنا اللہ" کہا ہے، اور اسلام کو اپنا دین بنا کے اور کلمہ شریف پڑھ کے ہم نے اقرار کیا ہے اور مانا ہے کہ اللہ ہمارا وحدہ لاشریک، مالک و معبود ہے اور ہم اُس کے بندے ہیں اور بندگی والی زندگی گزاریں گے اور اُس کی شریعت پر چلیں گے ـــ تو یہ پہلا مرحلہ تو ہم نے طے کر لیا ہے اب دوسرا مرحلہ ثُمَّ اسْتَقَامُوا کا ہے اور یہ مرتے دم تک کا ہے ـــ اگر اب تک ہم نے فیصلہ نہیں کیا تھا تو آؤ اب فیصلہ کریں کہ شریعت پر چلتے ہوئے جئیں گے اور شریعت پر چلتے ہوئے مریں گے ـــ بس اسی کا نام استقامت ہے ـــ اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے اور آپ حضرات کو بھی نصیب فرمائے۔

میرے بھائیو! اگر نفس میں خباثت نہ ہو تو شریعت پر چلنا کچھ مشکل نہیں، اللہ تعالیٰ نے دین اور شریعت کو بہت آسان کر دیا ہے ہمیں کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا گیا ہے جو ہم سے نہ ہو سکے۔ "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" ـــ نماز کے لیے وضو کا حکم دیا گیا، ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے وضو مشکل ہو تو تیمم کر لو، نماز کھڑے ہو کر ادا کرنے کا حکم دیا گیا، ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ بیماری وغیرہ کی مجبوری ہو تو بیٹھ کے اور یہ بھی مشکل ہو تو لیٹے لیٹے ادا کر لیا کرو، رمضان کے روزوں کا حکم دیا گیا ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ بیماری یا سفر کی معذوری ہو تو قضا کر سکتے ہو ـــ زکوٰۃ صرف چالیسواں حصہ مقرر کی گئی اور وہ بھی صرف دولتمندوں پر، اور اُن کے بھی مکانات اور سواریاں، موٹر وغیرہ بھی مستثنیٰ کر دیے گئے ـــ آپ شریعت کے ایک ایک حکم پر غور کر کے دیکھ لیں یہی نظر آئے گا کہ ہر حکم میں ہماری آسانی کا لحاظ رکھا گیا ہے اور جو بھی حکم دیا گیا ہے اُس میں ہماری بھلائی اور خود ہماری تکمیل ہے ـــ ایسی شریعت پر چلنا کیا مشکل ہے ـــ پھر دنیا کی وہ ساری چیزیں جن میں لطف اور لذت ہے جائز حدود کی پابندی لگا کر ہمارے لیے حلال کر دی گئیں۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ" یعنی اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں زینت و آرائش کا جو سامان پیدا کیا ہے یعنی خوبصورت لباس وغیرہ اور کھانے پینے کی نفیس و لذیذ چیزیں اُن کو کس نے حرام کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں تمہارے لیے حلال اور طیب ہیں، جائز حدود میں خوب استعمال کرو اور خدا کا شکر ادا کرو۔

میرے بھائیو! سوچو! ایسی شریعت پر چلنا اور مرتے دم تک استقامت کے ساتھ چلتے رہنا کیا مشکل ہے۔

پھر توبہ کا بھی دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، اگر بالفرض اس راستہ پر چلتے ہوئے خود اپنے نفس کی شرارت سے یا شیطان کے بہکانے سے ہم سے گناہ ہو جائے اور بڑے سے بڑا گناہ ہو جائے اور خدا نہ کرے بار بار ہو جائے، لیکن اس کے بعد ہم سچے دل سے توبہ کرلیں اور معافی مانگ لیں تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیں معاف فرما دے گا اور ہمارے اُن گناہوں کو بالکل کالعدم کردے گا اور ہمیں پھر وفادار بندوں میں اور استقامت والوں میں شامل کرلیا جائے گا ـــــ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص محروم ہو تو اس کے سوا کیا کہا جائے گا کہ وہ بڑا ہی بدبخت اور بدنصیب ہے۔

جب بات یہاں تک آگئی تو میں آپ بھائیوں اور دوستوں سے اور خود اپنے نفس سے کہتا ہوں کہ ہم یہ یقین کرکے کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہے اور مجھے اور آپ کو دیکھ رہا ہے اور اُس کے فرشتے بھی یہاں موجود ہیں، ہم آپ اپنے چھوٹے بڑے گناہوں سے اللہ کے حضور میں توبہ کریں اور آئندہ کے لیے استقامت کے ساتھ شریعت پر چلنے کا ارادہ اور عہد کریں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں۔

(اس موقع پر پورے مجمع نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر توبہ کی اور دعا ہوئی ـــ اور اس درمیان میں تقریر کا سلسلہ منقطع رہا ـــــ اس کے بعد تقریر کا سلسلہ پھر جاری ہوگیا)

میرے بھائیو اور دوستو! اب میں ایک بہت مختصر سا عملی پروگرام بتاتا ہوں وہ انشاء اللہ استقامت کے ساتھ شریعت پر چلنے میں بہت مدد دے گا ـــ

آپ سب حضرات نماز تو پابندی سے پڑھتے ہی ہوں گے اور اس وقت ہم سب نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے اُس کے بعد تو انشاء اللہ اور زیادہ اہتمام اور پابندی سے پڑھیں گے، اُس کے سلسلہ میں یہ کوشش کیجیے کہ آپ کی نماز ظاہر کے لحاظ سے بھی صحیح نماز ہو اور باطن کے لحاظ سے بھی، ظاہر کے لحاظ سے صحیح ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کا رکوع، سجدہ، قومہ، قیام قعود، قرأت حضور کی تعلیم اور آپ کی سنت کے مطابق ہو ـــ جس حد تک بھی ہو سکے ـــ اور باطن کے لحاظ سے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں آپ کا دھیان عظمت اور خشیت

کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔ یہی نماز کی روح اور اُس کا باطن ہے۔

آپ یقین کیجیے کہ جب آپ سچے دل سے اس کی کوشش کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہیں گے تو یہ چیز آپ کو کسی نہ کسی درجہ میں نصیب ہو جائے گی، بلکہ آپ کے صرف کوشش کرنے سے آپ کی نماز اللہ کے ہاں ایسی ہی لکھی جانے لگے گی۔ اور پھر یہ نماز آپ کے ظاہر و باطن کو بہت کچھ درست کر دے گی۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ کچھ اللہ کے ذکر کی عادت ڈالیے تیسرا کلمہ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم فرمایا ہوا ذکر اللہ کا نہایت جامع کلمہ ہے۔ صبح شام اس کی کم از کم ایک ایک تسبیح کا معمول مقرر کر لیجیے اور یہ بھی جہاں تک ہو سکے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور اسکی عظمت اور محبت و خشیت کے ساتھ ہو — اسی کے ساتھ ایک ایک تسبیح استغفار اور درود شریف کی ہو جایا کرے — یہ بہت ہلکا پھلکا ذکر کا نصاب ہے، قیامت میں پہنچ کے معلوم ہو گا کہ ان کلموں میں پہاڑوں سے بھی زیادہ وزن ہے۔ یہ کلمے جنت میں چلنے والے سکے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو یقین نصیب فرمائے اور عمل کی توفیق دے۔

تیسرا مشورہ یہ دیتا ہوں کہ روزانہ دو چار منٹ کا کوئی وقت اس کے لیے بھی مقرر کر لیجیے کہ اُس میں آپ اپنی موت کو یاد کریں بلکہ اُس کا مراقبہ کیا کریں، یعنی یہ سوچیں کہ یقیناً ایک دن مجھے موت آ جائے گی، پھر مجھے نہلایا اور کفنایا جائے گا، پھر میرا جنازہ قبرستان لے جایا جائے گا، پھر مجھے قبر میں دفن کر دیا جائے گا، الغرض موت کے وقت جو کچھ ہوتا ہے اُس کو تفصیل سے سوچا جائے اور اس طرح سوچا جائے کہ گویا مجھ پر یہ سب گزر رہا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے اعمال پر نگاہ ڈالی جائے اور پھر اللہ کے حضور میں پیشی اور حساب کا تصور کیا جائے کہ اُس وقت میرا کیا حال ہو گا — اس سب کا دھیان کر کے اللہ کے حضور میں سب گناہوں سے توبہ کی جائے — یہ صرف دو چار منٹ کا کام ہے لیکن اکسیر ہے اکسیر اور چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ ہو سکے تو آخری رات میں اُٹھ کر تہجد کی کچھ رکعتیں پڑھنے کی عادت ضرور ڈال لیجیے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمت کے لیے خاص الخاص تحفہ ہے۔ بندہ اُس وقت جو کچھ حاصل کر سکتا ہے وہ کسی دوسرے وقت حاصل نہیں ہو سکتا — آپ حضرات نے سُنا ہو گا حدیث

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ کی تدفین کا قضیہ

اور حضرت مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند کا بیان

(از محمد منظور نعمانی)

مرشدنا حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائپوری قدس سرہ کے وصال پر تقریباً ۹ سال گزر چکے ہیں۔ حضرت کا وصال وسط ربیع الاول ۱۳۸۲ھ میں لاہور میں ہوا تھا۔ یہ عاجز پاکستان کا پاسپورٹ نہ مل سکنے کی وجہ سے حضرت کے اس آخری قیامِ لاہور کے ایام میں وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔

وصال ہو جانے پر حضرت کے حقیقی بھائی حضرت حافظ محمد خلیل صاحب مدظلہ اور دوسرے قریبی اعزہ نے جو وہیں تھے اپنے اصل وطن (ڈھڈیاں، ضلع سرگودھا) لے جا کر دفن کرنے کا فیصلہ کیا (اگرچہ عاجز وہاں ہوتا تو آخری حد تک اصرار کرتا کہ جس سرزمین پر وصال ہوا ہے وہیں یعنی لاہور میں تدفین کی جائے۔ شرعی لحاظ سے بلاشبہ یہی چاہیے تھا اور یہی حضرت کی منشاء کے مطابق ہوتا) لیکن قضاء و قدر کا فیصلہ تھا کہ حضرت کا مولد ہی مدفن بھی بنے۔ ماشاءاللہ کان وما لم یشأ لم یکن۔

حضرت کے وصال اور اس فیصلہ کے بعد کہ تدفین وطن ہی میں ہوگی خود حضرت حافظ محمد خلیل صاحب قبر کی تیاری کے لیے جنازہ سے پہلے ہی وہاں کے لیے روانہ ہو گئے اور بستی کے قبرستان کے قریب میں (جو کافی نشیب میں ہے) اپنی ذاتی ملکیت کی زمین میں قبر تیار کرانی شروع کر دی اور قریب قریب تیار ہو گئی لیکن چونکہ موسم آخری برسات کا تھا اس لیے اس میں نیچے پانی کا اثر بہت زیادہ تھا گیلی مٹی نکلنے لگی، اس وجہ سے اہل خاندان اور بستی والوں نے تدفین کے لیے دوسری جگہ تجویز کی۔ یہ جگہ بستی کی مسجد کے صحن سے متصل اور مسجد سے متعلق حجروں کے سامنے کا ایک طویل و عریض قطعۂ اراضی تھا۔ جو حضرت کے خاندان والوں ہی کی ملکیت میں تھا ـــــ یہ مسجد بھی سیلاب سے متاثر ہو جانے

کی وجہ سے نئے سرے سے تعمیر ہوئی تھی۔ اور آئندہ کے لیے سیلاب کے اثرات سے حفاظت کے خیال سے اُس کی کرسی ۵۔۶ فٹ بلند کردی گئی تھی ــــ صحنِ مسجد کو بھی اتنا ہی بلند کرنا طے کر لیا گیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ برابر والے اس قطعۂ اراضی کے متعلق بھی طے ہو گیا تھا کہ اس میں بھی مٹی بھر کر اور اتنا ہی بلند کر کے صحنِ مسجد کے متوازی کر دیا جائے گا اور یہ گویا حجروں کا صحن ہو جائے گا لیکن ابھی صحنِ مسجد اور برابر والے اس قطعۂ اراضی میں مٹی ڈال کر اُس کو بلند نہیں کیا جا سکا تھا۔

جب اس قطعۂ زمین میں حضرت اقدسؒ کی تدفین کا فیصلہ کیا گیا تو اُن لوگوں نے سوچا کہ اگر یہاں موجودہ سطحِ زمین کو کھود کر وہاں کے عام رواج و دستور کے مطابق شق[1] بنا کر حضرت کو اس میں دفن کیا جائے گا تو طے شدہ منصوبہ کے مطابق ۵ فٹ مزید مٹی بھر جانے کے بعد حضرت کا جسد سطح سے دس گیارہ فٹ نیچے ہو جائے گا۔ اس لیے ــــ نیز اس وجہ سے کہ اگست کا مہینہ اور آخری برسات کا موسم ہونے کے سبب یہاں بھی نیچے گیلی مٹی نکل آنے کا قوی اندیشہ تھا۔ الغرض ان دونوں باتوں کے پیشِ نظر اہلِ خاندان نے بعض اُن علمائے کرام سے استصواب کر کے جو تدفین میں شریک تھے۔ یہ طریقہ اختیار کیا کہ زمین کو تھوڑا سا (ایک فٹ سے کچھ زیادہ) کھود کر اس میں پختہ[2] اینٹوں کا فرش کیا گیا اور اُس پر اوپر کی جانب کو چاروں طرف شق کی شکل میں دیواریں بنا کر اس میں حضرت کا تابوت[3] رکھا گیا (یعنی تابوت، لحد یا شق کی شکل میں قبر کھود کر زیرِ زمین دفن نہیں کیا گیا بلکہ زمین کے اوپر کے حصہ میں اینٹوں کے فرش پر دیواروں کے درمیان رکھا گیا) اور دیواروں کے اوپر سے اینٹوں ہی کی ڈاٹ لگا دی گئی۔ اور پھر ہر طرف سے مٹی ڈال دی گئی ــــ اور پھر سابق فیصلہ کے مطابق ۵

---

[1] اُس علاقہ میں زمین اس قابل نہیں ہے کہ لحد بنائی جائے اس لیے شق ہی کا رواج ہے۔

[2] برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے دیہات کی اس بستی میں کچی اینٹیں دستیاب نہیں ہو سکیں اسلیے فرش میں دیواروں میں اور چھت میں پختہ اینٹیں استعمال کرنا پڑیں۔ [3] حضرت قاضی عبد القادر صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ اُس علاقہ میں اکابر علماء و مشائخ کو لکڑی کے تابوت میں رکھ کر دفن کرنے کا رواج ہے اس لیے حضرت اقدس کے لیے تابوت استعمال کیا گیا ــــ راقم سطور کا خیال ہے کہ اگر تابوت کا استعمال کسی خاص ضرورت کے بغیر صرف امتیاز کے لیے کیا جاتا ہے تو یہ غلط ہے اور یہ رواج قابلِ اصلاح ہے اور افسوس ہے کہ حضرت اقدس کی تدفین میں یہ بات بھی سنت کے خلاف ہوئی۔

فٹ کے قریب مٹی بھر کر اُس پورے قطعۂ زمین کو اور صحن مسجد کو سجدہ کے متوازی کر دیا گیا اور اوپر کوہان نما قبر بنا دی گئی اور اُن حضرات نے سمجھا کہ اب یہ ویسی ہی صورت ہو گئی جو زمین کھود کر شق بنانے میں ہوتی۔

مگر ہم مسلمانوں پر صدیوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے افتراق و انشقاق کا جو عذاب مسلط ہے اس کا یہاں بھی ظہور ہوا۔ اور حضرت اقدسؒ سے تعلق رکھنے والے ہمارے کچھ بزرگوں اور بھائیوں نے ایک طرف تو یہ کہنا شروع کیا کہ حضرتؒ کی خواہش اور وصیت اپنے مستقر رائپور میں اپنے مرشد حضرت شاہ عبدالرحیم قدس سرہ کے برابر میں دفن ہونے کی تھی۔ لہٰذا حضرت کے تابوت کو اکھاڑ کر رائپور لے جانا چاہیے اور دوسری طرف یہ پھیلایا گیا کہ جس طرح حضرت کو دفن کیا گیا ہے، اس طرح دفن کرنے سے شرعاً تدفین ہی متحقق نہیں ہوئی۔ اور حضرتؒ کی میت ابھی تک غیر مدفون ہے۔ اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہ۔

جب یہ باتیں زیادہ پھیلیں تو حضرت کے حقیقی بھتیجے مولانا عبدالجلیل صاحب نے اس بارے میں علماء سے استفتاء کیا۔ اس کا پہلا مفصل جواب حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب لائلپوری نے لکھا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ تدفین شرعاً متحقق ہو گئی ہے۔ اور اب "نبش" (یعنی میت کو موجودہ قبر سے نکالنا) شرعاً ناجائز و حرام ہے۔ نیز لکھا کہ اگر بالفرض میّت کی وصیّت بھی ہو جب بھی اس کو پورا کرنے کے لیے منتقلی جائز نہیں۔

مولانا مفتی زین العابدین صاحب نے اپنے اس جواب میں کتب فقہ و فتاویٰ کی تصریحات کے علاوہ مطبوعہ "فتاویٰ دارالعلوم دیوبند" کے حوالہ سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا مندرجہ ذیل فتویٰ بھی درج کیا تھا۔

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید متوفی کا دوسرے موضع میں انتقال ہوا۔ وارث کے پہنچنے سے پہلے غسل دیا گیا۔ وارث نے ظاہر کر دیا کہ میں میت کو اپنے شہر لے جاؤں گا۔ اس موضع میں ہم راضی نہیں۔ باشندگان موضع مذکور نے بغیر کندنی قبر کے ہموار زمین پر صندوقچہ میں میت کو رکھ کر جبراً بلا رضا وارث کے قبر کے اردگرد اینٹیں لگا دیں۔ اور نمونہ قبر کا بنا دیا۔ اب دعویٰ فریقین عدالت میں ہے۔ عدالت سے حکم ملا کہ فیصلہ شریعت پر کیا جائے۔

الجواب:- شریعت کے موافق اس میّت کو اب دوسری جگہ منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ اور یہ

طریقہ دفن کا اگرچہ خلاف سنت ہے کہ بغیر قبر کھودنے کے میت کو صندوق میں رکھ کر قبر بنائی جائے لیکن جب کہ قبر بنادی گئی تو اب اس کو نہ کھولا جائے اور میت کو اس میں سے نہ نکالا جائے۔

(آگے حوالہ جات ہیں اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے دستخط ہیں۔)

پھر مولانا مفتی زین العابدین صاحب کا لکھا ہوا یہ فتویٰ پاکستان کے اکابر علماء و اہل فتویٰ کی خدمت میں تصدیق کے لیے بھیجا گیا۔ اُن سب حضرات نے اس کی تصدیق و توثیق کی اور بہت سے حضرات نے صراحت فرمائی کہ تدفین سنت کے خلاف ہوئی اور اگر اعذار صحیحہ کے بغیر ہوئی تو مکروہ ہوئی مگر تدفین متحقق ہو گئی۔ اور اب نبش قطعاً جائز نہیں۔

ان مؤیدین و مصدقین میں سے یہ چند حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری۔ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ۔

ان کے علاوہ بھی پاکستان کے بہت سے علماء و اہل فتویٰ نے تصدیق و توثیق فرمائی۔ لیکن مذکورہ بالا حضرات کے بعد ان کے اسماء گرامی کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پاکستان میں یہی حضرات خاص کر جماعت دیوبند میں فتویٰ اور علوم دین میں مرجع ہیں۔

پھر یہ فتویٰ تصدیق و توثیق کے لیے دیوبند و سہارنپور بھی بھیجا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے اُس وقت کے صدر مفتی حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب اور اُن کے نائبین نے بھی اس کی تصدیق و توثیق فرمائی اور دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں سے موجودہ صدر المدرسین اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب اور نائب صدر المدرسین جناب مولانا سید فخر الحسن صاحب نے بھی تصدیق و توثیق فرمائی۔ پھر اس کے بعد یہ فتویٰ مظاہر علوم سہارنپور کے حضرات مفتیین اور اکابر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان حضرات نے بھی تصدیق و توثیق فرمائی جن میں وہاں کے مفتی مولانا مظفر حسن صاحب اور حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ فتویٰ حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے وصال کے چند ہی مہینے کے بعد اواخر

لہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند حصہ اول و دوم ص ۳۳۶ مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند۔ مبوب مرتبہ مولانا محمد ظفیر صاحب۔

۸۲ھ میں) لکھا گیا تھا۔ اور اسی زمانہ میں مذکورہ بالا تمام تصدیقات و توثیقات کے ساتھ لاہور سے چھپ کر شائع بھی ہو گیا تھا، خیال تھا کہ اب یہ قضیہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ اس فتویٰ کی اشاعت کے بعد بھی قصہ ختم نہیں ہوا۔ اور اُسی زمانہ میں سُننے میں آیا کہ بعض حضرات نے یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ "تدفین متحقق نہیں ہوئی"۔ اُسی زمانہ میں اس طرح کا ایک فتویٰ پاکستان ہی کا چھپا ہوا نظر سے گزرا تھا۔ لیکن ہند و پاک کے قریب قریب تمام ہی اکابر علماء و اہلِ فتویٰ سے نیاز مندانہ تعلق و واقفیت کے باوجود اُس میں ایک بھی ایسا نام اس ناچیز راقم سطور کو نظر نہیں آیا جو اس حیثیت سے جانا پہچانا ہو ـــ بہر حال یہ دوسری رائے بھی اس ناچیز کے علم میں اسی زمانہ میں آئی تھی[1]۔

پھر یہ بھی وقتاً فوقتاً علم میں آیا کہ جو حضرات حضرتؒ کے تابوت کی رائپور منتقلی کے خواہشمند اور اس کے لیے ساعی ہیں، وہ حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کے دروازے بھی اپنے خاص تعلقات کے ذریعہ اس سلسلہ میں کھٹکھٹا رہے ہیں ـــ واقعہ یہ ہے کہ یہ معلوم کر کے بڑی سخت روحانی اذیت ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ اُن حضرات نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ اگر برسوں کے بعد مُردوں کو اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے کے معاملہ میں حکومتوں کو مداخلت کا موقع دے دیا گیا تو اس سے کیسے کیسے فتنے برپا ہو سکیں گے اور بات کہاں تک پہنچے گی؟ ـــ یہ بات اب سے ۵۔۶ سال پہلے کی ہے پھر اس کے بعد سے اب تک اس سلسلہ میں کوئی بات علم میں نہیں آئی۔ تو یہ سمجھ کر دل مطمئن ہو گیا تھا کہ ہمارے خاص حلقہ کا یہ ناخوشگوار تکلیف دہ اور رسواکن قضیہ ختم ہو گیا۔

لیکن اب سے ۳۔۴ مہینے پہلے شوال کے مہینے میں یہ معلوم کر کے انتہائی دکھ ہوا کہ پھر اسی قضیہ کو نئے سرے سے اور پورے زور و شور سے اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند سے بھی کوئی بیان لکھوایا گیا ہے۔ گزشتہ ذیقعدہ میں میرا دیوبند جانا ہوا تو اس کی تصدیق ہو گئی اور مجھے مہتمم صاحب

---

[1] حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے جس بیان کا آگے ذکر آ رہا ہے، اس کی بنیاد یہی فتاویٰ ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو اِن کے بارے میں علمی بحث آئندہ کسی اشاعت میں کی جا سکے گی۔

کے اس بیان کی کاپی بھی دیکھنے کو مل گئی ــــــ واقعہ یہ ہے کہ اُسے پڑھ کر انتہائی رنج و افسوس ہوا اور اندازہ ہوا کہ موصوف اس معاملہ سے (جس کا اب سے ۸-۹ سال پہلے اکابر جماعت دیوبند اور دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے ہند و پاک کے ہمارے پورے حلقہ میں اچھا خاصا چرچا رہا تھا) حیرت انگیز حد تک ناواقف ہیں ــــــ موصوف اس وقت خود دیوبند تشریف فرما نہیں تھے اس لیے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ میں نے وہاں سے واپس آ کر حضرت اقدس سرہٗ کے حقیقی بھتیجے اور مجاز جناب مولانا عبدالجلیل صاحب کی خدمت میں لکھا کہ حضرت اقدس کی تدفین کی پوری تفصیل اور قبر مبارک کی موجودہ صورت مجھے لکھ کر بھیجدیں، اور اس سلسلہ میں جو فتاویٰ اسی زمانہ میں لکھے گئے تھے اگر مہیّا ہو سکیں تو وہ بھی روانہ فرما دیں ــــــ انھوں نے تدفین کی پوری تفصیل بھی لکھ کر بھیجدی اور قبر مبارک کی موجودہ شکل بھی اور وہ فتاویٰ بھی مہیا کر کے بھیج دیئے۔ اس عاجز نے شروع کی سطروں میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی مفصل خط ہی سے ماخوذ ہے۔

میں نے اُن سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ خاندان اور بستی کے دوسرے ذمہ دار حضرات جو تدفین میں شریک تھے۔ اگر آپ ان کی بھی تصدیق اپنی تحریر پر کرا دیں تو دوسرے بہت سے لوگوں کے لیے زیادہ قابل اطمینان ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انھوں نے میرے لکھنے پر یہ زحمت بھی گوارا فرمائی۔ اور تدفین کی جو تفصیل لکھی اُس پر خاندان اور بستی کے بلکہ قرب و جوار کے بھی بہت سے ذمہ دار حضرات کی تصدیق کرا کے بھیج دی جو دفن میں خود شریک تھے۔

ان سب چیزوں کے مل جانے کے بعد حضرت مولانا محمد طیّب صاحب کو میں نے ایک بہت مفصّل خط لکھا، ابھی اس کے جواب کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ مولانا کا وہ بیان "الجمعیۃ" کے ہفتہ وار ایڈیشن میں شائع ہو گیا ہے ــــــ اس بیان کے حوالہ سے میرے پاس بہت سے خطوط بھی آئے جن سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس بیان کی وجہ سے جماعتِ دیوبند میں سخت ذہنی خلفشار برپا ہو گیا ہے۔ بلکہ دراصل مجھے ان خطوط ہی سے "الجمعیۃ" میں اس بیان کی اشاعت کا پتہ چلا۔ اس لیے بہت سوچ سمجھ کر "الفرقان" میں یہ سطریں لکھ دینا اپنا فرض سمجھا۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے اس فتنہ کو فرو فرمائے۔ اور ہم سب کو اپنی غلطیوں پر مطلع ہونے اور اُن کا تدارک کرنے کی توفیق دے۔

میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے بیان کی صرف یہی توجیہ کر سکتا تھا اور یہی توجیہ کرتا کہ موصوف اس نامبارک قضیہ سے اور اس سلسلہ کے واقعات سے بالکل ناواقف ہیں اور انھیں اپنی جماعت کے اکابر علماء اور مشاہیر اہل فتویٰ کے اُن فتاویٰ کی بالکل خبر نہیں ہے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اور جواب سے ۸ سال پہلے چھپ کر شائع ہو چکے تھے (اور یہ بات عقلاً بہر حال ممکن ہے) لیکن حضرت اقدس قدس سرہ کے حقیقی بھانجے جناب مولانا عبدالوحید صاحب نے میرے خط کے ذریعہ معلوم ہونے پر کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے اس طرح کا کوئی بیان لکھا ہے' اپنی انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے مجھے لکھا کہ "خود حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے اواخر ۱۳۸۲ھ میں جب کہ وہ پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے لاہور میں فلاں فلاں دوسرے علماء کرام کی موجودگی میں اس مطبوعہ فتوے کی (جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے) تصدیق فرمائی تھی' اور اپنے دستخط ثبت فرمائے تھے۔ اور وہ دستخطی تصدیق میرے پاس محفوظ ہے۔" اس لیے اس عاجز راقم سطور کا اندازہ اب یہ ہے کہ حضرت مہتمم صاحب اس کو بالکل بھول گئے ہیں (اور بے تکلف عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت مہتمم صاحب کے بارے میں اس طرح کی بھول کا راقم سطور کو یہ پہلا تجربہ نہیں ہے)

دوسری بات اس بیان کے سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ انھوں نے رائے پور میں تدفین کے بارے میں حضرت اقدس کی تمنا یا وصیت کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن خدام کو حضرت اقدس قدس سرہ کی خدمت میں حاضری کی توفیق ہوتی تھی۔ وہ سب جانتے ہیں کہ حضرت کی یہ بڑی محبوب خواہش اور تمنا تھی لیکن یہ کہنا کہ حضرت یہ چاہتے تھے یا کبھی حضرت نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ دنیا میں کہیں بھی میرا وصال ہو مجھے رائے پور لے جا کر ہی دفن کیا جائے اگر دانستہ غلط بیانی نہیں ہے تو افسوسناک غلط فہمی ہے' حضرت کے خدام میں وہ لوگ زندہ ہیں جن کے سامنے شدید علالت کے زمانہ میں جب حضرت کا قیام "بہٹ" میں تھا تو فرمایا تھا کہ اگر میرا انتقال یہاں ہو جائے تو مجھے یہیں شاہ زاہد حسن[1] صاحب کے برابر ہی دفن کر دیا

---

[1] شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم حضرت اقدس کے عاشق اور نہایت محبوب پیر بھائی تھے۔ حضرت اقدس اُن کا بہت تذکرہ فرمایا کرتے تھے اور اُن کو اہل اللہ میں سے سمجھتے تھے۔

جائے۔ اسی طرح سہارنپور کے زمانۂ قیام و علاج میں فرمایا کہ اگر یہاں سہارنپور میں وقت موعود آجائے تو حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب (حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کے والد ماجدؒ) کے برابر میں مجھے دفن کر دیا جائے ــــ کبھی کبھی یہ بھی فرمایا کہ اگر ریل کے سفر کے دوران انتقال ہو جائے تو اگلے اسٹیشن پر اتار کر دفن کر دیا جائے۔

حضرت مہتمم صاحب کے بیان میں کچھ خوابوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، یہ بھی مہتمم صاحب کا اپنا علم نہیں ہے بلکہ اُن کو بتلایا گیا ہے۔ لیکن ممدوح کے علم میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وہ مکتوب تو ضرور ہوگا جس میں تفصیل سے فرمایا گیا ہے کہ خواب میں تسویلات شیطانی کا کس حد تک اثر ہو سکتا ہے۔ اور اس میں امتیاز کتنا مشکل ہے۔ نیز یہ بات بھی ضرور اُن کے علم میں ہوگی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو مہدی موعود یا نبی ماننے والوں میں کتنے وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے خوابوں ہی پر اعتماد کر کے اس انتہائی گمراہی کو قبول کیا تھا ــــ یہ مسلّم ہے کہ خوابوں کے بارے میں معیار صرف شریعت ہے۔ اور شریعت کا حکم وہ ہے جو ماہرین شریعت اور اکابر علماء و اہل فتویٰ نے بیان فرمایا ہے۔

حضرت مہتمم صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ حضرت اقدس قدس سرہ اپنے آخری مرض شدید میں پاکستان جانا نہیں چاہتے تھے لیکن پاکستانی متوسلین کے اصرار شدید پر بادل ناخواستہ تشریف لے جانے پر مجبور ہوئے۔

یقیناً یہ بات بھی حضرت مہتمم صاحب نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر نہیں لکھی ہے اُن سے کسی صاحب نے بیان کیا ہوگا۔ لیکن یہ بھی بڑی افسوسناک غلط بیانی ہے ــــ ناچیز راقم سطور اور مولانا علی میاں کا قیام اُن دنوں حضرت اقدس کی خدمت میں رائے پور ہی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ سبب جو کچھ بھی ہو خود حضرت کی طبیعت پر پاکستان تشریف لے جانے کا سخت تقاضا تھا۔ ہم سب خدام اور ہم سب کے اوپر حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ چاہتے تھے کہ اس انتہائی ضعف و علالت کی حالت میں حضرت سفر نہ فرمائیں۔ اور سب جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت سب سے زیادہ حضرت شیخ الحدیث کی بات مانتے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث نے اس ناچیز کے سامنے عرض کیا کہ حضرت! ہم لوگوں کی رائے یہ نہیں ہے کہ اس حالت میں سفر فرمایا جائے

اللہ تعالیٰ صحت و توانائی عطا فرمادے تو ضرور تشریف لے جائیں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "حضرت! اس وقت تو طبیعت پر جانے ہی کا تقاضا ہے۔ ہاں واپسی کی نیت ہے"۔ (مجھے اطمینان ہے کہ حضرت کے الفاظ بھی قریب قریب یہی تھے۔)

حضرت مہتمم صاحب کا بیان پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ حضرت کے اہلِ خاندان سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ اس لیے کچھ لوگوں کے کہنے سننے سے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ لوگ بالکل جاہل دیہاتی قسم کے ہیں اور ایسے ضدی اور ناخدا ترس ہیں کہ اپنی اس جہالت اور ضد سے حضرت اقدس کے جنازہ کو بغیر شرعی تدفین کے ۹ سال سے "محبوس و مقید" کر رکھا ہے اور مسلسل اس معصیت میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ حضرت کے اہل خاندان سے کچھ بھی واقف ہوتے تو اُن کے بیان کا انداز ہرگز یہ نہ ہوتا جس کو پڑھ کر ہر ایک یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ لوگ بڑے ہی جاہل، ناخدا ترس اور ضدّی ہیں۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت کے حقیقی بھائی حضرت حافظ محمد خلیل صاحب مدظلہ حضرتؒ کے خواص مجازین اور اہل اللہ میں سے ہیں۔ اور حضرت کے حقیقی بھتیجے مولانا عبد الجلیل اور حقیقی بھانجے مولانا عبد الوحید صاحب دونوں عالم دین اور حضرت اقدسؒ کے خاص متعلقین میں سے ہیں۔ مظاہر علوم سے فراغت کے بعد حضرتؒ کی وفات تک کی طویل مدت میں حضرت ہی کی خدمت میں رہ کر ذکر شغل کرتے رہے اور اور جہاں تک خیال ہے اجازت سے بھی مشرف ہوئے۔ ہم نے جب سے اُن کو حضرت کے یہاں دیکھا اللہ کے صالح بندوں میں سے اور حضرت کے متعلقین میں سے جانا۔ وَاللہُ اَعْلَمُ بِاَحْوَالِ عِبَادِہٖ۔

آخر میں اپنے اس احساس و تاثر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حضرت اقدس کی تدفین جس طرح ہوئی کاش اس طرح نہ ہوئی ہوتی اور زیر زمین ہی شق کی شکل بنا کر دفن کیا گیا ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ غلطی اگر ہوئی تو نادانستہ ہی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی غلطیاں اور کوتاہیاں معاف فرمائے اور اتباع سنت و شریعت کی توفیق دے۔

[یہ صفحات کتابت اور تصحیح کے بعد طباعت کے لیے پریس جا رہے تھے کہ اس مسئلہ پر (حضرت رائے پوری قدس سرہ کی تدفین) سے متعلق حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کا ایک دوسرا مختصر بیان موصول ہوگیا۔ یہاں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے صفحہ ۵۶ پر درج کیا جا رہا ہے]

بقیہ نگاہ اولیں

بڑا اعلان سُننے کو ملا. معلوم ہوا کہ یحییٰ خاں کچھ نہیں کرسکے۔ وہ فوج کے سپرد مشرقی پاکستان کو کر گئے ہیں کہ طاقت کے بل پر اس کا رُخ سیدھا کرے۔

بالکل ہو سکتا ہے کہ فوج وقتی طور پر عوامی لیگ کی تحریک کو مغلوب کرلے۔ لیکن اس فوجی کارروائی کے بعد مستقبل کے لحاظ سے اس کی اُمید ہی ختم ہوگئی ہے کہ یہ خطہ پاکستان کا ایک جزو بنا رہ سکے۔ پاکستان کے عام انتخابات (مرکزی اور صوبائی دونوں) یہ ثابت کر چکے ہیں کہ عوامی لیگ وہاں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، کم سے کم ۷۵ فی صدی عوام اس کی پشت پر ہیں۔ اور باقی ۲۵ فی صدی کی حمایت کسی ایک میں نہیں دسیوں جماعتوں میں منتشر ہے۔ ایسی حالت میں سات کروڑ آبادی والے اس وسیع وعریض خطے کو دبا کر رکھنے کے لیے مستقل طور سے جتنی بڑی فوجی طاقت وہاں مسلط رہنا چاہیے کیا اس کا صرفہ برداشت کرنا مغربی پاکستان کے بس کی بات ہے؟ اور اگر بس کی بات بھی ہو تو اس شکل میں یہ خطہ واقعۃً پاکستان کا جزو ہوگا یا ایک غلام ملک؟

انتخابات کے بعد صرف ایک ہی امکانی راستہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کا اتحاد برقرار رہنے کا تھا اور وہ وہ تھا جو صدر یحییٰ خاں نے شروع میں اختیار کیا تھا بلکہ وعدے کے مطابق پوری ایمان داری اور جمہوری اصولوں کی پاسداری کے ساتھ انتخابات کرا کے ایک حد تک اُسے ہموار بھی کر دیا تھا، کہ عوامی لیگ کو جس منشور پر الکشن لڑنے کی اجازت دی گئی تھی اُس کے مطابق اسے دستور سازی کی بھی پوری آزادی دی جاتی اور اس طرح مشرقی پاکستان کے لوگوں اور اُن کے لیڈروں کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا جاتا کہ پچھلے دَور کا ورق اُلٹ چکا ہے اب انھیں اپنے تحفظ کے لیے علیحدگی پسندی کے انداز پر سوچنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اب مرکز خود ہی ان کے اقتدار میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی آبادی کی اکثریت کی بنا پر مرکز میں اُن کی اکثریت کا اصول مان لیے جانے کے بعد وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی تھی جس نے چھ نکاتی پروگرام کا خیال ان لوگوں کے ذہن میں ڈالا تھا۔ بس ضرورت اس کی تھی کہ وہ عملاً بھی اس بات کو آزما لیں کہ مغربی پاکستان کے لوگ ان کے اکثریتی حقوق کا احترام کرتے ہیں یا نہیں۔ اس آزمائش کے بعد اگر انھیں اطمینان ہو جاتا تو پھر دوسرے لوگ تو چاہے کمزور مرکز کی خواہش کرنے لگتے مگر انھیں اس کی ضرورت نہ رہتی۔ اور شاید یہی وہ اندیشہ تھا جس نے مسٹر بھٹو جیسے اقتدار پسند لوگوں کو بیچین کیا کہ وہ اقتدار میں اپنا

حق پہلے ہی سے متعین کرالیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوج کے طاقتور عناصر کو بھی مسٹر بھٹو اس تشویش میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور انھیں کے دباؤ سے یحییٰ خاں ایک دم اپنے راستے سے ہٹے۔

افسوس ایسے ہی مفاد پرست لوگوں نے مشرقی پاکستان کی حق تلفیاں کر کے انھیں طرح طرح کی شکایات سے اب تک بھرا تھا۔ اور اب جب اس معاملے کے کچھ سدھرنے کا وقت آیا تو پھر ان کی مفاد پرستی اور اقتدار پسندی ہی وہ چیز ثابت ہوئی جس نے بیڑا ہی غرق کر دیا۔

ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی اس باہمی خوں ریزی کو روکے اور اس شر سے کوئی بڑا خیر پیدا فرما دے، جو اس کی قدرت سے ذرا بھی باہر نہیں۔

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم نمبر ۴ دیکھئے قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت ... ... لکھنؤ

وقفہ اشاعت ... ... ماہانہ

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر کا نام ... ... محمد منظور نعمانی

قومیت ... ... ہندوستانی

پتہ ... ... کچہری روڈ، لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔

(دستخط) محمد منظور نعمانی

۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء

رمضان و عید وغیرہ کے بارے میں ایک اہم سوال

ـــــــــــ از محمد منظور نعمانی

گرامی منزلت حضرات علماءِ شریعت کی خدمت میں ـــــــ تحقیق کے لیے!

جس طرح یہ ایک معلوم و مسلّم بات ہے کہ دو بعید المسافت مقاموں کے طلوع و غروب اور زوال وغیرہ کے اوقات میں (اور اس کی وجہ سے نمازوں اور افطارِ صوم وغیرہ کے اوقات میں بھی) بُعدِ مسافت کے حساب سے فرق ہوتا ہے، مثلاً ہندوستان و پاکستان کے بہت سے علاقوں اور حجاز مقدس کے اوقات میں کم و بیش تین گھنٹے کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک معلوم و مسلّم حقیقت ہے کہ جن دو ملکوں کے درمیان بُعدِ مسافت زیادہ ہو (مثلاً جتنا کہ حجاز مقدس اور ہندوستان کے درمیان ہے یا اس سے بھی زیادہ) تو ان دونوں ملکوں میں کبھی کبھی رویت ہلال میں ایک دن یا اس سے بھی زیادہ فرق ہو جاتا ہے، چنانچہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ حجاز مقدس میں اور ان ممالک میں جو حجاز سے اور زیادہ مغرب میں ہیں ہلال کی رویت ہندوستان و پاکستان سے ایک دو دن پہلے ہو جاتی ہے، اور اب سفر و خبر رسانی کے تیز رفتار وسائل کی وجہ سے اس کی اطلاع ایسے طریقوں اور ذریعوں سے جو شرعاً معتبر ہیں قریب ترین وقت میں پہونچ جاتی ہے۔ (پہلے یہ بات نہیں تھی)

اس تازہ صورت حال کے نتیجہ میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہندوستان یا پاکستان میں یہاں کی رویت کے لحاظ سے ۲۸ یا ۲۹ تاریخ ہوتی ہے اور قابلِ اعتماد ذرائع سے یہاں معلوم ہو جاتا ہے کہ حجاز مقدس یا مصر یا ترکی میں گزشتہ رات ہلال رمضان دیکھ لیا گیا اور آج وہاں رمضان مبارک کی پہلی تاریخ یا پہلا روزہ ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی

رویت کے حساب سے رمضان کی ۲۸ ویں یا ۲۹ ویں تاریخ ہوتی ہے اور ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حجاز مقدس یا مصر یا ترکی میں گزشتہ رات ہلال شوال کی رویت ہوگئی اور وہاں آج عید الفطر ہے ــــ الغرض مختلف ممالک میں مسافت کے بُعد کے لحاظ سے رمضان اور عید الفطر اور اسی طرح عید الاضحیٰ میں ایک یا دو دن کا فرق جو ہمیشہ سے ہوتا تھا لیکن عام طور سے اُس کا علم نہیں ہوتا تھا اب اس کا علم عوام کو بھی ہو جاتا ہے اور قریب ترین وقت میں ہو جاتا ہے۔

اخبارات وغیرہ سے آپ حضرات کو بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ متعدد ممالک اسلامیہ کے بہت سے علماء اور ذمہ دار حضرات کی یہ رائے اور تجویز ہے کہ عالم اسلامی میں رمضان و عید وغیرہ کا یہ فرق و اختلاف عملاً باقی نہ رہے بلکہ کسی بھی ایک جگہ کی رویت ہلال کی بنا پر پورے عالم اسلام میں رمضان کا آغاز اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ ایک ہی دن ہوا کرے ــــ ان کے نزدیک یہ وحدتِ اُمت کا بھی تقاضا ہے اور ان کی اس تجویز کا عنوان "توحید اھلّہ" ہے۔

"رابطہ عالم اسلامی" (مکہ مکرمہ) کے گزشتہ اجلاس (منعقدہ شعبان ۸۹ھ) میں یہ مسئلہ بھی ایجنڈے میں تھا ــــ لیکن اجلاس کی جو کارروائی شائع ہوئی ہے اُس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ کی خاص نوعیت اور غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر پورے عالم اسلامی کے اکابر علماء اور اہل فتویٰ کی آراء حاصل کرنے کے لیے اس کو آئندہ اجلاس کے واسطے ملتوی کر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ "توحید اھلّہ" کی اس رائے اور تجویز کی شرعی و فقہی بنیاد یہ ہے کہ کتب فقہ اور شروح حدیث کے بیان کے مطابق بہت سے ائمہ مجتہدین کے نزدیک اختلاف مطالع معتبر نہیں ہے اور وہ مغرب کی رویت کو اہل مشرق کے لیے حجت مانتے ہیں، حنفیہ کا اصل مذہب جس کی بنیاد "ظاہر الروایۃ" پر ہے فقہ حنفی کی عام کتابوں میں یہی لکھا ہے۔ حنابلہ اور اکثر مالکیہ کا مذہب بھی یہی بتایا گیا ہے۔ اور امام نووی کے بیان کے مطابق بعض شوافع نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

ناچیز راقم سطور کی خصوصیت کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے حضرات علماء و اہل تحقیق سے گزارش ہے کہ وہ مسئلہ کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہوئے اُس کے اطراف و جوانب اور ماله و ما علیہ پر

غور فرماکر دلائل کے ساتھ اپنی آراء اور تحقیقات سے مطلع فرمائیں۔

اگر الفرقان میں اشاعت پسند فرمائیں تو اس عاجز کو تحریر فرمادیں انشاء اللہ شکریہ کے ساتھ شائع کی جائیں گی۔

اس عاجز کے نزدیک اس مسئلہ میں بنیادی طور پر صرف یہ امور غور طلب ہیں۔

(۱) اس مسئلہ میں براہ راست کتاب و سنت سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟

(۲) جن ائمہ نے اختلافِ مطالع کے اعتبار کا انکار کیا ہے اُن کا مقصد اس انکار سے کیا ہے؟ ـــــ اور اس مسئلہ میں اختلاف حقیقی ہے یا صرف لفظی اور تعبیری جیسا کہ بعض محققین نے رائے ظاہر کی ہے ـــــ اور اگر اختلاف و نزاع حقیقی ہے تو دلائل کے لحاظ سے کس مسلک کو ترجیح ہے؟ ـــــ

(۳) حنفیہ کے مشہور مذہب عدم اعتبار اختلاف کی بنا پر ہندوستان و پاکستان کے احناف کے لیے کیا اس کی گنجائش ہے کہ وہ "توحید اھلّہ" کی اس تجویز کو قبول کرلیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے ہاں کی رویت ہلال کے حساب سے نہیں بلکہ حجاز مقدس یا مصر یا ترکی یا مراکش کی رویت کی بنیاد پر رمضان کے روزے شروع کریں گے جبکہ ان کے ہاں کی رویت کے حساب سے شعبان کی اٹھائیسویں ۲۸ یا انتیسویں ۲۹ ہوگی۔ اسی طرح وہاں کی رویت ہلال کے حساب سے روزے ختم کرکے عید الفطر کریں گے جبکہ ان کی اپنی رویت کے حساب سے رمضان مبارک کی اٹھائیسویں ۲۸ یا انتیسویں ۲۹ ہوگی۔ اسی طرح وہاں کی دسویں ۱۰ ذی الحجہ کو عید الاضحیٰ منائیں گے اور قربانی کریں گے جبکہ اپنی مقامی رویت کے لحاظ سے آٹھویں ۸ یا نویں ۹ ذی الحجہ ہوگی ـــــ تو کیا اس کی گنجائش ہے؟

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کا دوسرا بیان

۸۶ ۔ حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین کے سلسلہ میں احقر نے بعض فتاویٰ کی روشنی میں جو اُس وقت سامنے تھے، ایک بیان شخصی طور پر تحریر کیا تھا جو شائع ہو گیا ہے، اجمالاً یہ علم تھا کہ اس بارہ میں فتاویٰ کے دو رُخ ہیں۔ لیکن دوسرے فتاویٰ علم میں نہ تھے۔ ابھی حال میں یہ فتاویٰ سامنے آئے، ہر دو نوع فتاویٰ میں اس پر اتفاق کے بعد کہ یہ تدفین غیر شرعی طریق پر عمل میں آئی ہے اختلاف اعادہٴ تدفین میں ہے اس لیے احقر ان تمام فتاویٰ کو سامنے رکھ کر مسئلہ پر از سر نو غور کر رہا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

محمد طیب ۔ مہتمم دار العلوم دیوبند
یکم صفر المظفر ۱۳۹۱ھ

سِیَر وسَوانح

سیرۃ النبی (چھ جلدوں میں مکمل) ۸۵/-
محسنِ انسانیت ۱۰/-
پیغمبرِ عالم ۶/۷۵
خطباتِ مدارس ۳/-
مقالاتِ سیرت ۵/-
اسوۂ حسنہ ۳/-
نبی عربی ۱/۵۰
ہمارے حضور ۱/۴۰
پہلی تقریرِ سیرت ۱/۷۵
دوسری تقریرِ سیرت ۲/۷۵
حیاۃ الصحابہ مکمل مجلد چرمی ۳۲/-
سیرتِ خلفاءِ راشدین ۲/۵۰
صدیقِ اکبر ۹/-
الفاروق ۶/-
سیرتِ عائشہ ۷/-
خلفاءِ راشدین ۷/۵۰
مہاجرین اول ۸/- .. دوم ۷/-
سیرِ انصار اول ۸/- دوم ۵/-
سیر الصحابہ .. اول ۶/- دوم ۶/۵۰
اسوۂ صحابہ .. اول ۶/- دوم ۸/-
سیر الصحابیات ۳/-
تابعین ۱۰/۵۰
اسوۂ صحابیات ۲/-

حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اور ان کی فقہ ۷/-
حکایاتِ صحابہ ۱/۵۰
شہیدِ کربلا ۱/۵
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۸/-
〃 عثمانؓ 〃 〃 ۴/-
اسلام مکمل (آغاز وارتقاء) ۶/-
تبع تابعین ۹/-
اہلِ کتاب صحابہ و تابعین ۳/-
تاریخ دعوت وعزیمت اول ۱۰/-
〃 〃 دوم ۸/۲۵
〃 〃 سوم ۶/-
سیرت النعمان ۳/۵۰
علماءِ ہند کا شاندار ماضی ۸/۵۰
حیاتِ شیخ عبد الحق دہلویؒ ۸/-
تذکرۃ الرشید ۱۰/-
سوانح قاسمی مکمل ۱۵/۵۰
امام رازی ۸/-
نقشِ حیات ۱۰/۵۰
حالات مشائخ کاندھلہ ۳/۵۰
تذکرہ شاہ فضل الرحمانؒ ۴/-
سیرت مولانا محمد علی مونگیری ۶/-
سوانح حضرت رائے پوری ۶/-
سوانح مولانا محمد یوسف ۱۰/-

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.
VOL 38 NO. 12
Regd. No. L-353

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سیرتِ نبویؐ پر منتخب کتابیں

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ کامل (۶ جلدیں)	۸۵/-
رحمۃ للعالمین (۳ جلدیں)	۲۵/-
رحمتِ عالم	۲/۷۵
پیغمبرِ عالم	۴/۷۵
محسنِ انسانیت	۱۰/-
ہمارے حضورؐ	۱/۸۰
خطبات مدراس	۳/-
مقالاتِ سیرت	۵/-
اسوۂ حسنہ	۲/-
نبی عربی (غیر مجلد) ۱/۵۰ (مجلد)	۱/۷۵
سیرت خاتم الانبیاء	۱/۲۵
شمائل ترمذی (اردو)	۶/-

اکابر و مشائخ کے سوانح اور تذکرے

کتاب	قیمت
تاریخ دعوت و عزیمت (اول تا سوم)	۲۴/۲۵
سیرۃ النعمان	۳/۵۰
علماءِ ہند کا شاندار ماضی	۸/۵۰
حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۸/-
سوانح قاسمی	۱۵/۵۰
نقشِ حیات (غیر مجلد کامل)	۸/۵۰
امام رازی	۸/-
حالات مشائخ کاندھلہ	۳/۵-
تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن	۲/-
سیرت مولانا مونگیری	۴/-
سوانح مولانا یوسفؒ	۱۰/-
سوانح حضرت رائے پوریؒ	۴/-

سیرت خلفاء راشدین و اکابر صحابہ

کتاب	قیمت
حیاۃ الصحابہ۔ اول تا سوم مجلد عکسی	۱۰/-
〃 〃 چہارم تا ہفتم 〃	۱۲/-
〃 〃 ہشتم تا دہم 〃	۱۲/-
سیرت خلفاء راشدین (از مولانا عبدالشکور لکھنوی)	۲/۵۰
صدیق اکبر	۹/-
الفاروق	۶/-
خلفاء راشدین	۷/۵۰
مہاجرین	۴/-
سیر الانصار اول ۸/- دوم	۵/-
سیر الصحابہ اول ۶/- دوم	۶/۵۰
سیر الصحابیات	۳/-
اسوۂ صحابہ اول ۴/- دوم	۸/-
تابعین ۱۰/۵ تبع تابعین	۶/-
(۲) کتاب صحابہ و تابعین ۲/۳ اسوۂ صحابیات	۲/-

تاریخ اسلام پر بہترین کتابیں

کتاب	قیمت
تاریخ اسلام کامل	۲۳/-
تاریخ صقلیہ	۹/-
تاریخ ملت کامل ۷ جلدیں	۳۷/-
تاریخ دولتِ عثمانیہ اول ۱۰/- دوم	۹/-
تاریخ فقہ اسلامی	۱۰/-
تاریخ اندلس	۸/۵۰
اسلام اور عربی تمدن	۸/۵۰
ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں	۴/-
ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک	۱۰/۲۵
سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات (مجلد)	۸/-
تاریخ پردہ ۴/- تاریخ گجرات	۹/-
سرکشی ضلع بجنور	۶/-
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء	۸/-
اشاعتِ اسلام	۶/-

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد (۳۹) بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۹۱ھ مطابق اپریل ۱۹۷۱ء شمارہ (۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارہ اصلاح تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر اس کی اطلاع ہمیں بھی دیں۔ جن حضرات نے ہمارے خط کے جواب میں اطلاع دی ہے کہ ان کو رسالہ برابر پہونچ رہا ہے ان کے علاوہ باقی تمام حضرات کا رسالہ فی الحال بند رہے گا۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط وکتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھدیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا جاتا ہے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپواکر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے قیام نے دُنیا کو یہ ماننے پر مجبور کیا تھا کہ اسلام بیسویں صدی کے وسط میں بھی وہ زندہ اور فعال مذہبی طاقت ہے جو مشرق و مغرب کے دو خطوں کو اُن کے ایک ہزار میل کے درمیانی فاصلے اور رنگ و نسل، زبان و کلچر، ذوق و مزاج اور تاریخ و روایات کے بیحد اختلافات کے باوجود ایک مملکت اور ایک اسٹیٹ کے رشتے میں پرو سکتی ہے۔

بیسویں صدی کا یہ ماحول جس میں عالمِ اسلامی کی وحدت پارہ پارہ ہو رہی تھی، خلافت دفنائی جا چکی تھی، عرب کی سرزمینِ اسلام اس رشتۂ وحدت سے نکل کر ذرا ذرا سے ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی، برصغیر کے یہ مسلمان دیکھ چکے تھے کہ انتشار اور علاقائیت کی اس رَو کے آگے وحدتِ اسلامی کی بقاء کے لیے ان کی کوششیں کس بری طرح ناکام ہوئیں، کس طرح ان کی آرزوئیں مٹی گئیں، اتنا ہی نہیں، ہجرت کی تحریک کا وہ تلخ تجربہ بھی اُن کے ذائقہ میں پیوست تھا کہ اس کے بعد اسلامی اُخوّت کو ایک واقعی حقیقت مانتے ہوئے کوئی قدم اُٹھانے سے اگر وہ کان پکڑ لیتے تو بجا ہوتا۔ وہ بن بلائے نہیں بلائے ہوئے مہاجر بن کر افغانستان گئے مگر اس بے رُخی اور بے مہری کا شکار ہوئے جس کا تجربہ بن بلائے مہمانوں کو بھی کسی اسلامی ملک میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

ان تجربوں کے ماحول میں مشرقی اور مغربی سروں پر واقع دو ایسے خطّوں کا، جن میں بجز اسلام کے کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی، یہ طے کرنا کہ وہ بس اسلامی وحدت ہی کی بنیاد پر ایک سیاسی وحدت بن کر رہیں گے کسی لیڈر کی سیاسی بازی گری کا کمال نہیں، حقیقت میں اسلام کا معجزہ اور گئے گزرے عالم میں بھی اس کی توانائی کا ثبوت تھا۔

لیکن آہ بے توفیقی! کہ پاکستان کی قیادت نے اسلام کے اس اعجاز کی، جس کا احسان اُسے کبھی نہ بھولنا چاہیے تھا، کچھ قدر نہ جانی۔ اور وہی پاکستان جس کا وجود میں آنا اس بات کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ٹھیرا تھا کہ اسلام اب بھی قوموں اور ریاستوں کی بنیاد بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، اپنی عمر کے چوبیسویں سال تک پہونچتے پہونچتے اس کے بالکل برعکس اس بات کا ثبوت دُنیا کی نگاہ میں بن گیا کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی اب یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ مختلف خطّوں اور علاقوں کے اپنے حلقہ بگوشوں کو ایک سیاسی وحدت اور ایک قومیت کے رشتے میں پرو کر رکھ سکے۔ مغربی پاکستان کے خلاف مشرقی پاکستان کی بےچینی عرصے سے اس دعوے کے لیے زمین ہموار کر رہی تھی۔ اب اس بے چینی نے مکمل جنگی صف آرائی کا روپ دھار کر بھرپور موقع لوگوں کو دے دیا ہے کہ وہ ایک ثابت شدہ دعوے کے طور پر اپنی بات کہیں۔ اور اس اعتماد کو درہم برہم کر دیں جو آج بھی اہلِ ایمان کے دلوں میں اسلام کی ان تمام صلاحیتوں کے بارے میں پایا جاتا ہے جن کا ثبوت اُس نے اپنے دورِ اوّل میں دیا تھا۔

پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس میں یقیناً اس بات کا شمّہ برابر بھی ثبوت نہیں ہے کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں کو متحد رکھنے میں اسلام کامیاب نہیں رہ سکا۔ تمام دُنیا جانتی ہے کہ پاکستان کے نظامِ حکومت اور عام زندگی کی باگ ڈور اسلام کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اُسے صرف پاکستان کو وجود میں لانے کے لیے استعمال کیا گیا اور اس نے ان دو مختلف اور دور دراز علاقوں کو زمانے کی رَو کے علی الرغم ایک ملک اور ایک اسٹیٹ بنا کر دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد اس وحدت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بھی اسلام ہی کو بنائے رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ نہ ایک دن اُسے نظامِ حکومت کی رہنمائی کا منصب ملا، نہ عام زندگی میں اُسے اُتار دینے کی کوئی بامعنی کوشش پاکستانی قیادت کی طرف سے ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں پاکستان کا نظامِ حکومت بھی اسلام سے دور تر ہوتا گیا اور عام زندگی میں بھی اسلام سے فاصلے کی نسبت بڑھتی ہی گئی۔ حتیٰ کہ جب وہاں پہلی مرتبہ عام انتخابات کے ذریعہ ملک کے نظامِ حکومت اور مقاصدِ حکومت کے بارے میں پبلک کو اپنا رجحان ظاہر کرنے کا موقع ملا۔ تو یہ تصویر دُنیا کے سامنے آئی کہ مکمل اسلامی نظامِ حکومت اور مقاصدِ حکومت کے علمبردار رد کر دیے گئے ہیں اور اُن لوگوں کو حکمرانی کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے جو حکومت کے اسلامی نظام اور اسلامی مقاصد

کے علمبردار نہیں تھے! اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اتحاد میں جو رخنہ پڑا وہ اسلام کی ناکامی ہے؟ بلکہ اس کے برعکس کہے جانے کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے ان دونوں بازوؤں کی وحدت اس وقت تک بہرحال قائم رہی جب تک ان کے عوام نے نظامِ مملکت کے سلسلے میں اسلام سے بے اعتنائی کا کھلا اظہار نہیں کر دیا۔ لیکن جیسے ہی یہ اظہار ہوا کہ پاکستانی عوام کی اکثریت کو اسلام اور اس کے مقاصد سے زیادہ اپنے اپنے شخصی، جماعتی اور علاقائی مفادات عزیز ہیں، ویسے ہی یہ دونوں بازو برسرِ پیکار ہو گئے۔

بہرحال یہ بات تو بالکل بے بنیاد ہے کہ پاکستان کی خانہ جنگی سے اسلام کے متعلق یہ نظریہ غلط ثابت ہو گیا کہ وہ مختلف رنگ و نسل اور مختلف زبان و تہذیب، مختلف تاریخ اور روایات کے حامل انسانوں کو ایک سیاسی وحدت کے سانچے میں بھی ڈھال سکتا ہے۔ لیکن پاکستان کے ان واقعات سے پاکستان کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی بہرحال نقصان پہونچا ہے اور شدید نقصان پہونچا ہے۔ اور اسلام کے اس نقصان کی تلافی کر کے ہی اب پاکستان کے نقصان کی بھی تلافی کی جا سکتی ہے۔ ورنہ یہ نقصان کسی طرح بھی اب پورا نہیں ہو سکتا۔ اسلام جب ایک بار پاکستان کی بنیاد بن گیا۔ چاہے بنانے والوں نے خلوصِ نیت سے اسے بنیاد بنایا ہو یا سیاسی ضرورت کے طور پر ـــــ تو اس بنیاد کو مستحکم رکھے بغیر پاکستان کو مستحکم نہیں رکھا جا سکتا؛ اسے ٹوٹ پھوٹ سے نہیں بچایا جا سکتا!۔

الفرقان کی اشاعت کئی ماہ سے ایک مہینہ پیچھے چل رہی ہے۔ جس کا شدت سے احساس ہے۔ اور ہر مہینے یہ خواہش ہوتی ہے کہ پندرہ پندرہ دن کے وقفے سے دو شمارے نکال کر یا دوگنی ضخامت کا ایک مشترک شمارہ نکال کر یہ صورتِ حال ختم کر دی جائے۔ مگر مرتب کی خرابیٔ صحت کے اثرات نے کوئی شکل اب تک نہیں بننے دی کہ یہ فرض ادا ہو سکے۔ لیکن اس کا احساس اور اندرونی تقاضہ بدستور ہے انشاء اللہ جس وقت بھی ممکن ہوا مذکورہ بالا دو صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کر کے ہر ماہ کی بروقت اشاعت کا سلسلہ بحال کر دیا جائے گا۔

کتابُ المُعاشرۃ والمُعاملات

معارفُ الحدیث

(مُسلسل)

کھانے پینے کے احکام و آداب

کھانے پینے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جن میں ماکولات و مشروبات یعنی کھانے پینے کی چیزوں کی حلت یا حرمت بیان فرمائی گئی ہے ـــــــ دوسرے وہ جن میں خورد و نوش کے وہ آداب سکھائے گئے ہیں جن کا تعلق تہذیب و سلیقہ اور وقار سے ہے، یا اُن میں طبی مصلحت ملحوظ ہے، یا وہ اللہ کے ذکر و شکر کے قبیل سے ہیں اور اُن کے ذریعہ کھانے پینے کے عمل کو جو بظاہر خالص مادی عمل ہے اور نفس کے تقاضے سے ہوتا ہے، نورانی اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔

ماکولات و مشروبات کی حلت و حرمت کے بارے میں بنیادی بات وہ ہے جس کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ"[1] (یہ نبی اُمی اچھی اور پاکیزہ چیزوں (الطَّیِّبَات) کو اللہ کے بندوں کے لیے حلال بتلاتے ہیں، اور خراب اور گندی چیزوں (الخَبَائِث) کو حرام قرار دیتے ہیں۔

قرآن و حدیث میں کھانے پینے کی چیزوں کی حلت و حرمت کے جو احکام ہیں وہ در اصل اسی آیت کے اجمال کی تفصیل ہیں۔ جن چیزوں کو آپؐ نے اللہ کے حکم سے حرام قرار دیا ہے ان میں فی الحقیقت

---

[1] اعراف ع ۱۹۔

کسی نہ کسی پہلو سے ظاہری یا باطنی خباثت اور گندگی ضرور ہے، اسی طرح جن چیزوں کو آپ نے حلال قرار دیا ہے وہ بالعموم انسانی فطرت کے لیے مرغوب اور پاکیزہ ہیں۔ اور غذا کی حیثیت سے نفع بخش ہیں۔

قرآن مجید میں پینے والی چیزوں میں سے صراحت کے ساتھ شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے، حدیثوں میں اُس کے بارے میں مزید تفصیلی اور تاکیدی احکام ہیں، جیسا کہ اس سلسلہ کی آگے درج ہونے والی حدیثوں سے معلوم ہوگا ـــــ اور غذائی اشیاء میں سے ان چند چیزوں کی حرمت کا قرآن پاک میں واضح اعلان فرمایا گیا ہے ـــــ

مَیْتَۃ یعنی وہ جانور جو اپنی موت مر چکا ہو، خونؔ یعنی وہ لہو جو رگوں سے نکلا ہو۔ خنزیرؔ جو ایک ملعون اور خبیث جانور ہے، اور وہ جانور جو غیر اللہ کی نذر کیا گیا ہو (وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ) ـــــ یہ سب وہ چیزیں تھیں جن کو عرب کے کچھ طبقات کھاتے تھے، حالانکہ پہلی آسمانی شریعتوں میں بھی ان کو حرام قرار دیا گیا تھا، اسی لیے قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ اور بار بار ان کی حرمت کا اعلان کیا گیا۔

مَیْتَۃ یعنی مرے ہوئے جانور کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ انسان کی فطرت سلیمہ اس کو کھانے کے قابل نہیں سمجھتی بلکہ اُس سے گھن کرتی ہے۔ اور طبی حیثیت سے بھی وہ مضر ہے، کیونکہ جیسا کہ علماءِ طب نے کہا ہے حرارتِ غریزیہ کے گھُٹ جانے اور خون کے اندر ہی جذب ہو جانے سے اس میں سمیت کا اثر آ جاتا ہے۔

خونؔ یعنی لہو کا بھی یہی حال ہے کہ فطرت سلیمہ اس کو کھانے کی چیز نہیں سمجھتی اور شریعت میں اس کو قطعاً ناپاک، یعنی نجس العین قرار دیا گیا ہے۔

اور خنزیرؔ وہ ملعون مخلوق ہے کہ جب اللہ کے غضب و جلال نے بعض سخت مجرم اور بدکردار قوموں کو مسخ کرنے کا فیصلہ فرمایا تو اُن کو خنزیروں اور بندروں کی شکل میں مسخ کیا گیا (وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ) اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں جانور انتہائی خبیث و ملعون ہیں اور خدا کی لعنت و غضب کا مظہر ہیں، اس لیے ان کو قطعی حرام قرار دیا گیا۔ البتہ چونکہ بندر کو غالباً دنیا کی کوئی قوم نہیں کھاتی اور اس طرح گویا اس کی حرمت پر انسانوں کے تمام طبقات اور اقوام ملل کا اتفاق ہے، اسلئے قرآن مجید میں اس کی حرمت پر خاص زور نہیں دیا گیا، بخلاف خنزیر کے کہ بہت سی قوموں نے خاص کر

حضرت مسیح علیہ السلام کی اُمت نے اس کو اپنی مرغوب غذا بنا لیا ہے اس لیے قرآن پاک میں اس کی حرمت کا بار بار اور شدت و تاکید سے اعلان فرمایا گیا ــــــ اور احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ جب آخری زمانہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول ہوگا تو وہ صلیب شکنی کے ساتھ دُنیا کو خنزیر کے وجود سے پاک کرنے کا بھی حکم دیں گے (ویقتل الخنزیر) اور اسی وقت اس بات کا پورا ظہور ہوگا کہ اُن کے نام لیوا عیسائیوں نے خنزیر کو اپنی مرغوب غذا بنا کر اُن کی تعلیم اور تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعت کی کیسی مخالفت کی ہے۔

اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کی نذر کر دیا گیا ہو جس کو قرآن مجید میں "فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کے عنوان سے ذکر فرمایا گیا ہے، اُس کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں نذر کرنے والے کی مشرکانہ نیت اور اس کے اعتقادی شرک کی نجاست و خباثت سرایت کر جاتی ہے۔ اسلیے وہ جانور بھی حرام ہو جاتا ہے۔

الغرض یہ چار چیزیں وہ ہیں جن کی حرمت کا اعلان اہتمام اور صراحت کے ساتھ خود قرآن میں فرمایا گیا ہے ــــــ ان کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ گویا اسی حکم الٰہی کا تکملہ ہے۔

اس تمہید کے بعد اب وہ حدیثیں پڑھیے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کی چیزوں کی حلت و حرمت کے بارہ میں ہدایات فرمائی ہیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَاْكُلُوْنَ اَشْيَاءَ وَيَتْرُكُوْنَ اَشْيَاءَ تَقَذُّرًا فَبَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّهٗ وَاَنْزَلَ كِتَابَهٗ وَاَحَلَّ حَلَالَهٗ وَحَرَّمَ حَرَامَهٗ وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ وَتَلَا "قُلْ لَّا اَجِدُ فِيْمَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً" الاٰية

ــــــ رواہ ابو داؤد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت (یعنی اسلام سے پہلے عرب) کچھ چیزوں کو (طبعی خواہش اور رغبت کی بنا پر) کھاتے تھے اور کچھ چیزوں کو (طبعی نفرت اور گھن کی بنیاد پر) نہیں کھاتے تھے ـــ (اسی طرح اُن کی زندگی چل رہی تھی) پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا اور اپنی مقدس کتاب نازل فرمائی، اور جو چیزیں عند اللہ حلال تھیں اُن کا حلال ہونا بیان فرمایا اور جو حرام تھیں اُن کا

حرام ہونا بیان فرمایا ۔۔۔۔ پس جس چیز کو اللہ و رسول نے حلال بتلایا ہے وہ حلال ہے اور جس کو حرام بتلایا ہے وہ حرام ہے ۔ اور جس کے بارے میں سکوت فرمایا گیا ہے (یعنی اس کا حلال یا حرام ہونا بیان نہیں فرمایا گیا) وہ معاف ہے (یعنی اس کے استعمال پر مواخذہ نہیں) اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباس نے بطور سند یہ آیت تلاوت فرمائی "قُلْ لَا أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً" الآیۃ

(سنن ابو داؤد)

تشریح : مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن پاک کے نزول کے بعد کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا معیار وحی الٰہی اور خدا و رسول کا حکم ہے کسی کی پسند و ناپسند اور رغبت و نفرت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے ۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهَىٰ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَكُلِّ ذِي مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ ۔۔۔۔ رواہ مسلم

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہر کچلی والے درندے اور ہر چنگل گیر (یعنی شکاری پنجہ والے) پرندے کے کھانے سے ۔ (صحیح مسلم)

تشریح : وہ سب درندے جو منہ سے اور دانتوں سے شکار کرتے ہیں، جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا، اسی طرح کتا اور بلی ان سب کے وہ نکیلا دانت ہوتا ہے جس کو عربی میں "ناب" اور اردو میں کچلی اور کیلا کہتے ہیں، وہی ان درندوں کا خاص جارحہ اور ہتھیار ہے ۔ اسی طرح جو پرندے شکار کرتے ہیں جیسے باز، اور چیل اور شاہین، ان کا جارحہ وہ پنجہ ہوتا ہے جس سے جھپٹا مار کر بیچارے شکار کو یہ اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں ۔

حدیث کا مطلب اور حاصل یہ ہے کہ درندوں کی قسم کے سب چوپائے جن کے منہ میں کچلی ہوتی ہے اور جو شکار کرتے ہیں اور اسی طرح شکاری پرندے جو مخلب یعنی پنجہ سے جھپٹا مار کر شکار کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کے کھانے سے منع فرمایا، یعنی حکم دیا کہ ان کو نہ کھایا جائے ۔ یہ بھی محرمات اور خبائث میں شامل ہیں ۔

عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَۃَ قَالَ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لُحُوْمَ الْحُمُرِ الْاَھْلِیَّۃِ ــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھوں کو حرام قرار دیا۔　(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) بعض دوسری حدیثوں میں گدھوں کے ساتھ خچروں کا ذکر بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں ہی جانوروں کی حرمت کا اعلان فرمایا ہے اور یہ بھی محرمات میں سے ہیں۔

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی یَوْمَ خَیْبَرَ عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَھْلِیَّۃِ وَاَذِنَ فِیْ لُحُوْمِ الْخَیْلِ ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے دن منع فرمایا پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے اور اجازت دی گھوڑوں کے گوشت کے بارہ میں۔　(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث کی بنا پر اکثر ائمہ گھوڑے کے گوشت کی حلت کے قائل ہیں، امام ابوحنیفہ سے کراہت کا قول نقل کیا گیا ہے ــــ غالباً اس کی بنیاد یہ ہے کہ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں حضرت خالد بن الولیدؓ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں اور
نَھٰی عَنْ اَکْلِ لُحُوْمِ الْخَیْلِ وَالْبِغَالِ	خچروں اور گدھوں کا گوشت کھانے
وَالْحَمِیْرِ	سے منع فرمایا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھے اور خچر کے ساتھ گھوڑے کے گوشت کی بھی ممانعت فرمائی ہے ــ اگرچہ اس حدیث کی سند میں ضعف ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کا عام دستور یہ ہے کہ جب کسی چیز کی حلت وحرمت دلائل کی بنا پر مشتبہ ہو جائے تو وہ ازراہ احتیاط ممانعت کو ترجیح دیتے ہیں، غالباً اسی لیے انھوں نے گھوڑے کے گوشت کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اُن کے کچھ دلائل ہیں۔ لیکن فقہ حنفی کی بعض کتابوں میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ آخر میں امام ابوحنیفہؒ نے اس مسئلہ میں دوسرے ائمہ کے قول کی طرف رجوع فرمایا تھا

اور جواز کے قائل ہو گئے تھے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا حدیث سے معلوم ہوتا ہے جو صحیحین کی حدیث ہے۔ واللہ اعلم

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ الْهِرَّةِ وَاَكْلِ ثَمَنِهَا ـــــــــــــــ رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے کھانے سے منع فرمایا اور اس کی قیمت کے کھانے سے بھی ممانعت فرمائی۔

(سنن ابی داؤد و ترمذی)

تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بلی بھی محرمات میں سے ہے، اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ وہ بھی ایک درندہ ہے۔ نیز اسی حدیث میں بلی کی قیمت کھانے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، علماء اور شارحین کے نزدیک اس ممانعت کا مطلب کراہت ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَكْلِ الْجَلَّالَةِ وَاَلْبَانِهَا ـــــــــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلالہ (نجاست خور جانور) کے کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا۔

(جامع ترمذی)

تشریح) کبھی کبھی بعض جانوروں، اونٹ، گائے، بکری وغیرہ کا مزاج ایسا بگڑ جاتا ہے کہ وہ نجاست اور غلاظت ہی کھاتی ہیں یہاں تک کہ اس کے گوشت اور دودھ میں بھی اس کی بدبو محسوس ہونے لگتی ہے، ایسے ہی جانور کو جلالہ کہا جاتا ہے، اس حدیث میں اس کا گوشت کھانے اور دودھ پینے سے منع فرمایا گیا ہے، اگر کسی مرغی کا یہ حال ہو تو اس کا حکم بھی یہی ہے ـــ ہاں اگر اس جانور کو اتنی مدت تک باندھ کے پابند کر کے نجاست کھانے سے باز رکھا جائے کہ اس کے گوشت یا دودھ میں کوئی اثر باقی نہ رہے تو پھر اس کا کھانا یا دودھ پینا جائز ہوگا، اب وہ گوشت اور دودھ "جلالہ" کا نہیں رہا۔

عَنْ اَبِيْ وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ

وَهُمْ يَجُبُّونَ أَسْنِمَةَ الْإِبِلِ وَيَقْطَعُونَ أَلْيَاتِ الْغَنَمِ فَقَالَ مَا يُقْطَعُ مِنَ الْبَهِيمَةِ وَهِيَ حَيَّةٌ فَهِيَ مَيْتَةٌ لَا تُؤْكَلُ ـــــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (مکہ سے ہجرت فرماکے) مدینہ تشریف لائے تو یہاں (نہایت سنگدلانہ ایک طریقہ یہ رائج تھا کہ) کچھ لوگ کھانے کے لیے اپنے زندہ اونٹ کا کوہان کاٹ لیتے (جو بہت مرغوب قسم کا گوشت ہوتا ہے) اور اسی طرح دُنبوں کی چکّی کاٹ لیتے (اور پھر اُس اونٹ اور دُنبہ کا علاج کر لیتے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں فرمایا کہ کسی زندہ جانور میں سے جو گوشت کاٹا جائے گا وہ مردار ہے اُس کا کھانا جائز نہیں۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ شَرِيطَةِ الشَّيْطَانِ زَادَ ابْنُ عِيسَى هِيَ الذَّبِيحَةُ تُقْطَعُ مِنْهُ الْجِلْدُ وَلَا تُفْرَى الْأَوْدَاجُ ثُمَّ تُتْرَكُ حَتَّى تَمُوتَ ـــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا "شریطۂ شیطان" کے کھانے سے ــــ حدیث کے راوی ابن عیسیٰ نے (لفظ "شریطۂ شیطان" کی تشریح میں) یہ اضافہ کیا ہے کہ اس سے مراد وہ ذبح کیا ہوا جانور ہے جس کی اوپر سے صرف کھال کاٹ دی جائے اور گلے کی رگیں جن سے خون جاری ہوتا ہے، نہ کاٹی جائیں اور یوں ہی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ مرجائے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ یہ سنگدلانہ فعل بھی ناجائز و حرام ہے، کیونکہ اس سے جانور کو جو اللہ کی مخلوق ہے بے ضرورت اور بہت دیر تک سخت تکلیف و اذیت ہوتی ہے، اور اس طرح ذبح کیا ہوا جانور بھی مردار کے حکم میں ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔ اس طرح ذبح کیے ہوئے جانور کو "شریطۂ شیطان" کہا گیا ہے، جس کے معنی ہیں شیطان کا گھائل کیا ہوا، گویا جانور کو ذبح کرنے کا یہ طریقہ شیطان کا سکھایا ہوا ہے۔

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَعَنْ كُلِّ ذِيْ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاَهْلِيَّةِ وَعَنِ الْمُجَثَّمَةِ وَعَنِ الْخَلِيْسَةِ ۔

——— رواہ الترمذی

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے دن منع فرمایا تمام کچلی والے درندوں اور شکاری پنجہ والے پرندوں کے کھانے سے، اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے اور مُجَثَّمَہ اور خَلِیسَہ کے کھانے سے۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) امام ترمذی نے اس حدیث کی روایت کے ساتھ اس کے ایک راوی ابو عاصم سے مجثمہ اور خَلِیسَہ کی یہ تشریح بھی نقل کی ہے کہ مُجَثَّمَہ سے مراد وہ پرندہ یا وہ جانور ہے جس کو باندھ کے ڈال دیا جائے یا کھڑا کر دیا جائے اور پھر اس پر تیر اندازی اور نشانہ بازی کر کے اس کو مار ڈالا جائے، اور خَلِیسَہ وہ جانور ہے جس کو شیر، بھیڑیئے جیسے کسی درندے نے شکار کیا ہو اور اُس درندہ سے اُس کو چھین لیا جائے اور وہ ذبح کیے جانے سے پہلے مرجائے، ——— اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مجثّمہ اور خَلِیسَہ دونوں مردار کے حکم میں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کھانے کی ممانعت فرمائی ہے۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ شِبْلٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ اَكْلِ لَحْمِ الضَّبِّ ——— رواہ ابو داؤد

عبد الرحمٰن بن شبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گوہ حلال جانوروں میں سے نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے امام ابو حنیفہؒ کا قول یہی ہے، لیکن آگے درج ہونے والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کھانا ناجائز نہیں ہے، اس بنا پر دوسرے اکثر ائمہ نے اس کو جائز اور حلال کہا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيْدِ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَيْمُوْنَةَ وَهِيَ خَالَتُهُ وَخَالَةُ ابْنِ عَبَّاسٍ فَوَجَدَ عِنْدَهَا ضَبًّا مَحْنُوْذًا فَقَدَّمَتِ الضَّبَّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ عَنِ الضَّبِّ فَقَالَ خَالِدٌ اَحَرَامٌ الضَّبُّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ لَا، وَلٰكِنْ لَمْ يَكُنْ بِاَرْضِ قَوْمِيْ فَاَجِدُنِيْ اَعَافُهُ، قَالَ خَالِدٌ فَاجْتَرَرْتُهُ فَاَكَلْتُهُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ اِلَيَّ۔ ———— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خالد بن الولید نے ان سے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا (راوی نے بتایا کہ حضرت میمونہ خالد بن الولید اور عبداللہ بن عباس کی بھی حقیقی خالہ تھیں، آگے حضرت خالد کا بیان ہے کہ) میں نے دیکھا کہ ان کے (یعنی ہماری خالہ میمونہ کے) پاس ایک بھنی ہوئی گوہ ہے، وہ انھوں نے کھانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف بڑھادی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے ہاتھ کھینچ لیا، (جس سے معلوم ہوا کہ آپ اس کو کھانا نہیں چاہتے) تو خالد بن الولید نے (جو کھانے میں شریک تھے) پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، (یعنی حرام تو نہیں ہے) لیکن یہ ہمارے علاقہ میں (یعنی مکہ کی سرزمین میں) ہوتی نہیں تھی اس لیے میری طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی۔ — خالد نے بیان کیا کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب سن کر) میں نے اس کو اپنی طرف سرکا لیا اور کھا لیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے رہے (یعنی آپ نے مجھے کھاتا دیکھا اور منع نہیں فرمایا۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) جو حضرات ائمہ گوہ کی حلت کے قائل ہیں اُن کی سب سے بڑی دلیل یہی حدیث ہے، اس کے علاوہ بھی بعض حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گوہ کا کھانا حلال ہے، امام ابوحنیفہ کا خیال یہ ہے کہ یہ حدیثیں غالباً اس زمانہ کی ہیں جبکہ اس کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا،

اور جب تک کسی چیز کی حرمت کا حکم نہ آئے وہ مباح ہے، بہرحال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ممانعت کی حدیث کو جو اوپر درج ہو چکی ہے، زمانہ کے لحاظ سے مؤخر اور ناسخ سمجھتے ہیں ___ علاوہ ازیں ابھی کچھ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام صاحب کا عام دستور اور رویہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کی حلت اور حرمت کے بارہ میں اشتباہ پیدا ہو جائے تو وہ ازراہِ احتیاط حرمت کے قول کو ترجیح دیتے ہیں ___

عَنْ مَیْمُوْنَةَ اَنَّ فَارَةً وَقَعَتْ فِیْ سَمْنٍ فَمَاتَتْ فَسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلْقُوْھَا وَمَا حَوْلَھَا وَکُلُوْہُ ___ رواہ البخاری

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ گھی میں چوہا گر گیا اور مر گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا، آپ نے فرمایا کہ اس مرے ہوئے چوہے کو اور اس کے ارد گرد کے گھی کو نکال کر پھینک دو اور پھر باقی گھی کو کھا لو۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) جیسا کہ آگے درج ہونے والی حدیث سے معلوم ہوگا کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ گھی منجمد ہو، لیکن اگر منجمد نہ ہو بلکہ رقیق اور سیال ہو تو پھر وہ سارا گھی کھانے کے لائق نہیں رہے گا۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَتِ الْفَارَةُ فِی السَّمْنِ فَاِنْ کَانَ جَامِدًا فَاَلْقُوْھَا وَمَا حَوْلَھَا وَاِنْ کَانَ مَائِعًا فَلَا تَقْرَبُوْہُ ___ رواہ احمد وابوداؤد ورواہ الدارمی عن ابن عباس

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب چوہا گھی میں گر جائے (اور مر جائے) تو اگر گھی جما ہوا ہو تو اس چوہے کو اور ارد گرد کے گھی کو نکال کے پھینک دو، اور اگر گھی پتلا ہو تو پھر اس کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس کا کھانا جائز نہیں ہے نہ کھاؤ۔ (مسند احمد، سنن ابی داؤد)

[اور یہی حدیث دارمی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے]

عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّہٗ رَاٰی حِمَارًا وَحْشِیًّا فَعَقَرَہٗ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ مَعَکُمْ مِنْ لَحْمِہٖ شَیْءٌ؟ قَالَ مَعَنَا رِجْلُہٗ فَاَخَذَھَا فَاَکَلَھَا ___ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک سفر میں) ایک گورخر اُن کی نظر پڑا (وہ اچھے ماہر شکاری تھے) انھوں نے اُس کو زخمی کر کے شکار کر لیا (پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس کے بارہ میں دریافت کیا کہ وہ حلال ہو یا نہیں؟) آپ نے فرمایا کہ اُس کے گوشت میں سے کچھ بچا ہوا تمھارے پاس ہے؟ ابو قتادہ نے عرض کیا کہ ہاں اُس کا ایک پاؤں ہے، (اور وہ پیش کر دیا) آپ نے اس کو قبول فرمالیا اور تناول فرمایا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس سے معلوم ہوا کہ گورخر حلال ہے اور شکار کیا ہوا جانور حلال طیب ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ اَنْفَجْنَا اَرْنَبًا بِمَرِّ الظَّهْرَانِ فَاَخَذْتُهَا فَاَتَيْتُ بِهَا اَبَا طَلْحَةَ فَذَبَحَهَا وَبَعَثَ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَرِكِهَا وَفَخِذَيْهَا فَقَبِلَهٗ ____________ رواہ البخاری و مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم نے مَرُّ الظّہران کے جنگل میں ایک خرگوش دوڑا کر پکڑ لیا اور میں اس کو (اپنے مربّی) ابو طلحہ کے پاس لے آیا، انھوں نے اس کو ذبح کیا اور اس کی دونوں رانیں اور کولھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (بطور تحفہ کے) بھیجا تو آپ نے اس کو قبول فرمالیا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) خرگوش جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے حلال ہے، اور ائمہ کا اس پر اتفاق ہے۔

عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ لَحْمَ الدَّجَاجِ ____________ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغ کا گوشت کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ سَفِيْنَةَ قَالَ اَكَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَحْمَ الْحُبَارٰى رواہ ابوداؤد

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور آزاد کردہ غلام) حضرت سفینہ

رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حباری پرند کا گوشت کھایا ہے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) لغت کی کتابوں میں "حُباری" کے ترجمے مختلف کیے گئے ہیں، بعض نے سرخاب کیا ہے اور بعض نے تغدری، بہرحال "حُباری" پرندہ ہے اور معلوم ہے کہ وہ سب پرندے حلال ہیں جو ذی مخلب" نہیں ہیں، یعنی جو جھپٹا مار کر پنجے سے شکار نہیں کرتے اور جو فطرت کے لحاظ سے موذی اور خبیث نہیں ہیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُحِلَّتْ لَنَا مَیْتَتَانِ وَدَمَانِ، اَلْمَیْتَتَانِ الْحُوْتُ وَالْجَرَادُ وَالدَّمَانِ الْکَبِدُ وَالطِّحَالُ

———— رواہ احمد وابن ماجہ والدارقطنی

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حلال قرار دی گئی ہیں ہمارے لیے دو مردہ چیزیں اور خون کی دو قسمیں، دو مردہ چیزیں ہیں مچھلی اور ٹڈھی، اور خون کی دو قسمیں ہیں، کلیجی اور تلی (کہ در اصل یہ دونوں منجمد خون ہیں) (مسند احمد، سنن ابن ماجہ، سنن دارقطنی)

(تشریح) مطلب یہ ہو کہ سارے حلال جانوروں کیلئے شرعی قانون اور ضابطہ یہ ہو کہ وہ شرعی طریقہ سے ذبح کیے جائیں تو حلال ہیں اور اگر بغیر ذبیحہ کے مرجائیں تو مُردار اور حرام ہیں لیکن دو چیزیں اس سے مستثنیٰ ہیں ایک مچھلی اور دوسرے ٹڈھی۔ یہ دونوں مری ہوئی بھی حلال ہیں۔ اسی طرح کلیجی اور تلی اگرچہ یہ دونوں در اصل منجمد خون ہیں اور خون حرام ہو۔ لیکن جب وہ جم کر کلیجی اور تلی کی شکل اختیار کرلے تو اس کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے۔

عَنِ ابْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ کُنَّا نَاْکُلُ مَعَہُ الْجَرَادَ ———— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سات غزوے کیے ہیں (یعنی سات غزووں میں ہمیں آپ کی معیت ورفاقت نصیب ہوئی ہو۔) ہم ان غزووں میں آپ کے ساتھ رہ کر ٹڈھیاں بھی کھاتے تھے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) سنن ابی داؤد میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹڈھیوں کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا "اکثر جنود اللہ لا آکلہ ولا احرمہ" (اللہ کی بہت سی مخلوق یعنی بہت سے جانور ایسے ہیں کہ میں اُن کو خود تو نہیں کھاتا لیکن حرام نہیں بتلاتا، مطلب یہ کہ وہ حلال ہیں، لوگ ان کو کھا سکتے ہیں ___ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ خود ٹڈھی نہیں کھاتے تھے، اسکی روشنی میں شارحین نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی مندرجہ بالا حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ صحابہ کرام حضورؐ کے ساتھ غزوات میں ٹڈھیاں بھی کھاتے تھے اور آپ منع نہیں فرماتے تھے۔ اس مطلب کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ حضرت ابن ابی اوفیٰ والی اس حدیث کی صحیح مسلم اور جامع ترمذی وغیرہ کی روایات میں "معہ" کا لفظ نہیں ہے بلکہ آخری الفاظ یہ ہیں "کنا ناکل الجراد" ___ واللہ اعلم

عَنْ جَابِرٍ قَالَ غَزَوْتُ جَيْشَ الْخَبَطِ وَأُمِّرَ أَبُو عُبَيْدَةَ فَجُعْنَا جُوْعًا شَدِيْدًا فَأَلْقَى الْبَحْرُ حُوْتًا مَيِّتًا لَمْ نَرَ مِثْلَهُ يُقَالُ لَهُ الْعَنْبَرُ فَأَكَلْنَا مِنْهَا نِصْفَ شَهْرٍ فَأَخَذَ أَبُو عُبَيْدَةَ عَظْمًا مِنْ عِظَامِهِ فَمَرَّ الرَّاكِبُ تَحْتَهُ فَلَمَّا قَدِمْنَا ذَكَرْنَا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كُلُوْا رِزْقًا أَخْرَجَهُ اللهُ إِلَيْكُمْ وَأَطْعِمُوْنَا إِنْ كَانَ مَعَكُمْ قَالَ فَأَرْسَلْنَا إِلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُ فَأَكَلَهُ ___ رواہ البخاری ومسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں "جَیْشُ الْخَبَط" کے جہاد میں شریک تھا اور ابو عبیدہ اُس لشکر کے امیر بنائے گئے تھے، (غذا کا کچھ سامان نہ ہونے کی وجہ سے اس سفر جہاد میں) ہم سخت بھوک میں گرفتار ہوئے، تو سمندر نے ایک مچھلی پھینکی جو مر چکی تھی، ہم نے ایسی (یعنی اتنی بڑی) مچھلی کبھی نہیں دیکھی تھی، اُس کا نام عنبر بتلایا جاتا تھا، ہم سب نے (یعنی پورے لشکر نے) اُس کو آدھے مہینہ تک کھایا، پھر ابو عبیدہ نے اس کی ہڈیوں میں سے ایک ہڈی (غالباً پسلی) اُٹھا کے کھڑی کی تو اونٹ کا سوار اس کے نیچے سے گزر گیا، پھر جب ہم سفر سے مدینہ واپس آئے تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا (اور پوچھا

کہ ہمارا اُس کو کھانا درست تھا یا نہیں، تو آپ نے فرمایا کھاؤ، اللہ تعالیٰ کا عطیہ (اور تحفہ) جو اللہ نے تمہارے واسطے نکالا تھا، اور اگر اُس میں سے کچھ تمہارے ساتھ ہو تو ہمیں بھی کھلاؤ (جابر کہتے ہیں کہ) ہم نے اُس میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی بھیجا تو آپ نے اُس کو تناول فرمایا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ ۸ھ کی ایک جہادی مہم کا واقعہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریباً تین سو مجاہدین کا ایک لشکر روانہ فرمایا تھا اس کا امیر حضرت ابو عبیدہ کو بنایا گیا تھا، پورے لشکر کے کھانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بورا کھجوریں حضرت ابو عبیدہ کو دی تھیں، اُس وقت اتنا ہی بندوبست ہو سکا تھا، ابو داؤد وغیرہ کی اس واقعہ کی روایت میں ہے کہ ابو عبیدہ روزانہ ہر لشکری کو اُس بورے میں سے صرف ایک کھجور دیتے تھے، اور یہ اللہ کے سپاہی اُسی پر گزارہ کرتے تھے، خود اُس لشکر کے بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ہم اُس ایک کھجور کو منہ میں دیر تک رکھ کر اس طرح چوستے تھے جس طرح ننھے بچے چوستے ہیں اور اوپر سے پانی پی لیتے تھے، بس یہی دن بھر کے لیے کافی ہو جاتا تھا — پھر وہ کھجوریں ختم ہو گئیں تو درختوں سے پتے جھاڑ کے اور انھیں پانی سے تر کر کے کھانے لگے، اُس سے ہمارے منہ زخمی ہو گئے اور سوج گئے، اس لشکر کو "جَیْشُ الْخَبَطْ" کے نام سے اسی لیے یاد کیا جاتا ہے خَبَطْ کے معنی درخت سے پتے جھاڑنے کے ہیں۔

ابو داؤد وغیرہ کی روایت میں حضرت جابر ہی کا بیان ہے کہ اسی حال میں ہم سمندر کے کنارے سے قریب چل رہے تھے کہ ہمیں ایک ٹیلہ یا ایک پہاڑی سی نظر پڑی، قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہ سمندر کا پھینکا ہوا ایک مچھلی نما جانور ہے اور مرا ہوا ہے، حضرت ابو عبیدہ کو اُس کے حلال ہونے کے بارہ میں تنگ ہوا، بعد میں انھوں نے سوچا کہ ہم اللہ کے کام کے لیے نکلے ہیں اور اُس کے رسول کے بھیجے ہوئے ہیں، اور کھانے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ہماری غذا کا سامان فراہم کیا ہے، پھر اس بارہ میں انہیں شرح صدر ہو گیا تو انھوں نے لشکر کو اُس کے کھانے کی اجازت دی۔ اور صحیحین کی اس روایت کے بیان کے مطابق پورے لشکر نے اس کو آدھے مہینے تک کھایا — اور دوسری بعض روایات میں ہے کہ اُس کو ایک مہینہ تک کھایا گیا۔

اِس عاجز کے نزدیک ان دونوں باتوں میں مطابقت اس طرح ہو کہ لشکر کا قیام آدھے مہینہ کے قریب اُسی علاقہ میں رہا اور اِن دنوں میں وہی مچھلی خوب فراوانی سے کھائی جاتی رہی ۔۔۔ اُس کے بعد واپسی ہوئی اور قریباً آدھے مہینہ میں مدینہ پہنچے' ان دنوں میں بھی اُسی سے کچھ کام چلتا رہا' تو جن روایات میں آدھے مہینہ تک کھائے جانے کا ذکر ہو' اُن میں صرف سفرِ واپسی سے پہلے دنوں کا ذکر کیا گیا ہو' جبکہ پورا لشکر فراوانی سے اُس کو کھاتا رہا' اور جن روایات میں ایک مہینہ تک کھانے کا ذکر کیا گیا اُن میں واپسی کا زمانہ بھی شامل کر لیا گیا ہو' کیونکہ اُن دنوں میں بھی اس کو بطور غذا کے کچھ نہ کچھ استعمال کیا جاتا رہا ۔۔ واللہ اعلم۔

حدیث کے آخر میں یہ بھی بیان کیا گیا ہو کہ مدینہ کی واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا اور غالباً ابوعبیدہ کے شک وشبہ کا ذکر آیا' تو آپ نے یہ فرما کر ۔۔۔۔

"کُلُوا رِزْقاً اَخْرَجَہُ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ" اطمینان دلایا کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ اور تحفہ تھا جو اُس نے تمہارے ہی واسطے سمندر سے باہر نکلوایا تھا' ایسی چیز کو تو بڑی قدر اور شکر کے ساتھ کھانا چاہیے ۔ آخر میں آپ نے اُن لوگوں کا دل خوش کرنے اور اُس عطیۂ ربانی کی قدردانی کے اظہار کے لیے یہ بھی فرمایا۔

وَاَطْعِمُوْنَا اِنْ کَانَ مَعَکُمْ ۔ (یعنی اگر اس میں سے کچھ ساتھ لائے ہو تو ہمکو بھی کھلاؤ !)

چنانچہ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور آپ نے تناول فرمایا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سمندر کی اتنی بڑی مچھلی' جو ظاہر ہے کہ ایک عجیب و غریب مخلوق معلوم ہوتی ہوگی حلال طیب ہو ۔۔

حدیث میں ہو کہ اس مچھلی کو عنبر کہا جاتا ہو' بعض لوگوں نے لکھا ہو کہ عنبر جو بعض خاص علاقوں میں سمندر کے کنارہ ملتا ہو اسی مچھلی سے نکلتا ہو۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ ھٰھُنَا اَقْوَاماً حَدِیْثٌ عَھْدُھُمْ بِشِرْکٍ یَاْتُوْنَنَا بِلُحْمَانٍ لَا نَدْرِیْ اَیَذْکُرُوْنَ اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا اَمْ لَا؟ قَالَ اُذْکُرُوْا اَنْتُمْ اِسْمَ اللّٰہِ وَکُلُوْا۔

رواہ البخاری

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے وہاں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ اُن کا شرک کا زمانہ قریب ہی کا ہے (یعنی قریبی زمانہ کے نو مسلم ہیں اور ابھی اُن کی اسلامی تعلیم و تربیت نہیں ہو سکی ہے) وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ ذبح کرتے وقت وہ اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں، (تو اس صورت میں وہ گوشت کھائیں یا نہ کھائیں؟) آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کا نام لو اور کھالو۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خواہ مخواہ وہم میں نہیں پڑنا چاہیے جب وہ لوگ مسلمان ہو چکے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ اللہ کا نام لے کر ہی ذبح کرتے ہوں گے اس لیے تم اللہ کا نام لے کر کھالیا کرو، ۔۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر انھوں نے اللہ کا نام لیے بغیر ہی کافرانہ طریقہ پر ذبح کر لیا ہو تو تمہارے بسم اللہ پڑھنے سے اب وہ حلال ہو جائے گا۔۔۔ قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ (الانعام۔ ع ۱۴)

اور جس جانور پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو اُسکو مت کھاؤ، اس کا کھانا سخت گناہ ہے۔

عَنْ قَبِيصَةَ بْنِ هُلْبٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ طَعَامِ النَّصَارَى فَقَالَ لَا يَتَخَلَّجَنَّ فِي صَدْرِكَ طَعَامٌ ضَارَعْتَ فِيهِ النَّصْرَانِيَّةَ۔

رواہ الترمذی

قَبیصہ بن ھُلب اپنے والد ھُلب طائی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصاریٰ کا کھانا کھانے کے بارہ میں سوال کیا (کہ جائز ہے یا ناجائز؟) تو آپ نے فرمایا کہ اُس کے کھانے کے بارہ میں تمہارے دل میں کوئی خلجان نہیں ہونا چاہیے۔ تم اس (تنگ نظری اور بیجا شدت پسندی) میں طریقۂ نصرانیت سے مشابہ ہو گئے ہو۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) یہ ھُلب طائی پہلے خود نصرانی المذہب تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ایمان و اسلام نصیب فرمایا تو ان کو نصاریٰ یعنی عیسائیوں کے ہاں کھانا اور اُن کا ذبیحہ کھانے کے بارہ میں تردد تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس بارہ میں تمہارے دل میں کوئی تردد اور خلجان نہیں ہونا چاہیے یعنی ہماری شریعت میں اُن کا کھانا اور ذبیحہ جائز ہے۔ قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے "وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ"[1] (یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے واسطے حلال ہے) آپ نے یہ بھی فرمایا کہ کھانے پینے میں یہ تنگ نظری اور شدت پسندی عیسائی راہبوں کا شیوا ہے۔ اگر تم وہی طریقہ اپناتے ہو تو گویا اُن کی ہم رنگی اختیار کرتے ہو۔ ہماری شریعت میں یہ تنگی نہیں بلکہ وسعت ہے۔ والحمد للہ۔

---

[1] سورہ مائدہ رکوع ۱

موعظۂ معرفت[1]

(از افادات مصلح الامۃ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ)

فرمایا کہ ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے جو اعضاء ہیں آنکھ کان وغیرہ یہ سب خود بخود کام کرتے ہیں اور جب یہ مریض ہو جاتے ہیں تو ہم ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے ہیں اور وہاں جا کر ٹھیک کرا لیتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دیکھیے کہ سب اعضاء کے ٹھیک ہونے کے باوجود فرماتے ہیں کہ

وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا۔

یعنی اے اللہ کارآمد رکھ ہماری شنوائیاں اور بینائیاں اور ہماری قوت جب تک ہم کو زندہ رکھے، اور کرنا اس کی خیر کو باقی بعد ہمارے، اور ہمارا انتقام لے اُس سے جو ہم پر ظلم کرے اور مدد دے ہمیں اُس پر جو ہم سے دشمنی کرے۔

اس دُعا میں یہ فرما رہے ہیں کہ یہ اعضاء گو ہمارے ہیں مگر ان سے تمتع حاصل کرنا یہ آپ کے قبضہ میں ہے آپ ہی چاہیں تو ہم نفع اُٹھا سکتے ہیں اور نہ چاہیں تو ہم کچھ نہیں کر سکتے اسی مضمون کو ایک دوسری دعا میں یوں فرماتے ہیں۔

وَبَارِكْ لَنَا فِيْ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

---

[1] یہ مضمون "معرفت حق الہ آباد" سے لیا گیا ہے۔ عنوان ہمارا قائم کیا ہوا ہے ___ ادارہ الفرقان

اے اللہ برکت دے ہمیں ہماری شنوائیوں میں اور ہماری بینائیوں میں اور ہمارے دلوں میں اور ہماری بیبیوں میں اور ہماری اولاد میں اور توبہ قبول کر ہماری تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اسی طرح سے ایک اور دُعا میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ وَمِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ جَنَّتَکَ وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ بِہٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا۔

اے اللہ حصہ دے ہمیں اپنے خوف سے کہ حائل ہو جائے ہم میں اور تیرے گناہوں میں اور اپنی عبادت سے اتنا کہ پہنچا دے ہمیں بذریعہ اُس کے اپنی جنت میں اور یقین اتنا کہ سہل کر دے ہم پر دنیا کی مصیبتیں۔

دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دُعا میں اللہ تعالیٰ سے خشیت طلب کر رہے ہیں باوجودیکہ آپ سید الانبیاء ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے خشیت کی دُعا فرما رہے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ متقی ہوں اور سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔ یہاں فرما رہے ہیں کہ اے اللہ جس طرح سے کہ میں اور چیزیں تجھ سے مانگتا ہوں اسی طرح خشیت کا بھی تجھ سے سوال کرتا ہوں اور اس سوال کرنے میں بھی اعتدال کو کس طرح ملحوظ فرما رہے ہیں یعنی اُس کی اتنی زیادتی بھی نہ ہو جائے کہ میں کوئی کام ہی نہ کر سکوں بلکہ اتنا حصہ دے اپنے خوف سے کہ تو حائل ہو جائے اس کی وجہ سے ہمارے اور معصیت کے درمیان۔

سبحان اللہ توحید کا کس قدر غلبہ ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ وہ خشیت میرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے بلکہ یہ فرمایا کہ اُس خشیت کے سبب سے تو حائل ہو جا یعنی میں ترک معاصی میں اور دخول جنت میں محض تیری ہی ذات کا محتاج ہونا چاہتا ہوں کسی مخلوق کا ممنون احسان نہیں ہونا چاہتا۔

اب ہم لوگ ہوتے تو خشیت ہی کو حائل سمجھتے اور طاعت ہی کو جنت میں لے جانے والا سمجھتے حالانکہ آپ فرما رہے ہیں کہ عطا فرما ہم کو اپنی طاعت کا اتنا حصہ کہ آپ اس کی وجہ سے ہم کو پہنچا دیں اپنی جنت میں۔ اگر خشیت کو حائل ہونے والا اور طاعت کو جنت میں پہنچانے

والا سمجھے تو توحید فوت ہو جاتی۔ انبیاء علیہم السلام کی یہی تعلیمات ہیں کہ کسی موقعہ پر توحید کو فوت نہیں ہونے دیتے۔

ایک شخص نے حضرت[1] سے سوال کیا کہ حضرت اسلام کا سب سے مایہ ناز عقیدہ توحید ہی ہے اور بزرگوں سے ایسی ایسی چیزیں ثابت ہیں کہ توحید ہی فوت ہو جاتی ہے۔ کوئی انا الحق کہہ رہا ہے کوئی سبحانی ما اعظم شانی تو آخر یہ کیا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے والے ہی توحید کو جو اصل الاصول ہے ڈھا رہے ہیں۔ حضرت مولانا نے جب یہ سنا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور اس کو جواب دیا کہ آج کل جو یہ ایجادات نکلی ہیں ان کو دیکھو گراموفون کی پلیٹ میں آواز ضبط ہو جاتی ہے۔ ٹیپ ریکارڈ آواز کو ضبط کر لیتا ہے۔ پھر جب دوبارہ لگایا جاتا ہے تو وہی آواز نکلتی ہے۔ اب یہاں کوئی تعجب نہیں کرتا کہ یہ مصالحہ کی پلیٹ ایسی عالمانہ اور فاضلانہ تقریریں کر رہی ہے چونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ یہ پلیٹ متکلم نہیں ہے بلکہ متکلم کوئی دوسرا ہے۔ یہ اسکی حکایت کر رہی ہے اسی طرح سے اولیاء اللہ جو اس قسم کے کلمات بولتے ہیں تو یہ خود نہیں بولتے بلکہ غائت قرب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی باتیں ان کے اندر ضبط ہو جاتی ہیں جس کو یہ حکایت کرتے ہیں۔

من نمی گویم انا الحق یار میگوید بگو
کس نگویم چوں مرا دلدار می گوید بگو

یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا اور اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

اسی طرح سے ایک اور واقعہ سنئیے۔

ایک دفعہ ہم لوگ حضرتؒ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک پٹواری آیا اس نے حضرتؒ سے ایک سوال کیا کہ حضرت انبیاء علیہم السلام کی اولاد کا انتقال ہوا ہے تو اس پر ان کو غم ہوا ہے۔ چنانچہ رونا تک ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لائے اور چہرہ پر سے چادر ہٹا کر فرمایا۔ اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ۔ یعنی اے ابراہیم ہمیں تمہاری جدائی کا صدمہ ہے۔ لیکن اولیاء کی اولاد مری ہے تو وہ ہنس دیے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

[1] یعنی حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

انبیاء علیہم السلام کا مل اُن کے احوال کامل لیکن بظاہر اولیا کا حال بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

حضرت نے اُس کے سوال کو غور سے سُنا اور سنبھل کر بیٹھ گئے اور اس کا جواب دیا۔ فرمایا کہ دیکھو جب کسی کا آپریشن کرنا ہوتا ہے اور وہ کمزور ہوتا ہے تو اسے کلوروفارم سونگھا دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کو آپریشن کی تکلیف نہیں محسوس ہوتی اور جو قوی ہوتے ہیں اُن کا آپریشن بدون کلوروفارم کے کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انھیں تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس کو اپنی قوت کی بنا پر برداشت کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سے انبیا علیہم السلام چونکہ قوی ہوتے ہیں اس لیے ان کو تکلیف کا احساس ہوتا ہے لیکن قوت کی وجہ سے اس کو برداشت کر لیتے ہیں اور اولیا کو بہ سبب اُن کے ضعف حال کے کلوروفارم سونگھا دیا جاتا ہے جس سے تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

ایک مولوی صاحب بھی اُس مجلس میں موجود تھے ان کو اس جواب پر حال آگیا وہیں لوٹنے لگے اور زور زور سے کہنے لگے کہ حضرت یہ مضمون اس سے بیان مت کیجیے۔ یہ پٹواری ہے۔ یہ اس کی کیا قدر کرے گا۔ بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگرائے اسی کو بار بار کہنے لگے تو میں نے کہا کیجئے اس بیچارے نے تو اتنا عمدہ سوال کیا جس کی وجہ سے حضرت یہ جواب فرما رہے ہیں۔ اور آپ اسی کے متعلق ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ اگر وہ سوال نہ کرتا تو یہ جواب کیسے سننے میں آتا۔

چنانچہ مقولہ ہے۔ اَلسُّوَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ

حضرت مولانا کے ایک مرید بڑے شخص تھے اُن کے پیر میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے ایک پیر کا کاٹنا تجویز کیا۔ جس دن پیر کٹنے کو ہوا مولانا آپریشن کے کمرے میں تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ کلوروفارم سونگھا دیں۔ فرمایا اس کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے کہا بڑا آپریشن ہے اور لمبا کام ہے۔ دو تین گھنٹے اس میں صرف ہوں گے اتنی دیر تک تکلیف کیسے برداشت کریں گے۔ کہا کہ تم اس چیز کی فکر نہ کرو اور اپنا کام کرو۔

آپریشن شروع ہوا اور مولانا تسبیح لے کر پڑھنے لگے اُدھر التفات بھی نہیں کیا۔ لوگوں نے بعد میں دریافت کیا کہ حضرت آپ نے کیسے برداشت کیا۔ فرمایا کہ بھائی کچھ نہیں اس

تکلیف پر جو آخرت میں اجر مجھے ملنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے وہ میرے سامنے کردیا۔ اُسی کی لذت میں میں کھو گیا اور مجھے پیر کٹنے کا احساس تک نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ سے جب سچا تعلق ہو جاتا ہے اور مومن کو اُس سے نسبت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو حال کا انعام عطا فرماتے ہیں۔

علامہ شعرانی نے الیواقیت میں ابن عربی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر تم کہو کہ حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں تو آیا اس سے کون لوگ مراد ہیں۔ اولیا یا فقہا تو جواب اس کا یہ ہے کہ مراد اس سے وہ علماء ہیں جو عامل ہیں کیونکہ یہی لوگ جامع ہیں علم وعمل کے جیسا کہ گزشتہ زمانہ میں علماء سلف کا ایسا ہی حال تھا اسی لیے تو صوفیہ اُن علماء کو کہا جاتا تھا جو اپنے علم پر عمل کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاق میں اتباع کرتے تھے پھر جب لوگوں نے عمل سے کنارہ کشی اختیار کرلی تو جو لوگ صرف علم کے حامل ہوئے اُن کا نام فقہاء ہوا نہ کہ صوفیا۔ گویا جب تک حال وقال دونوں کے جامع رہے تب تک انھیں وراثت کامل حاصل رہی اور جب صرف قال کو لیا اور حال کو چھوڑ دیا اُس وقت سے وراثت بھی اُن کی ناقص ہو گئی۔

دیکھا جا رہا ہے کہ اب حال ختم ہوتا جا رہا ہے بس قال قال باقی رہ گیا ہے۔ آدمی اگر تقریر بھی کرے گا تو اس سے دل نہیں بدل جائے گا۔ حال جو بدلتا ہے تو حال ہی سے بدلتا ہے۔ جس طرح سے خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ اسی طرح سے کسی حال والے کی صحبت میں بیٹھ کر آدمی کا حال بدل جاتا ہے۔ علماء ظاہر شرع اور قال کے محافظ ہیں اور صوفیا حال کے۔

اس کو بھی ضروری بات بیان کر رہا ہوں اور دونوں فریق کی ضرورت اور اُن کے باہمی فرق کو سمجھا رہا ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ صرف وعظ سے اصلاح کرلیں تو اصلاح نہیں ہوگی۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ محض کسی کا وعظ سُن کر اُس کے معتقد نہ ہو جاؤ اور نہ اُس کے مُرید ہو جاؤ جب تک کہ اس کی صحبت میں رہ کر اس کو قریب سے نہ دیکھ لو۔ اُس کی

صحبت میں رہنے سے اگر اثر ہو تو معتبر ہے۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وعظ ایک فن ہو گیا ہے۔ اس زمانہ میں اسے سیکھا جاتا ہے اور اس میں اُتار چڑھاؤ پیدا کیا جاتا ہے۔ وعظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ شخص (کامل) ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں کتابوں میں دکھا سکتا ہوں کہ لوگوں نے بہت عمدہ عمدہ وعظ کہا ہے اور سننے والوں پر اس کا اثر بھی ہوا ہے مگر وعظ کا مقصد محض دنیا کمانا تھا اور کچھ نہیں اس لیے کہتا ہوں کہ تنہا قال کا کچھ اعتبار نہیں۔

لکھا ہے کہ ایک شخص وعظ کہہ رہا تھا لوگ توجہ سے سُن رہے تھے سب کو لطف آرہا تھا اتنے میں ایک جوان درمیان سے اُٹھا اور کہا کہ ارے لوگو! یہی میرے باپ کا قاتل ہے۔ لوگوں کو اس کا یہ کہنا ناگوار ہوا کہ واعظ کی توہین کرتے ہو اور چاہا کہ اُسے زدوکوب کریں۔ واعظ صاحب نے لوگوں کو منع کیا کہ بھائی اس کو مت کچھ کہو۔ جوانی میں انسان سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ جس قدر لوگ اُسے منع کرتے تھے وہ جوان اور شور مچاتا تھا۔ بالآخر لوگوں نے یہ طے کیا کہ مولانا صاحب کو بے عزتی سے بچانا چاہیے۔ چندہ کر کے کچھ رقم اس جوان کو دیدی جائے اور اس سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ یہی کیا کہ واعظ صاحب کی عقیدت میں اور اُن کی آبرو بچانے کی خاطر کافی رقم فراہم کیا اور اُس جوان کو دے کر رخصت کیا۔

کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے اس جوان کو اور واعظ صاحب کو قریب ہی کے کسی جنگل میں بُری حالت پر دیکھا یعنی کھانے پینے کی ناجائز چیزیں سامنے رکھے ہوئے خوب عیش و طرب کر رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کا کہاں وہ وعظ اور کہاں یہ عمل۔ کہا وعظ وغیرہ کیا تھا وہ تو ہم نے کمائی کا ایک ذریعہ نکالا تھا اور ہمارے پاس ایسے ایسے کتنے طریقے ہیں جن سے ہم لوگوں کو پھانستے اور بیوقوف بناتے ہیں۔

اسی طرح سے ٹھگنے لوگوں کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مسجد میں پہنچے پوچھا کہ یہاں کا متولی اور مہتمم کون شخص ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے کہا کچھ نہیں انھیں سے کام ہے۔ جب لوگوں نے اصرار کیا تو کہا کہ مجھے راستہ میں زیوروں کی ایک پوٹلی ملی ہے اسمیں قیمتی قیمتی زیورات ہیں جس کے ہوں وہ ڈھونڈتا ہوا ادھر ضرور آئے گا۔ میں مسافر آدمی ہوں چلا جاؤں گا اور غریب و مفلس بھی ہوں اس لیے مجھے اپنے پر اعتبار بھی نہیں ہے۔ شاید

اس میں سے کچھ مجھ سے خرچ ہو جائے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کو آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب یہیں رکھ لیں اور کوئی تلاش کرتا ہوا آئے تو تحقیق کر کے اُسے دیدیجئے گا۔

اہل مسجد پر اُس کے اس معاملہ کا بہت اثر ہوا۔ لوگوں نے کہا بڑا دیانتدار شخص ہے اپنے آپ کو غریب بھی کہہ رہا ہے لہذا زیورات تو رکھ لیے جائیں مگر چندہ کر کے اُس کے لیے کچھ مال فراہم کر دیا جائے۔

چنانچہ چندہ کر کے اس کو کافی رقم دیدی۔ وہ رقم لے کر اور زیورات کی پوٹلی دیکر چلا گیا۔ وہ تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ مسجد والوں کے پاس ایک عورت روتی پیٹتی آئی اور کہا کہ اے لوگو! مجھ پر ایک بڑی اُفتاد پڑی ہے وہ یہ کہ میں دلہنوں کے سنوارنے کا کام کرتی ہوں۔ امیروں اور رئیسوں کے یہاں سے زیورات لاکر دُلہنوں کو سنوارتی ہوں اور تقریب ختم ہو جانے کے بعد اُن کے زیورات واپس کر آتی ہوں مجھے کچھ پیسے مل جاتے ہیں جس سے میری روزی چلتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ زیورات کی ایک گٹھڑی لیے ہوئے ادھر سے جا رہی تھی کہیں راستہ میں میری گٹھڑی گر گئی سب زیورات امانت کے تھے جن لوگوں کے لائی تھی اب میں ان کو کیا جواب دوں گی۔

لوگوں نے کہا گھبرا مت تیری چیز موجود ہے مگر تو پہلے زیورات کی فہرست اور علامات بتا تاکہ ہم سمجھیں کہ ہاں تیری ہی ہے اُس نے مکمل فہرست اور پوری علامت بتادی لوگوں نے وہ زیورات اُس کے حوالے کیے اور اُس کو غریب جان کر کچھ اور چندہ وغیرہ کر دیا۔ بعد میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ جال تھا اور یہ عورت اسی مسافر کی بیوی تھی دونوں میاں بیوی نے اس طرح سے لوگوں کو ٹھگا تھا۔

یہ میں نے آپ کو اس پر سنایا کہ کسی کے محض وعظ کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ وعظ میں بہت اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے اور صرف قال سُن کر کسی کا معتقد نہیں ہو جانا چاہیے۔ جب تک کہ اُس کے عمل و حال کو نہ دیکھ لے کہ متبع سنت ہے یا نہیں۔ اب اہل اللہ کے حال کی ایک مثال سُنیے۔

امام ابُو حنیفہ نے ایک امام کے پیچھے عشا کی نماز پڑھی۔ اُس نے سورۂ اذا زلزلت

پڑھی لوگ تو نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن امام صاحبؒ وہیں کھڑے اپنی داڑھی کو پکڑے ہوئے ساری رات فجر تک یہی کہتے رہے۔ یَا مَنْ یَجْزِیْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرٍ خَیْرًا وَیَا مَنْ یَجْزِیْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرٍّ شَرًّا اَجِرْ عَبْدَكَ النُّعْمَانَ مِنَ النَّارِ۔

یعنی اے وہ ذات جو ذرہ برابر خیر کا بدلہ خیر سے دیگی اور ذرہ برابر شر کا بدلہ شر سے دیگی اپنے بندہ نعمان کو دوزخ سے نجات فرما۔

یہ حال تھا ورنہ تو امام نے آیت پڑھی اور سب مقتدیوں نے اس کو سنا لیکن ان پر ایسا اثر نہیں ہوا لیکن امام صاحب کو اس آیت نے پکڑ لیا اور ساری رات روتے رہے اور یہی دعا کرتے رہے۔

حضرت زفرؒ بیان کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے میرے یہاں ایک شب قیام کیا۔ میں نے دیکھا کہ ساری رات یہی آیت پڑھتے رہے۔ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ ۝

ترجمہ :۔ اور قیامت بڑی سخت اور ناگوار چیز ہے۔

اور انھیں سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ تمام رات اسی آیت کو پڑھ کر گزار دیا۔

فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝

ترجمہ :۔ سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچالیا۔

دیکھا آپ نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہ حالات تھے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات ائمہ فقہ صرف علم ظاہر کے امام اور پیشوا تھے حالانکہ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا باطن خدا کے ساتھ کس طرح مشغول رہتا تھا اور حق تعالیٰ سے ان حضرات کا معاملہ کیسا درست تھا۔ ان حالات کے پیش نظر بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ جس طرح فقہ ظاہر میں امام تھے اسی طرح فقہ باطن کے بھی امام تھے۔ مذکورہ بالا واقعات اس کی بین دلیل اور واضح برہان ہیں اور امام صاحب کے سب ماننے والوں پر یہ واقعات حجت ہیں لہٰذا ان کو اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے اور امام صاحب کی اقتدا ان حالات میں بھی کرنی چاہیے۔

(مسرفقہ حق)

مسلمانوں میں غیر اسلامی کلچر کے اسباب

(مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی "مدیر برہان" کے ایک طویل سلسلۂ مضمون سے اقتباس)

اسلام فقط چند رسوم اور عبادات و معاملات کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک تہذیب، ایک سماجی نظام اور دستور معاشرت بھی ہے اور جس طرح پھل اپنے ذائقہ اور درخت اپنی صورت سے پہچانا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان اپنے طور طریق اور طرز معاشرت سے پہچان لیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ اقوام عالم کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کی معاشرت اور اس کے سماجیات میں مکمل انفرادیت اسی وقت باقی رہتی ہو جب تک اس کا خلاملا اور ارتباط دوسری قوموں کیساتھ نہیں ہوتا، جب ارتباط اور دوسری قوموں کیساتھ میل جول بڑھتا ہو تو اب باہمی جذب و انجذاب اور تاثیر و تاثر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ایک قوم کی تہذیبی زندگی میں ــ اور اگر اس کی تہذیب اور مذہب میں گہرا ربط ہو تو اس کی مذہبی زندگی میں بھی ــ یہ مرحلہ بہت نازک اور بعض اوقات خطرناک اور مہلک ہوتا ہو کیونکہ مختلف قسم کے داخلی اور خارجی عوامل و موثرات ہوتے ہیں جو اس قوم کی تہذیبی انفرادیت اور تمدنی خصوصیات و امتیازات کے لیے ایک چیلنج کا حکم رکھتے ہیں۔ قومی زندگی کے اس موڑ پر وہ قوم بڑی خوش نصیب ہوتی ہے جو دوسروں کا اثر کم سے کم قبول کرتی اور اپنے سے متاثر زیادہ سے زیادہ کرتی ہے جو قوم اس کا حوصلہ رکھتی اور ایسا کر سکتی ہے وہی اس عہد کی ترقی یافتہ اور اعلیٰ قوم ہوتی ہے۔

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اسے دنیا میں پھیلنا اور مختلف تہذیب و تمدن رکھنے والی قوموں کو اپنے زیر سایہ لینا تھا۔ یا کم از کم مسلمانوں کی سوسائٹی محدود۔ بند (CLOSED) اور علیحدگی پسند (ISOLATED) نہیں ہو سکتی تھی۔ انھیں لامحالہ دوسری قوموں کے ساتھ مل جل کر

زندگی بسر کرتا تھا۔ اس بنا پر اس قسم کے مواقع کے لیے اس کی تعلیمات بالکل صاف اور واضح ہیں۔ ایک طرف حکمت کو مومن کی متاع گمشدہ قرار دے کر وہ جہاں کہیں بھی ہو اسے حاصل کرنے کی اور اسی طرح علم خواہ کتنے ہی دور دراز مقام پر ہو اور اس کی تحصیل کی ترغیب دی گئی ہے اور دوسری جانب اس کا عمل "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر رہا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو اجنبی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا اور خود بعض چیزیں اہل ایران کی اختیار فرمائیں۔ حضرت عمر کے زمانے میں جب فتوحات کی وسعت ہوئی تو غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط اور ارتباط کا دائرہ اور وسیع ہوا اور غیر ملکی اثرات کا رنگ اور زیادہ گہرا ہونے لگا اسی کا تاثر تھا جس کی وجہ سے ایک مرتبہ خلیفہ دوم نے فرمایا تھا۔ "اے کاش ہمارے اور ایران کے درمیان آگ کی ایک دیوار حائل ہوتی" بنی امیہ کے عہد میں ریاست کا دفتری نظم و نسق اور فوجوں کی تقسیم اور ان کی تنظیم کے قواعد و ضوابط زیادہ تر بازنطینی ایرانی اور ایک حد تک یونانی اثرات کا نتیجہ تھے۔ لیکن چونکہ بنو امیہ کے عہد تک عربی عصبیت قائم رہی اس بنا پر تہذیب و تمدن کا عام خاکہ عجمی اثرات سے پاک تھا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بڑی حد تک اس عہد میں "خذ ما صفا" پر عمل ہوتا رہا۔

لیکن بنو عباس کی حکومت کے قائم ہوتے ہی یہ بند ٹوٹ پڑا۔ اور عجمی اثرات کے سیلاب نے اسلامی تہذیب کی دیوار میں افراط و تفریط کے رخنے پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ یہ اثرات ملے جلے تھے اور ان کا ہیولیٰ مختلف قوموں کی تہذیبی اور تمدنی خصوصیات کے باہم امتزاج سے تیار ہوا تھا لیکن ان میں سب سے زیادہ گہرا رنگ ایران کا تھا۔ حد یہ ہے کہ حرم شاہی میں وزراء، امراء اور اعیانِ حکومت کے محلات میں نوروز اور ایرانیوں کے دوسرے تیرتہوار بالکل ایرانی رسم و رواج کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ ان چیزوں نے اسلامی تہذیب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ اس کی تصویر اس زمانہ کے ادبی سرمایہ، شعر و شاعری اور تاریخ کی کتابوں کے آئینہ میں صاف نظر آتی ہے۔ راقم الحروف کی پرانی کتاب "مسلمانوں کا عروج و زوال" میں بھی اس کا ایک عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایرانیوں کا ایک عام مقولہ مشہور ہے کہ عربوں نے ہمارے ملک اور جسم کو فتح کیا تو کیا ہوا؟ ہم نے ان کا دل و دماغ اور ان کی روح کو جیت

یا۔ یہ بات اس زمانہ کی ہے جب کہ مسلمانوں کی سیاسی سطوت اور شوکت وصولت کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجتا تھا۔ اور جب دنیا کی کوئی طاقت مشکل سے ان کی حریف ہو سکتی تھی۔ اب خود اپنے ملک کو دیکھیے، یہاں آٹھ سو برس کے لگ بھگ مسلمانوں نے حکومت وسلطنت کا پرچم لہرایا اور اس سلسلے میں بے شبہہ انھوں نے عدل وانصاف۔ معاشرتی اصلاح وتعمیر اور علم وفن میں ترقی اور اس کی حوصلہ افزائی کی ایسی شاندار روایات قائم کی ہیں جو کسی قوم کے لیے سرمایۂ افتخار ونازش ہو سکتی ہیں لیکن ساتھ ہی اس المناک حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ اس ملک کی پرانی تہذیب اور اس کے مذہبی افکار، خیالات اور تہذیبی عوائد ورسوم نے مسلمان فاتحین کو اس درجہ متاثر کیا کہ مغلیہ سلطنت کا گل سر سبد اکبر اعظم "زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا تیرا" کا مصداق بن گیا۔ اکبر کا عمل صرف ایک انفرادی عمل اور شخص واحد کی اپج نہیں ہے بلکہ اس عہد کے مسلمانوں کی تہذیبی علامت ہے۔ دو ڈھائی برس سے زیادہ سے برہان میں ایک نہایت محققانہ اور معلومات افزا مضمون "ہندو تہذیب اور مسلمان" کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے لوگ اس کو دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں، بہر حال یہ مقالہ مسلمانوں کے لیے ایک مرقع عبرت ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں نے ہندو تہذیب کے جو اثرات قبول کیے ہیں وہ کس درجہ وسیع، عمیق اور دور رس ہیں اور انھوں نے ان کے حجازی چہرہ کو کس درجہ مسخ اور متغیر ومتبدل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو قبروں کو ٹھنڈا رکھے جنھوں نے اس صورت حال کے خلاف جہاد عظیم کیا اور سوسائٹی کی اصلاح کی۔ لیکن آج بھی شہروں میں نسبتاً کم اور دیہاتوں اور قصبات میں زیادہ ایسے مسلمان آباد ہیں جو اب تک ہندو تہذیب کے ان ہمہ گیر اثرات سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکے۔ حالانکہ زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے عام ہو جانے کے باعث اب خود ہندوؤں میں ایک بڑا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو قدیم ہندو تہذیب کے شادی وبیاہ اور مرنے جینے کی ناپسندیدہ رسومات کے خلاف سخت احتجاج کر رہا ہے۔

یقین کیجیے۔ میں نے بارہا بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ اس پر غور کیا ہے کہ مغربی ممالک میں انگریز اور فرانسیسی یہ دو قومیں ہیں جو کلچر کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ قومیں سمجھی جاتی ہیں، کم وبیش دو سو برس سے ان قوموں نے ایشیا اور افریقہ کی ......

مختلف المذاہب اقوام و امم کو اپنے کلچر سے متاثر کرنا شروع کیا ہے اور آج عالم یہ ہے کہ ان کی تہذیب اور ان کے کلچر نے دنیا کے سب انسانوں کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جما رکھا ہے اور یہ تسلط اور اس کلچر کی گرفت اس درجہ شدید ہے کہ شاعر مشرق اقبال کی طرح جو لوگ ۔

فریاد ز افرنگ و دلاویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

کا نوحہ پڑھتے ہیں اور وہ بھی کسی نہ کسی درجہ میں اس تہذیب کا صید زبوں نظر آتے ہیں لیکن خود انگریز اور فرانسیسی قوم کو دیکھیے تو دو سو برس سے مشرقی اقوام کی تہذیب کا کوئی اثر قبول نہیں کیا گویا اس قسم کے مواقع کے لیے باہمی جذب و انجذاب کا جو فطری قانون ہے ان قوموں نے اس کو بھی اپنے اوپر اثر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ ایک طرف تبکدۂ یورپ کے برہمن افرنگ کی یہ پختہ زناری دیکھیے اور دوسری جانب میکدہ توحید کے جام برداروں کی یہ سہل انگاری ملاحظہ فرمائیے کہ ابھی پوری ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ان کی اصل تہذیب اور ثقافت کے روئے روشن و جبین شفاف پر دریوزہ گری اغیار کی گرد جمنے لگی۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا میں نے اس سوال پر بہت غور کیا ہے اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کے اسباب متعدد ہیں۔ مثلاً اسلامی فتوحات کی کثرت و وسعت اور فتوحات کے باعث دولت و ثروت کی افراط وغیرہ! لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور موثر چیز اسلامی مملکت میں مختلف ملکوں کی باندیوں اور غلاموں کی ریل پیل ہے۔ انھوں نے عربوں کی اندرون خانہ زندگی میں دخیل ہو کر اور اپنے بعض ظاہری اور باطنی اوصاف و کمالات سے ان کے دل و دماغ کو مسحور کر کے ان کو بہت جلد اپنی قومی اور ملکی تہذیب کے شیشہ میں آتار لیا۔ اس کے برخلاف انگریزوں اور فرانسیسیوں کا اختلاط و ارتباط مشرقی اقوام کے ساتھ اگرچہ بہت کچھ رہا ہے لیکن انھوں نے ایک چیز کی پابندی اور اس کا التزام کیا ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے اس کی اجازت دی ہے کہ مشرق کے مردان کی عورتوں سے شادی کریں لیکن وہ اس کے روادار نہیں ہوئے کہ ان کے مرد مشرقی خواتین کے ساتھ زناشوئی کے تعلقات پیدا کریں۔ ہمارے یہاں ایک مسلمان کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن ایک مسلمان لڑکی کتابی مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کے برخلاف شریعت یہود میں ایک یہودی لڑکی غیر مذہب کے مرد سے نکاح کر سکتی ہے لیکن مرد یہودی غیر عورت سے زناشوئی تعلق قائم نہیں کر سکتا۔ علمائے یہود اس حکم کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکی کسی غیر مذہب کے گھر پہنچ جائیگی

تو اولاد پر تو اس کا خاص اثر ہوگا ہی گھر کے دوسرے افراد بھی اس کے زیر اثر ہوں گے۔ کیونکہ ایک گھر کے افراد پر عورت کا جو اثر ہوتا ہے۔ مرد کا نہیں ہوتا۔ اسلام میں اہل کتاب خواتین سے نکاح کرنا بے شبہ جائز اور مباح ہے لیکن اگر کسی مباح کا استعمال سوچے سمجھے بغیر محض حظ نفس کی خاطر اور کثرت سے کیا جائے تو جلد یا بدیر اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا اور بعض اوقات اس کے نتائج بڑے خطرناک اور دور رس ہوتے ہیں۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب کہ ایک قوم کا فرمان روا یا اس کا رہنما اس طرح کے معاملات میں دخل دیتا اور قوم کے لیے ایک راہ عمل متعین کرتا ہے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ سے بڑھ کر شریعت کا نباض اور اسلام کے مزاج اور طبیعت کا رازداں اور کون ہوگا؟ انہیں وجوہ کے پیش نظر آپ نے کتابیہ عورتوں سے نکاح کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کوتاہ نظر سمجھتے ہیں کہ آپ کا یہ عمل اور اسی طرح کے بعض دوسرے احکام قرآن کے حکم کے خلاف اور شریعت میں مداخلت ہیں۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ قرآن میں جن مباحات کا ذکر ہے حضرت عمر جانتے تھے کہ ان کا موقع محل کیا ہے؟ ان کو مباح کیوں رکھا گیا ہے؟ اور ان کا استعمال کب مفید یا ضروری اور کب نامناسب یا نقصان رساں ہوتا ہے!

پس یہی معاملہ استرقاق کے ساتھ پیش آیا۔ جیسا کہ راقم الحروف نے اپنی کتاب الرق فی الاسلام میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ استرقاق اسلام میں بے شبہ مباح تھا۔ لیکن مسلمانوں کو اور خصوصاً سلاطین و خلفا اور علما کو سمجھنا چاہیے تھا کہ اس جواز کی اور شریعت کی اصل اسپرٹ کیا ہے۔ اس بے توجہی اور مصلحت ناشناسی کا انجام کس درجہ ہولناک اور تباہ کن ہوا ہے؟ اس کا تصور کر کے بھی جگر خون اور کلیجہ پاش پاش ہوتا ہے۔ عورت اور شراب دونوں لازم و ملزوم ہیں چنانچہ حکومت کے ایوانوں پر موالی کا اقتدار بڑھا اور معاشرہ میں عورت کو نفوذ و اثر حاصل ہوا تو بنت العنب بھی اس کے جلو میں آئی۔ عہد بنی عباس کا لٹریچر اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ نثر کا سرمایہ ادب کی فضول کہانیوں سے اور شعرا کے دواوین خمریات اور اس کے متعلقات کے ذکر و افکار سے پر ہیں فآہا ثم آہا ثم آہا۔

(برہان دہلی مارچ ۱۹۷۱ء)

حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی تدفین کا واقعہ

اور اس کے بارے میں

اکابر علماء و اہل فتویٰ کی تحقیقات و فتاویٰ

الفرقان کے گزشتہ شمارے میں اس قضیہ سے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ناظرین کرام کی نظر سے گزر چکا ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ حضرتؒ کے وصال کے ۹ سال بعد اس ناخوشگوار قضیہ پر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیدا ہوئی کہ ہمارے محترم حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا ایک بیان اس سلسلے میں چند ہفتے پہلے ہفتہ وار "الجمعیۃ" میں شائع ہوا تھا، جو واقعہ سے متعلق کچھ لوگوں کی فراہم کردہ غلط اطلاعات اور غیر صحیح معلومات پر مبنی تھا اور اس لیے قدرتی طور پر افسوسناک درجہ میں غیر صحیح اور واقعات کے خلاف تھا — اس کے باوجود ایک حلقہ یہ شہرت دے رہا تھا کہ موصوف نے یہ بیان "دارالعلوم دیوبند" اور "جماعت علماء دیوبند" کے نمائندہ کی حیثیت سے دیا ہے اور گویا یہ پوری جماعت کا فیصلہ ہے — بہرحال اس کے تدارک ہی کے لیے اپنا فرض سمجھ کر اور دل پر جبر کر کے "الفرقان" کے گزشتہ شمارہ میں وہ مضمون لکھا گیا تھا جو قارئین کرام پڑھ چکے ہیں — اسی کے ساتھ گزشتہ شمارہ ہی میں حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب کا دوسرا مختصر بیان بھی شائع ہو چکا ہے، جس میں ممدوح نے یہ وضاحت فرمانے کے بعد کہ ان کا پہلا بیان صرف شخصی اور ذاتی حیثیت سے لکھا گیا تھا، یہ بھی اعتراف فرمایا ہے کہ وہ کچھ فتووں کی بنا پر

اور انہی کی روشنی میں لکھا گیا تھا جو اس وقت سامنے تھے، دوسرے فتووں کا علم نہیں تھا، اب دوسرے فتوے بھی ان کے پاس پہونچ گئے ہیں (جن میں پہلے فتوؤں سے مختلف رائے ظاہر کی گئی ہے) اس لیے اب وہ مسئلے پر از سر نو غور فرما رہے ہیں۔

حضرت مہتمم صاحب کے اس دوسرے بیان کے بعد ان کا وہ پہلا بیان تو کالعدم ہو گیا جسکی وجہ سے اس مسئلہ پر لکھنے کی ضرورت پیدا ہوئی تھی، لیکن جب مسئلہ چھڑ گیا ہے اور ناظرین کے علم میں یہ بات بھی آچکی ہے کہ اس واقعہ سے متعلق فتووں میں کچھ اختلاف ہے، اور ایک حلقہ اب بھی اپنی غلط رائے اور غلط رویہ پر مصر ہے اور اس کے لیے کچھ فتووں کا بھی حوالہ دے رہا ہے۔ تو اس کی مزید وضاحت اور تحقیق کی ضرورت باقی ہے تاکہ واقعہ کی حقیقت اور شرعی حکم واضح ہو کر سامنے آجائے۔ واللہ الموفق وھو المستعان۔

تدفین کس طرح ہوئی۔

راقم سطور گزشتہ شمارہ کے مضمون میں ذکر کر چکا ہے کہ جب مجھے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے بیان کا علم ہوا تو میں نے حضرت قدس سرہ کے حقیقی بھتیجے جناب مولانا عبدالجلیل صاحب کو اُن کے مکان و مستقر ڈھڈیاں (ضلع سرگودھا) کے پتہ پر خط لکھا کہ وہ تدفین کے واقعہ کی پوری تفصیل لکھ کر بھیجدیں، اور ہو سکے تو چند دوسرے ایسے ذمہ دار اور قابل اعتماد حضرات سے بھی اس کی تصدیق کرا دیں جو اول سے آخر تک تدفین میں شریک رہے ہوں ـــــ مولانا موصوف سفر حج پر روانہ ہو چکے تھے جس کا مجھے علم نہیں تھا، جب میرا خط ڈھڈیاں پہونچا تو گھر کے دوسرے لوگوں نے اُس کو مولانا عبدالجلیل صاحب کے پاس مکہ مکرمہ بھجوا دیا۔ جب دو تین ہفتہ تک کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے دوسرا خط تقاضے کے طور پر ڈھڈیاں ہی کے پتہ پر لکھا۔ اس خط کے پہونچنے پر حضرت اقدس کے حقیقی بھانجے مولانا عبدالوحید صاحب نے مجھے جواب دیا کہ بھائی عبدالجلیل صاحب حجاز مقدس جا چکے ہیں اور تمہارا خط ان کو وہیں بھیجدیا گیا ہے، وہ وہیں سے جواب دیں گے ـــــ لیکن حضرت اقدس رح کے دفن کی تفصیل جس کی تم نے فرمائش کی ہے وہ ہم لکھے دیتے ہیں ـــــ چنانچہ انھوں نے پوری تفصیل لکھی

اور میری فرمائش کے مطابق اس پر ڈھڈیاں اور قریبی قصبہ جھاوریاں کے دوسرے متعدد اہلِ علم اور ذمہ دار حضرات سے تصدیق بھی کرا دی جو خود تدفین میں شریک تھے۔

اُدھر جب مولانا عبد الجلیل صاحب کو مکۂ معظمہ میں میرا خط ملا تو انھوں نے وہاں سے بھی تدفین کے واقعہ کی پوری تفصیل لکھی اور حسنِ اتفاق سے وہیں اُن کے ساتھ جھاوریاں کے حضرت قاضی عبد القادر صاحب نقشبندی اور حضرت مولینا مفتی زین العابدین صاحب لائلپوری بھی تھے جو اول سے آخر تک تدفین میں شریک رہے تھے۔ اُن حضرات نے بھی اس پر تصدیق و توثیق تحریر فرمائی۔

ان سب تحریروں سے تدفین کے پورے واقعہ کی تفصیل اس طرح سامنے آتی ہے۔[1]

حضرت قدس سرہ کا وصال اور تدفین:-

لاہور میں ۱۴ ربیع الاول سنہ ۸۲ھ (۱۶ اگست سنہ ۶۲ء) کو ۱۲ بجے سے کچھ پہلے حضرت اقدس سرہٗ کا وصال ہوا۔ حضرت کے حقیقی بھائی حضرت حافظ محمد خلیل صاحب مدظلہ (جو حضرت کے خواص مجازین میں سے بھی ہیں) اور اُن کے صاحبزادے مولانا عبد الجلیل صاحب اور حضرت کے حقیقی بھانجے مولنا عبد الوحید صاحب اور دوسرے قریبی اعزہ جو وہاں موجود تھے، انھوں نے اصل وطن (ڈھڈیاں ضلع سرگودھا) لے جا کر دفن کرنے کا فیصلہ کیا (اور ظاہر ہے کہ اس فیصلہ سے خواہ ہمیں اتفاق نہ ہو، لیکن اس بارہ میں فیصلہ کا اختیار ولی ہونے کی حیثیت سے شرعاً قانوناً اور عرفاً انہی حضرات کو تھا)

یہ بھی طے ہو گیا کہ پہلی نماز جنازہ ۵½ بجے لاہور میں ہوگی، اُس کے بعد جنازہ براہ لائل پور، سرگودھا ڈھڈیاں روانہ ہوگا۔ اس فیصلہ اور پروگرام کی اطلاع ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ مختلف شہروں کو دے دی گئی۔

اس فیصلہ کے بعد خود حضرت حافظ محمد خلیل صاحب، حضرت قاضی عبد القادر صاحب کو

---

[1] آگے تدفین کی جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ ان تحریروں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ گزشتہ شمارہ میں اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ وہ تھا جو ان تحریروں کے مطالعے سے میرے ذہن میں بطور حاصل اور خلاصہ کے محفوظ تھا۔ لہٰذا اگر کسی بات میں کچھ فرق محسوس ہو تو اس بیان پر اعتماد کیا جائے جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔

ساتھ لے کر قبر کی تیاری اور تدفین کے انتظامات کے لیے ڈھڈیاں تشریف لے گئے۔ وہاں پہونچ کر بستی کے قبرستان کے قریب اپنی ذاتی زمین میں قبر تیار کرانی شروع کر دی، لیکن چونکہ موسم آخر برسات کا تھا اس لیے قریباً ۲ ہی فٹ کھدائی کے بعد گیلی مٹی نکلنے لگی، تو وہاں تدفین کا ارادہ ترک کر دیا گیا، اور اہلِ خاندان اور گاؤں والوں کی رائے ہوئی کہ گاؤں کی مسجد کے صحن کے بالکل برابر جانب شمال میں حجروں کے سامنے جو طویل و عریض قطعۂ زمین ہے (جو حضرت اقدسؒ کے خاندان ہی کی ملکیت تھا، اور جس میں حضرت قدس سرہٗ ڈھڈیاں قیام کے زمانہ میں سایہ کے اوقات میں اکثر تشریف فرما ہوتے تھے اور مجلس وہیں ہوتی تھی) اسی میں حضرت اقدسؒ کی تدفین ہو۔

اور یہاں صورت یہ تھی کہ مسجد کی عمارت کو کئی سال پہلے سیلاب سے سخت نقصان پہونچ چکا تھا، اس لیے مسجد کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا تھا اور آئندہ سیلاب کے اثرات سے حفاظت کے لیے اس کی کرسی سابق کے لحاظ سے ۵-۶ فٹ بلند کر دی گئی تھی۔ مسجد کے صحن اور حجروں کے متعلق بھی یہ طے ہو گیا تھا کہ ان کو بھی اتنا ہی بلند کر کے مسجد کے متوازی کر دیا جائے گا۔

اسی طرح حجروں کے سامنے والے اس قطعۂ زمین کے بارے میں بھی یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اس پورے قطعۂ زمین میں بھی ۵-۶ فٹ مٹی بھر کر اس کو بھی صحنِ مسجد کے ہم سطح کر دیا جائے گا تاکہ جب سابق حجروں کے صحن کے طور پر بھی یہ استعمال ہوتا رہے۔ لیکن ابھی مسجد کے صحن اور اس قطعۂ زمین میں مٹی بھری نہیں جا سکی تھی۔

تو جب اس جگہ حضرت اقدس کی تدفین کا فیصلہ کیا گیا اور قبر کی کھدائی شروع ہوئی تو قریباً ایک فٹ کھدائی کے بعد ہی زمین سے راکھ اور کباڑ نکلنے لگا (کیونکہ گاؤں کی سطح بھی ایک دفعہ کے سخت سیلاب کے بعد کافی بلند کی گئی تھی اور اس میں راکھ اور کباڑ استعمال ہوا تھا)، تو لوگوں نے سوچا کہ جب یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس پورے قطعۂ زمین میں ۵-۶ فٹ مٹی ڈال کر مسجد اور صحن مسجد کے متوازی کیا جائے گا تو پھر اس زمین میں پوری قبر کھودنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی قطعۂ زمین پر شق ہی کی شکل میں قبر کیوں نہ بنا دی جائے۔ تدفین کے بعد جب اس قطعۂ زمین کو ۵-۶ فٹ مٹی سے بھر دیا جائے گا تو انجام کار شق ہی کی شکل ہو جائے گی ـــــ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر موجودہ سطح میں پوری قبر شق کے طور پر کھود کر تدفین کی جائے گی تو ۵-۶ فٹ مزید مٹی پڑ جانے کے بعد حضرت کا جسدِ مبارک

اوپر کی سطح سے ۱۱-۱۲ فٹ نیچے ہو جائے گا حالانکہ اتنا نیچے نہ ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ان کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ پوری قبر کھودنے کی صورت میں موسم کی وجہ سے یہاں بھی گیلی مٹی نکلنے لگے

الغرض ان سب باتوں کے پیش نظر بعض اُن علماء کرام سے استصواب کر کے جو دفن میں شریک تھے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اسی کھدی ہوئی زمین میں (جو صرف ۱½ فٹ کے قریب کھودی گئی تھی) نیچے پختہ اینٹوں[1] کا فرش کیا، اسی فرش پر حضرت کا تابوت رکھا گیا، تابوت کے چاروں طرف شق کی شکل میں اکہری اینٹ کی دیواریں قریباً ۲ فٹ بلند کھڑی کی گئیں اور اوپر کی جانب اینٹوں ہی کی چھت یعنی ڈاٹ لگا کر اس کو بند کر دیا گیا۔ پھر ہر طرف سے اس پر مٹی ڈال دی گئی۔ اتنا کام تدفین کے وقت رات کے بالکل آخری حصہ میں گویا صبح تک ہو گیا۔ پھر اسی دن اس قطعۂ زمین میں طے شدہ تجویز کے مطابق مٹی بھرنے کا کام شروع ہو گیا اور اتنی مٹی اسی روز پڑ گئی کہ اینٹوں سے جو شق کی شکل بنائی گئی تھی مٹی اس کے اوپر تک آگئی۔ پھر یہ کام یہاں تک جاری رہا کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق مسجد کے صحن اور اس پورے قطعۂ زمین میں ۵-۶ فٹ مٹی بھر کر سطح مسجد کے بالکل متوازی کر دیا گیا۔ اور پھر اوپر تابوت کی جگہ پر کوہان نما قبر بنا دی گئی۔ اور نقشہ یہ بن گیا کہ جانب مغرب میں مسجد کا مسقف حصہ ہے جس کی کرسی باہر کی سطح زمین کے مقابلہ میں ۵-۶ فٹ بلند کی گئی ہے، اُسکے آگے مسجد کا صحن ہے جو اب مسجد کے ہم سطح ہے، شمال میں مسجد سے متعلق حجرے اور اُن کا برآمدہ ہے۔ ان کے سامنے ۲۸ فٹ طویل اور ۲۰ فٹ عریض یہ قطعۂ زمین ہے۔ جو ۵-۶ فٹ مٹی بھر جانے کے بعد مسجد اور صحن کے بالکل متوازی ہو گیا ہے، اسی قطعۂ زمین پر حضرت کی کوہان نما قبر ایک فٹ سے کچھ زیادہ بلند بنی ہوئی ہے۔ مولانا عبدالجلیل صاحب نے اپنے خط میں موجودہ صورت کا یہ نقشہ بھی دیا ہے جو ناظرین کرام کے سامنے ہے۔

جانب مغرب

مسجد کا مسقف حصہ | حجرہ | حجرہ

برآمدہ

صحن مسجد

قطعۂ زمین جس میں تدفین ہوئی ہے

قبر شریف

مدرسہ ۔ چھپر

---

[1] پختہ اینٹیں اس لیے استعمال کرنا پڑیں کہ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے گاؤں میں اُس وقت کچی اینٹیں دستیاب نہیں ہو سکیں۔

اس تدفین کے بعد حضرت قدس سرہٗ سے تعلق رکھنے والے ایک حلقہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار اور اس پر اصرار شروع ہوا کہ چونکہ حضرت اقدس کی خواہش اور تمنا اور اُن کے بقول وصیت بھی، ٹرے پور میں اپنے مرشد برحق حضرت شاہ عبدالرحیم نوراللہ مرقدہٗ کے برابر میں دفن ہونے کی تھی اس لیے اس تدفین کے بعد بھی تابوت کو موجودہ مدفن سے نکال کر رائے پور لے جاکر دفن کرنا چاہیے۔ ــــ اسی کے ساتھ ایک شوشہ یہ بھی چھوڑا گیا کہ حضرت اقدس کو جس طرح دفن کیا گیا ہے اس سے دفن کا فریضہ ہی پورا نہیں ہوا اور تدفین ہی متحقق نہیں ہوئی، اور حضرت اقدس کی میت گویا مدفون ہی نہیں ہوئی بلکہ (معاذ اللہ) اس کو محبوس و مقید کر دیا گیا ہے۔

پھر خدا کے ان بندوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کچھ خاص ذرائع استعمال کر کے حکومت ہند کی طرف سے حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرایا کہ ہمارے ملک کے ایک آدمی (یعنی حضرت قدس سرہٗ) کا انتقال تمہارے ملک میں ہو گیا ہے، تم اس کی لاش یہاں واپس کر دو ــــ اور دوسری طرف اسی قسم کے ذرائع استعمال کر کے حکومت پاکستان سے تعلق رکھنے والے بعض اصحابِ اقتدار کی اعانت و حمایت بھی اس "کارِ خیر" کے لیے حاصل کر لی گئی۔ لیکن انجام کار اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور جیسا کہ وہاں کی اطلاعات سے معلوم ہوا ہے اُس وقت کے وہاں کے گورنر نے حقیقتِ واقعہ معلوم ہونے پر سختی سے اس کو رد کر دیا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

مگر معلوم ہوا ہے کہ یہ حضرات اب بھی ان کوششوں سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں اور اس رُخ پر دوڑ دھوپ اب بھی جاری ہے، اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب سے جو بیان لکھایا گیا تھا (جس میں دونوں حکومتوں سے بھی درخواست کی گئی تھی) وہ بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی ــــ حیرت ہے کہ کس جذبہ نے اس قدر مغلوب الحال کر دیا ہے کہ یہ موٹی سی بات بھی یہ حضرات نہیں سمجھتے کہ اگر یہ دروازہ ایک دفعہ کھل گیا تو اس سے کتنے بڑے بڑے فتنے درآمد ہو سکیں گے۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ حکومت ہند کی یہ ذمہ داری ہے یا اس کو یہ حق حاصل ہے کہ یہاں کے کسی مسلمان کا انتقال اگر کسی دوسرے ملک میں ہو جائے تو مہینوں بلکہ برسوں کے بعد بھی اس کے شرعی وارثوں کی مرضی کے بغیر بلکہ اُن کے علی الرغم، اس کی لاش کو یہاں واپس کرنے کا مطالبہ کرے اور بین الممالکی قوانین کی بنیاد پر اُس کو اکھڑوا کر منگوا لے، تو مسلمانوں کے موجودہ تشتت اور ارباب حکومت کی

موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ اللہ کے کسی خوش نصیب بندے کا انتقال مکۂ معظمہ یا مدینۂ طیبہ میں ہو جائے اور اس کو جنتہ المعلیٰ[1] یا جنتہ البقیع میں دفن ہونا نصیب ہو جائے اور یہاں اس کے دشمن اور بدخواہ صرف دشمنی اور عناد کے جذبہ کے تحت اور اس مرحوم بندہ کے گھر والوں کو ایذا پہونچانے اور پریشان کرنے کے لیے اپنے ذرائع اور وسائل استعمال کر کے حکومت ہند سے اس کی لاش جنتہ المعلیٰ یا جنتہ البقیع سے اکھڑوا کے ہندوستان واپس کیے جانے کا مطالبہ کرائیں اور اس طرح اس کے گھر والوں اور خاندان والوں کو رلا کر اور پریشان کر کے اپنے دلوں کو خوش کریں۔ یا کسی ناجائز مقصد کے لیے ان بیچاروں پر دباؤ ڈالیں۔

ظاہر ہے کہ اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی غیر معمولی ذہانت و فطانت اور کسی خاص درجہ کی باریک بینی کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بالکل کھلی حقیقت ہے، لیکن کتنے رنج و قلق کی بات ہے کہ ان ظاہر باہر خطرناک نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر اتنے غلط راستے پر چلا جا رہا ہے اور حضرتؒ قدس سرہ کی محبت کے دعوے کے ساتھ اس کو ایک "مقدس مہم" بنا لیا گیا ہے۔ فوا اسفاہ!

حکومتی سطح کی ان سخت قابلِ مذمت اور انتہائی ناعاقبت اندیشانہ کوششوں کا ذکر اور اس پر اپنے دردِ دل کا اظہار تو یہاں زبان قلم سے اضطراراً ہو گیا، ورنہ اس وقت تو تدفین کے واقعہ کی تفصیل اور اس کے بارہ میں اکابر و مشاہیر علماء شریعت و اصحابِ فتویٰ کی تحقیقات و فتاویٰ ہی پیش کرنے کا ارادہ تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جب حضرت قدس سرہٗ سے تعلق رکھنے والے ایک خاص حلقہ کی طرف سے یہ بات اٹھائی گئی کہ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی تمنا اور بقول اُن کے وصیت بھی رائے پور میں دفن ہونے کی تھی اس لیے حضرت کے تابوت کو موجودہ مدفن سے نکال کر اب رائے پور لے جا کر ہی دفن کرنا چاہیے، اور اسی کے ساتھ یہ کہ جس طرح حضرت کو دفن کیا گیا ہے یہ شرعاً تدفین ہی نہیں ہے،

---

[1] و [2] "جنتہ المعلیٰ" مکۂ معظمہ کا قدیمی قبرستان ہے اور "جنتہ البقیع" مدینۂ طیبہ کا قبرستان ہے جس میں دفن ہونا کسی مسلمان کی محبوب سے محبوب تمنا ہو سکتی ہے۔

اور گویا (نعوذ باللہ) حضرت ابھی دفن ہی نہیں کیے گئے ہیں بلکہ محبوس اور مقید کر دیئے گئے ہیں، —— اور پھر جب مجلسی چرچوں سے گزر کر زور وشور سے ان باتوں کا پروپیگنڈا ہونے لگا اور فتووں کے حوالے بھی دیئے جانے لگے اور یہ بات بھی علم میں آگئی کہ حکومتی سطح پر بھی اس کے لیے کوششیں شروع کر دی گئی ہیں، تو خود حضرت کے اہلِ خاندان اور دوسرے اہلِ تعلق نے اس بارہ میں حضرات علماء کرام اور اصحابِ فتویٰ سے استفسار کیا، اور ان حضرات نے جوابات دیئے۔

اس وقت راقم سطور کے سامنے اُسی وقت کے لکھے ہوئے چند غیر مطبوعہ فتاویٰ کے علاوہ دو مجموعے مطبوعہ فتاویٰ کے بھی ہیں، جن پر ہندوستان و پاکستان کے قریب قریب اُن سب ہی مشاہیر علماء و اصحابِ فتویٰ کی تصدیقات ثبت ہیں جو علومِ شریعت اور خاصکر فتوے میں ہمارے اس دور میں بجا طور پر سند اور مرجع سمجھے جاتے ہیں —— ان سب فتاویٰ کو اگر یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی —— اس لیے اُن کے صرف بقدرِ ضرورت و کفایت اقتباسات ہی پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔

حضرتؒ کے حقیقی بھتیجے مولانا عبد الجلیل صاحب نے اس بارہ میں جو استفتا کیا تھا پہلے وہ اور اُس کا جواب ذیل میں پڑھ لیجیے!

استفتا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارا گاؤں دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ جب دریا میں سیلاب آتا ہے تو گاؤں پانی سے بھر جاتا ہے، تین سال قبل تو اکثر مکانات گر گئے، اسی بنا پر گاؤں کی مسجد کو بھی از سرِ نو پانچ فٹ اونچی کرسی رکھ کر بنایا گیا، ابھی اس کے صحن اور مسجد کے ساتھ والے حجروں کے صحن میں پانچ فٹ اونچی مٹی ڈال کر مسجد کی کرسی کے برابر کرنا باقی تھا کہ ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا اور اہلِ گاؤں نے طے کیا کہ حجروں کے سامنے والے خارج از مسجد ۲۸ فٹ لمبے ۲۰ فٹ چوڑے صحن میں مرحوم کی قبر بنائی جائے۔ سیلابی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں لحد نہیں بن سکتی۔

چند فٹ کھودنے پر گیلی مٹی اور کبھی کیچڑ نکلنے لگتا ہے۔ اس بنا پر ہم نے یہ خیال کیا کہ اس جگہ پر ۲۰ فٹ چوڑا اور ۲۰ فٹ لمبا اور پانچ فٹ اونچا چبوترہ بنانا پہلے سے ہی طے ہے۔ اس وقت زمین کے اوپر اینٹوں سے ۵ فٹ اونچی شق بنا کر اس کے اندر تابوت رکھ دیا جائے۔ اور صبح گرد و نواح قبر میں مٹی ڈال کر حسب پروگرام چبوترہ بنا دیا جائے۔ اسی وقت چند علماء سے پوچھا۔ تو انھوں نے کہا کہ اگر اس جگہ پہلے سے چبوترہ بنا ہوا ہوتا تو کھود کر بھی اسی طرح شق بنائی جاتی۔ اور سیلاب کا عذر واضح ہے۔ نیز اس وقت پکی اینٹیں گاؤں میں موجود نہ تھیں۔ اس لیے نیچے اوپر پکی اینٹیں لگا دی گئیں۔ اور اس کے بعد قبر کے ارد گرد ۲۰ فٹ لمبا ۲۰ فٹ چوڑا ۵ فٹ اونچی مٹی ڈال کر چبوترہ بنا دیا گیا۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ تدفین محقق نہیں ہوئی۔ اس لیے اس بزرگ کی نعش مبارک والے لکڑی کے تابوت کو یہاں سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے۔ کیا تدفین محقق ہو گئی یا نہ؟ اور اب اس تابوت کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

عبد الجلیل بقلم خود

(حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب نے جو خود تدفین میں شریک بھی تھے مندرجۂ ذیل جواب لکھا۔)

الجواب۔ کبیری ص۵۵۵ پر ہے والشق ان یحفر حفیرۃ کالنھر ویبنی جانباھا باللبن او غیرہ ویوضع المیت بینھما ویسقف علیہ باللبن او الخشب ولا یمس السقف المیت، واستحب بعض الصحابۃ ان یرمس فی التراب یروی ذلک عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص وقال لیس احد جنبی اولی بالتراب من الآخر وقال صاحب المنافع اختار الشق فی دیارنا لرخاوۃ الاراضی فیتعذر اللحد فیھا حتی اجاز والآجر ورفوف الخشب واتخاذ التابوت ولو کان من الحدید ومثلہ فی المبسوط۔ البدائع والصنائع ص۳۱۹ج۱ پر ہے۔ وکان الشیخ ابوبکر محمد ابن الفضل البخاری یقول لا بأس بالآجر فی دیارنا لرخاوۃ الاراضی وکان ایضاً

یجوز دفوف الخشب و اتخاذ التابوت للمیت حتی قال لو اتخذ والتابوت من

حدید لم ار به باسا فی هذه الدیار۔

شامی صـ۸۳۵ جلد اول (وحفر قبره) فی غیر دار (مقدار نصف قامته) و

هذا حد العمق والمقصود منه المبالغة فی منع الرائحة ونبش السباع

طحطاوی صـ۳۶۱ پر ہے ووضع کثیر من الصحابة ان یرمسوا فی التراب

من غیر لحدٍ ولا شق وقال لیس احدٌ اولی بالتراب من الآخر ویلقی

وجهه التراب بلبنتین او ثلاث۔

فتاوی دار العلوم دیوبند صـ۲۳۶، جلد ۱

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید متوفی کا دوسرے موضع میں انتقال ہوا وارث کے پہونچنے سے پہلے غسل دیا گیا۔ وارث نے ظاہر کردیا کہ میت کو میں اپنے شہر لے جاؤں گا۔ اس موضع میں ہم راضی نہیں۔ باشندگان موضع مذکور نے بغیر کندنی قبر کے ہموار زمین پر صندوقچہ میں میت کو رکھ کر جبراً بلا رضا وارث کے قبر کے گرد اینٹیں لگادیں۔ اور نمونہ قبر کا بنا دیا۔ اب دعوی فریقین عدالت میں ہے۔ عدالت سے حکم ملا ہے کہ فیصلہ شریعت پر کیا جائے۔

الجواب۔ شریعت کے موافق اس میت کو اب دوسری جگہ منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ اور یہ طریقۂ دفن کا اگرچہ خلاف سنت ہے کہ بغیر قبر کھودنے کے صندوق میں میت کو رکھ کر قبر بنائی جائے۔ لیکن جبکہ قبر بنادی گئی تو اب اس کو نہ کھولا جائے۔ اور میت کو اس میں سے نہ نکالا جائے۔ آگے حوالہ جات ہیں۔ کتبہ (حضرت مولانا) عزیز الرحمٰن عفی عنہ

مذکورہ عبارات سے ظاہر ہے کہ اضطرار کی بنا پر لحد کے بجائے شق اور رخاوۃ الارض کی وجہ سے پختہ اینٹوں اور تابوتِ حدید (یعنی لوہے کے تابوت) تک کو تمام فقہا نے بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔

طحطاوی اور کبیری کی خط کشیدہ عبارات میں لحد و شق ہر دو غائب ہیں۔

بنا بریں جب آپ کے وہاں زمین سیلابی ہے۔ اور جہاں قبر بنائی وہ نیچی تھی۔ وہاں تقریباً ۵ فٹ اونچی مٹی ڈال کر باقی زمین کے برابر کرنا پہلے سے طے تھا۔ چنانچہ ۲۰ فٹ لمبی

۲۸ فٹ چوڑی اور ۸ فٹ اونچی مٹی اس پر بنائی ہوئی شق کے ارد گرد ڈال دی گئی، تو بصورت شق تدفین بلاشبہ محقق ہو گئی۔ اور عزیز البغدادی کی عبارت سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بلا ضرورت و بلا اجازت ولی جبراً بھی زمین پر صندوق رکھ کر ارد گرد اینٹیں لگا دی جائیں تو تدفین محقق ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ صورت خلافِ سنّت ہے۔

۲:- اور قبر بن جانے کے بعد قبر کھولنا اور میّت کو دوسری جگہ منتقل کرنا بالاجماع حرام ہے (الا لحق آدمی) چاہے میّت نے کسی اور جگہ دفن کرنے کی وصیت کی ہو۔ یہاں تک کہ اگر میت کو بلا غسل یا بلا کفن یا بلا نماز جنازہ یا مستدبراً الی القبلہ (رو بہ قبلہ کے بجائے پشت بہ قبلہ) دفن کر دیا گیا ہو۔ تو غسل دینے، کفن دینے، نماز جنازہ پڑھنے اور میت کو قبلہ رُخ کرنے جیسی اہم ضرورتوں کے لیے بھی قبر کھولنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔

نور الایضاح ص۱۲۳ ولا یجوز نقلہ بعد دفنہ بالاجماع الا ان تکون الارض مغصوبۃ او اخذت بالشفعۃ۔

شامی ص۸۴۲/۱ وکذا ابطل لو اوصی بان یکفن فی ثوب کذا او یدفن فی موضع کذا، کما عزاہ الی المحیط الا ان المذکور فی المنتقی ان ھذہ الوصیۃ باطلۃ۔

خلاصۃ الفتوی ص۲۲۵۔ اذا دفن بغیر کفن لا ینبش القبر ولو دفن قبل الغسل لا ینبش ایضاً وقبل الصلوٰۃ قد مر ایضاً۔

کبیری ص۵۵ وکذا لو لم یغسل اصلا ولم یکفن فانہ لا ینبش بعدما اھیل علیہ التراب لان الغسل والکفن مامورٌ والنبش حرام والنہی راجحٌ علی الامر۔

ھذا ما ظھر لی والعلم عند اللہ الخبیر

زین العابدین غفرلہ (مفتی وخطیب جامع مسجد لائل پور)

پھر پاکستان کے قریب قریب تمام اکابر علماء و اہلِ فتویٰ نے اس فتوے کی تصدیق و توثیق فرمائی اور وہ سب تصدیقات بھی فتوے کے ساتھ چھپی ہوئی ہیں، ان میں سے صرف ان چند حضرات کے اسمائے گرامی کا ذکر کر دینا یہاں کافی ہوگا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب

بنوری، حضرت مولانا ولی حسن صاحب، حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی، حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری (رحمۃ اللہ علیہ) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب حضرت مولانا عبدالحق صاحب (اکوڑہ خٹک)

بلاشبہ پاکستان میں یہی وہ حضرات ہیں جن کا مقام علوم شریعت اور خاصکر فقہ و فتاویٰ میں مسلم ہے اور جن کو مرجعیت حاصل ہے۔

پھر یہ فتویٰ توثیق و تصدیق کے لیے ہندوستان میں دیوبند و سہارنپور کے مراکز میں بھی بھیجا گیا، یہاں اس وقت کے دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ تصدیق و توثیق فرمائی:-

"الجواب صحیح والمجیب نجیح۔ بیشک تدفین کے بعد، اگرچہ خلاف سنت متوارثہ ہو نبش جائز نہیں۔ عبارات مجیب لبیب نے عدم جواز کی پیش کردی ہیں۔ وہ کافی ہیں۔

سید مہدی حسن غفرلہٗ (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) ۲/۱۲/۸۲ھ

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے اس وقت کے دوسرے مفتی صاحبان نے بھی توثیق و تصدیق فرمائی، نیز دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور موجودہ صدر المدرسین حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب اور نائب صدر المدرسین حضرت مولانا فخرالحسن صاحب نے بھی اس فتوے کی تصویب و تصدیق فرمائی۔

پھر سہارنپور کے اکابر علماء میں سے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا اور حضرت مولانا محمد اسعداللہ صاحب اور مظاہر علوم کے مفتی صاحبان نے بھی تصدیق و توثیق فرمائی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ ساری تصدیقات فتوے کے ساتھ چھپی ہوئی ہیں۔ اور یہ فتویٰ اب آٹھ نو آٹھ سال پہلے لاہور سے چھپ کر شائع بھی ہو چکا ہے، اور اس وقت وہی اڈیشن راقم سطور کے سامنے ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے، اس مسئلہ میں بنیادی سوال یہی ہے کہ اس طرح دفن کرنے سے (جس کی تفصیل خود دفن کرنے والوں اور ان کے شریک کاروں اور شاہدوں کے بیان کی بنا پر کی جا چکی ہے جن کی ثقاہت معلوم ہے) فریضۂ دفن ادا ہو گیا یا نہیں، اور تدفین متحقق ہو گئی یا نہیں؟

مولانا مفتی زین العابدین صاحب نے اپنے مندرجہ بالا فتوے میں جواب یہ دیا ہے کہ تدفین متحقق ہو گئی اور فریضۂ دفن ادا ہو گیا، اور اب کسی تبدیلی کے لیے نبش ہرگز جائز نہیں، بلکہ حرام ہے ـــــ اسی فتوے سے اُن تمام مذکورۂ بالا اکابر علماء اور مشاہیر اصحاب فتویٰ نے اتفاق کیا ہے جو علم شریعت اور فتوے میں ہندو پاکستان میں مرجع اور سند ہیں۔

حضرتِ مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب مدظلہٗ کی مکرّر توثیق:۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ پچھلے دنوں ایک صاحب کے خط سے راقم سطور کو معلوم ہوا تھا کہ حضرت رائے پوری قدس سرّہٗ کی تدفین ہی کے واقعہ سے متعلق کسی ایسے فتوے کی بھی حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب نے کبھی تصدیق و توثیق فرمائی تھی جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ یہ تدفین صحیح نہیں ہوئی۔ اور اس کے لیے شامی کی اس عبارت سے استناد کیا گیا تھا " (وحفر قبرہ) ومفادہ انہ لایجزئ دفنہ علی وجہ الارض ببناء علیہ کما ذکرہ الشافعیۃ۔"

اس عاجز راقم السطور نے حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا جس میں تدفین کا وہی واقعہ لکھ کر جو مولانا عبد الجلیل صاحب نے اپنے مندرجہ بالا استفتا میں لکھا ہے ـــــ عرض کیا کہ

اس واقعہ پر قریباً ۹ سال گزر چکے ہیں، معلوم ہوا ہے کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس طرح دفن کرنے سے تدفین ہی نہیں ہوئی، ان کا استدلال یہ ہے کہ علامہ شامی نے صاحب در مختار کے قول " وحفر قبرہ " کے ذیل میں لکھا ہے " ومفادہ انہ لایجزئ دفنہ علی وجہ الارض ببناء علیہ کما ذکرہ الشافعیۃ ولم ارہ لائمتنا صریحاً" صـ۵۶۹/۱ ـــــ بہر حال شامی کی اس عبارت ہی کی بنا پر ان کی رائے ہے کہ میت کو اکھاڑ کے پھر سے قاعدہ کے مطابق زمین میں قبر کھود کے دفن کیا جائے۔

لیکن دوسرے بہت سے اکابر علماء و اہلِ فتویٰ کی رائے ہے کہ اگرچہ یہ تدفین طریقہ متوارثہ کے خلاف ہوئی، لیکن تدفین متحقق ہو گئی اور فریضۂ دفن ادا ہو گیا، اس لیے اب نبش ہرگز جائز نہیں، ان حضرات کا استدلال یہ ہے کہ دفن کا اصل مقصد، ارضی اجزاء کے ذریعہ " ستر سوءۃ المیت " ہے، جیسا کہ عینی شرح ہدایہ میں صراحۃً فرمایا

گیا ہے" المقصود منه (ای من الدفن) ستر سوءة الميت واليه الاشارة فی قوله تعالیٰ فبعث الله غرابا یبحث فی الارض لیریه کیف یواری سوءة اخیه - الاٰیة —

اور بلاشبہ صورت مذکورہ میں یہ مقصد بالکل اسی طرح حاصل ہو گیا جس طرح لحد یا شق میں تدفین کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے طور پر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تدفین اگرچہ ابتداءً فی الارض نہیں ہوئی لیکن انتہاءً ہو گئی اور اب میت بلاشبہ فی بطن الارض ہی ہے۔

اور امام ابن الہمام نے فتح القدیر میں دفن کے دونوں معروف و متوارث طریقوں، لحد اور شق کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ " ذکرلی ان بعض الارضین من الرمال یسکنها بعض الاعراب لایتحقق فیه الشق ایضاً بل یوضع المیت ویهال علیه نفسه .... واستحب بعض الصحابة ان یرمس فی التراب رمساً"

اس سے صراحۃً معلوم ہوا کہ تدفین کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ لحد یا شق بنائے بغیر لاشۂ میت کو مٹی میں دبا دیا جائے، اور بعض صحابہ کرام نے اسی کو اپنے لیے پسند کیا تھا۔ اور علامہ شامی ہی نے فتح القدیر اور بحر سے نقل کیا ہے " ویکره الدفن فی الفساقی وهی کبیت معقود بالبناء یسع جماعة قیاماً لمخالفتها السنة" —

اس سے معلوم ہوا کہ فساقی (یعنی خاص مُردوں کے لیے بنی ہوئی مقبرہ نما بند کوٹھریوں) میں مردے کو رکھ کے دفن کرنے کا جو غلط طریقہ بعض علاقوں میں رائج تھا جس میں قبر کھودی بالکل نہیں جاتی تھی بلکہ مردے کو فرش پر بس رکھ دیا جاتا تھا) — اس کو بھی فقہا نے صرف مکروہ کہا ہے، یہ نہیں کہا کہ اس طرح دفن کرنے سے تدفین متحقق ہی نہیں ہوتی، اور فریضہ دفن ادا ہی نہیں ہوتا —

تو ان علماء کرام و اصحاب فتویٰ کا قول یہ ہے کہ فقہاء کی ان تصریحات سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ تدفین کے جس واقعہ کے متعلق یہ اختلاف ہے اُس میں تدفین شرعی متحقق ہو گئی اور نبش ہرگز جائز نہیں — اور علامہ شامی کی عبارت ومفاده انه لایجزی

دفنہ علی وجہ الارض الخ" کا مطلب فقہا کی ان تصریحات کی روشنی میں یہ ہوگا کہ "لایجزئ عن الدفن المسنون" یعنی اگر ایسا کیا گیا تو یہ تدفین مسنون نہ ہوگی۔

تو جناب سے دریافت طلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں رایوں میں سے جناب کے نزدیک کون رائے صحیح ہے، آیا یہ کہ مسئلہ مسئولہ میں تدفین متحقق ہوگئی اور اب نبش جائز نہیں، یا یہ کہ تدفین ہی متحقق نہیں ہوئی، لہٰذا اس مدفون میت کو (جو موجودہ سطح زمین سے ۵-۶ فٹ نیچے ہے) اکھاڑ کے پھر سے دفن کیا جائے؟

راقم سطور نے اپنے اس عریضہ کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب کا وہ مطبوعہ فتویٰ بھی بھیج دیا تھا جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے اور جس پر خود حضرت مفتی صاحب کی بھی تصدیق ثبت ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ ایک صاحب نے اپنے خط میں مجھے لکھا ہو کہ اسی واقعہ سے متعلق کبھی جناب نے کسی ایسے فتوے کی بھی توثیق و تصدیق فرمائی ہو جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ اس طرح دفن کرنے سے تدفین متحقق نہیں ہوئی۔

حضرت مفتی صاحب نے میرے استفسار و استفتا کا جو جواب اسی پر تحریر فرمایا وہ بلفظہ درج ذیل ہے۔ (جواب پر تاریخ نہیں لکھی گئی ہو لیکن یہ ناچیز کو اپریل ۷۰ء کے پہلے ہفتہ میں موصول ہوا ہو۔)

الجواب

میری تحقیق کے مطابق انبہٹہ تدفین مذکور شریعت کے قانون کے مطابق صحیح اور درست ہو چکی ہو، اب نبش جائز نہیں، کوئی ایسی وجہ وجیہ اور ضرورت نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر نبش مذکورہ جائز ہو، اکثر علما کا قول اور ارباب افتا کا فتویٰ صحیح ہو، اُس کے دلائل باعتبار روایات فقہیہ سوال مذکورہ میں موجود ہیں اور مطبوعہ فتوے میں بھی تفصیل دار ارباب افتا کے اقوال اور تصحیحات کے ساتھ مذکور ہیں وہی حق ہو۔ اور جو تدفین کو غیر صحیح کہتے ہیں اُن کا قول صحیح دلائل پر مبنی نہیں ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہو اگر بالفرض ہو تو غلط اور مرجوع عنہ ہو، اس پر عمل جائز نہیں ہو۔

الحاصل تدفین صحیح اور اب سنت کے مطابق ہو، عبادتیں بدائع، فتح القدیر،

در مختار، ردّ المحتار، کبیری، عینی، شرح الہدایہ، محیط وغیرہ میں موجود ہیں۔ نقل کی ہمت نہیں بیماری کی وجہ سے معذور و مجبور ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

سید مہدی حسن غفرلہٗ (شاہجہانپور)

ہند و پاک کے یہ اکابر علماء و اصحاب فتویٰ

جو حضرات ہندوستان و پاکستان کے علماء و اصحاب فتویٰ اور اُن کے علمی مقام و مراتب سے کچھ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ پاکستان کے جن اکابر علماء نے حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب کے اس فتوے کی تصدیق و توثیق کی ہو کہ زیرِ بحث واقعہ میں تدفین متحقق ہو گئی اور انتہائی شق ہی کی صورت میں ہوگئی اور اب نبش جائز نہیں ہے اور اگر بالفرض کسی دوسری جگہ دفن کیے جانے کی وصیت بھی کی تھی تب بھی اب میت یا تابوت کو موجودہ مدفن سے نکال کر دوسری جگہ لے جانا جائز نہیں ہے۔ [مثلاً حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (سابق مفتی دار العلوم دیوبند) اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ وغیرہ جن کے اسمائے گرامی اوپر دیے جا چکے ہیں] بلاشبہ پاکستان میں وہی حضرات خاصکر اُن احناف کے لیے جو جماعت علماء دیوبند سے وابستہ ہیں، علوم شریعت اور بالخصوص فقہ و فتاویٰ میں آخری مرجع اور سند ہیں۔ اور اگر بالفرض وہاں کے کسی صاحبِ علم کی رائے اِن حضرات کی متفقہ رائے کے خلاف ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ بس ایک رائے ہے۔

اسی طرح ہندوستان میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری مدظلہ کا علوم شریعت خاصکر افتا میں خاص الخاص مقام ہے۔ وہ عرصہ دراز تک دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی رہے، اور اب جبکہ انتہائی کبر سنی اور مرض فالج کی وجہ سے بالکل معذور ہو کر اپنے وطن شاہجہانپور ہی میں مقیم ہو گئے ہیں، خود علماء و اصحاب فتویٰ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ اس حال میں جوابات تحریر فرماتے ہیں۔[1]

---

[1] یہ عاجز راقم سطور اب سے کوئی دو مہینے پہلے حضرت مفتی صاحب کی زیارت و عیادت کے لیے شاہجہانپور حاضر ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک عجیب نمونہ دیکھا۔ حضرت ممدوح کا حال یہ ہے کہ بس

(باقی اگلے صفحہ پر)

پھر جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث و صدر المدرسین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب وغیرہ یہاں کے دیگر اکابر علماء نے بھی حضرت قدس سرہ کی تدفین کے اس مسئلہ میں اس رائے سے اتفاق فرمایا ہے کہ تدفین متحقق ہو گئی اور اب نعش اور دوسری جگہ منتقلی کی بات کسی طرح جائز نہیں ہے ـــ اور ان سب سے بڑے اور دار العلوم دیوبند اور جماعت دیوبند کے سب سے پہلے "مفتیٔ اعظم" حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ بھی سامنے آچکا ہے جس کو مولانا مفتی زین العابدین صاحب نے اپنے فتوے میں بلفظہ درج کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان اور سلسلہ دیوبند کے ان اکابر علماء و اصحاب فتویٰ کے متفقہ فیصلے اور فتوے کے خلاف اگر کسی عالم کی کوئی رائے ہو بھی تو قابل اعتنا نہیں ـــ اور اگر کسی کو واقعات یا ان فتاویٰ سے ناواقفیت کی وجہ سے اس بارہ میں کوئی غلط فہمی تھی (جیسا کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کے بیان سے بھی اندازہ ہوتا ہے) تو اب اُس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

اور ۹ سال گزر جانے کے بعد حضرت قدس سرہ کی میت یا تابوت کو اُن کے وارثوں کے علی الرغم حکومت کی مدد سے موجودہ مدفن سے نکلوا کر رائپور (ضلع سہارنپور) لانے کی بات تو اس قدر شنیع اور فساد انگیز ہے کہ اسکے تصور سے بھی ہر ایسے شخص کو تکلیف اور اذیت ہونا برحق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے روح شریعت کا کچھ بھی ادراک بخشا ہو۔

(گزشتہ سے پیوستہ) ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جس پر چمڑا منڈھا ہوا ہے، جسم کا خون تک گویا خشک ہو چکا ہے۔ لیکن علمی استحضار کا اب بھی یہ حال ہے کہ بعض نہایت اہم تصانیف کا سلسلہ جاری ہے۔ ابن حزم کی "محلیٰ" پر فاضلانہ تنقید اسی حالت میں کئی حصوں میں لکھی ہے جو "السیف المجلی" کے نام سے چھپ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان فیوض علمیہ کا سلسلہ دیر تک جاری رکھے۔

۱؎ اس سلسلہ کی بعض تحریروں سے اس ناچیز کو اب تک جن حضرات کے بارہ میں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ "تدفین ہی متحقق نہیں ہوئی اور اس بنا پر دوسری جگہ منتقلی بھی جائز ہے" ـــ کم از کم اس عاجز کی معلومات میں اُن میں کوئی صاحب بھی ایسے نہیں ہیں جنھیں علوم شریعت اور فتاویٰ میں مرجعیت کا مقام حاصل ہو ـــ صرف حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب مدظلہ کے بارہ میں معلوم ہوا تھا کہ ممدوح نے کسی ایسے فتوے کی تصدیق و توثیق کی ہے، لیکن اُن کی تازہ تحریر ابھی اوپر درج ہو چکی ہے جس میں حضرت ممدوح نے صراحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ

"انہماز تدفین نمبر کو شریعت کے قانون کے مطابق صحیح اور درست ہو چکی ہے اب نبش جائز نہیں" ـــ ساتھ ہی تحریر فرمایا ہے کہ

"مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہو، اگر بالفرض ہو تو غلط اور مرجوع عنہ ہو اور اس پر عمل جائز نہیں ہے۔ ۱۲"

نئی مطبوعات

فریب تمدن

از جناب اکرام اللہ ایم۔ اے

صفحات ۵۰۸۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ مجلد۔ قیمت دس روپے

پتہ :۔ اقبال پبلیکیشنز۔ فتح گنج۔ امین آباد۔ لکھنؤ ۱

یہ اکرام اللہ صاحب کون ہیں ؟ کیا ہیں ؟ کتاب سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہیں، کام زور کا کیا ہے۔ مغربی قوموں کی مادی ترقیوں نے وہ سحر لوگوں پر کر دیا ہے کہ ہر معاملے میں اُن کی تقلید ترقی کا زینہ محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ کتنی ہی باتوں میں یہ قومیں انسانی نقطۂ نظر سے اتنی گراوٹ کا شکار ہو گئی ہیں کہ اس کی نظیر نہ خود ان کی تاریخ میں ملنی آسان ہے اور نہ کسی دوسری قوم کی تاریخ میں۔ جنس زدگی کے جتنے بھی برے مظاہر ہو سکتے ہیں اُن کے اندر کمال میں ان قوموں کا کوئی جواب نہیں۔ اور پھر اس کے جو نتائج معاشرے پر مرتب ہونے چاہئیں وہ بھی ایک عذاب کی طرح سامنے آرہے ہیں۔ ان مظاہر اور اِن نتائج کے بارے میں جو کچھ بھی مصنف کی نظر سے کہیں گزرا ہے، شاید وہ سبھی کچھ انھوں نے اس کتاب میں ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ کتاب چار حصوں اور بارہ بابوں میں تقسیم ہے۔ اور ان کا مواد مغربی معاشرے کے اس پہلو کی بڑی بھرپور تصویر سامنے لے آتا ہے۔ بکسر بس اتنی سی ہے کہ یہ تصویر سکنڈ ہینڈ حوالوں سے تیار ہوئی ہے۔ اور اس کا پتہ زیادہ تر اُس وقت چلتا ہے جب باب کو ختم کر کے قاری کی نظر حوالوں پر پڑتی ہے۔ پھر اسی میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے حوالے دس بیس سال پرانے ہیں تو یہ دونوں باتیں اس تصویر کا وہ تاثر قائم رہنے نہیں دیتیں جو ان حوالوں تک پہنچنے سے پہلے ہوتا ہے۔ لیکن جتنا کچھ رہتا ہے

وہ کم نہیں ہے، اخلاقی حس اور انسانیت کے معنی کا شعور اگر کچھ بھی کہیں موجود ہے تو کتاب کا نشانہ بالکل ہی خطا نہیں جائے گا۔

یہود اور ہم۔ قرآن کی روشنی میں — از جناب عبدالکریم پاریکھ
صفحات ۸۰ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد کاغذ گلیز
قیمت ۱/۷۵ روپیہ۔ پتہ۔ جناب عبدالکریم پاریکھ۔ گلشن گنج ناگپور ع۲

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اسلامی دنیا میں یہودیوں سے متعلق بہت سے مضامین، رسالے اور کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مصنف کو قرآن مجید کی تبلیغ کا ذوق ہے۔ اپنے کاروباری مشاغل کے ساتھ درس قرآن کا بھی برسہا برس سے مشغلہ رکھتے ہیں۔ اپنے اسی مطالعہ کی مدد سے انھوں نے یہود سے متعلق قرآن مجید کی تمام آیات کو اس کتاب میں جمع کیا ہے۔ ہر آیت پر ایک مستقل عنوان قائم کرکے اس عنوان کے مناسب تشریحی نوٹ لکھے ہیں۔ جن کا انداز تذکیری ہے۔ مصنف کا مقصد یہ کہ مسلمان قرآن مجید کی روشنی میں یہود کو سمجھیں اور اسی کے ساتھ وحی و رسالت سے نوازی جانے والی قوموں کے بارے میں قانونِ خداوندی سے آگاہ ہوں جو نہایت بے لاگ ہے اور جس کی رو سے مسلمان بھی ــــ اگر وہ کسی دور میں یہودیوں کے مذموم اخلاق و اعمال کی پیروی کرنے لگیں تو انھیں کی طرح غضب الٰہی کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

النبی الامیؐ — مترجمہ جناب مولانا مختار احمد سلفی۔ صفحات ۲۲۴۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ کاغذ گلیز
قیمت درج نہیں۔ پتہ۔ مکتبہ دینیہ مومن پورہ بمبئی ع۱۱

قرآن مجید کے کتاب الٰہی ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی صادق ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ قرآن مجید میں بھی اس حقیقت کو بطور ایک دلیل کے بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ مستشرقین نے ایک زمانے میں بڑی کوشش کی ہے کہ اس قطعی حقیقت کو مشکوک بنا دیا جائے۔ چنانچہ کچھ "دلائل" آپؐ کے خواندہ

ہونے پر گھڑ لیے گئے۔ اور ان مستشرقین سے علمی فیض حاصل کرنے والے بعض مسلمان بھی اسکے قائل ہو گئے کسی ایسے ہی صاحب کے ایک مقالے کی علمی تردید میں ریاست قطر کے قاضی محکمۂ شرعیہ شیخ احمد ابن حجر نے ایک رسالہ اپنی زبان (عربی) میں تحریر کیا تھا۔ زیر نظر کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواندہ ہونے پر پیش کیے جانے والے تمام دلائل و شواہد پر پوری شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ ترجمہ میں البتہ لفظیت ذرا زیادہ ہے اور اس لیے کتاب کچھ بوجھل سی ہو گئی ہے۔

شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول

از ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

صفحات ۱۶۰ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت ۲ روپے

ناشر:- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) دہلی ۶

چند مہینے پہلے ڈاکٹر نجات اللہ صاحب کی کتاب "غیر سودی بنک کاری" کے تعارف میں اس کتاب کا ذکر آیا تھا۔ یہ اُن شرعی اصولوں کی تشریح ہے جن کی بنا پر غیر سودی بنک کاری کے نظام کا ایک خاکہ مصنف نے پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی نوعیت سمجھنے کے لیے مصنف کی دو صراحتوں کا نقل کر دینا یہاں مفید ہوگا۔

۱۔ "اس کتاب میں شرکت و مضاربت کے تمام فقہی احکام کا احاطہ نہیں کیا گیا ہو بلکہ صرف ان امور سے بحث کی گئی ہے جن کا بنکوں کے نظام نو سے گہرا تعلق ہو۔"

۲۔ "شرکت اور مضاربت کے شرعی اصولوں کی وضاحت میں ہم نے اسلامی فقہ کے چاروں مشہور مکاتب، حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کی مستند کتابوں کو سامنے رکھا ہو۔ ہم نے کوشش کی ہو کہ نظام بنک کاری کی تنظیم نو کے لیے شرکت و مضاربت کے سلسلے میں ایسی رایوں کو بنیاد بنائیں جو ان مکاتب فقہ کے درمیان متفق علیہ ہوں یا جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے میسر آسکے البتہ جن امور کے سلسلے میں خود قرآن و سنت نے کوئی متعین ضابطہ نہیں دیا ہو اُن میں زمانے کی تبدیلی اور نت نئی ضروریات پیدا ہونے کی وجہ سے ...... چند مسائل میں ہم نے ایسی رائیں بھی اختیار کی ہیں جو ان فقہاء نے اختیار نہیں کی تھیں۔"

۱۔ چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں
از مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی
صفحات ۲۵۸۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۳/۵۰

۲۔ اسلام اور جدید سائنس
" ۳۲ " " قیمت ۵۰/۔

ناشر:- فرقانیہ اکیڈمی۔ چک باناور۔ بنگلور (نارتھ)

آج اس بات میں کوئی خاص استعجاب نہیں رہا ہے کہ انسان نے اپنے قدم چاند تک پہنچا دیے لیکن آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے جب اس نوعیت کے پہلے واقعے کی خبر چند امریکی خلابازوں کے متعلق آئی تھی تو دنیا کا عام انسان سچ مچ حیرت کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ جن مذاہب میں چاند سورج کی حیثیت دیوتاؤں کی تھی اُن کے ماننے والے تو ہل ہی گئے۔ خود مسلمانوں میں بھی عام لوگوں پر ایسا تاثر ہوا جیسے انسان اپنی اُن حدود سے باہر چلا گیا ہو جو خدا نے اُس کے لیے مقرر کر دی تھیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک نئے فاضل مولوی شہاب الدین صاحب نے ان ہی دنوں میں اپنی کتاب "چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں" کا مواد مرتب کیا تھا جو پہلے بعض رسائل و اخبارات میں شائع ہوا اور اب کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ پوری کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا ابھی غالباً شائع نہیں ہوا ہے۔

کتاب کے اس خاص پس منظر میں توقع ہوتی تھی کہ انسان سے متعلق قرآن کے ایسے بیانات یا رموز و اشارات سامنے لائے گئے ہوں گے جن سے انسان کے اندر ان بلند پروازیوں کی صلاحیت کا اظہار ہو رہا ہو۔ لیکن جہاں تک کتاب کے پیش نظر حصے کا تعلق ہے اُس کی بحث زیادہ تر دو نقطوں کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایک یہ کہ سائنس کی دریافت کردہ کوئی حقیقت اور اُس کی کوئی کرشمہ سازی ایسی نہیں ہے اور نہ ہوگی جس کا کسی نہ کسی طور پر قرآن میں ذکر نہ مل جائے۔ دوم یہ کہ سائنس نے کائنات کے جن جن بھیدوں کو اب تک آشکارا کیا ہے اُن سے خدا کی ہستی بھی ثابت ہوتی ہے اور اُس کی وہ صفات و کمال بھی جن کا قرآن مدعی ہے۔ پہلی بحث کے ذریعہ مصنف اُن قدیم علماء کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو از روئے قرآن اس امر کا فیصلہ کرنے میں مذبذب رہے کہ چاند پر انسان کے پہنچ جانے کی تصدیق کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور دوسری بحث سے اُس جدید انسان کے طرزِ فکر کی اصلاح

اُنھیں مقصود ہے۔ جو سائنسی مشاہدوں کے بل پر اس دعوے کی ہمت کرنے لگتا ہے کہ اس کائنات کے اندر خدا کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ پہلی بحث میں مصنف کا نقطۂ نظر بیحد انتہا پسندانہ ہو گیا ہے اور اس کے زیر اثر انھوں نے قرآن سے استشہاد میں کتنی ہی آیتوں کا وہ مدعا قرار دیدیا ہے جس کی کسی لحاظ سے تک نہیں بیٹھتی۔ اور دوسری بحث میں ایک مومن کے ازدیاد ایمان کا تو بیشک اچھا خاصہ سامان ہے لیکن جدید ذہن کے آدمی پر اُسے اتمام حجت فرض کر لینا ایک مغالطہ ہوگا۔

۲۔ یہ مصنف کا ایک مقالہ ہے جو مدراس کی اسلامک سوسائیٹی کے ایک جلسہ میں انھوں نے پڑھا تھا۔ مندرجہ بالا کتاب مصنف کے جن بنیادی افکار کی ایک تفصیلی شکل ہے، یہ کتابچہ ان ہی افکار کی ایک مختصر شکل ہے۔

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 39 NO: 2 Regd. No. L-353

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سیرت نبویؐ پر منتخب کتابیں

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ کامل (۶ جلدیں)	۸۵/-
رحمۃ للعالمین (۳ جلدیں)	۲۵/-
رحمت عالم	۲/۷۵
پیغمبر عالم	۹/۷۵
محسن انسانیت	۱۰/-
ہمارے حضورؐ	۱/۸۰
خطبات مدراس	۳/-
مقالات سیرت	۵/-
اسوۂ حسنہ	۲/-
نبی عربی (غیر مجلد) ۱/۵۰ (مجلد)	۱/۷۵
سیرت خاتم الانبیاء	۱/۲۵
شمائل ترمذی (اردو)	۶/-

اکابر و مشائخ کے سوانح اور تذکرے

کتاب	قیمت
تاریخ دعوت و عزیمت (اول تا سوم)	۲۴/۲۵
سیرۃ النعمان	۳/۵۰
علمائے ہند کا شاندار ماضی	۸/۵۰
حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی	۸/-
سوانح قاسمی	۱۵/۵۰
نقش حیات (غیر مجلد کامل)	۸/۵۰
امام رازی	۸/-
حالات مشائخ کاندھلہ	۳/۵۰
تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن	۳/-
سیرت مولانا مونگیری	۹/-
سوانح مولانا یوسفؒ	۱۰/-
سوانح حضرت رائے پوریؒ	۶/-

سیرت خلفاء راشدین و اکابر صحابہ

کتاب	قیمت
حیاۃ الصحابہ اول تا سوم مجلد عکسی	۱۰/-
〃 چہارم تا ہفتم 〃	۱۲/-
〃 ہشتم تا دہم 〃	۱۲/-
سیرت خلفاء راشدین (از مولانا عبد الشکور لکھنوی)	۲/۵۰
صدیق اکبر	۹/-
الفاروق	۹/-
خلفاء راشدین	۷/۵۰
حضرات حسنین	۷/-
سیر الخلفاء اول ۸/- دوم	۵/-
سیر الصحابہ اول ۶/- دوم	۶/۵۰
سیر الصحابیات	۳/-
اسوۂ صحابہ اول ۶/- دوم	۸/-
تابعین ۱۰/۵۰ تبع تابعین	۹/-
اہل کتاب صحابہ و تابعین ۳/- اسوۂ صحابیات	۲/-

تاریخ اسلام پر بہترین کتابیں

کتاب	قیمت
تاریخ اسلام کامل	۳۳/-
تاریخ صقلیہ	۹/-
تاریخ ملت کامل ۱۱ جلدیں	۳۷/-
تاریخ دولت عثمانیہ اول ۱۰/- دوم	۹/-
تاریخ فقہ اسلامی	۱۰/-
تاریخ اندلس	۸/۵۰
اسلام اور عربی تمدن	۸/۵۰
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں	۳/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	۱۰/۲۵
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (مجلد)	۵/-
تاریخ پردہ ۳/- تاریخ گجرات	۹/-
سرکشی ضلع بجنور	۶/-
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	۸/-
اشاعت اسلام	۷/-

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۷۵ صفحات
قیمت فی کاپی ......۷۵ پیسے

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

اس اشاعت کی قیمت :- ایک روپیہ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۹ | بابت ماہ ربیع الاوّل و ربیع الآخر ۱۳۹۱ھ مطابق مئی و جون ۱۹۷۱ء | شمارہ ۳،۴

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہم کو اطلاع کردیں کیونکہ جن حضرات نے ہمارے خط کے جواب میں لکھا ہے کہ ان کو رسالہ برابر پہونچ رہا ہے صرف اُن ہی حضرات کو رسالہ بھیجا جا رہا ہے۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ ان کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

ـــــ محمد منظور نعمانی

ابھی ہفتہ آسٹریلیا میں مقیم ایک مسلمان ڈاکٹر کا خط دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ صاحب کچھ ہی عرصہ پہلے اپنی فنی تکمیل کے لیے وہاں گئے ہیں، ان کا تبلیغی جماعت اور اس کے کام سے بھی کچھ تعلق رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دین کے اُس درد و فکر کا کچھ حصہ بھی اُن کو عطا فرمایا ہے جو انبیاء علیہم السلام اور اُن کے رفقاء اور نائبین کی میراث ہے ـــــ آسٹریلیا پہونچکر انھوں نے مسلمانوں کی تلاش شروع کی، مختلف ملکوں کے کچھ مسلمانوں کا پتہ چلا، کسی طرح اُن سے رابطہ پیدا کیا اور ملاقات کی، یہ بعض عرب ملکوں کے مسلمان تھے جنھوں نے وہاں ہوٹل کھول رکھے ہیں، انھوں نے دیکھا کہ یہ لوگ نماز روزہ جیسے اسلامی فرائض اور شعائر سے بالکل ہی آزاد ہیں ـــــ لیکن یہ تو بلاء عام ہے (ہر ملک میں یہاں تک کہ اُن ملکوں میں بھی جن کو "اسلامی ممالک" کہا جاتا ہے بہت بڑی تعداد ایسے ہی مسلمانوں کی ہی) ـــــ مگر اس سے آگے جب ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنے ہوٹلوں میں برملا خنزیر کا گوشت بھی پکاتے اور بیچتے ہیں. تو انھیں بہت دھکا لگا۔ اور انھوں نے اسلام اور خدا و رسول کا نام لے کر اس بارے میں ان سے بات کی تو انھوں نے صفائی اور بے تکلفی سے کہا کہ یہاں کے لوگ یہی گوشت پسند کرتے ہیں اور کھاتے ہیں، اگر ہم یہ گوشت نہ پکائیں تو ہمارے ہوٹل نہیں چل سکتے۔ الغرض ڈاکٹر صاحب اُن میں سے کسی ایک کو بھی اس پر آمادہ نہیں کر سکے کہ وہ یہ گوشت پکانا اور بیچنا چھوڑ دے۔

اس تجربے سے ڈاکٹر صاحب کو بہت ہی دکھ اور صدمہ ہوا اور اپنے خط میں انھوں نے اس پر بڑی حیرت اور استعجاب کا بھی اظہار کیا ہے ـــــ اُن کا دکھ اور صدمہ تو بالکل برحق ہے، لیکن حیرت اور استعجاب کی بنیاد یقیناً ایک بڑی غلط فہمی ہے جس میں ہمارے اس دور کے بہت سے

پڑھے لکھے مسلمان بھی مبتلا ہیں ۔ وہ آج کی مسلمان قوم کو قرآنِ مجید کی "اُمّتِ مسلمہ" اور "خیر اُمّۃ" سمجھتے ہیں اور اس کے جو افراد صرف نام کے مسلمان ہیں اُن کو حقیقی معنیٰ میں "مومن و مسلم" سمجھ کر توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایسے کام نہیں کریں گے یا ان کو نہیں کرنے چاہئیں جو اسلام و ایمان کے بالکل ہی منافی ہیں۔

حالانکہ جن بیچاروں کی حالت ہماری صدیوں کی غفلت اور دوسرے تاریخی اسباب سے یہ ہو چکی ہے کہ ان کی زندگی خدا و رسول کے احکام سے بالکل آزاد اور اُن کے دل خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے یکسر خالی ہو چکے ہیں، فرائض ادا کرنے اور محرمات و معصیات سے بچنے کا سوال اُن کی زندگی سے بالکل ہی نکل گیا ہے، تو یہ لوگ اگر شرپشتوں کے بھی مسلمان ہیں تو یہی سمجھنا چاہئے کہ ان کے پاس اسلام کا بس نام ہے، اسلام و ایمان کی حقیقت موجود نہیں ہے، اس لیے اُن سے اسلامی شریعت کے خلاف جو کچھ بھی ظہور میں آئے اُس پر دُکھ اور صدمہ تو بالکل بجا ہے لیکن حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں ہے۔

خنزیر کا گوشت پکانے اور بیچنے کی معصیت چونکہ ہمارے معاشرہ میں ابھی رواج نہیں پا سکی ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب نے قدرتی طور پر اُس کا دُکھ اور صدمہ زیادہ محسوس کیا، حالانکہ اللہ و رسول کے نزدیک اور شریعت کے نقطۂ نظر سے نماز و زکوٰۃ جو اول درجہ کے اسلامی فرائض اور شعائر ہیں ان کا مستقل ترک (جس میں مسلمان کہلانے والوں کی اکثریت مبتلا ہے) کسی طرح بھی اس سے کم درجہ کی معصیت نہیں ہے۔

چند روز پہلے مشرقی بنگال میں جو کچھ ہوا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ یہ کیونکر ہوا، اور مسلمانوں نے ایسی بربریت اور سفاکی سے دوسرے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو کس طرح لوٹا مارا اور موت کے گھاٹ اتارا؟ اور وہ سب کچھ کیا جو اسلام ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لیے بھی باعثِ رسوائی ہے —

اصل بات یہ ہے کہ اسلام جب صرف نام کا ہو تو اُس کے ساتھ سب کچھ ہو سکتا ہے، زنا، شراب، ظلم و سفاکی، قتل و غارت گری، کسی بُرائی کے روکنے کی بھی اس میں طاقت نہیں ہے، ہاں اسلام و ایمان کی حقیقت زندگی میں کارفرما ہو تو وہ ظلم و معصیت سے روک دیتی ہے، قرآن پاک اور ارشاداتِ نبویؐ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور یہی تجربہ بھی ہے۔

مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اُس کی بنیاد پر ایک یہ بحث بھی کھڑی ہوگئی ہے کہ کیا اس زمانہ میں بھی اسلام میں یہ صلاحیت باقی ہے کہ وہ انسانوں کے ایسے مختلف عناصر اور طبقات کو جن میں لسانی، نسلی اور تہذیبی قسم کے اختلافات ہوں جوڑ کر ایک وحدت بنا دے؟ — جن لوگوں کو اس سے انکار ہے وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے موجودہ اختلاف و انتشار کو بطور دلیل کے پیش کر رہے ہیں، اور جو اسلام کی اس صلاحیت کو ابدی مانتے ہیں وہ طرح طرح سے اس کی جوابدہی کر رہے ہیں، حالانکہ بالکل سیدھی سی بات ہے کہ اسلام کے صرف نام اور نسبت میں (یا بالفاظ دگر اسلامی قومیت کے تصور میں) ہرگز یہ صلاحیت نہیں ہے، ہاں اسلام کی حقیقت میں یہ صلاحیت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ آج کی مسلمان قوم میں (ہمارے اندازہ میں کسی ملک میں بھی) بحیثیت مجموعی اسلام اور ایمان کی حقیقت موجود نہیں ہے۔ اور اب سے ۲۴۔۲۵ سال پہلے جب مغربی اور مشرقی پاکستان ایک بنے تھے تو اس وجہ سے نہیں کہ ان دونوں علاقوں کے عام مسلمانوں میں یا ان کے لیڈروں میں اسلام و ایمان کی وہ حقیقت پیدا ہوگئی تھی، بلکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ اُس وقت کی مسلم قیادت نے (جس نے مختلف اسباب کی وجہ سے اُس وقت عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا) ہندو غلبہ کے خوف اور مسلم قومیت کے احساس کو اُبھار کر ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس نے مشرق و مغرب دونوں کو ایک بن جانے کے لیے راضی کر دیا تھا — نہ وہ اتحاد اسلام کا معجزہ تھا اور نہ یہ اختلاف و انتشار اسلام کے خلاف دلیل اور شہادت ہے۔

زیر نظر شمارہ دو ماہ کے مشترک شمارے کی حیثیت سے شائع کیا جا رہا ہے، ایک ہی مہینے کے وقت میں اور بغیر کسی پیشگی تیاری کے اس سے زیادہ ضخامت ممکن نہ تھی۔ اس کمی کو آئندہ مہینوں کی اشاعت میں کسی نہ کسی حد تک ضرور پورا کر دینے کا ارادہ ہے۔

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

کھانے پینے کے احکام وآداب (۲)

مشروبات کے احکام :-

گزشتہ اشاعت میں وہ حدیثیں درج کی گئی تھیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غذائی اشیاء یعنی کھانے کی چیزوں کی حلت وحرمت کا حکم بیان فرمایا ـــــ اب آگے وہ حدیثیں پیش ہوں گی جن کا تعلق مشروبات یعنی پینے کی چیزوں کی حلت وحرمت سے ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کھانے پینے کی چیزوں کی حلت وحرمت کے بارہ میں شریعت کا بنیادی اصول وہی ہے جسے قرآن پاک میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے "یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ" ـــــ اس بنا پر مشروبات میں بھی جو طیبات ہیں یعنی پاکیزہ اور مرغوب و خوشگوار اور نفع بخش چیزیں مثلاً حلال چوپایوں کا دودھ، پھلوں کا رس، اچھے سے اچھے شربت، نفیس عرقیات وغیرہ یہ سب حلال قرار دیے گئے ہیں ـــــ اور ان کے برعکس جو مشروبات "خبیث" اور انسانیت کے لیے مضر ہیں وہ حرام قرار دیے گئے ہیں ـــــ پھر جس طرح کھانے کی بعض ان چیزوں کی حرمت کا اعلان اہتمام اور خصوصیت سے قرآن پاک میں بھی کیا گیا ہے جو اگلی شریعتوں میں بھی حرام قرار دی گئی تھیں مگر ان کو بعض طبقے کھاتے تھے جیسے کہ مردار جانور اور

خنزیر وغیرہ، اسی طرح مشروبات میں خمر یعنی شراب کی حرمت کا اعلان بھی خاص اہتمام سے قرآن پاک میں بھی کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُس کے بارہ میں غیر معمولی اہتمام فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے اس سلسلہ میں نہایت سخت رویہ آپ نے اختیار فرمایا۔ جیسا کہ آگے درج ہونے والی احادیث سے معلوم ہوگا۔

شراب کی حرمت کا حکم :-

شراب کے حرام قرار دیے جانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اُس کے استعمال سے آدمی کم از کم کچھ دیر کے لیے اس جوہر عقل و تفکر سے محروم ہو کر جو اس کے پروردگار کا خاص الخاص عطیہ اور معرفت الٰہی کا وسیلہ ہے اُن حیوانوں کی صف میں آجاتا ہے جن کو ان کے پیدا کرنے والے نے عقل و تمیز کی نعمت اور اپنی خاص معرفت کی صلاحیت عطا نہیں فرمائی ہے، اور یہ انسان کا اپنے اوپر بڑے سے بڑا ظلم اور اپنے پروردگار کی انتہائی ناشکری ہے ـــــ اس کے علاوہ نشہ کی حالت میں بسا اوقات اُس سے انتہائی نامناسب اور شرمناک حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اور وہ شیطان کا کھلونا بن جاتا ہے، علاوہ ازیں شراب نوشی کے نتیجہ میں بعض اوقات بڑے دور رس اور تباہ کن فسادات برپا ہو جاتے ہیں۔ ـــــ اسی لیے تمام آسمانی شریعتوں میں اس کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ہر دور کے خدا پرست مصلحوں اور روحانیت پسندوں نے اس سے پرہیز کیا ہے اور اس کے خلاف جد و جہد کی ہے۔

آگے جو احادیث شراب کے بارے میں درج ہوں گی اُن کا یہ پس منظر ناظرین کے ذہن میں رہنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اور غالباً اس سے بہت پہلے سے عربوں میں خاصکر اہل مدینہ میں شراب کا بیحد رواج تھا، گھر گھر شراب بنتی اور پی جاتی تھی، اس سے وہ نشاط و سرور بھی حاصل کیا جاتا تھا جس کے لیے عموماً پینے والے اس کو پیتے ہیں، اس کے علاوہ اس ماحول میں شراب نوشی کو ایک اخلاقی عظمت و فضیلت کا مقام بھی حاصل تھا، وہاں کا عام رواج یہ تھا کہ دولت مند لوگ شراب پی کر نشہ کی حالت میں خوب داد و دہش کرتے اور مال لٹاتے تھے جس سے غریبوں کا بھلا ہوتا تھا اور اسی وجہ سے شراب نہ پینا یا کم پینا بخل و کنجوسی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

یہی حال جوُئے کا بھی تھا وہاں جوئے کے کچھ خاص طریقے رائج تھے اور حوصلہ مند اور دریا دل

لوگ ہی وہ جوا کھیلتے تھے اور جو کچھ جیتتے تھے وہ غرباء اور حاجتمندوں کو لٹا دیتے تھے۔ اس لیے جوا بھی امیروں کا ایک معزز کھیل تھا جس سے غریبوں کا بھلا ہوتا تھا ـــــ زمانۂ جاہلیت کی روایات اور شاعری میں اس کا پورا سراغ ملتا ہے۔

شراب اور جوئے میں نافعیت کا غالباً یہی وہ خاص پہلو تھا جس کی طرف اشارہ سورۂ بقرہ کی اس آیت میں بھی کیا گیا ہے جو شراب اور جوئے کے بارے میں سب سے پہلے نازل ہوئی تھی ـــــ بہرحال شراب کا چونکہ وہاں عام رواج تھا اور گویا وہ اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اس کے وہ بری طرح عادی اور رسیا تھے اور ان کی نگاہ میں اس کو ایک عظمت بھی حاصل تھی اس لیے اس کی ممانعت کے بارہ میں ابتداءً تو نرم تدریجی رویہ اختیار کیا گیا لیکن جب قوم میں اس کی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ قطعی حرمت کا اعلان ہو جانے پر وہ اس کو یکلخت چھوڑ دے تو پھر اتنا سخت رویہ اختیار کیا گیا کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پینے کا رواج تھا سرے سے ان برتنوں ہی کے استعمال کرنے کی ممانعت کر دی گئی، اسی طرح کے بعض اور بھی انتہائی سخت احکام جاری کیے گئے جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ اہلِ ایمان کے دلوں میں اس اُمّ الخبائث سے سخت نفرت پیدا ہو جائے، چنانچہ جب یہ بات پیدا ہو گئی تو وہ سخت احکام واپس لے لیے گئے ـــــ اس تمہید کے بعد شراب کی حرمت سے متعلق آگے درج ہونے والی حدیثیں پڑھیے!

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ حُرِّمَتِ الْخَمْرُ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَدِمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَةَ وَهُمْ یَشْرَبُوْنَهَا وَیَاْكُلُوْنَ الْمَیْسِرَ فَسَاَلُوْهُ عَنْهُمَا فَنَزَلَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ الْاٰیَةَ فَقَالَ النَّاسُ مَا حُرِّمَ عَلَیْنَا وَكَانُوْا یَشْرَبُوْنَ حَتّٰی اِذَا كَانَ یَوْمٌ صَلّٰی رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ بِاَصْحَابِهٖ وَخَلَطَ فِیْ قِرَائَتِهٖ فَنَزَلَتْ اٰیَةٌ اَغْلَظُ مِنْهَا "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰی الْاٰیَةَ" وَكَانُوْا یَشْرَبُوْنَ حَتّٰی نَزَلَتْ اَغْلَظُ مِنْهَا "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ الْاٰیَةَ" قَالُوْا اِنْتَهَیْنَا رَبَّنَا، فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَاسٌ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَاتُوْا عَلٰی فُرُشِهِمْ

كَانُوا يَشْرَبُونَ الْخَمْرَ وَيَأْكُلُونَ الْمَيْسِرَ وَقَدْ جَعَلَهُ اللّٰهُ رِجْسًا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَنَزَلَ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا الْآيَة" ـــــــــــــــ رواہ احمد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شراب کی ممانعت (تدریجاً) تین دفعہ میں کی گئی (جس کی تفصیل یہ ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اس زمانہ میں اہلِ مدینہ شراب پیا کرتے تھے اور جوئے سے حاصل کیا ہوا مال کھایا کرتے تھے، تو ان دونوں چیزوں کے بارے میں لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا (کہ یہ جائز ہیں یا ناجائز؟ دریافت کرنے کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ خود اُن میں صالح طبیعت رکھنے والوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اسلام کی عام تعلیمات اور اُس کے پاکیزہ مزاج سے یہ دونوں چیزیں میل نہیں کھاتیں۔ واللہ اعلم) ۔ ان کے اس سوال کے جواب ہی میں (سورۂ بقرہ کی) یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ط

اے پیغمبر یہ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ انھیں بتا دیجئے کہ ان دونوں چیزوں میں گناہ ہو بہت، اور فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے، اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہو۔

تو کچھ لوگوں نے کہا کہ (اس آیت میں) شراب اور جوئے کو قطعیت کے ساتھ حرام قرار نہیں دیا گیا ہے، تو وہ لوگ (گنجائش سمجھتے ہوئے) اس کے بعد بھی پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ مہاجرین میں سے ایک صاحب اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے (اور امامت کر رہے تھے اور شراب کے نشہ میں تھے) انھوں نے قرأت میں کچھ گڑبڑ کر دی (اور کچھ کا کچھ پڑھ گئے)، تو شراب کی ممانعت کے سلسلہ میں یہ دوسری آیت نازل ہوئی جو پہلی آیت کے مقابلہ میں زیادہ سخت تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا

اے ایمان والو تم ایسی حالت میں نماز کے

الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔

پاس بھی نہ جاؤ جبکہ تم نشہ میں ہو، تاوقتیکہ تمھیں ایسا ہوش نہو کہ تمھیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

مگر کچھ لوگ (اس کے بعد بھی گنجائش سمجھتے ہوئے) پیتے رہے (ہاں جیسا کہ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے اس کا اہتمام کرنے لگے کہ نماز کے قریب نہیں پیتے تھے) تو سورۂ مائدہ کی یہ آیتیں نازل ہوئیں جو پہلی دونوں آیتوں سے زیادہ سخت اور صاف صریح تھیں۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَاءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ۝

اے ایمان والو بلاشبہ یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے (جو ایک خاص قسم کے جوئے میں استعمال ہوتے تھے، یہ سب چیزیں) گندی اور ناپاک ہیں اور شیطانی اعمال میں سے ہیں، لہٰذا ان سے کلی پرہیز کرو، پھر تم امید کر سکتے ہو کہ فلاحیاب ہو جاؤ۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جوئے میں پھانس کر تمھارے درمیان بغض و عداوت پیدا کر دے (اور تمکو آپس میں لڑا دے) اور اللہ کی یاد سے اور نماز جیسی نعمت سے (جو بارگاہِ خداوندی کی حضوری ہے) تم کو روک دے، تو کیا اب تم (شراب اور جوئے وغیرہ سے) باز آؤ گے؟

جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو ان لوگوں نے کہا "اِنْتَھَیْنَا رَبَّنَا!" (اے ہمارے پروردگار! ہم باز آئے اور اب ہم نے اس کو بالکل چھوڑ دیا) ـــــ پھر ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا جو راہِ خدا میں شہید

ہو چکے ہیں یا اپنے بستروں پر (بیمار پڑکر) انتقال کر چکے ہیں اور وہ شراب پیا کرتے اور جوئے سے حاصل کیا ہوا مال کھایا کرتے تھے ۔ اور اب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ناپاک اور شیطانی عمل قرار دیا ہے، (تو ہمارے جو بھائی ان دونوں میں ملوث تھے اور اسی حال میں انتقال کر گئے یا راہ خدا میں شہید ہو گئے تو آخرت میں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟) تو اس کے جواب میں بعد والی یہ آیت نازل ہوئی۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الآية۔

اُن صاحبِ ایمان اور نیکوکار بندوں پر کوئی گناہ (اور مواخذہ) نہیں ہے اُن کے کھانے پینے پر جبکہ اُن کا حال یہ ہو کہ وہ خدا سے ڈر کر پرہیزگاری کی زندگی گزارتے ہوں اور دل سے مانتے ہوں اور اعمالِ صالحہ کرتے ہوں الخ

(مسند احمد)

تشریح حدیث کی تشریح ترجمہ کے ضمن میں جابجا کر دی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ شراب کی حرمت کے بارہ میں ابتداءً تدریجی رویہ اختیار کیا گیا اور آخر میں سورۂ مائدہ کی آیت میں اس کے بارہ میں "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ" فرما کر اس کی قطعی حرمت کا اعلان فرما دیا گیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت سنہ میں نازل ہوئی۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنْتُ سَاقِيَ الْقَوْمِ فِيْ مَنْزِلِ اَبِيْ طَلْحَةَ فَنَزَلَ تَحْرِيْمُ الْخَمْرِ فَاَمَرَ مُنَادِيًا فَنَادٰى فَقَالَ اَبُوْ طَلْحَةَ اُخْرُجْ فَانْظُرْ مَا هٰذَا الصَّوْتُ؟ قَالَ فَخَرَجْتُ فَقُلْتُ هٰذَا مُنَادٍ يُنَادِيْ اَلَا اِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حُرِّمَتْ، فَقَالَ لِيْ اِذْهَبْ فَاَهْرِقْهَا قَالَ فَجَرَتْ فِيْ سِكَكِ الْمَدِيْنَةِ قَالَ وَكَانَتْ خَمْرُهُمْ يَوْمَئِذٍ الْفَضِيْخَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ قُتِلَ قَوْمٌ وَهِيَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ قَالَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ "لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا" —— رواہ البخاری و مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (میرے مربی اور سرپرست) ابوطلحہ انصاری کے گھر میں مجلس قائم تھی اور شراب کا دور چل رہا تھا اور میں پلانے والا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شراب کی حرمت کا حکم نازل ہو گیا (یعنی سورۂ مائدہ کی وہ آیت نازل ہو گئی جس میں شراب کو "رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ" بتلا کر اس کو قطعی حرام قرار دیا گیا ہے) تو آپ نے اسی وقت ایک منادی کو حکم دیا کہ وہ اس کا اعلان مدینہ میں کر دے، چنانچہ اس نے (معمول کے مطابق پکار کے) اعلان کیا، تو ابوطلحہ نے مجھ سے کہا کہ انس باہر جا کر دیکھو کہ یہ کیسی پکار ہے اور کیا اعلان ہو رہا ہے؟ میں باہر نکلا اور (واپس آ کر) میں نے بتلایا کہ منادی یہ اعلان کر رہا ہے کہ "شراب حرام ہو گئی" تو ابوطلحہ نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ اور اس ساری شراب کو باہر لے جا کر بہا دو، ــــ چنانچہ (میں نے ایسا ہی کیا اور دوسرے گھروں سے بھی شراب بہائی گئی جس کی وجہ سے) شراب مدینہ کی گلیوں سے بہنے لگی ــــ انس کہتے ہیں کہ اس دن وہ شراب وہ تھی جو "فضیخ" بولی جاتی ہے ــــ پھر بعض لوگوں کی زبان پر یہ بات آئی کہ بہت سے بندگانِ خدا ایسی حالت میں شہید ہوئے ہیں کہ شراب اُن کے پیٹ میں تھی (تو اُن کا کیا انجام ہو گا؟) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا" (جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ شراب کی قطعی حرمت کے اس حکم کے آنے سے پہلے اس دُنیا سے جا چکے اور ان کی زندگی ایمان اور عملِ صالح اور تقوے والی تھی تو اس پچھلے دور کے کھانے پینے کے بارے میں ان سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) "فضیخ" ایک خاص قسم کی شراب بنائی جاتی تھی کچی پکی کھجوروں کے باریک ٹکڑے کر کے اُن کو پانی میں ڈال دیا جاتا تھا، ایک مقررہ مدت گزرنے پر اس میں سُرور اور نشہ پیدا ہو جاتا تھا، اُس زمانہ میں یہ اوسط درجہ کی ایک شراب تھی جو بہت آسانی سے بن جاتی تھی۔

عَنْ اَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ كَانَ عِنْدَنَا خَمْرٌ لِيَتِيمٍ فَلَمَّا نَزَلَتِ الْمَائِدَةُ سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُ وَقُلْتُ إِنَّهُ لِيَتِيمٍ فَقَالَ اَهْرِيقُوهُ ــــــ رواہ الترمذی

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے یہاں کچھ شراب تھی جو ایک یتیم بچہ کی ملکیت تھی تو جب سورہ مائدہ (یعنی اس کی وہ آیت جس میں شراب کی قطعی حرمت کا حکم بیان ہوا ہے) نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شراب کے بارے میں پوچھا کہ اب اس کا کیا کیا جائے؟ اور میں نے یہ عرض کر دیا کہ وہ ایک یتیم بچہ کی ملکیت ہے تو آپ نے فرمایا کہ اسکو پھینک دیا جائے اور بہا دیا جائے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ اس کو کسی غیر مسلم کے ہاتھ بیچ دیا جائے یا کسی طرح بھی اس سے کوئی فائدہ اٹھا لیا جائے ——— اور حضرت انس کی ایک روایت میں ہے کہ شراب کی قطعی حرمت نازل ہونے سے کچھ ہی پہلے ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بعض یتیموں کے لیے جو ان کی سرپرستی میں تھے ان ہی کے حساب میں شراب خریدی تھی، انھوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اب اس کا کیا کیا جائے؟ تو آپ نے ان سے فرمایا۔ اھرق الخمر واکسر الدنان" یعنی شراب کو بہا دو، پھینک دو اور جن مٹکوں میں وہ ہے اُن کو بھی توڑ دو۔

شراب کی حرمت اور شرابی کے بارہ میں وعیدیں:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ وَمَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا فَمَاتَ وَهُوَ يُدْمِنُهَا لَمْ يَتُبْ لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ ——— رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز (یعنی ہر وہ مشروب جس کو پی کر نشہ آ جائے) خمر (شراب) کا مصداق ہے اور حرام ہے اور جو کوئی دنیا میں شراب پیئے اور اس حال میں مرے کہ برابر شراب پیتا ہو اور اس نے اس سے توبہ نہ کی ہو تو وہ آخرت میں جنت کی شراب طہور سے محروم رہے گا۔

(صحیح مسلم)

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَجُلاً قَدِمَ مِنَ الْيَمَنِ فَسَالَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَرَابٍ يَشْرَبُوْنَهُ بِاَرْضِهِمْ مِنَ الذُّرَةِ يُقَالُ لَهُ الْمِزْرُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ مُسْكِرٌ هُوَ قَالَ نَعَمْ قَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ ـــــ اِنَّ عَلَى اللّٰهِ عَهْدًا لِمَنْ يَشْرَبُ الْمُسْكِرَاتِ يَسْقِيَهُ مِنْ طِيْنَةِ الْخَبَالِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا طِيْنَةُ الْخَبَالِ؟ قَالَ عَرَقُ اَهْلِ النَّارِ اَوْ عُصَارَةُ اَهْلِ النَّارِ ـــــــــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص یمن سے آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خاص قسم کی شراب کے بارے میں سوال کیا جو اس علاقہ میں پی جاتی تھی جس کو "مزر" کہا جاتا تھا اور وہ چینا سے بنتی تھی، آپ نے اُس آدمی سے پوچھا کہ کیا وہ نشہ پیدا کرتی ہے؟ اُس نے کہا کہ ہاں اس سے نشہ ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ (اصولی بات یہ ہے کہ) ہر نشہ آور چیز حرام ہے، (مزید آپ نے فرمایا کہ سنو) نشہ پینے والے کے لیے اللہ کا یہ عہد ہے جس کا پورا کرنا اُس نے اپنے پر لازم کر لیا ہے کہ وہ آخرت میں اس کو "طِيْنَةُ الْخَبَالِ" ضرور پلائے گا، لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ "طِيْنَةُ الْخَبَالِ" کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ دوزخیوں کے جسم سے نکلنے والا پسینہ، یا فرمایا کہ دوزخیوں کے جسم سے نکلنے والا لہو پیپ۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) یعنی راوی کو شک ہے کہ "طِيْنَةُ الْخَبَالِ" کی وضاحت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "عَرَقُ اَهْلِ النَّارِ" فرمایا تھا یا "عُصَارَةُ اَهْلِ النَّارِ" پہلے کا ترجمہ "دوزخیوں کا پسینہ" اور دوسرے کا ترجمہ "دوزخیوں کے جسم سے بہنے والا لہو اور پیپ" ـــــ بہر حال شراب کی حرمت کے بعد اس کا پینا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرما لیا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں شراب سے دلچسپی رکھے گا اور بلا توبہ کے اس دنیا سے چلا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو شراب نوشی کی پاداش میں "طِيْنَةُ الْخَبَالِ" ضرور پلائے گا ـــــ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا! ـــــ

عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى

بَعَثَنِي رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ وَاَمَرَنِي رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ بِمَحْقِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِيرِ وَالْاَوْثَانِ وَالصَّلِيبِ وَاَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَحَلَفَ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ بِعِزَّتِي لَا يَشْرَبُ عَبْدٌ مِّنْ عَبِيدِي جُرْعَةً مِّنْ خَمْرٍ اِلَّا سَقَيْتُهُ مِنَ الصَّدِيدِ مِثْلَهَا وَلَا يَتْرُكُهَا مِنْ مَّخَافَتِي اِلَّا سَقَيْتُهُ مِنْ حِيَاضِ الْقُدُسِ ـــــــ (رواہ احمد)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عالم کے لیے رحمت اور سب کے لیے وسیلۂ ہدایت بنا کر بھیجا ہے، اور میرے پروردگار عزّ وجل نے مجھے حکم دیا ہے معازف و مزامیر (یعنی ہر طرح کے باجوں) کے مٹا دینے کا اور بت پرستی اور صلیب پرستی کو مٹا دینے کا اور تمام رسوم جاہلیت کو ختم کر دینے کا، اور میرے رب عزّ وجل نے یہ قسم کھائی ہے کہ میری عزت و جلال کی قسم میرے بندوں میں سے جو بندہ شراب کا ایک گھونٹ بھی پیے گا تو میں آخرت میں اس کو اتنا ہی لہو پیپ ضرور پلاؤں گا۔ اور جو بندہ میرے خوف سے شراب کو چھوڑ دے گا اور اس سے باز رہے گا تو میں آخرت کے قدسی حوضوں کی شراب طہور اپنے اس بندہ کو ضرور نوش کراؤں گا۔ (مسند احمد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ چند اصلاحی کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے خاص مقاصد میں سے ہیں ـــــ بت پرستی اور صلیب پرستی کا قلع قمع کرنا، زمانہ جاہلیت کی جاہلی رسوم کو ختم کرنا اور معازف و مزامیر یعنی ہر قسم کے باجوں کے رواج کو مٹانا ـــــ معازف ان باجوں کو کہا جاتا ہے جو ہاتھ سے بجائے جائیں جیسے ڈھولک، طبلہ، ستار، سارنگی وغیرہ۔ اور مزامیر وہ باجے ہیں جو منہ سے بجائے جاتے ہیں جیسے شہنائی اور بانسری وغیرہ ـــــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ سب باجے دراصل لہو ولعب اور فسق و فجور کے آلات ہیں۔ اور دنیا سے ان کے رواج کو مٹانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خاص کاموں میں سے ہے جن کے لیے آپ مبعوث ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں ـــــ لیکن کس قدر دکھ کی بات اور شیطان کی کتنی بڑی کامیابی ہے کہ بزرگان دین کے مزارات پر عرسوں کے نام سے جو میلے ہوتے ہیں ان میں

دوسری خرافات کے علاوہ معازف ومزامیر کا بھی وہ زور ہوتا ہے کہ فسق و فجور کے کسی تماشے میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوتا ہوگا ـــــ کاش یہ لوگ سمجھ سکتے کہ خود ان بزرگان دین کی روحوں کو ان خرافات اور ان باجوں گانوں سے کتنی تکلیف ہوتی ہے، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں شیطان کے مشن کو کامیاب بنا کر روح نبوی کو کتنا صدمہ پہونچا رہے ہیں۔

حدیث کے آخری حصہ میں شراب اور شراب پینے والوں کے بارہ میں اور خدا کے خوف سے شراب سے بچنے والوں کے بارہ میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ کسی وضاحت اور تشریح کا محتاج نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے ان بندوں میں شامل فرمائے جو اس کے حکم سے اور اس کی پکڑ اور عذاب کے خوف سے شراب سے پرہیز کرتے ہیں اور جنت کے قدسی حوضوں کی شراب طہور سے ہمیں سیراب فرمائے۔

نشہ آور شراب کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے:-

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ ـــــ رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شراب کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

[قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث مسند احمد اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے]

شراب بطور دوا کے بھی استعمال نہ کی جائے:-

عَنْ وَائِلِ الْحَضْرَمِيِّ اَنَّ طَارِقَ بْنَ سُوَيْدٍ سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَمْرِ فَنَهَاهُ فَقَالَ اِنَّمَا اَصْنَعُهَا لِلدَّوَاءِ فَقَالَ اِنَّهٗ لَيْسَ بِدَوَاءٍ وَلٰكِنَّهٗ دَاءٌ ـــــ رواہ مسلم

حضرت وائل بن حجر حضرمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ طارق بن سوید رضی اللہ عنہ نے

شراب کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے ان کو شراب پینے سے منع فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ میں تو اس کو دوا کے لیے استعمال کرتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ وہ دوا نہیں ہے بلکہ وہ تو بیماری ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) بعض قرائن کی بنا پر کچھ ائمہ اور علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث اس دور کی ہے جبکہ شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص مصلحت اور مقصد کے لیے۔ جو آگے آنے والی بعض حدیثوں سے معلوم ہو جائے گا، شراب کے بارے میں انتہائی سخت رویہ ہنگامی طور پر اختیار کیا تھا اور اس سلسلہ میں بعض اُن چیزوں کو بھی منع فرما دیا تھا جن کی بعد میں آپ نے اجازت دے دی۔ اس بنا پر ان حضرات نے اسکی گنجائش سمجھی ہے کہ اگر کسی ایسے مریض کے بارے میں جس کی زندگی خطرہ میں ہو، معتمد اور حاذق طبیب کی رائے ہو کہ اس کے علاج میں شراب ناگزیر ہے تو صرف بقدر ضرورت استعمال کی جا سکتی ہے واللہ اعلم۔

شراب نوشی پر اصرار کرنے والی قوم کے خلاف اعلان جنگ :-

عَنْ دَيْلَمِ الْحِمْيَرِيِّ قَالَ قُلْتُ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَارَسُولَ اللهِ إِنَّا بِأَرْضٍ بَارِدَةٍ وَنُعَالِجُ فِيهَا عَمَلًا شَدِيدًا وَإِنَّا نَتَّخِذُ شَرَابًا مِنْ هٰذَا الْقَمْحِ نَتَقَوّٰى بِهِ عَلٰى أَعْمَالِنَا وَعَلٰى بَرْدِ بِلَادِنَا، قَالَ هَلْ يُسْكِرُ؟ قُلْتُ نَعَمْ، قَالَ فَاجْتَنِبُوهُ قُلْتُ إِنَّ النَّاسَ غَيْرُ تَارِكِيهِ قَالَ إِنْ لَمْ يَتْرُكُوهُ فَاقْتُلُوهُمْ ــــــــ (رواہ ابوداؤد)

حضرت دیلم حمیری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم لوگ سرد علاقہ میں رہتے ہیں اور وہاں بڑی سخت محنت کرتے ہیں، اور ہم گیہوں سے ایک شراب بنا کر استعمال کرتے ہیں اور اس سے قوت و طاقت حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہم اپنے سخت محنت طلب کام بھی کر لیتے ہیں اور اپنے ملک کی سردی کا مقابلہ بھی کر لیتے ہیں ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت

فرمایا کیا اس سے نشہ ہوتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں وہ نشہ پیدا کرتی ہے، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ پھر اس سے بچو، بالکل استعمال نہ کرو، ــــــ میں نے عرض کیا کہ حضرت وہاں کے لوگ اس کو چھوڑنے والے نہیں ہیں، (یعنی مجھے اس کی اُمید نہیں ہے کہ وہ کہنے سننے سے اس کا استعمال چھوڑ دیں) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جنگ کرو۔ (سنن ابی داود)

(تشریح) اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی علاقہ کے مسلمان اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے اپنے واسطے شراب کے استعمال کو ناگزیر اور ضروری سمجھیں تب بھی ان کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی ــــ

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی علاقہ یا بستی والے شراب کے استعمال پر اجتماعی طور سے اصرار کریں اور باز نہ آئیں تو اسلامی حکومت ان کے خلاف طاقت استعمال کرے ــــ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں شراب نوشی کتنا سنگین جرم ہے۔

شرابیوں کے واسطے سخت ترین وعید:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ اِنْ مَاتَ لَقِیَ اللّٰہَ تَعَالٰی کَعَابِدِ وَثَنٍ ــــــ رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیشہ شراب پینے والا اگر اسی حال میں مرے گا تو خدا کے سامنے اس کی پیشی مشرک اور بُت پرست کی طرح ہوگی۔ (مسند احمد)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْخَمْرِ عَشَرَۃً عَاصِرَھَا وَمُعْتَصِرَھَا وَشَارِبَھَا وَسَاقِیَھَا وَحَامِلَھَا وَالْمَحْمُوْلَۃَ اِلَیْہِ وَبَائِعَھَا وَمُبْتَاعَھَا وَوَاھِبَھَا وَآکِلَ ثَمَنِھَا ــــــ رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلے میں (اس سے تعلق رکھنے والے) دس آدمیوں پر لعنت کی، ایک (انگور وغیرہ سے

شراب نچوڑنے والے پر (اگرچہ کسی دوسرے کے لیے نچوڑے) اور خود اپنے واسطے نچوڑنے والے پر، اور اُس کے پینے والے پر، اور ساقی یعنی پلانے والے پر، اور اُس پر جو شراب کو لے کر جائے، اور اُس پر جس کے لیے وہ لے جائی جائے اور اُس کے بیچنے والے اور خریدنے والے پر، اور اُس پر جو کسی دوسرے کو ہدیہ اور تحفہ میں شراب دے اور اُس پر جو اُس کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائے (جامع ترمذی)

تشریح) لعنت کا مطلب ہے خدا کی رحمت اور اُس کی نگاہِ کرم سے محرومی کی بد دعا، اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص شراب سے کچھ بھی تعلق رکھے خواہ اس کا بنانے والا یا بنوانے والا ہو، یا پینے والا یا پلانے والا ہو، یا خریدنے والا یا بیچنے والا ہو یا کسی کو ہبہ کرنے والا یا اس کو کسی کے پاس پہونچانے والا ہو، ان سب کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کی کہ وہ خدا کی رحمت اور اس کی نگاہِ کرم سے محروم رہیں۔

قریب قریب اسی مضمون کی حدیث مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قسم کے ارشادات نے صحابۂ کرام کو شراب کے بارے میں کتنا شدت پسند بنا دیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے انگور کے باغات تھے، ایک دفعہ اُن میں بہت پھل آیا تو باغوں کے اُس محافظ نے جو ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے ان کی طرف سے مقرر تھا (اور اُن کا معتمد ملازم تھا) ان کو خط لکھا کہ اس فصل میں انگور کی پیداوار بہت ہے اور مجھے ان کے ضائع اور برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تو اگر آپ کی رائے ہو تو میں انگوروں سے شیرہ حاصل کر کے محفوظ کر لوں؟ ——

حضرت سعد نے اس کے جواب میں خط لکھا۔

إِذَا جَاءَكَ كِتَابِي فَاعْتَزِلْ ضَيْعَتِي فَوَاللهِ لَا أَأْتَمِنُكَ عَلَى شَيْءٍ بَعْدَهُ أَبَدًا ۔[۱] (جب تمھیں میرا خط ملے تو میری زمین اور باغات سے الگ اور بے تعلق ہو جاؤ۔ خدا کی قسم میں اسکے بعد کسی چیز کے بارہ میں بھی تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

بہر حال حضرت سعد نے اس محافظ اور باغبان کو صرف اس بنا پر الگ اور ملازمت سے برطرف کر دیا کہ اس نے انگور سے شیرہ حاصل کر کے اس کو محفوظ کرنے کے بارے میں سوچا تھا جس سے شراب بنائی جا سکتی ہے۔

[۱] رواہ النسائی۔ جمع الفوائد ص ۲۳۶

حضرت عمرؓ کی سیاسی اصلاحات

(از مولانا محمد تقی امینی ۔ ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

جدید دور میں سیاست کو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ اس کے بغیر کوئی تنظیم اپنی افادیت زیادہ دنوں نہیں برقرار رکھ سکتی۔ ذیل میں حضرت عمرؓ کی سیاسی اصلاحات ذکر کی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ اسلامی تنظیم کا معیار کس قدر بلند اور حالات کے لحاظ سے اس میں کس قدر وسعت ہے۔

(۱) حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے شوریٰ کو بنیادی نظام کی حیثیت دی اور فرمایا۔

لا خلافۃ الا عن مشورۃ[۱] خلافت شورہ کے بغیر نہیں ہوتی۔

(۲) حضرت عمرؓ نے خلافت کو پدرانہ حیثیت دی اور کسی کیساتھ کوئی ترجیحی سلوک روا نہ رکھا چنانچہ آپ نے فرمایا۔

انما مثلنا کمثل قوم سافروا فدفعوا نفقاتهم الی رجل منهم فقالوا له انفق علینا فهل له ان یستاثر علیهم بشئ قال لا[۲]	میری (خلافت کی) مثال اور قوم کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ سفر پر روانہ ہوئے اور خرچ کی رقم اپنے میں سے کسی آدمی کے حوالہ کر دی اور کہا کہ (وقت ضرورت) ہمارے اوپر خرچ کرتے رہو کیا ایسی صورت میں ان کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی سلوک روا ہو سکتا ہے؟ جواب دیا کہ نہیں۔

۱؎ کنز العمال و مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ صہ ۱۳۹ ۲؎ تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثامع والثلثون صہ ۲ و ۱۰۴

دوسری جگہ ہے۔

ما مثلی ومثل ھؤلاء الا کقوم سافروا فدفعوا نفقاتھم الی رجل منھم فقالوا لہ انفق علینا فھل لہ ان یستاثر منھا بشیٔ قالوا لا یا امیر المومنین[1]

"میری (خلافت کی) مثال اور لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جماعت نے سفر کیا اور خرچ کی رقم اپنے ہی میں سے کسی آدمی کے یہ کہکر حوالہ کردی کہ ہمارے اوپر خرچ کرتے رہو کیا ایسی صورت میں اس آدمی کیلئے جائز ہوگا کہ کسی معاملے میں اپنے آپکو ترجیح دے؟ کہا نہیں اے امیر المومنین"

(۳) حضرت عمرؓ نے خلافت کو عوام کی معاشی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا اور خلافتی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا حوالہ دیا۔

اللہ ورسولہ مولی من لا مولی لہ[2]

اللہ ورسول (ارباب خلافت) اس کے سرپرست ہیں جس کا کوئی سرپرست نہیں

ایک موقع پر آپ نے خطبہ میں فرمایا:

ایھا الناس ان اللہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء

اے لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا مکلف کیا ہے کہ اس سے کی جانے والی دعا کو رد کردوں۔

عز الدین عبد العزیز (مشہور شافعی فقیہ) کہتے ہیں

"دعا رد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اللہ سے انکو انصاف طلب کرنے کی حاجت نہ ہو۔ لوگوں کی ضرورتیں پوری کرے اللہ سے مانگنے کی نوبت نہ آنے دے"[3]

ایک موقع پر آپ نے اعلان کیا۔

ولا یدع فقیرا فی ولایتہ

مملکت میں ہر تنگدست کو دیا جائے۔ ہر

---

[1] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب التاسع والثلثون ص ۱۰۲　[2] ابوداؤد کتاب النکاح باب الولی۔
[3] قواعد الاحکام لمصالح الانام ج ۱ ص ۱۴۷

الا اعطاہ ولا مدیونا الا قضی عنہ دینہ ولا ضعیفا الا اعانہ ولا مظلوما الا نصرہ ولا ظالما الا منعہ عن الظلم ولا عاریا الا کساہ کسوۃ[1]

(مدیون کا دین ادا کیا جائے ہر کمزور کی مدد کی جائے ہر مظلوم کی دستگیری کی جائے ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے (غرض کہ کوئی ضرورتمند ایسا نہ رہنے پائے جس کی ضرورت نہ پوری ہو)

فتح قادسیہ کے بعد آپ نے یہ بیان دیا۔

"جب تک لوگوں میں اس قدر وسعت ہے کہ ان کے مال کے ذریعہ ایک دوسرے کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے مجھے تمہاری ہر ضرورت پوری کرنے کی فکر ہے اور جب یہ وسعت نہ ہوگی تو ہم زندگی میں تنگی کریں گے یہاں تک کہ کفاف (بقدر حاجت) میں ہم سب برابر ہو جائیں کاش تم بیان سکتے کہ مجھے تمہارا کس قدر خیال ہے؟ اس کو میں اپنے عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں غلام بنا رکھوں بلکہ اللہ کا غلام ہوں بس حکمرانی کی امانت میرے سپرد ہے۔ اگر میں اس کو امانت سمجھ کر تمہارا حق ادا کروں اور خدمت کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھاؤ پیو تو میں اسکے (حکمرانی کے) ذریعہ فلاح پاؤں گا اور اگر میں اس کو ذاتی ملکیت سمجھوں اور (مطالبہ حقوق کے لیے) اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر آنے پر تمہیں مجبور کروں تو میرا انجام خراب ہو جائے گا۔"[2]

۴۔ حضرت عمرؓ نے خلافتی ذمہ داریوں میں جانوروں کی کفالت کو بھی شامل کیا اور فرمایا۔

لو مات کلب علی شاطی الفرات جوعا لکان عمر مسئولا یوم القیمۃ[3]

اگر ایک کتا بھوک کی وجہ سے فرات کے کنارے جیسی دور دراز جگہ پر بھی مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بازپرس ہوگی۔

دوسری جگہ ہے۔

---

[1] توفیق الرحمٰن صـ ۲۴ [2] البدایہ والنہایہ ج صـ ۳۶ [3] توفیق الرحمٰن مطبوعہ مصر صـ ۲۴

لو ترکت عنز جرباء الی جانب	اگر نہر (فرات) کے کنارے بھی کوئی خارش والی
ساقیۃ لم تدھن لخشیت ان	بکری اس حال میں رہ جائے کہ اس پر
أسأل عنھا یوم القیمۃ [1]	(بطور علاج) تیل کی مالش نہ ہو تو ڈر ہے
	کہ قیامت کے دن عمرؓ سے اسکی بازپرس ہوگی۔

(۵) حضرت عمرؓ نے ملک کے تمام افراد کو حقوق اور مملکت کے قوانین میں مساوی قرار دیا۔ قومیت۔ ذات پات۔ رنگ و زبان اور تصورحیات کی بنا پر کسی قسم کی تفریق گوارا نہ کی جیسا کہ دستور کی درج ذیل دفعات سے ظاہر ہے۔

(۱) مسلم اور غیر مسلم دونوں کے خون کا معاوضہ مساوی ہے۔

(۲) تعزیرات میں دونوں برابر ہیں یعنی جرائم کی جو سزا مسلمانوں کو دی جائے گی وہی غیر مسلم کو دی جائے گی

(۳) دیوانی قانون میں دونوں برابر ہیں۔

(۴) غیر مسلموں کو کسی قسم کی تکلیف پہونچانا حتی کہ پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرنا قانوناً جرم ہے۔

(۵) غیر مسلموں کی عزت و آبرو کی اس قدر حفاظت کی جائے گی جس قدر مسلمانوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے گی۔

عمر بن سعد جو حمص کے حاکم تھے اور زہد و تقدس میں تمام عہدہ داروں سے ممتاز تھے۔ ایک دفعہ ان کی زبان سے ایک غیر مسلم کے لیے یہ لفظ نکل گیا۔

اخزاك الله		اللہ تجھ کو رسوا کرے۔

اس پر ان کو اس قدر ندامت ہوئی کہ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہو کر اپنی ملازمت سے استعفاء دیدیا اور کہا کہ "اس ملازمت کی بدولت مجھ سے یہ حرکت صادر ہوئی ہے"۔ [2]

(۶) حضرت عمرؓ نے ہر قوم و ملک کے مذہب و کلچر کو خصوصیت سے برقرار رکھا اور غیر مسلموں کے معاملات ان ہی کے مذہبی طریقے اور رسم و رواج کے مطابق طے کیے

---

[1] التبر المسبوک حاشیہ سراج الملوک غزالی ص ۱۷ [2] ازالۃ الخفاء ص ۲۰۳

چنانچہ ابو عبیدؒ کہتے ہیں

اقر اھلھا فیھا علی ملتھم وشرائعھم [1]

مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو ان کے اپنے مذہب اور رسم و رواج پر برقرار رکھا۔

دوسری جگہ ہے۔

فھم احرار فی شہاداتھم و مناکحاتھم ومواریثھم و جمیع احکامھم [2]

یہ سب لوگ اپنی شہادتوں میں نکاح کے معاملات اور وراثت کے قانون میں غرض اپنے تمام قواعد و قانون میں آزاد تھے۔

اُس زمانے کے ایک نسطوری پادری نے اپنی تحفظات کے بارے میں یہ تاثرات قلم بند کیے ہیں۔

"یہ طائی (عرب) جنھیں خدا نے آج کل حکومت عطا فرمائی ہے وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں ہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں" [3]

پروفیسر ڈاکٹر قانون بین الممالک کی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

"متمدن اور مہذب سلطنتوں پر وحشیوں کا دھاوا بولنا اور غالب آکر سلطنت و حکومت کا مالک بن جانا تاریخ کا ایک عادی واقعہ ہے لیکن جرمنوں تاتاریوں وغیرہ وحشیوں کے برخلاف عجیب بات یہ ہے کہ عرب کے بدو جب اپنے صحرائی براعظم سے باہر کی دنیا میں اُمنڈنے لگے تو ان عربی فاتحین کو عام تصور کے وحشی فاتحین میں کسی طرح نہیں شامل کیا جا سکتا کیونکہ ان وحشی بدوؤں میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے کہیں بڑھ کر تہذیب اور اخلاق حسنہ نظر آتے ہیں۔" [4]

کلیسائی تاریخ و جغرافیہ کے قاموس میں ایک رومن کیتھولک پادری نے لکھا ہے۔

---

[1] الاموال ص۱۰۳ [2] ایضاً ص۱۴۰ [3] عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص۱۴۸ [4] ہسٹری آف دی لا آف نیشن از عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص۵۱

"مسلمان عربوں کو یعقوبی زجاکو بارٹ، عیسائیوں نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا یہ تھی کہ انھوں نے ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا اور اس مذہب کے سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کیے۔"[1]

(۷) حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کو ملکی انتظامات اور حکومت میں شریک و دخیل بنایا۔

کتب عمر بن الخطاب الی اهل الکوفة یبعثون الیه رجلا من اخبرهم و اصلحهم والی اهل البصرة کذلک والی اهل الشام کذالک[2]

حضرت عمر نے اہل کوفہ بصرہ اور اہل شام کو لکھا کہ اپنے میں سے بہتر اور صاحب صلاحیت افراد کو منتخب کرکے بھیجیں۔

اسی طرح اکثر سابق غیر مسلم افسران کو مقامی باشندوں کی مرضی سے بحال رکھا اور حکومت کا مزاج بدل جانے کے بعد ان سب نے ظلم و ستم کی راہیں چھوڑ دیں۔ علامہ مقریزیؒ کہتے ہیں۔

فکانت جبایتهم بالتعدیل[3]

ان افسران کی وصول تحصیل عدل والنصاف کے ساتھ ہوگئی تھی۔

(۸) حضرت عمرؓ نے افسروں اور عہدیداروں کے تقرر کے لیے ضابطے مقرر کیے۔ ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے خفیہ پولیس کا علیحدہ محکمہ قائم کیا اور ان کے لیے خصوصی قوانین مقرر کیے مثلاً

۱۔ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوں

۲۔ باریک کپڑے نہ پہنیں

۳۔ میدہ کی روٹی نہ کھائیں۔

۴۔ لوگوں کی ضرورتوں سے اپنے دروازہ بند نہ کریں۔

۵۔ بیمار کی بیمار پرسی کے لیے جایا کریں۔

---

[1] ایضاً [2] کتاب الاموال فی تقبیل السواد و اختیار الولاۃ [3] کتاب الخطط للمقریزی ج ۱ ص ۱۲۰

اگر کوئی افسر و عہدیدار ان خواتین کی خلاف ورزی کرتا تو اس کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی

اذا بلغہ ان عاملہ لا یعود المریض ولا یدخل علیہ الضعیف نزعہ [۱]

جب شکایت پہونچتی کہ آپ کا مقرر کردہ حاکم مریض کی عیادت نہیں کرتا اور کمزور ضعیف اس کے پاس نہیں آپاتے تو ایسے حاکم کو معزول کر دیتے تھے۔

ایک شخص نے مصر کے حاکم اعلیٰ (گورنر) عیاض بن غنم کی ان الفاظ میں شکایت کی۔

"اے عمر کیا حاکموں سے صرف حلف لے لینے سے آپ کو اللہ کی باز پرس سے نجات مل جائے گی؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عیاض بن غنم باریک کپڑا پہنتے ہیں اور دروازہ پہ دربان رکھا ہے" [۲]

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ (سفیر) کو حکم دیا کہ "عیاض بن غنم" جس حالت میں ہوں مہلت دیے بغیر میرے پاس حاضر کرو۔ محمد بن مسلمہ جب مصر پہونچے تو واقعی عیاض بن غنم باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ حسب الحکم مہلت دیے بغیر اسی حالت میں لے آئے گئے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھنے کے بعد فرمایا:

انزع قمیصک ودعا بمدرعۃ صوف وبربضۃ من غنم وعصا فقال البس ھذہ المدرعۃ وخذ ھذہ العصا وارع ھذہ الغنم واسق من مر بک [۳]

اپنی قمیص اتار دو اور پھر کملی کا جبہ اور بکریوں کا گلہ منگوا کر حکم دیا کہ کملی کا جبہ پہن لو اور بکریوں کا گلا اور عصا لے کر جنگل کی طرف جاؤ وہاں جا کر بکریاں چراؤ اور راستہ سے جو گزرے اس کو پانی پلاؤ۔

اسی طرح حضرت سعد بن وقاص کے خلاف لوگوں نے شکایت کی کہ وہ گھر کے اندر عدالت کرتے ہیں باہر نہیں کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلا کر کہا۔

---

۱ کتاب الخراج فی تعقیل السواد لاختیار الولاۃ ۲ کتاب الخراج ۳ ایضاً

اذهب الى سعد بالكوفة — سعد کے پاس کوفہ جاؤ اور ان کے محل کو جلادو

وحرق عليه قصره ولا تحدثن — وہاں اور کوئی نئی بات نہ کرنا یہاں تک کہ

حدثا حتى تأتيني — میرے پاس آجاؤ۔

محمد بن مسلمہ حکم کی تعمیل میں کوفہ گئے، جہاں ایک نبطی سے لکڑی کا گٹھا خریدا اور محل کو آگ لگادی۔ سعدؓ نے نکل کر پوچھا۔

ماهذا — یہ کیا حرکت ہے؟

ابن مسلمہ نے جواب دیا۔

عزمة امير المومنين — امیر المومنین کا حکم ہے۔

یہ سُن کر وہ خاموش ہوگئے اور محل جل گیا۔ سعدؓ نے ابن مسلمہ کو واپسی کے وقت سفرخرچ دینا چاہا لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ واپس آنے کے بعد حضرت عمرؓ نے سفرخرچ کے بارے میں پوچھا:۔

هلا قبلت نفقته — تم نے خرچ کیوں نہیں قبول کیا۔

جواب دیا:۔

انك قلت لا تحدثن حدثا — آپ نے کہا تھا کہ کوئی نئی بات نہ کرنا یہاں تک

حتى تأتيني [۱] — کہ میرے پاس آجاؤ۔

(باقی)

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ اور اتباعِ سنت و شریعت

(از جناب مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار و اڑیسہ)

حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سنت پر عمل کیا کرتے تھے، شب و روز میں کوئی دعا ایسی نہیں کہ جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھی ہو اور وہ آپ کو یاد نہ ہو، اور اسے آپ اپنے وقت پر پابندی سے پڑھتے نہ ہوں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تھا کہ جو باتیں آپ کے علم اور اطلاع میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں تھی ان پر آپ عمل نہیں فرماتے تھے، مثال کے طور پر ایک بات مجھے یاد آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار رکعت والی فرض نماز سے پہلے چار رکعتیں سنت کی بھی پڑھی ہیں، اسی بنیاد پر فقہار لکھتے ہیں کہ ظہر کے فرض سے پہلے تو چار رکعتیں سنت موکدہ ہیں لیکن عصر اور عشار سے پہلے بھی چار رکعتیں سنت کی پڑھنا مستحب ہے اور لوگ پڑھتے ہیں، لیکن حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ عشا سے پہلے سنت کی چار رکعتیں نہیں پڑھتے تھے، لوگوں کو حیرت تھی کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر احادیث پر عمل کرنے والا شخص عشار سے پہلے چار رکعتیں سنت کی نہیں پڑھتا، چنانچہ پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ فقہار لکھتے ہیں لیکن عشار سے پہلے چار رکعتیں سنت کی پڑھنا حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا لیا تھا کہ جو حدیث سے ثابت ہے کرو اور جو حدیث سے ثابت نہیں ہے نہ کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ اور اسوہ کے

بعد آپؒ نے صحابۂ کرام کے طریقہ اور اسوہ کو اپنایا کہ جس کام کو صحابۂ کرامؓ نے نہیں فرمایا لعد
نہیں کیا وہ مولانا فضل رحمانؒ سے بھی نہ ہوگا۔ اس بیان کی تائید میں ایک واقعہ سنئے:۔
خانقاہ رحمانی کے محفوظ تبرکات میں ایک حصن حصین مطبوعہ افضل المطابع بھی ہے، اس کے
(متن کتاب کا آخری صفحہ) پر حضرت مولانا فضل رحمان علیہ الرحمۃ کے دستخط سرخ ص ۲۱۲
روشنائی سے ہیں اور اسی صفحہ کے حاشیہ پر حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قلم
سے حسب ذیل عبارت لکھی ہے، اسے غور سے پڑھئے تو اس سلسلہ کی متعدد باتیں واضح ہو جائیں گی۔
اور تصوف کے مختلف مسائل پر واضح اشارات ملیں گے۔ عبارت یہ ہے:۔

"ایں نسخہ متبرکہ بعد معائنہ و تصحیح حضرت مولانا مرشدنا در ۱۲۹۳ھ بایں خاک پا مرحمت فرمودند
وقتیکہ بر دست مبارک بیعت کردم و در مسلک ارادتمنداں منسلک شدم بعد ارشاد بعضے اذکار
و اشغال خواندن ادعیہ ایں کتاب خصوصاً ادعیہ غیر مخصوصہ را کہ در آخر کتاب مذکور اند تاکید فرمودند
و اجازت ایں کتاب دادند دریں وقت ایں نسخہ موجود نبود پس بعد معاودت از سہارنپور کہ برائے
سند گرفتن حدیث شریف بخدمت مولانا احمد علی صاحب حاضر شدہ بودم۔ بخدمت حضرت
قدوۃ العرفاء مولانا و مرشدنا کہ نام مبارکش بر ایں صفحہ بدستخط خاص ثبت است حاضر شدم
دراں وقت ایں نسخہ مصححہ عنایت فرمودند، عرض کردم کہ در کلمہ اجازت تحریر فرمایند ارشاد شد کہ
صحابہ بر اجازت زبانی اکتفا می کردند، دریں مرتبہ وقت رخصت اجازت بیعت گرفتن در خاندان
نقشبندی و قادری ہم فرمودند عرض کردم کہ ایں خاکپا کجا و ایں منصب کجا فرمودند کہ شمارا از چون
و چرا چہ حاصل آنچہ می گویم بر آں عمل کنید و انا العبد الفقیر الراجی الی فضل الرحمٰن الغنی محمد علی حفی عنہ"

ذرا غور فرمایئے کہ لکھ کر اجازت طلب کی جاتی ہے اس کے جواب میں حضرت گنج مراد آبادی
رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ زبانی اجازت پر اکتفا کیا کرتے، اجازت نامہ لکھ کر دینا کوئی
بری بات نہیں ممنوع نہیں بالکل مباح ہے لیکن وہاں تو یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ ہم تو وہی کام کریں گے
جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کیا ہے یا آپؐ کے صحابہؓ نے کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جناب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات گرامی سے ایسی والہانہ محبت اور حدیث و آثار صحابہؓ سے ایسا
مضبوط تعلق کم دیکھنے میں آیا اور کیوں نہ ہو حضرت مولانا فضل رحمان علیہ الرحمۃ کا مشرب نقشبندی تھا

اور سنت و آثار پر عمل کرنا اسی راستہ سے سلوک کے منازل طے کرنا نقشبندیوں کا امتیاز ہے، مشرباً نقشبندی ہونے کے باوجود حضرت مولانا شاہ فضل رحمانؒ بعض دفعہ [illegible] روحانی کیفیت کے باعث بظاہر بے تاب و بے چین ہو جایا کرتے تھے اور شورش کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، ایک دفعہ فرمایا کہ جانتے ہو کہ اللہ کا ترجمہ ہندی میں کیا ہے؟ خود ہی ارشاد ہوا: "من موہن" اللہ کو ولہ سے بھی مشتق کہتے ہیں: "دل کو موہنے والا" یہ کہتے ہوئے زور سے چیخ ماری "آہ" کی، مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میری حالت بھی متغیر ہو گئی، اور سکون کے بعد دل میں یہ خطرہ آیا کہ نقشبندیوں میں تو ضبط و سکون ہے، یہ شورش کس وجہ سے؟ ارشاد ہوا کہ خاندان نقشبندیہ مجددیہ میں نسبت جذبیہ بھی ہے، حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ نے تین برس تک ایک مجذوب کی صحبت میں رہ کر نسبتِ جذبیہ حاصل کی ہے، اس تین برس میں خواجہؒ صاحب کا یہ معمول رہا ہے کہ دو گھنٹہ ہر روز ان مجذوب کی خدمت میں رہتے تھے، اس میں گرمی برسات اور جاڑا سب برابر تھا، اگر وہ بیٹھے رہتے تھے تو خواجہ صاحبؒ بھی بیٹھے رہتے تھے، اگر وہ پھرتے تھے تو خواجہ صاحبؒ بھی ان کے ہمراہ پھرا کرتے تھے، خواہ کیسی ہی دھوپ ہوتی یا کیسا ہی پانی برستا۔"

یہ بھی ارشاد ہوا کہ "یہ کہ بعض مجذوبوں کی نسبت صحیح ہوتی ہے اور بعض کی صحیح نہیں ہوتی جن کی نسبت صحیح ہوتی ہے وہ احکام شریعت کا بہت ادب کرتے ہیں" حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:- ۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۰ھ بعد عصر شیخ احمد صاحب مکی قرآن مجید سنانے لگے، حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ فرماتے جاتے تھے، جب یہ لفظ پڑھا۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول، ارشاد فرمایا کہ: "لفظ اطاعت طوع سے ماخوذ ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کی بجاآوری بہ رغبت و خوشی کرو۔"

مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ ہی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ کچھ ورد و وظائف کا تذکرہ تھا، میں نے حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ بعد ظہر انا فتحنا پڑھنا چاہیے؟ ارشاد ہوا کہ حدیث میں نہیں آیا، پھر حضرت مونگیریؒ نے عرض کیا بعد عصر عم یتساءلون پڑھنا چاہیے؟ ارشاد ہوا کہ یہ بھی حدیث میں نہیں ہے۔

مولانا محمد تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضورؒ نے کون سا عمدہ عمل فرمایا ہے

کو اس درجہ کو پہونچے، ارشاد ہوا کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے سے۔

ایک جلسہ میں ارشاد ہوا "فاتبعونی یحببکم اللہ" اس کا ترجمہ کہو، پھر خود ہی فرمایا۔

"ہماری چال چلو تب پیار کرے گا اللہ تم لوگوں کو"

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا:- کہ "اتباع سنت یہی ہے کہ جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اسی طرح کرے گھٹائے بڑھائے نہیں" اور یہ قطعہ پڑھا:- ؎

گردِ فعل اسپ سلطانِ شریعت سرمہ کن تا شود نورِ الٰہی باد و چشمت مقترن

حضرات نقشبندیہ شغل رابطہ یعنی تصور شیخ کی بھی تعلیم کرتے ہیں اور اس کو نہایت مؤثر اور سہل ترین راہ بتلاتے ہیں، حضرت مولانا محمد علی مونگیری علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں۔

"مگر حضرت قدس سرہ بسبب کمال احتیاط کے اس کی تعلیم نہیں فرماتے، میں نے مکرر تصور شیخ کی نسبت دریافت کیا تو فرمایا کہ ہمارے حضرت کے یہاں یہ تعلیم نہیں تھی، شیخ کی محبت اور اس کا اتباع چاہیے، اور محبت کی وجہ سے بے اختیار تصور آ جانا اور بات ہے، خود صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسا ہوا تھا، چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، کانی انظر الی وبیض ساقیہ[1] حضرت عالیشان[2] نے جو اپنے مکتوبات میں تحریر فرمایا ہے کہ ذکر بے رابطہ موصل الی اللہ نہیں ہے اور رابطہ بغیر ذکر کے موصل ہو سکتا ہے، اس سے مراد محبت شیخ ہے نہ تصور شیخ

ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضرت! رابطہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ شیخ سے محبت ہو جانا اور اس کی کیفیت مرید میں آ جانا کم یا زیادہ، میں نے عرض کیا کہ تصور شیخ کو رابطہ کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ تصور یا بے تصور شیخ کی محبت ہونی چاہیے، ہم نے کبھی نہیں کیا، ہم تو وہی باتیں کرتے تھے جو حدیث میں آئی ہیں، ہمیں سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ جاری رہتا تھا، یاد رکھو کہ جو بات شریعت کے اتباع اور ان اعمال سے حاصل ہوتی ہے جو حدیث میں آئے ہیں وہ کسی سے نہیں ہوتی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احترام شریعت اور اتباع سنت حضرت گنج مرادآبادی کی زندگی کا سرمایہ تھا عشق رسول صلعم، اسوۂ نبی صلعم، اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی حیات کا محور تھا، اسی کے گرد آپ کی زندگی

---

[1] گویا میں آپ کی پنڈلیوں کی چمک دیکھ رہا ہوں۔ [2] حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ۔

گردش کرتی رہی تصوف و سلوک جس کے آپ شیخ کامل اور امام اعظم تھے وہ بھی شریعت و سنت ہی کی راہ سے طے کراتے، اکثر وبیشتر انہیں وظائف و اوراد کی تعلیم فرماتے جو حدیث میں آئے ہیں، اوپر ایسے حوالے گزر چکے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سید محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض اذکار کے پڑھنے کی اجازت خاص اوقات میں چاہی تو فرمایا کہ حدیث میں نہیں آیا۔

بعض نادان شریعت و طریقت میں فرق کرنا چاہتے ہیں شریعت کی پابندیوں سے ہٹ کر طریقت کی آزاد راہ الگ نکالنا چاہتے ہیں، لیکن طریقت کے امام مولانا فضل رحمان علیہ الرحمۃ تو شریعت و سنت کے اتباع ہی سے سلوک کی راہ طے کرایا کرتے تھے، آپ کے نزدیک تو ولایت کی نشانی یہی تھی کہ شریعت پر عمل بے تکلف ہونے لگے، مولانا سید محمد علیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ "حضرت! حالتیں سب کچھ طاری ہوتی ہیں مگر وہ جو بات ہے وہ نہیں ہے"

ارشاد ہوا کہ کوئی آسمان پر اڑنے نہیں لگتا ہے، ولایت اسی کو کہتے ہیں کہ احکام شریعت بے تکلف ہونے لگیں، اور افعال شریعت ایسے ہو جائیں کہ گویا امور طبعی ہیں"

یعنی اس درویش کامل کے نزدیک ولایت کے لئے صرف احکام شریعت پر عمل ہی کافی نہیں ہے بلکہ احکام شریعت پر اس قدر عمل ہونا چاہیئے کہ وہ سالک کے لئے ملکہ راسخہ بن جائے، اور شریعت کے کام طبعی امور کی طرح انجام پانے لگیں۔

حق تعالیٰ نے جن کاموں کی انجام دہی کا حکم دیا ہے ان کی طرف ایسی رغبت کہ اسے انجام دیئے بغیر چین نہ ملے اور جن کاموں سے حق تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے ایسی نفرت کہ اس کے پاس بھٹکنا بھی گوارا نہ ہو، یہ رغبت و نفرت دونوں طبعی قسم کی ہونی چاہیئے حلال و حرام معروف و منکر کے علاوہ کچھ چیزیں مشتبہ اور بعض باتیں متشابہات میں سے ہیں، ایسی مشتبہ باتوں سے بھی اجتناب اور پرہیز سالک کا فریضہ ہے وہ درمیان کی مشتبہ بات اگر حلال و معروف کی صف میں داخل ہے تو ہر مباح اور ہر حلال پر عمل اور اس کا استعمال ضروری نہیں، اگر انسان کسی مباح پر عمل نہ کرے، تو کوئی جرم نہیں، لیکن اگر وہ مشتبہ چیز حرام کی صف میں شامل ہے تو حرام پر عمل یا اس کا استعمال کسی حالت میں بھی مستحسن نہیں اور پھر یہ بات

بھی ذہن میں رہے کہ سالک کو فتویٰ پر نہیں تقویٰ پر عمل کرنا ہے، فتویٰ تو عام لوگوں کے لئے ہے۔
حضرت امام ابو داؤد علیہ الرحمۃ جنھیں پانچ لاکھ حدیثیں محفوظ تھیں انہیں میں سے انتخاب کر کے انھوں نے سنن ابو داؤد مرتب کی ہے جو صحاح ستہ میں داخل ہے، ان ہی امام ابو داؤدؒ کا قول ہے فرماتے ہیں:۔

"حدیث کے ذخیرے میں چار حدیثیں سمجھدار شخص کے لئے کافی ہیں ایک انما الاعمال بالنیات۔" انسان کے عمل کا مدار اس کی نیت پر ہے دوسری من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ" لایعنی چیزوں کو چھوڑ دینا انسان کے اسلام کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے" تیسری لایکون المومن مومنا حتی یرضی لاخیہ مایرضاہ لنفسہ" کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے اسی چیز کو پسند نہیں کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے" چوتھی الحلال بین والحرام بین وبین ذالک متشابہات فمن اتقی المشبہات استبرء لدینہ "حرام اور حلال دونوں واضح ہیں اور جو کچھ اس کے درمیان ہے متشابہات ہیں، پس جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنی دنیا پاک کر لی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ان چاروں حدیثوں کو اپنی زندگی کا اصول بنالے وہ دین اور دنیا دونوں میں کامیاب رہے گا۔
مطلب یہ ہے کہ حضرت گنج مرادآبادیؒ کے نزدیک شریعت وطریقت دو چیزیں نہیں تھیں، ان کے یہاں تو ولی کہتے ہی تھے اس شخص کو جس سے افعال شرعیہ اس طرح سرزد ہوں جس طرح امور طبعی ہوا کرتے ہیں۔
ایک دفعہ آپؒ سے غوث وقطب کے متعلق سوال کیا گیا، نواب نور الحسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ حضرتؒ نے فرمایا:۔"کہ اتباع سنت یہی غوثیت اور قطبیت ہے۔"
بعض لوگوں میں کچھ اثرات اور خاص باتیں ہوتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ شریعت کے خلاف بھی کام کرتے ہیں اور بہت سے نادان ایسے لوگوں کو بزرگ اور ولی سمجھتے ہیں لیکن حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "غوث ہو یا قطب جو خلاف شرع کرے، کچھ بھی نہیں۔"

صوفیاء کے یہاں تین اصطلاحیں اکثر سننے میں آتی ہیں فنافی الشیخ، فنافی الرسولؐ، فنافی اللہ، پہلی کے متعلق تو شغل رابطہ والی روایت میں واضح اشارہ مل چکا، تصور شیخ جس کے نتیجہ میں سب سے پہلے شیخ میں فنا حاصل ہوتی ہے، اس کے متعلق حضرت گنج مرادآبادی علیہ الرحمۃ نے وضاحت فرمادی کہ شغل رابطہ سے مراد شیخ کی محبت ہے، شیخ کا تصور مراد نہیں۔

اب فنافی الرسولؐ کا مطلب بھی حضرت مولانا فضل رحمان رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے، حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس سرہٗ ارشاد رحمانی میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔ ارشاد ہوا۔

"افعال ظاہری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسہولت اور بے تکلف ہونے لگنا یہی فنا فی الرسولؐ ہے اور کچھ نہیں"

یعنی اتباع سنت ہی فنافی الرسولؐ اور محبت رسولؐ کی نشانی ہے، زبانی دعوی سے کام نہیں چلتا، سالک کو فنافی الرسولؐ کا مقام اسی وقت ملے گا جب افعال ظاہری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بے تکلف ہونے لگیں۔ غرض یہ کہ حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سالک کے لئے شاہد مقصود سے ہمکناری، ولایت کا حصول اور فنا فی الرسولؐ کا مقام اتباع شریعت و سنت ہی کے ذریعہ ملتا ہے، یہی نہیں، حضرتؒ تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ:۔ "حدیث پر عمل کرنے سے دین و دنیا دونوں ملتی ہے۔"

یہ بالکل صحیح ہے کہ سلاسل طریقت کی مقررہ اور مروجہ تعلیم ایک منجھا ہوا راستہ ہے جس پر ہزارہا اللہ کے بندے چل کر منزل مقصود تک پہونچ چکے ہیں اور پہونچتے رہیں گے لیکن اس راہ پر چل کر منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے شیخ طریقت اور مرشد کامل ایسا ہی ضروری ہے جیسے بدن انسانی کے لئے خون اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں شریعت و سنت ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو شیخ و مرشد سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے، یعنی شیخ و مرشد کے بغیر صرف شریعت کی اتباع اور سنت کی پیروی کے ذریعہ بھی ولایت حاصل ہو سکتی ہے۔

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری قدس سرہٗ ارشاد رحمانی میں تحریر فرماتے ہیں:۔ کہ

"جب میں نے خلیل الرحمٰن کی نسبت عرض کیا کہ یہ لٹھے کی تجارت کرتے ہیں ارشاد ہوا کہ جو کوئی کچھ خریدے اور سورۂ لایلف اور چاروں قل پڑھ کر اس پر دم کرے اور دعا مانگے اللہ برکت

دیتا ہے، کسی کا ذکر بھی کیا کہ وہ غریب تھے، تھوڑی تجارت کرتے تھے اسی عمل کو کیا اور مالدار ہو گئے، حدیث میں سب کچھ ہے عمل کرنا چاہیئے، بعض اگلے بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ انہیں کوئی کام نہ ملا اور انھوں نے شریعت پر عمل کیا اور جو اوراد جس وقت کے لئے حدیث شریف میں آئے ہیں انہیں پڑھا اور ولی ہو گئے۔"

اسی لئے حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ اکثر انہی وظائف و اوراد کی تعلیم دیتے ہیں جو احادیث میں آئے ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ متعدد بار گنج مرادآباد تشریف لے گئے، پہلی مرتبہ کی حاضری میں واپسی کا حال اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ

"میں نے رخصتی مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت! میرے لئے دعا کیجئے، فرمایا ہم نے تمہارے لئے دعا کی ہے" پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھ کو کچھ پڑھنے کو بتلا دیجئے فرمایا قل ھو اللہ شریف اور سبحان اللہ وبحمدہ دو دو سو بار پڑھ لیا کرو۔ اوروں سے بھی سنا کہ حضرت مولانا طالبین کو کثر یہی پڑھنے کو بتایا کرتے تھے کیونکہ حدیث شریف میں ان چیزوں کی بڑی فضیلت آئی ہے۔"

صوفیاء کی تعبیری اصطلاح فنا فی اللہ ہے اس لفظ کو بول کر ہمارے جیسے کم ظرف اور ناکارہ ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہو جایا کرتے ہیں اور جو دل چاہتا ہے کرتے ہیں، کہ جب فنا فی اللہ ہو گیا تو پابندی کیسی؟ "جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج"

لیکن حضرت گنج مرادآبادی اور ان کے خلیفہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مجاز حضرت مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوری رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کی روشنی میں حق تعالیٰ کی ذات میں فنا ہونے والا انسان آزاد اور شتر بے مہار نہیں ہو جاتا جب ذکر و فکر اور مجاہدہ و مراقبہ کی کثرت سے حق تعالیٰ کا فضل کسی سالک پر متوجہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے سالک کے قلب کو فنا حاصل ہوتی ہے اور اس کا حال ایسا ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کی محبت اس کے دل میں باقی نہیں رہتی اور وہ محسوس کرتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ اپنے اور سارے عالم کے افعال کو حق تعالیٰ کا فعل سمجھتا ہے اور جانتا ہے اور جب روح کو فنا حاصل ہوتی ہے تو اس وقت سالک ان تمام صفتوں سے اپنے آپ کو خالی سمجھتا ہے جو اسے عارضی طور پر عطا کی گئی ہیں، ارادہ کرنا، بات کرنا، سننا

دیکھنا، سوچنا وغیرہ یہ ساری صفتیں بندے کی اپنی ہیں، گرچہ عارضی ہیں اور عطا کردہ ہیں لیکن فنائے روح کے حصول کے بعد ان صفتوں سے بھی اپنے آپ کو خالی پاتا ہے اور ان سب کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب جانتا ہے اس جگہ پہونچ کر سالک سے بعض دفعہ شطحیات (خلاف ظاہر اور خلاف شرع امور) کا صدور ہوتا ہے، اور چلنے والے اس جگہ پہونچ کر پھسلتے ہیں، لیکن یہ سالک کی کمزوری ہے بیشک خدا کی تجلی ہوتی ہے اور سالک اس تجلی میں بے اختیار اور غیر محسوس طریقے پر گم ہو جاتا ہے، اور فنا ہو جاتا ہے، لیکن خدا نہیں ہوتا، یقیناً حق تعالیٰ اپنا جلوہ دکھاتا ہے جن نگاہوں میں اور جس دل و دماغ میں حق تعالیٰ کی تجلی سما جائے اس کی طاقت کا کیا کہنا؟ کائنات میں کون اس کے مقابل آسکے گا یہ سب کچھ ہے لیکن خدا سالک میں حلول نہیں کرتا۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمان قدس سرہ کے حالات و ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض دفعہ مقام فنا کے دریچہ سے ارشاد فرمایا کرتے تھے مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ ارشاد رحمانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس کے بعد فرمایا کہ نیک بختی اور شے ہے اور ولایت اور چیز ہے، ولایت محض عنایت خدا سے ہوتی ہے حضرت[1] کے پاس بیس بیس برس تک لوگ رہے اور حضرت فرماتے تھے کہ ہم بہت چاہتے ہیں مگر کچھ نہیں ہوتا اور جس کو وہ چاہتا ہے ایک توجہ میں ہو جاتا ہے، یہ ارشاد فرما کر آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ پڑھنے پڑھانے سے کیا ہوتا ہے دیکھو میں کچھ قرآن شریف پڑھ لیتا ہوں، اور تھوڑا سا کچھ اور، اور پھر لطف میں آکر فرمایا کہ اللہ و رسول پر جان قربان کرنا چاہیے اس سے سب کچھ ہوتا ہے۔"

مرض وفات کے واقعہ سے تو صاف ظاہر ہے کہ آپ کو فنائے کامل حاصل تھی علالت کی ابتدا ۲ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ سے ہوئی، اور ۲۲ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ بعد نماز مغرب آپ کا وصال ہوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولوی محمد عبد الغفار صاحب اسیونی اپنی کتاب

---

[1] یعنی حضرت مولانا شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ

"ہدیۂ عشاق فضل رحمانی" میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اکیسویں کو ۲ بجے دن کو آپ نے فرمایا کہ "ہم مرگئے ہمارے جنازے کی نماز پڑھ دو اور اگر کوئی نہ پڑھے تو میں خود پڑھ لیتا ہوں اور تمام مقتدی کھڑے ہیں، اللہ اکبر فرما کر ہاتھ باندھ لیے"۔

فنائے کامل کی ایسی مثالیں متقدمین میں تو ملتی ہیں لیکن متاخرین میں کہاں نظر آتی ہیں؟ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نیل المراد فی سفر گنج مراد آباد میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"ہدیوں سے فارغ ہونے کے بعد مختلف باتیں فرماتے رہے بعض بعض یاد بھی ہیں۔ مثلاً فرمایا کہ:۔

"کہنے کی بات تو نہیں ہے لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب میں سجدہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پیار کر لیا"۔

سجدہ والی کیفیت کی یہ انوکھی تعبیر وہی کر سکتا ہے جسے فنار کامل حاصل ہو۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمان قدس سرہ کے حالات و ملفوظات کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے شاید آپ کی زندگی میں کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں جسے شطحیات میں شمار کیا جائے، دراصل حق تعالیٰ میں فنا ہونے کی نشانی خدا کے ساتھ سچی محبت اور یہ کہ ہمہ دم اس کا استحضار رہے، ایک دفعہ ارشاد ہوا:۔

"اللہ کی محبت میں جو مزہ ہے وہ جنت کی چیزوں میں نہیں ہے، حور و قصور اور کھانے کی چیزیں اور حوض کوثر ان سب کا مزہ اس مزہ کے روبرو نہیں ہے۔ عاشقوں کو جنت بھی اسی وجہ سے پسند ہوگی کہ اس میں اسی کا جمال ہے ؎

عاشقاں را روز محشر باقیامت کار نیست ۔۔۔ کار عاشق جز تماشائے جمالِ یار نیست

"ہمیں یہ مزہ قرآن مجید پڑھنے میں آتا ہے جنت میں ہمارے پاس حوریں آئیں گی تو ان سے کہیں گے کہ آؤ ذرا قرآن مجید تو سن لو، بعض مرتبہ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ قریب تھا کہ دم نکل جائے، مگر حضرت (شاہ محمد آفاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ) پاس بیٹھے ہوئے تھے اللہ کے فضل سے بچ گئے"۔

حضرت گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی تھی اور کبھی شعلہ بن کر اٹھتی تھی جس سے آپ خود بے چین ہو جاتے اور حاضرین مجلس بھی حسب استعداد

متاثر ہوتے، مولانا تجمل حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ایک بار مولانا محمد علیؒ وغیرہ کا مجمع تھا قرآن شریف کا ترجمہ ہوا، جب وہ آیت پڑھی گئی جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیان میں ہے:۔

"وکان عند ربہ مرضیا" تو حضرتؒ نے اس کا ترجمہ فرمایا کہ:۔

"تھا اپنے رب کا پیارا" یہ فرما کر چیخ ماری اور آپ پر گویا کیفیت مدہوشی کی طاری ہوئی، اس واقعہ کے بعد دو مہینے سخت علیل رہے۔

حضرت مولانا فضل رحمان رحمۃ اللہ علیہ محبت و فنا کے بلند سے بلند تر مقامات پر تھے لیکن شریعت کے خلاف کیا کام ہوتا کبھی کوئی لفظ اتباع سنت اور شریعت سے ہٹ کر زبان سے نہ نکلا، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی نوٹ بک میں فارسی کے دو شعر لکھے ہوئے دیکھے ہیں، یہ نوٹ بک اس وقت میرے پاس موجود ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار میں مشائخ نقشبندیہ کی صحیح اور سچی تصویر کھینچی گئی ہے:ـ

ما صاف دلاں نہ ہا و ہوئے داریم | نے بحث کس نہ گفتگوئے داریم
جز جلوۂ او زماں نہ باید طلبید | ما آئینہ ایم عکس روئے داریم

عشق اور محبت کے زور و شور کے باوجود حضرت گنج مرادآبادی قدس سرہ کی پوری زندگی احترام شریعت اور اتباع شریعت میں گزری قرآن و حدیث سے آپ کو جس قدر شغف تھا اس کی تعبیر "عشق" کے علاوہ کسی اور لفظ سے نہیں کی جا سکتی، ایک دفعہ حضرت مولانا سید محمد علی قدس سرہ العزیز نے عرض کیا کہ ہم کو جو مزہ شعر میں آتا ہے قرآن شریف میں نہیں آتا، آپؒ نے فرمایا:۔

"ابھی بعد ہے۔ قرب میں جو مزہ قرآن شریف میں ہے کسی میں نہیں"

مولانا تجمل حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا:۔ کہ

"قرآن شریف اور حدیث پڑھا کرو کہ اللہ میاں دل پر آکر بیٹھ جاتے ہیں"

معلوم ہوتا ہے کہ طریقت کی ہر منزل پر حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ شریعت و سنت ہی کی راہ سے پہونچے تھے، اور زندگی کے تمام شعبوں میں کھرا کھوٹا پرکھنے کے لئے قرآن و

حدیث ہی کسوٹی تھی، اور شریعت و سنت پر عمل آپ کا مزاج بن چکا تھا اور قرآن و حدیث کے خلاف آپؒ کسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے تھے صوفی عبد الرب صاحب اپنے والد مولوی عباد علی صاحب گنج مراد آبادی کی حاضری اور حضرتؒ کی زیارت کا حال بیان فرماتے ہیں:۔

"اس شوق میں مسجد کے اندر جانے کے لئے ایک پاؤں جوتے سے نکال کر اندر رکھا ہی تھا، میرے ایک ہاتھ میں بانس کا ہلکا سا عصا تھا، ابھی دوسرا پاؤں اندر نہ رکھا تھا کہ وہ بڑے میاں بلند آواز سے برہمی کے ساتھ فرمانے لگے:۔ "کھینچو، کھینچو، کھینچو، کھینچو" میں ششدر کھڑا رہ گیا، کچھ میں نہ آیا کہ کیا کھینچوں، مجھ کو ہکا بکا دیکھ کر وہ میری طرف تیزی سے آئے اور میں ڈرا کہ اب پٹا، یہ بغیر مارے نہ چھوڑیں گے۔

لیکن یا تو برہمی تھی، یا میرے پاس آکر بڑی نرم اور شیریں آواز میں محبت سے فرمایا کہ "میاں کیسے آدمی ہو، مسجد میں کوئی پہلے بایاں پاؤں رکھتا ہے" اب میں نے فوراً اپنا بایاں پاؤں کھینچ کر پھر اپنے جوتے پر رکھ لیا اور ان کے سامنے کھڑا ہوا ان کی باتیں سنتا رہا ہے کہ جب مسجد کے اندر آتے ہیں تو داہنا پاؤں پہلے اندر رکھتے ہیں، درود شریف پڑھتے ہیں، اللھم افتح لی ابواب رحمتک اور جب مسجد سے نکلتے ہیں تو پہلے بایاں پاؤں باہر رکھتے ہیں اور درود شریف پڑھتے ہیں اور پڑھتے ہیں اللھم انی اسئلک من فضلک"

اور اسی لئے آپؒ بدعات اور رسوم کے مخالف تھے، مولانا تجمل حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت قبلہؒ کی خدمت میں مونگیر سے ایک استفتاء، تعزیہ سے متعلق آیا، اس پر آپؒ نے حسب ذیل جواب تحریر فرمایا:۔

"ما امور مذکورہ قائل نیم، ہرچہ خلاف سنت است بدعت است۔"

عرض کیا گیا کہ چہلم و سوم جو آج کل مسلمانوں میں مروج ہے، بدعت ہے یا نہیں، فرمایا

"بیشک بدعت ہے۔"

غرض ظاہر ہو یا باطن، شریعت ہو یا طریقت انسان کے معاشرتی معاملات ہوں یا سلوک کی تعلیم، ہر جگہ اور ہر مقام پر حضرت گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں شریعت و سنت ہی نظر آئے گی، آپؒ خدا کے محبوب بندے اور رسولؐ کے عاشق تھے، مگر آپؒ نے قرآن و حدیث کو

اپنا پیشوا بنایا اور پوری زندگی اسی کے پیچھے چلائی اللہ تعالےٰ نے مقبولیت بھی ویسی عطا فرمائی کہ شاید و باید۔

حضرت مولانا حکیم سید عبد الحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء نے اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں حضرت گنج مراد آبادیؒ کا ترجمہ لکھا ہے، اور حقیقت نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ اس کے متفرق حصوں کا ترجمہ آپ بھی سنئے۔

"اور مراد آباد میں مستقل قیام اختیار فرمایا، جب عقیدت مندوں نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا تحائف و ہدایا کی بارش ہوئی بڑے بڑے امراء و رؤسا دور دراز اور دشوار گزار علاقوں سے عقیدتمندانہ حاضر ہوئے اور آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی اور ایسی مقبولیت اور شہرت عزیزی حاصل ہوئی جو اس زمانے میں کسی شیخ طریقت کو حاصل نہیں تھی۔ ... میں نے اپنے زمانہ میں جن علماء و مشائخ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ان میں کسی کو سنت نبوی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال ڈھال اور طور و طریقہ کا آپؒ سے زیادہ جاننے والا نہیں دیکھا ورع و احتیاط، قناعت و استغناء بذل و سخا اور زہد و کرم میں آپ فرد فرید تھے۔ ...

..... اگر حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر میں قسم کھاؤں کہ میں نے ان سے بڑھ کر کریم اور درہم و دینار سے بے تعلق، کتاب و سنت کا پیرو نہیں دیکھا تو میں حانث نہیں ہوں گا۔ ... جہاں تک آپؒ کے کشف و کرامات کا تعلق ہے وہ حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔ اور اس بارے میں اولیاء متقدمین میں حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی علیہ الرحمہ کے علاوہ اور کوئی نظیر نہیں ملتی۔"

(ختم)

آخر میں آپ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ایک مکتوب کی چند سطریں بھی پڑھ لیجئے جو آپ نے ایک صاحب علم طالب سلوک کو لکھا تھا۔

"ذی علم کے لیے شریعت محمدیہ کافی ہے، خلوص سے اس پر عمل کرنا چاہیے، اعمال شرعیہ و مرویہ و ظائف پر عمل کرنے سے جو نسبت قوی الی اللہ حاصل ہوتی ہے ویسی قوی نسبت اذکار و اشغال صوفیائے کرام رحمہم اللہ سے نہیں ہوتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ سید الانبیاء فخر الاولیاء کے اعمال و اشغال کو حضرات صوفیہ کے اعمال پر بلاشبہ فضیلت ہے، مگر خلوص کے ساتھ کامل طور پر عمل ہونا چاہیے، البتہ میرے خیال میں یہ امر بغیر صحبت مرشد کامل دشوار ہے، اللہ تعالیٰ میسر کرے۔"

مکتوبات محمدیہ جلد دوم ص ۴۹

داماں کوہ سے ایک مردِ حق آگاہ کی آواز بازگشت

اِرشادات

حضرت خواجہ محمد عثمان دامانی نقشبندی مجددی

ترجمہ و تلخیص ــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

طلب العلم فریضۃ کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو کام مردِ مومن اختیار کرتا ہے اس کا علم طلب کرنا فرض ہے۔ مثلاً ایک شخص ارادہ حج کرتا ہے اس کے لیے مسائلِ حج کو سیکھنا اور یاد رکھنا فرض ہے اور جو شخص تجارت کرتا ہے مسائلِ بیع و شری اس کو جاننا فرض ہے اور جو مسکین فقیر ہے اس کو مسائل زکوٰۃ کا طلب کرنا فرض نہیں اسی طرح جو شخص مجرد ہے اس کے لیے مسائلِ نکاح و طلاق جاننا فرض نہیں۔

فرمایا کہ علم فقہ میں غیر ضروری انہماک صوفی کے قلب میں قدرے کثافت پیدا کرتا ہے لیکن "جمالِ درستی عقائد" اس نقصان کا تدارک کر دیتا ہے ــــ اس ارشاد کے وقت جناب (مولانا) مولوی حسین علی[ع] شاہ صاحب بھی حاضر خدمت تھے۔ حضرت پیر و مرشد نے اس خادمِ دیرینہ (جامع ملفوظات

ع حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب نقشبندی مجددیؒ ضلع میانوالی پنجاب کے ایک غیر معروف خاندان اور ایک غیر معروف گاؤں واں بھچراں میں پیدا ہوئے۔ آپ کی شخصیت کی وجہ سے خاندان اور گاؤں کو شہرت حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ سے علم قرآن و حدیث پڑھا۔ پھر حضرت خواجہ محمد عثمان دامانیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر اور سلوک کے تمام مراحل طے کر کے خلافت حاصل کی۔ حضرت مولانا صاحب تصنیفات جید عالم اور ایک بلند پایہ کامل درویش تھے۔ توحید اور اتباع سنت کا غلبہ تھا۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ کے شاگرد اور مرید تھے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کو حکم دیا کہ تسبیح خانہ سے مکتوباتِ امام ربانیؒ کے جلد اوّل لے آؤ۔ حسب الحکم میں وہ جلد لایا۔ حضرت والا نے جناب مولوی صاحب کو مکتوب ہشتم کی ایک عبارت دکھائی (جس کا ترجمہ یہ ہے) اہلِ سنت کے علماء ظاہر اگرچہ بعض اعمال میں (کچھ) کوتاہی کرتے ہوں لیکن ذات و صفاتِ خداوندی کے بارے میں اُن کا جمالِ درستی عقائد" اس قدر نورانیت رکھتا ہے کہ اُن کی کوتاہی اُس کے سامنے مضمحل و ناچیز معلوم ہوتی ہے بعضے لوگ جو بتکلف صوفی بن گئے ہیں چوں کہ ذات و صفاتِ باری میں اِس قدر درستی عقیدہ نہیں رکھتے اس لیے باوجود ریاضات و مجاہدات کے اُن میں وہ جمال نہیں پایا جاتا اس لیے (بنابریں) علماء اور طلبۂ علوم کی محبت میرے دل میں بہت زیادہ پیدا ہوگئی ہے۔ اُن کی طرز و روش پسند آتی ہے آرزو کرتا ہوں کہ علماء و طلبہ کے ہی جرگے اور گروہ میں رہوں۔ آج کل تلویح اور ہدایہ کا ایک طالبعلم سے مذاکرہ کرتا ہوں غرضیکہ معیت و احاطۂ علمی میں علماء کا شریک ہوں۔"

ایک دن ارشاد فرمایا ــــ کہ طالبِ سلوک کے اسبابِ فتور میں سے قوی ترین سبب یہ ہے کہ وہ طالب، ایسے شیخ ناقص کی طرف رجوع کرے جو سلوک و جذبہ کا نا تمام اور ادھورا کام انجام دیکر مسندِ مشیخت پر بیٹھ گیا ہے۔ طالب کو ایسے شخص کی صحبت، پستی کی طرف لے جاتی ہو اور اوپر سے نیچے کو کھینچتی ہے ــــ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کا ارشاد ہے کہ "جس طالب کا مادۂ استعداد مختلف (اور ناموافق) صحبتوں کی وجہ سے ــــ فاسد ہو گیا ہو اُس کا کامیاب ہونا دشوار ہے ــــ اہلِ تدبیر کی صحبت کے بغیر اُس کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور اہلِ تدبیر کمیاب ہیں کبریتِ احمر کا حکم رکھتے ہیں"ــــ

ایک دن ارشاد فرمایا کہ ہر ایک نے (مثنوی مولانا رومیؒ) کا یہ شعر یاد کر رکھا ہے اور لوگ اپنی تحریروں میں بھی لکھتے ہیں ؎

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ　　تیر جستہ باز گرد اند ز راہ

(گزشتہ سے پیوستہ) ــــ اصلاح و تبلیغ کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا، پچاس سال مسلسل خدمتِ اسلام کرکے ۱۹۴۲ء میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ تفصیل کیلئے دیکھیے۔ سوانح حضرت مولانا حسین علی مولفہ مرزا محمد یعقوب خطیب۔

علہ یہ مکتوب اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کی خدمت میں تحریر فرمایا ہے۔)

(یعنی اولیاء اللہ کو اللہ کی طرف سے یہ قدرت حاصل ہو کہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو راستے سے لوٹا دیں) ــ مگر اس شعر کو (کما حقہ) سمجھتے نہیں ــ درحقیقت جس وقت اولیا کو سختی اور لاچاری و بے بسی کی حالت پیش آتی ہو (نیز اضطرار کا عالم ہو جاتا ہو) اُس وقت اس طرح کی کرامت و خرق عادت کا (منجانب اللہ) ظہور و صدور ہوتا ہے ــ (ہر وقت یہ بات نہیں ہوتی) پھر حضرت شاہ احمد سعید مجددیؒ کی ایک کرامت کا واقعہ سُنایا۔

ایک دن (مرتب ملفوظات) بحضور فیض گنجور... حاضر ہوا۔ جناب شاہ سید محمد برادر زادہ حضرت لعلشاہ مرحوم بھی مجلس میں بیٹھے تھے۔ اُن کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا ــ اس فقیر کی یہ نصیحت یاد رکھو کہ کسی کی امانت اپنے پاس نہ رکھنا ــ یہی نصیحت حضرت پیر و مرشد (حضرت حاجی دوست محمد قندھاریؒ) نے فقیر کو بارہا فرمائی تھی کہ کسی کی امانت اپنے پاس نہ رکھنا۔

ایک دن بخدمت حضرت قبلہ حاضر تھا۔ حضرت والا نے نمازِ فجر کی امامت کے لیے اس خادم کو حکم فرمایا۔ حسب ارشاد مصلّے پر چلا گیا اور پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ عمّ یتساءلون کو پڑھا ــ ختم خواجگان اور حلقے سے فارغ ہونے کے بعد اس عاصی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا ــ تم کو کبھی کبھی امامت کرنی پڑتی ہو۔ اس لیے اس مسئلہ کو یاد رکھو کہ طول قرأت باعتبار آیات نہیں ہو بلکہ باعتبارِ کلمات و حروف ہے۔ پھر ملّا مسکین کی شرح کنز اور عقود جواہر المنیفۃ فی ادلۃِ مذہب الامام ابی حنیفۃ کا حوالہ دیا (مقصدِ ارشاد یہ تھا کہ سورہ جمعہ سورۂ عمّ سے باعتبار کلمات و حروف چھوٹی ہے۔ اگرچہ آیات کے لحاظ سے بڑی ہے اور فجر کی پہلی رکعت میں دوسری رکعت کے مقابلے میں قدرے بڑی سورت ہونی چاہیے تھی)

ایک دن حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ انسان بیچارے نے اپنی اصل کو فراموش کر کے لباسِ انانیت پہن لیا ہے اگر وہ اپنی اصل کو یاد رکھتا تو اُس کو بجز عجز و انکسار کوئی چارہ کار نہ ہوتا شکستگی و نیستی کو اپنا پیرایہ بناتا۔ بعد ازاں یہ آیت تلاوت فرمائی ــ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (تا) فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

عہ اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی غذا) سے بنایا پھر ہم نے اُس کو نطفہ سے بنایا جو کہ (ایک مدت معینہ تک) ایک محفوظ مقام (یعنی رحم) میں رہا پھر ہم نے اُس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا پھر ہم نے اُس خون کے لوتھڑے کو

(اگلے صفحہ پر)

بعد ازاں فرمایا کہ اس مضمون کو پیش نظر رکھ کر مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

مولوی گشتی و آگہ نیستی | از کجا و در کجا و کیستی
از خودی آگاہ نئی اے بے شعور | بر چنیں علمت نباید شد غرور

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک روز قبل از نماز فجر میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ اس زمانے میں ارکانِ اسلام و ایمان کی ادائیگی میں فتور واقع ہو گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے بُنِیَ الاسلامُ علیٰ خمسٍ۔ یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ یہ پانچ چیزیں بھی (ادائیگی کے لحاظ سے) اپنی حالت پر نہیں۔ اصل کو معیوب اور معیوب کو مطلوب طبائع بنالیا ہے۔ نیز فرمایا کہ اس زمانے کے لوگ، طالبِ کشف و کرامات ہیں۔ فقیری کو کشف کرامات پر منحصر کر کے مقصود سے بمراحل دور ہو گئے ہیں۔ فقیری سے مقصود وہ ہے جس کو آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے (بغرض تعلیم اُمت) بیان فرمایا تھا ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك (یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ بات نہ حاصل ہو تو پھر یہ دھیان رکھ کر اللہ تعالیٰ تجھے دیکھ رہا ہے)

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک دن بوقت تہجد حاضر تھا۔ بکمالِ مہربانی احقر کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ لوگ برائے حصول معاش کس قدر تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ بطور حیلہ و تدبیر ملازمتِ نصاریٰ، تجارت مال، زراعت، مزدوری، صنعت و حرفت وغیرہ اختیار کرتے ہیں۔ اِن تمام محنتوں اور مشقتوں کے برداشت کرنے کا مقصد صرف روٹی کا حاصل کرنا ہے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ اور دیگر طُرق کے باکمال اہل اللہ بھی طالبانِ خدا اور درویشانِ باصدق و صفا کو کثرتِ ذکر، قلتِ طعام، قلتِ کلام، تسبیح و تہلیل، مراقبہ و مجاہدہ کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسے اوراد و اذکار میں اپنے وقت کو مشغول رکھنے کی تلقین کرتے ہیں جن کا ثبوت صحیح احادیث سے ملتا ہے۔ ان بزرگوں کا مقصود، یادِ الٰہی اور عشق الٰہی ہے تاکہ ماسوی اللہ سے تعلق منقطع ہو اور

(گذشتہ سے پیوستہ) (گوشت کی) بوٹی بنادیا پھر ہم نے اُس بوٹی (کے بعض اجزا کو) ہڈیاں بنادیا پھر ہم نے اُن ہڈیوں پر گوشت چڑھادیا پھر ہم نے (اسمیں روح ڈالکر) اُسکو دوسری طرح کی مخلوق بنادیا سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھکر ہے۔

حُبِّ جاہ و ریاست دل میں سنہ رہے ــــــ پروردگارِ عالم کو شرکت پسند نہیں۔ حسب مضمون الا للہِ الدِّینُ الخالِص ــــ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے دین خالص چاہتے ہیں ــــ نیز فرمایا کہ شریعت غرّا میں (بعد تصحیح عقاید) وقت پر نماز روزے کا ادا کرنا، نصاب کے بقدر مال ہونے اور سال گزرنے پر زکوٰۃ دینا، شرائط کی موجودگی میں حج کرنا، گناہ صغیرہ وکبیرہ سے اجتناب کرنا، حلال وحرام کا خیال رکھنا اور تمام منہیات سے پرہیز کرنا یہ اعمال برائے نجات کافی ہیں ــــ بموافق ارشاد خداوندی لا یُکلِّفُ اللہُ نفساً اِلّا وُسعَہا ــــ (یعنی اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا) لیکن درجۂ افضلیت بغیر دوام حضور اور بغیر ذوق وشوق اور بغیر جمیعتِ قلبی واستغراق حاصل نہیں ہوتا۔ بموافق حدیثِ جبرئیل ــ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی عبادت کر گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے اور یہ بات حاصل نہ ہو سکے تو یہ تصور کر کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن بعد از صلوٰۃ عصر حضرت والا ختم خواجگان پڑھنے کے واسطے بیٹھے تھے۔ اُس وقت ایک عورت حضرت حاجی حرمین خواجہ دوست محمد قندھاریؒ کے مزار پر آئی اور اپنا سر سجدۂ تعظیمی کے لیے جھکا دیا۔ اتفاق سے حضرت والا کی نگاہ اس حرکت پر پڑ گئی فوراً ایک خوفناک آواز سے اُسے ڈانٹا۔ اے بدبخت کیا کرتی ہے قبور پر سجدہ کرنا حرام ہے۔ ڈانٹ سنتے ہی فوراً وہ عورت سجدے سے باز آگئی۔

ایک دن ارشاد فرمایا کہ کسی شخص نے ایک لوہار کے لڑکے سے دریافت کیا تھا کہ تیرا باپ دکارخانے سے) جلدی آجائے گا یا دیر میں؟ لڑکے نے کہا کہ اگر میرے باپ نے کام میں جلدی کی تو دیر میں آئے گا۔ کام کو دیر میں انجام دیا تو جلدی آئے گا ــــ سُننے والوں نے تعجب سے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے ایسا کیوں ہوگا؟ اس نے جواب دیا کہ اگر گرم لوہے کے کام میں جلدی کرے گا تو اُس کے اندر کچھ چنگاریاں زندہ باقی رہ جائیں گی اور جس تھیلے میں وہ لوہا ڈال کر لا رہا ہوگا، راستے کی ہوا سے چنگاریوں کے بھڑک جانے کی وجہ سے وہ تھیلا جل جائے گا۔ (ظاہر ہے کہ اس وجہ سے آنے میں دیر لگے گی) اور اگر اُس نے سہولت سے کام کیا اور اُس لوہے کی تمام چنگاریاں اچھی طرح بجھا کر لوہا تھیلے میں ڈالا تو راستہ میں کوئی خطرہ پیش نہ آئے گا اور بآرام

تمام جلد اپنے گھر آجائے گا۔ غرض اس حکایت سے یہ ہے کہ طالبوں اور شغلوں کو چاہیے کہ اوّل کار علم کی بنیاد پختہ اور مضبوط کریں (چاہے دیر لگے) تاکہ باقی تعمیر پختہ ہو۔ اگر پہلے ہی سے (جلدی میں) بنیاد کمزور رکھی گئی تو آگے کی تعمیر بھی کمزور اور بودی رہے گی۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت والا سے مولوی نور خاں نے عرض کیا کہ حضرت! کثرتِ ورد اسم ذات و نفی و اثبات کے باعث غصہ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ خداوند کریم تمہارے غصے کو محض اپنے لیے بنادے۔ پھر مولوی صاحب نے عرض کیا کہ قبلہ! جی میں یہ آتا ہے کہ کہیں نکل جاؤں اور وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر اچھی طرح کروں اس لیے کہ گھر میں وہ کر ذکر کی کثرت غصے کا سبب بن رہی ہے۔ فرمایا ایسا نہ کرنا چاہیے۔ تمہارے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں وہ علم سے بے بہرہ رہ جائیں گے۔ اور تمہارے غصے کا سبب یہ ہے کہ تمہارے اندر عقل معاد زیادہ ہے اور عقل معاش نہیں ہے۔ اس زمانے میں ہر شخص اپنے اغراض کے مطابق بلا لحاظِ شرع کام کرتا ہے۔ یہی بات موجب غصہ ہو جاتی ہے ...... پھر فرمایا کہ جو کپڑا سفید ہوتا ہے اس پر داغ دھبہ فوراً ظاہر ہو جاتا ہے اور جو کپڑا میلا ہوتا ہے اس پر کوئی داغ اپنا اثر نہیں کرتا اور کوئی کدورت ظاہر نہیں ہوا کرتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر موجب صفائی دل ہے ایسی حالت میں جب کوئی امر خلافِ شرع سامنے آتا ہے تو غصے کا سبب بن جاتا ہے اور جو دل ذاکر نہیں مکدر رہے اس پر خلافِ شرع بات سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ایک دن حضرت والا نے فرمایا کہ دل میں آتا ہے کہ اپنا تمام کتب خانہ باسم مبارک حضرت مرشدنا مولانا حاجی دوست محمد صاحبؒ اپنی حیات میں وقف کر دوں۔ ایسا کرنے میں تین فائدے ہیں۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ ہمیشہ پیرو مرشد کی روح کو ثواب پہونچتا رہے گا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کتابیں تنازعِ تقسیم سے محفوظ ہو جائیں گی اور میرے ورثہ کہیں گے کہ یہ کتابیں وقف ہیں ہماری ملکیت میں نہیں ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ میرے تینوں لڑکے بھی حسب دلخواہ ان کتابوں سے علمی نفع اٹھاتے رہیں گے۔

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن حاضر خدمت اقدس ہوا۔ حضرت والا حاضرین کو نصیحتیں فرما رہے تھے۔ بعد ازاں میری جانب متوجہ ہو گئے اور ارشاد فرمایا کہ

اس زمانے کے درویش جو روٹی سالن کے ساتھ چٹنی اور اچار استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس نیت سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک عمدہ سالن ہے کہ روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے تو جائز ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض ازواج مطہرات سے سالن کو معلوم فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا کہ سرکے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ نے سرکہ منگوایا اور اسی سے کھانا تناول فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ "سرکہ اچھا سالن ہے۔" — اور اگر کوئی اس خیال سے چٹنی اور اچار استعمال کرتا ہے کہ اس سے بھوک خوب ہوگی اور خوراک زیادہ کھائی جائے گی تو پھر ناجائز ہے۔ پھر فرمایا کہ دو سالن (دستر خوان پر) جمع نہ کیے جائیں اس لیے کہ روٹی کے ہمراہ دو قسم کے سالن طریقۂ صوفیہ کے خلاف ہیں۔ (باقی)

صاحبِ قرآن اور قرآن

(از مولانا محمد منظور نعمانی)

اس ناچیز کی تصنیف "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے" جو اردو زبان میں ۱۰-۱۲ سال سے برابر شائع ہو رہی ہے، اس کا انگریزی اڈیشن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اُس کے خاص فضل سے اس وقت طباعت کے آخری مرحلہ میں ہے (اُمید ہے کہ انشاء اللہ مہینے کے اندر ہی اندر کتاب تیار ہو کر مجلد شکل میں شائقین تک پہنچ سکے گی)

چونکہ انگریزی اڈیشن کا اہتمام خاص کر غیر مسلم دنیا کے لیے کیا گیا ہے اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اُس کے شروع میں ایک مقدمہ کا اضافہ کیا جائے جو کتاب کے پڑھنے والوں کو قرآن کے لانیوالے نبی امی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم شخصیت اور قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت سے ممکن حد تک آشنا اور مانوس کرے — اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو مقدمہ اس مقصد کے لیے لکھا گیا وہ ناظرین الفرقان کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے — اس کو بھی ہمارے عزیز ترین دوست اور بھائی ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے انگریزی میں منتقل کیا ہے جو اصل کتاب کے بھی مترجم ہیں

محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

یہ ایک مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ اب سے قریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے پانچویں، چھٹی صدی عیسوی میں پوری انسانی دنیا نور ہدایت سے محروم اور روحانیت و اخلاق کے لحاظ سے اندھیر نگری بنی ہوئی تھی، یورپ پر قرون وسطیٰ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، ایران اور اُس کے زیر اثر ملکوں میں مزدکیت

کا دورِ دورہ تھا جس نے اخلاق و شرافت کی حدود کو درہم برہم کر کے انسانوں کو حیوان بنا دیا تھا۔ ہندوستان
پورا ایک عہد کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔ یہاں ایک طرف تو جمادات و حیوانات بلکہ سانپوں تک کی
پرستش ہوتی تھی اور دوسری طرف بیچارے اُن انسانوں کے ساتھ جن کو نسلی اور پیدائشی طور پر اچھوت
قرار دیا گیا تھا حیوانوں سے بدتر سلوک ہوتا تھا، وہ انسان ہونے کے باوجود انسانی حقوق سے محروم
تھے، جس کے کچھ اثرات اتنا طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود اب تک بھی باقی ہیں — کم و بیش یہی
حال انسانیت کی پستی اور انسانوں کی بے راہ روی کے لحاظ سے اُس وقت دنیا کے اُن دوسرے
ملکوں کا بھی تھا جن کی تاریخ معلوم ہے۔

پھر ان سب کے گویا قلب میں جزیرہ نمائے عرب تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مقامِ اتصال
پر واقع تھا اور اسی لیے پرانے زمانے میں اُسے "دنیا کی ناف" کہا جاتا تھا، یہ بھی اُس دور میں خداوندی
ہدایت اور تعلیم و تہذیب کی روشنی سے یکسر محروم تھا، تاریکیوں اور گمراہیوں کے بادل تہ بہ تہ چھائے
ہوئے تھے۔ ایک خدا کو چھوڑ کر بے شمار دیویوں دیوتاؤں اور اُن سے نسبت رکھنے والی پتھر کی مورتیوں
کی پوجا ہوتی تھی، اُن کے لیے انسانوں تک کی قربانی دی جاتی تھی، شہر مکہ کا وہ کعبہ جس کو خدا کے پیغمبر
ابراہیم و اسماعیل نے خدا کی عبادت کے مرکز کے طور پر اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، وہ ایک بڑا بت خانہ
بن گیا تھا، پورے ملک میں جنگل کا قانون چالو تھا، کوئی حکومتی نظام بھی نہ تھا، انسانی جان کی
کوئی قیمت نہ تھی، قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا، سنگدلی اور قساوت اس حد تک پہنچ
گئی تھی کہ خود اپنے نومولود بچوں کو گڑھا کھود کے زمین میں زندہ دفن کر دیتے تھے، بے شرمی اور بے
حیائی کا یہ حال تھا کہ بہت سے لوگ مادر زاد برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ بعض قبیلوں
میں باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اس کی بیوہ بیوی کو اپنی بیوی بنا لیتا تھا اور یہ گویا اُس کا حق تھا
— اخلاق و روحانیت کی اس تباہی کے علاوہ دنیا بھی برباد تھی، بہت بڑی تعداد ایسے غریبوں
کی تھی جو غربت و افلاس کی مجبوری سے زمین کے کیڑے مکوڑے اور مردار تک کھا لیتے تھے۔

پوری انسانی دنیا کے اور خاص کر ملک عرب کے یہ حالات تھے کہ اب سے ٹھیک چودہ سو سال[1]

---

[1] مشہور و مقبول سیرت نگار نبوی قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی تھی، عجیب اتفاق ہے کہ آج جب راقم سطور یہ سطریں لکھ رہا ہے ۱۹۷۱ء کی ٹھیک وہی تاریخ ۲۲ اپریل ہے۔ اس حساب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش پر ایک دن کی کمی بیشی کے بغیر شمسی حساب سے ٹھیک چودہ سو سال آج کے دن پورے ہوئے ہیں۔

پہلے عرب کے مرکزی شہر مکہ میں ابراہیم و اسماعیل ہی کی نسل کے ایک معزز قبیلہ قریش کے ایک شریف گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا ـــ یہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو چکا تھا یعنی ابھی یہ ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ باپ عبداللہ بن عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا اور بیوہ ماں ہی نے اس کو پالا. عمر کا چھٹا سال تھا کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تو دادا عبدالمطلب نے اپنے آغوش تربیت میں لے لیا، اس کے دو ہی سال بعد دادا کا بھی انتقال ہو گیا تو اس آٹھ سالہ بچہ کو چچا ابوطالب نے اپنی کفالت میں لے لیا۔

اس بچہ کا نام "محمد" رکھا گیا تھا جس کے معنی ہیں وہ ذات جو اپنی صفات اور کارناموں کی وجہ سے بہت ہی قابل تعریف ہے۔

چونکہ عربوں میں اس زمانہ میں تعلیم کا رواج نہیں تھا اس لیے آپ بھی اُمّی یعنی نوشت وخواند سے بالکل ناآشنا رہے ـــ لیکن فطرت کی سلامتی اور روح کی پاکیزگی جو خدا کا خاص عطیہ تھا اس کی وجہ سے اُس انتہائی فاسد ماحول میں بھی آپ کی زندگی نہایت معصومانہ اور شریفانہ رہی۔

جب سن شعور کو پہنچے تو کسب معاش کی فکر ہوئی تاکہ چچا ابوطالب پر (جن کے خود بھی کافی اولاد تھی) بوجھ نہ پڑے. تجارت خاندانی پیشہ تھا، اسی کا اپنے لیے انتخاب کیا، لیکن سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنا ذاتی کاروبار نہیں کر سکتے تھے اس لیے اپنی محنت دوسروں کے سرمایہ کے ساتھ لگا کر کام شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں معاملات میں آپ کی امانت و دیانت، سچائی اور نیک کرداری کی شہرت ہو گئی اور آپکا لقب ہی "امین" پڑ گیا، جس نے آپ کے ساتھ کاروباری معاملہ کیا اُس نے آپ کو ایک فرشتہ صفت انسان اور بالکل نئے قسم کا ایک پاکباز تاجر پایا اور وہ متاثر ہوا۔

مکہ میں قریش ہی کے قبیلہ میں خدیجہ ایک دولتمند بیوہ خاتون تھیں، جن کا اپنا کاروبار بھی تھا اور دوسروں کو سرمایہ دے کر بھی وہ تجارت کراتی تھیں. بڑی صاحب فراست اور نیک فطرت خاتون تھیں، اُن سے بھی آپ کا کچھ کاروباری واسطہ پڑا تھا ـــ وہ اگرچہ صاحب اولاد تھیں اور اُن کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی اور آپ کی عمر ابھی صرف پچیس سال ہی کی تھی اس کے باوجود انھوں نے آپ سے نکاح کرنا چاہا اور یہ نکاح ہو گیا۔

اس نکاح کے بعد آپ کو اپنے معاشی مسئلہ کی زیادہ فکر نہیں رہی تو آپ زیادہ وقت خلق اللہ کی خدمت، خاص کر غریبوں، آفت رسیدوں اور ضرورتمندوں کی امداد و اعانت اور علاقہ میں امن و سلامتی کی فضا قائم کرنے پر صرف کرنے لگے۔ ــــ زندگی اسی طرح چل رہی تھی اور آپ کی معصومانہ سیرت، نیک کرداری، غرباء نوازی اور خدمت خلق کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں عام طور سے آپ کی عظمت اور محبت پیدا ہو گئی تھی اور اس طرح پوری قوم کی غیر رسمی سرداری آپ کو حاصل تھی کہ عمر کے چالیسویں سال میں آپ کے اندر ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی۔ دل میں شدت سے یہ داعیہ پیدا ہوتا کہ گھر سے اور آبادی سے دور، سب سے الگ بالکل تنہائی میں عبادت اور دعا و مناجات کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کریں۔ مکہ سے قریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ایک اونچی پہاڑی ہے، جس کی چوٹی پر پتھر کی بڑی بڑی چند چٹانوں سے گھرا ہوا ایک قدرتی غار ہے جو آج بھی غار حرا کے نام سے معروف ہے۔ آپ ایک ہفتہ کے لیے صرف زندگی کی ضرورت کے بقدر کھانے پینے کا مختصر سامان لے کر وہاں چلے جاتے۔ اور ... بالکل یکہ و تنہا اس غار میں رہتے، ہفتہ میں ایک دفعہ گھر آتے، اور پھر اسی طرح کھانے پینے کا مختصر سامان لے کر وہیں چلے جاتے اور سارا وقت توجہ الی اللہ اور تفکر و عبادت میں گزارتے۔

اگرچہ اُس وقت خدا کی ذات و صفات کی وہ معرفت آپ کو حاصل نہیں تھی جو بعد میں وحی الٰہی سے حاصل ہوئی، اسی طرح طریق عبادت کی بھی کوئی خاص تعلیم آپ کو نہیں ملی تھی، لیکن کسی طالبِ صادق کو جس کی فطرت سلیم، روح پاکیزہ اور دل نورانی ہو جس درجہ کی خدا کی مجمل معرفت و محبت اور اُس کی رضا جوئی اور حصول قرب کا شوق پیدا ہو جانا چاہیے وہ یقیناً آپ کو حاصل تھا اور اپنے قلبی داعیہ کی رہنمائی کے مطابق آپ خدا کی عبادت اور اُس کے حضور میں دعا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی مہینے اسی طرح جاری رہا۔

اسی زمانہ میں ایک نئی کیفیت آپ میں یہ بھی پیدا ہوئی کہ آپ بکثرت خواب دیکھتے اور جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ اگلے دن واقعہ کی شکل میں سامنے آجاتا، لیکن آپ لوگوں کے سامنے اس کا اظہار و اعلان بالکل نہ کرتے ــــ یہ عالم بالا کے ساتھ آپ کے روحانی رابطہ کا آغاز تھا اور شروع ہونے والے دن کی صبح صادق تھی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک دن جبکہ غار حرا کے اس مجاہدہ اور اعتکاف کے تسلسل پر چھ مہینے

گزر چکے تھے۔ آپ غارِ حرا سے اِس غیر معمولی حالت میں گھر آئے کہ رنگ پیلا تھا جیسا کہ کسی سخت دہشت زدہ انسان کا ہو جاتا ہے، اور جسم پر لرزہ کی سی کیفیت طاری تھی، آپ آتے ہی پڑ گئے، اور گھر والوں سے فرمایا "مجھے موٹے کپڑے اڑھا دو، مجھ پر موٹے کپڑے ڈالدو" (زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي)۔۔۔

پھر جب حالت کچھ سنبھلی تو بیوی خدیجہ کے دریافت کرنے پر، غار میں خدا کے فرشتے کا ظاہر ہونا اور خدا کا پیغام پہنچانا اور اُس کا کلام پڑھوانا اور اس سلسلہ میں جو کچھ پیش آیا تھا اور آپ کے قلب اور روح پر اُس کا جو غیر معمولی بوجھ پڑا تھا وہ سب آپ نے بیان کیا، اور تبلایا کہ میری یہ حالت اُسی کے اثر سے ہے۔۔۔ خدیجہ جو بڑی صاحب فراست خاتون تھیں، اُنھوں نے پہلے تو خود آپکو تسلی دی کہ آپ جیسے نیک اور سب کے کام آنے والے بندہ کے ساتھ اُس کا خدا جو کچھ کرے گا وہ بہتر ہی ہوگا، اُس کے بعد وہ آپ کو اپنے چچا زاد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو بہت بوڑھے تھے، آنکھوں سے بھی معذور ہو چکے تھے، اُنھوں نے بہت پہلے اپنی بت پرست قوم کے کیش و مذہب کو چھوڑ کے نصرانیت اختیار کر لی تھی، وہ قدیم آسمانی کتابوں توراۃ و انجیل کے اچھے عالم بلکہ مترجم بھی تھے، اُنھوں نے غارِ حرا کا واقعہ سُن کر یقین کے ساتھ کہا کہ تمہارے پاس جو فرشتہ آیا تھا یہ اللہ کا وہی خاص فرشتہ ہے جو پیغمبروں کے پاس خدا کا کلام و پیام اور اس کے احکام لایا کرتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے تم کو منصب نبوت پر فائز کیا ہے اور پیغمبری کا کارِ عظیم تمہیں سپرد کیا جائے گا اور سُن لو تمہاری قوم دشمن ہو جائے گی اور تم کو جلا وطن کر دے گی۔ پھر بوڑھے ورقہ نے حسرت سے کہا کہ کاش میں اُس وقت زندہ و توانا ہوتا اور تمہارا ساتھ دے سکتا۔

بس یہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ نبوّت کا آغاز ہوا۔

آپ کا اب تک حال یہ تھا کہ اپنی ذات سے معصوم فطرت اور خادمِ خلق تھے لیکن خاموش پسند تھے، اس دور میں عربوں میں شعر و سخن سے دلچسپی عام تھی لیکن آپ نے اس میں بھی کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی، نہ قوم کے سامنے کبھی خطیب اور مقرر بن کے کھڑے ہوئے، کبھی مصلحانہ حیثیت سے بھی کسی تحریک اور ہنگامہ خیزی کا آپ سے ظہور نہیں ہوا حتیٰ کہ قوم کی حد سے گزری ہوئی بداخلاقی و بے راہ روی کی اصلاح کے لیے بھی آپ نے کوئی تحریک کھڑی نہیں کی اور کوئی بلند بانگ دعوٰی

نہیں بنایا، وحی و رسالت، قیامت و آخرت اور دین و شریعت کے موضوع پر بھی اس پورے چالیس سال میں کبھی آپ سے کچھ نہیں سنا گیا، اگلے پیغمبروں اور ان کی امتوں کے سبق آموز واقعات کا بیان بھی آپ کی زبان پر کبھی نہیں آیا۔ سیاسیات و عمرانیات، معاشیات و اقتصادیات کے بارے میں بھی اس پورے عرصہ میں اپنی قوم کو آپ نے کوئی رہنمائی نہیں دی۔ الغرض چالیس سال کی عمر تک آپ کی زندگی کا ان باتوں سے کوئی ادنیٰ تعلق ظاہر نہیں ہوا اور کسی نے کوئی ایسی بات آپ سے نہیں سنی جس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ آپ ان مسائل کی الف ب سے بھی واقف و باخبر ہیں۔

لیکن عمر کے اکتالیسویں سال میں غار حرا کے مذکورہ بالا واقعہ کے بعد اچانک آپ میں ایک محیر العقول انقلاب پیدا ہو گیا گویا آپ کے قالب میں ایک دوسری روح آگئی، اور آپ ایک بالکل دوسری قسم کے انسان بن گئے۔ اب آپ کی خاموشی ٹوٹ گئی اور اپنی قوم سے آپ نے کہا کہ مجھے خدا نے وحی و الہام سے نوازا ہے اور اپنی پیغمبری کی خدمت میرے سپرد کی ہے جیسے کہ کبھی پہلے ابراہیم و اسماعیلؑ، اسحاق و یعقوبؑ، اور پھر موسیٰ و عیسیٰ کو سپرد کی تھی۔

آپ نے قوم کو بتایا کہ وہ خدا میرا اور تمہارا اور ساری کائنات کا خالق و پروردگار ہے، ہر نقص سے پاک اور عظمت و کمال کی ساری صفات کا جامع ہے، صرف وہی عبادت اور پرستش کے لائق ہے، میری تمہاری اور سب کی موت و حیات اُسی کے قبضہ میں ہے، ہر طرح کا بناؤ بگاڑ اور کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ کسی دوسرے کی یہ شان نہیں ہے، اس کے سوا جن بتوں اور دیویوں دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے اور جن کو حاجت روا سمجھا جاتا ہے اُن کے قبضہ و اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، اُن کی عبادت اور اللہ کے سوا کسی مخلوق کی بھی عبادت بہت بڑا گناہ اور ناقابل معافی جرم ہے، اس لیے صرف ایک خدا کی عبادت کرو جو معبود برحق ہے اُسی سے لو لگاؤ، اُس سے بھرپور محبت کرو اور اُس سے بہت زیادہ ڈرو! — یہ حکم میرے لیے بھی ہے اور تم سب کے لیے بھی!

آپ نے قوم کو یہ بھی بتایا اور اُن کے دلوں میں اس کا یقین اتار دینے کی پوری کوشش کی کہ یہ دنیا جس میں ہم اور تم بس رہے ہیں ہمیشہ نہیں رہے گی، جس طرح ہر پیدا ہونے والا آدمی اپنی مقررہ زندگی پوری کر کے مر جاتا ہے، اسی طرح یہ پوری دنیا بھی ایک وقت خدا کے حکم سے

فنا کر دی جائے گی۔ وہ قیامت کا دن ہوگا، پھر خدا اپنی اپنی قدرت سے سب کو دوبارہ زندگی بخشے گا اور ایک دوسرا عالم برپا ہوگا، یہ آخرت کا عالم ہوگا جس میں سب کو اپنے کیے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی، جنھوں نے دنیا میں خدا کو اور خدا کے احکام کو مان کر پاکبازی اور نیک کرداری کی زندگی گزاری ہوگی، ان پر خدا کی رحمت ہوگی اور ان کو بھرپور لذتوں اور مسرتوں والی زندگی عطا فرمائی جائے گی اور اس کے برعکس جنھوں نے اس دنیا میں اپنے خالق و پروردگار کو بھلا کر اور اُس کے احکام سے بے پروا اور آخرت کے انجام سے بے فکر ہوکر مجرمانہ زندگی گزاری ہوگی وہ سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

پھر آپ نے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بندوں پر اللہ کے حقوق اور بندوں پر دوسرے بندوں کے حقوق، اور اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کی بھی قوم کو تعلیم و تلقین کی اور فواحش و منکرات اور بداعمالیوں اور بداخلاقیوں سے منع بھی فرمایا اور اس کے برے انجام سے ڈرایا۔

اسی طرح آپ نے قوم کو خرید و فروخت، تجارت و سوداگری اور مالی لین دین اور محنت و مزدوری وغیرہ کے بارے میں بھی خدا کی ہدایات پہنچائیں اور بتایا کہ ان میں یہ طریقے صحیح و جائز اور یہ غلط و ناجائز ہیں۔

کھانے پینے کے بارے میں بھی آپ نے بتایا کہ یہ چیزیں خدا نے حلال اور یہ حرام قرار دی ہیں۔ پھر آپ نے اِن باتوں کو صرف بتا کے اور بیان کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ یہی آپ کی زندگی کا مشن ہوگیا، اور ان سچائیوں کی دعوت اور اپنی قوم عرب کی اور پوری انسانی دنیا کی ہدایت کی فکر آپ پر اس طرح چھا گئی کہ اس سے الگ کسی چیز سے گویا کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ دن رات اسی کی فکر اور جد و جہد میں مشغول رہتے اور اسی کے لیے اپنے خدا سے دعائیں کرتے۔

اس راستہ میں آپ نے سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں، ماریں کھائیں، ذلتیں برداشت کیں۔ آپ کا اور آپ کے کنبہ کا طویل مدت تک بائی کاٹ کیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں کی بھی ناکہ بندی کی گئی، لیکن آپ نے اپنی دعوت اور جد و جہد میں کوئی کمی نہیں کی، مخالفین سے کسی آویزش کے بغیر آپ امکان بھر اپنے کام میں اسی طرح لگے رہے اور اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے اور زیادہ الحاح سے ہدایت اور رحمت کی دعائیں کرتے رہے۔

قوم میں سے جن لوگوں کی روحوں میں نیکی کا جوہر اور حق کو قبول کرنے کی کم و بیش صلاحیت موجود تھی وہ ایک ایک دو دو کرکے آپ کی سچائی سے متاثر ہوکر آپ کی دعوت کو قبول کرتے رہے اور پھر وہ بھی مکہ کے شرارت پسند عنصر کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے۔ قریباً دس بارہ سال اسی طرح گزرے، اس کے بعد جب وہاں کے لوگوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور اس کا کوئی امکان نہیں رہا کہ مکہ میں رہ کر دین حق کی دعوت اور بندگان خدا کی ہدایت کی خدمت کا سلسلہ جاری رہ سکے تو آپ نے خدا کے حکم سے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ کو اپنا مستقر اور اپنی دعوت و جد و جہد کا مرکز بنا لیا۔ یہاں پہنچکر کام اور زیادہ جذبہ اور محنت سے ہونے لگا اور خدا کے فضل سے دعوت قبول کرنے کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مدینہ میں آپ کے پیروؤں اور رفیقوں کی اجتماعیت سے ایک عجیب و غریب قسم کا حکومتی نظم و نسق بھی قائم ہو گیا ـــــ اس حکومت کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی پولیس نہیں تھی، تھانیدار نہیں تھا، تحصیلدار نہیں تھا، جج نہیں تھا، منصف نہیں تھا۔ کوئی بھی عہدہ دار نہیں تھا، اور سب تھے یعنی حسب ضرورت ان عہدوں کے سارے کام ہوتے تھے، اور آپ کی دعوت کو قبول کرنے والے بندگان خدا صرف اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے بغیر کسی تنخواہ اور حکومتی منصب و لقب کے یہ ساری خدمات انجام دیتے تھے۔

نئے طرز کی اس حکومت نے جس کے رئیس اور سربراہ نبی اُمّی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے، دنیا کو عملی طور سے دکھا دیا کہ بغیر فوج اور خزانے کے بھی حکومت ہو سکتی ہے اور مقاصد حکومت بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام پا سکتے ہیں ـــــ دشمن طاقتوں سے اس حکومت کی جنگیں بھی ہوئیں۔ جو دنیا کے لیے مختلف پہلوؤں سے جنگوں کا بہترین نمونہ تھیں اور جن سے بہت کچھ سبق سیکھا جا سکتا ہے۔ مخالف طاقتوں سے معاہدے بھی ہوئے، صلحیں بھی ہوئیں، اس حکومت نے اپنوں پر اور پرایوں پر ٹیکس بھی لگائے اور دنیا کو دکھا دیا کہ ٹیکسوں کے بارے میں اچھی حکومتوں اور ان کے عوام کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد صرف دس سال آپ اس دنیا میں رہے اور اتنی تھوڑی مدت میں قریب

قریب پورا ملک عرب آپ کے لیے مسخر ہوگیا اور آبادی کے بہت بڑے حصہ نے آپ کی دعوت وہدایت
کو قبول کرلیا۔ ہزار ہا ہزار وہ آدمی جو پہلے خدا سے نا آشنا تھے، آخرت اور جزا سزا کے تصور سے جن کا
ذہن بالکل خالی تھا اور ساری عمر انتہائی گمراہیوں اور بداخلاقیوں میں گزاری تھی وہ آپ کے فیض
صحبت اور تعلیم وتربیت سے ایسے معیاری اور کامل انسان بن گئے کہ طویل انسانی تاریخ اُن کی
مثال پیش کرنے سے عاجز ہے — افراد ہی نہیں بلکہ کامل انسانوں کی ایک پوری قوم پیدا ہوگئی
جس کی مثال چشم فلک نے نہ اُس سے پہلے دیکھی تھی نہ اُس کے بعد دیکھی۔

یہ سب کچھ صرف دس سال میں — اور مکہ کے ابتدائی دور کو بھی شامل کرلیا جائے تو قریباً
قریباً بیس بائیس سال میں ایک ایسے آدمی کے ذریعہ ہوگیا جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ الف ب بھی
نہیں جانتا تھا، اُس کو اچھے مہذب اور دانشمند اور خدا پرست انسانوں کی کبھی صحبت بھی نہیں ملی
تھی، اُس کی زندگی میں چالیس سال کی عمر تک (جو اندرونی جذبات اور رجحانات کے ظہور کا خاص
زمانہ ہوتا ہے) کسی قسم کی ہنگامہ پسندی، تحریکیت اور کسی مہم کی قیادت کے جذبہ کی ادنیٰ سی جھلک
بھی کسی نے نہیں دیکھی تھی، جو نہ شاعر تھا نہ خطیب تھا، نہ شاعروں یا مقرروں کی کوئی ٹیم اس کے ساتھ
تھی، رسالوں، اخباروں اور ریڈیو کا تو وہ زمانہ ہی نہیں تھا — تو سوچنے کی بات ہے کہ اتنا عظیم الشان
اور دنیا کی تاریخ میں عدیم المثال یہ انقلاب اُس آدمی کے ذریعہ کیسے ہوگیا؟

خدا کا وہ بندہ کہتا تھا کہ خود مجھ میں کچھ نہیں ہے، میں تو ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا
ہوں، پڑھا لکھا بھی کچھ نہیں ہوں — میں خدا کی ذات وصفات اور توحید وغیرہ کے بارہ میں جو
بیان کرتا ہوں، قیامت و آخرت اور دوزخ و جنت کے بارے میں جو بتاتا ہوں اور زندگی کے
مختلف شعبوں سے متعلق جو احکام دیتا ہوں اور جو کچھ بھی تعلیم و تلقین کرتا ہوں یہ میرے اپنے فہم و
فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ سب میرے اور تمہارے خدا کی طرف سے ہے اُس نے مجھے تمہاری
ہدایت وخدمت کے لیے آلۂ کار اور وسیلہ بنالیا ہے — وہ ایک کلام پڑھ کر سناتا تھا جو اس
تعلیم وہدایت کا سرچشمہ تھا اُس میں بلا کی تاثیر اور کشش تھی۔ اگرچہ وہ عربی زبان میں تھا جو پوری
قوم کی زبان تھی لیکن وہ بالکل نرالا کلام تھا، خود لانے والے (پیغمبر) کے کلام سے بھی بالکل ممتاز
— اُس کے دشمن بھی اُس سے متاثر ہوتے تھے اور اسی لیے اُس کو "جادو" کہتے تھے —

لیکن وہ کلام سُنانے والا کہتا تھا کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ کلام میرا نہیں ہو بلکہ خدا کا کلام ہو اُس نے مجھ پر نازل فرمایا ہے۔ یہ میرے لیے بھی اُس کا ہدایت نامہ اور حکمنامہ ہے اور تمہارے لیے اور ساری دنیا کے لیے بھی ۔۔۔ یہ خدا کی آخری کتاب قرآن ہے۔

وہ قرآن آج بھی جوں کا توں محفوظ ہے اور اُس میں غور وفکر کے آج بھی سچائی کا ہر طالب یہ یقین حاصل کرسکتا ہے کہ ۔۔۔ یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس میں صفات الٰہی اور توحید جیسے مضامین کے بارہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یقیناً معرفت کا آخری نقطہ ہے جس تک خدا کی ہدایت وتعلیم کے بغیر کسی ذہین سے ذہین انسان کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی، اسی طرح حیات بعد الموت اور اس قسم کے دوسرے مشکل مسائل پر قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یقیناً انسانی علم وفکر سے بہت آگے کی چیز ہے ۔۔۔ پھر انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں جو زمانہ کی بڑی سے بڑی تبدیلیوں کے باوجود انسانوں کی رہنمائی کے لیے بالکل کافی ہیں اُن کے بارے میں ہرگز نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ کسی انسان اور خاصکر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے کسی اُمّی انسان کے فہم وفکر کا نتیجہ ہیں۔

الغرض قرآن خود ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ خدا کا کلام اور اس کا نازل کیا ہوا ہدایت نامہ ہے اور اس کے لانے والے اور پیش کرنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُسکے سچے رسول ہیں۔

اُمید ہے کہ اس کتاب "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے" کا مطالعہ اس سلسلہ میں آپ کا مددگار ثابت ہوگا۔

"توحیدِ اہلّہ" کی تجویز سے متعلق سوال کا جواب

(از جناب مولانا شبیر احمد صاحب ازہر میرٹھی (معلم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

[الفرقان کے گزشتہ سے پیوستہ شمارہ (بابت ماہ محرم الحرام) میں رمضان وعید وغیرہ سے متعلق ایک سوال شائع کیا گیا تھا جس میں بعض ممالک اسلامیہ کے کچھ علماء کی اس رائے اور تجویز کا ذکر کیا گیا تھا کہ کسی ایک ملک میں رویتِ ہلال ثابت ہو جانے پر دنیا کے تمام ملکوں میں رویت مان لی جائے اور پھر اس بنیاد پر دنیا کے تمام ملکوں میں ایک ہی دن رمضان شروع اور ختم ہو اور ایک ہی دن عید اور بقرعید ہو ــــ اس سوال کا پہلا جواب مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ وہ آج کی صحبت میں نذر ناظرین کیا جا رہا ہے، امید ہے کہ یہ سلسلہ انشاء اللہ چند اشاعتوں تک جاری رہے گا ــــــــــ (ادارہ)]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرض نمازوں کی طرح روزہ بھی مؤقت عبادت ہے، یعنی شرع شریف نے اس عبادت کو ادا کرنے کا خاص وقت مقرر کر دیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ نماز کے لیے جو وقت ادا شرعاً طے شدہ ہے عموماً نماز اُس کے ایک جزو یا حصہ میں ہی ادا ہو جاتی ہے اور بہت سا وقت اس سے فاضل بچ جاتا ہے۔ لیکن روزہ کے لیے جو وقت مقرر ہے یعنی طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک

تو روزہ اس پورے وقت میں ہی رکھا جاتا ہے اس وقت کا کوئی جزو اس سے فاضل نہیں بچتا ہے خواہ فرض روزہ ہو یا نفل، ماہ رمضان میں رکھا جائے یا کسی اور ماہ میں۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت کا ایک مبدأ ہے اور ایک منتہیٰ ہے۔ مبدأ یعنی وقتِ آغاز طلوع صبح صادق ہے اور منتہیٰ یعنی وقتِ اختتام غروبِ آفتاب ہے۔

اور یہ طلوعِ صبح صادق اور غروبِ آفتاب چونکہ تمام بلاد و امصار میں یکساں نہیں ہے حتیٰ کہ ایک ملک کے مختلف علاقوں میں بھی اس کے لحاظ سے تھوڑا بہت تفاوت ضرور ہوتا ہے اس لیے ہر شہر، ہر علاقے اور ہر بستی میں وہی وقت مبدأ صوم ہے جب وہاں صبح صادق طلوع ہو اور وہی وقت منتہائے صوم ہے جب وہاں سورج غروب ہو۔ دوسرے علاقوں کا اس سلسلہ میں قطعاً اعتبار نہ ہوگا۔ مثلاً اگر دہلی میں ساڑھے چار بجے صبح صادق ہو رہی ہو اور کلکتہ میں چار بجے۔ تو دلی والوں کا روزہ ساڑھے چار بجے سے شروع ہوگا۔ یہ لوگ چار بجنے کے بعد ساڑھے چار تک بے تکلف کھا پی سکتے ہیں۔ اور کوئی شخص دلی کو کلکتہ پر قیاس کرکے یہ سمجھے کہ کلکتہ والوں کی طرح دلی والوں کو بھی چار بجے کے بعد کھانا پینا جائز نہیں تو اس کا یہ خیال قطعاً غلط ہوگا، لیکن کلکتہ کے روزہ داروں کو چار بجے کے بعد کھانا پینا جائز نہ ہوگا اور وہاں کا کوئی روزہ دار کلکتہ کو دلی پر قیاس کرکے اگر چار بجے کے بعد کھائے پیے گا تو اس کا روزہ نہ ہوگا۔ اسی طرح منتہائے صوم کا معاملہ ہے، اور یہی حال نماز کے مبدأ و منتہیٰ کا بھی ہے۔ جہاں چار بجے صبح صادق ہو رہی ہو وہاں چار بجنے پر نماز فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں ساڑھے چار بجے صبح صادق کا وقت ہو وہاں چار بجنے پر نماز کا وقت نہ ہوگا ساڑھے چار پر ہی ہوگا۔ اسی پر جملہ نمازوں کے اوقات اور ان کے مبدأ و منتہیٰ کو قیاس کر لیا جائے۔

اور سالانہ جس ماہ مبارک میں تسلسل کے ساتھ پورے ماہ روزے رکھنا ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے وہ ماہ رمضان ہے جو قمری مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے اور ہر ماہ کی طرح اپنا مبدأ و منتہیٰ رکھتا ہے۔ ماہِ رمضان کا مبدأ یہ ہے کہ سابق مہینہ یعنی شعبان ختم ہو کر رمضان کی پہلی رات آجائے، اور منتہیٰ یہ ہے کہ لاحق مہینہ یعنی شوال کی پہلی رات آجائے۔ مطلع صاف ہو تو اس کا فیصلہ ثبوتِ رویتِ ہلال سے ہوگا اور مطلع ابر آلود یا غبار آلود ہو تو دنوں کی گنتی سے۔ اس لیے کہ

کوئی قمری مہینہ نہ ۲۹ سے کم ہوتا ہے نہ ۳۰ سے زائد۔ پس نہ کوئی مہینہ ۳۱ کا ہوگا نہ ۲۸ کا، بلکہ ۲۹ کا ہوگا یا ۳۰ کا۔ احادیث صحیحہ میں بھی یہی بات مذکور ہے اور دنیا کا ہر انسان اس سے واقف ہے، پس یہی کرنا چاہیے اور یہی ہوتا بھی ہے کہ ماہ شعبان کے ۲۹ دن گزر جانے پر چاند دیکھا جائے۔ نظر آجائے تو شعبان ختم ہوا، رمضان شروع ہوگیا، اور نظر نہ آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ماہ شعبان ۳۰ یوم کا ہے۔ اس کے بعد یعنی ۳۰ شعبان کی شام کو رویت ہلال کی کوشش ضروری نہیں، ہلال نظر آئے یا نہ آئے بہرحال شعبان ختم ہوکر رمضان شروع ہوگیا۔ پھر جب انتیسویں روزہ کی شام ہو تو ہلال عید دیکھنے کی کوشش کی جائے، نظر آجائے تو رمضان ختم ہوا شوال شروع ہوگیا۔ اور نظر نہ آئے تو سمجھنا چاہیے کہ یہ ماہ مبارک ۳۰ دن کا ہے، لہذا اگلے دن روزہ رکھا جائے اور اس کے اگلے دن عید کی جائے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے اذا رائیتم الھلال فصوموا و اذا رائیتموہ فافطروا فان غم علیکم فصوموا ثلثین یوما (صحیح مسلم وغیرہ)

پس اس ماہ کے آغاز سے پہلے ۲۹ یا ۳۰ شعبان کو بقصد روزہ رمضان اگر روزہ رکھا تو وہ روزہ درست نہ ہوگا جس طرح کہ قبل از وقت نماز پڑھ لینے سے فریضہ صلاۃ ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ عبادت موقتہ کے متعلق یہ حکم بلا اختلاف پوری امت کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ قبل از وقت بجا لانے سے صحیح نہیں ہوتی، دخول وقت کے بعد اسے حسب قاعدہ بجالانا ضروری ہے اور بعد از وقت بجالانے سے ادا نہیں رہتی قضا ہوجاتی ہے۔ پس مبداء و منتہیٰ کے لحاظ سے ماہ رمضان کا سالانہ فریضہ صیام سے وہی تعلق ہے جو وقت خاص کا وقتیہ فریضہ صلاۃ سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد احادیث صحیحہ میں صوم کی رمضان کی طرف اضافت آئی ہے جیسے نماز کی اس کے وقت خاص کی طرف اضافت ہوتی ہے۔ یعنی صلاۃ الظھر۔ صلاۃ العصر۔ صلاۃ المغرب۔ صلاۃ العشاء۔ صلاۃ الفجر کی طرح صوم رمضان اور صیام رمضان آیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے صیام رمضان کی فرضیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" (اے مسلمانو۔ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان کو پائے تو اس پورے ماہ روزے رکھے) یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ صیام رمضان کے وجوب کا سبب ماہ رمضان کا ادراک و شہود ہے اور ظاہر ہے کہ سبب سے اس کا مسبب مقدم نہیں ہوسکتا۔ اور اگرچہ ہر نماز اور ہر روزے کے مبداء و منتہیٰ کا تعین ہر جگہ کے لیے وہیں کے طلوع و غروب کے لحاظ سے ہوگا نہ کہ

کسی اور جگہ کے طلوع و غروب کے لحاظ سے۔ لیکن قمری مہینوں کی ابتدا و انتہا میں طلوع و غروب کا علاقائی تفاوت غیر معتبر و غیر ملحوظ ہے۔ البتہ اقلیمی تفاوت واجب اللحاظ ہے۔ علاقائی تفاوت سے میری مراد ایک اقلیم کے مختلف علاقوں کا باہمی تفاوت ہے۔ مثلاً اقلیم ہند کے مختلف بلاد و امصار ہیں۔ گو ان کا مطلع مختلف ہے لیکن یہ اختلاف و تفاوت کثیر نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ رویتِ ہلال میں ایک دن کا فرق پڑ جائے، پس اس اقلیم میں اگر ایک علاقہ میں رویتِ ہلال ہو گئی اور دوسرے علاقوں میں رویت نہیں ہوئی اور باوثوق ذرائع سے اس کی خبر اُن علاقوں میں پہونچ گئی تو ان علاقوں میں بھی اس رویت کا حکم ثابت ہو جائے گا۔ اور اقلیمی تفاوت سے میری مراد تفاوت کثیر ہے جس میں ایک دن یا دو دن کا فرق پڑتا ہو جیسے ہند و عرب کا حال ہے کہ عرب میں ہندوستان سے ایک دن قبل بھی رویتِ ہلال ہو جاتی ہے۔ اس تفاوت کثیر کو نظر انداز کر کے عرب کی رویت کو ہندوستان میں بھی معتبر سمجھنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اہل علم کا اس پر اجماع و اتفاق ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں نقل کیا ہے "واجمعوا علی انہ لا یُراعیٰ ذلک فی البلدان النائیۃ کالاندلس والحجاز (ج ۱ صـ ۲۷۷ کتاب الصیام) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر جو کریب مولائے ابن عباس سے مروی ہے نقل کرنے کے بعد ابن ارشد نے لکھا ہے "فظاھر ھذا الاثر یقتضی ان لکل بلد رؤیتہ قرب او بعد۔ والنظر یعطی الفرق بین البلاد النائیۃ والقریبۃ وبخاصۃ ما کان نایہ فی الطول والعرض کثیرا (ایضاً صـ ۲۷۹) اور اب تک اُمتِ مسلمہ کا تمام دنیا میں متوارث عمل بھی یہی رہا ہے۔

لہٰذا یہ تجویز کہ پوری دنیائے اسلام میں ایک ہی دن رمضان شروع ہو اور ایک ہی تاریخ میں عید منائی جائے شرعاً صحیح نہیں ہے اور اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتی، یہ تجویز اسی صورت میں صحیح و قابلِ عمل ہو سکتی ہے کہ دُنیا بھر سے مشارق و مغارب کا اختلاف ختم ہو جائے اور ہر خطۂ زمین میں ایک ہی وقت میں شمس و قمر کا طلوع و غروب ہونے لگے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا اور یقیناً نہیں ہو سکتا تو ہندستانی مسلمانوں کی طرف سے اس تجویز کے مجوزین و مؤیدین کو کھلے لفظوں میں آگاہ کر دینا چاہیئے کہ ہم اس احداث فی الدین اور شرع مالم یأذن بہ اللہ کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔

جن فقہائے کرام نے رمضان وشوال کی رویت ہلال کے سلسلہ میں یہ کہا ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں اُن کی مراد وہ اختلاف و تفاوت ہے جو ایک وسیع مملکت کے مختلف بلاد و امصار میں ہوتا ہے، جسے اوپر ہم نے "علاقائی تفاوت" کہا ہے۔ ان کا مطلب بس یہ ہے کہ ایسی مملکت کے کسی مقام میں رویت متحقق ہو جائے تو پوری مملکت میں رویت کا تحقق ہو جائے گا اور اسی کے مطابق صوم و افطار کا حکم لگایا جائے گا۔ مثلاً بمبئی میں ہلال ماہِ رمضان کی رویت ہو جائے اور دہلی میں نہ ہو اور اس کی معتبر اطلاع اسی رات دہلی میں پہونچ جائے تو دہلی وغیرہ کے مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ فی الواقع ہلالِ رمضان کی رویت ہو گئی ہے، اس لیے صبح کو انھیں روزہ رکھنا چاہیے۔ اور اگر یہ اطلاع اگلے دن پہونچے جب کہ دہلی وغیرہ کے لوگوں نے عدم رویت کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا ہے اور اس دن کو ۳۰ شعبان قرار دیا ہے تو اس اطلاع کے بموجب انقضائے ماہِ رمضان کے بعد وہ ایک روزہ بہ نیتِ قضا رکھیں۔ اسی طرح اگر ۲۹ رمضان کو بمبئی میں چاند ہو گیا، دہلی وغیرہ میں نظر نہ آیا اور اطلاع رات ہی کو پہونچ گئی تو بمبئی کے مسلمانوں کی طرح دہلی وغیرہ کے مسلمانوں کو بھی سمجھنا چاہیے کہ ماہِ رمضان ختم ہوا اور صبح کو دوگانۂ عید پڑھنا چاہیے۔ —— ان فقہائے کرام کا یہ قول اُن فقہاء و محدثین کے قول کے بالمقابل ہے جو اس کے قائل تھے کہ ہر شہر میں بس وہیں کی رویت درکار ہے، دوسرے کسی شہر میں رویت ہو جائے اور اس کی خبر پہونچ جائے تو اُس کے مطابق یہاں رویت کو متحقق نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن جن دو ملکوں میں اختلافِ مطلع سے ایک یا دو دن کا فرق پڑتا ہے تو جیسا کہ ابن رشد نے تصریح کی ہے تمام علماء و فقہائے اُمت اس کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ ایسے دو ملکوں کی رویت الگ الگ ہے اور ان میں سے ایک ملک کی رویت کو دوسرے ملک میں رویت قرار نہیں دیا جائے گا۔

بس یہ "توحید اہلہ" اور "توحید اعیاد" کی تجویز بالکل غیر معقول و خلافِ اصول ہے۔ اور اس پر عمل کرنے میں شرعاً مضرت ہی مضرت ہے فائدہ کچھ نہیں۔ مضرت یہ ہے کہ باشندگانِ ہند کو فی الواقع رمضان شروع نہ ہونے کے باوجود اواخر شعبان کو ہی اوائل رمضان فرض کر کے روزہ رکھنا ہوگا جو حدیثِ صحیح کی رُو سے ممنوع ہے۔ اور قبل از وقت ہونے کی وجہ سے فی نفسہ یہ روزہ رمضان کا نہ ہوگا۔ پھر ۲۸ یا ۲۹ رمضان کو یکم شوال فرض کر کے روزہ نہ رکھیں گے اور عید منائیں گے، حالانکہ فی الواقع یہ رمضان کا دن ہوگا۔ اور اس میں روزہ رکھنا لازم ہوگا۔

پھر وہ مقصد جس کے حصول کے لیے "توحیدِ اعیاد" و "توحید اہلّہ" کی یہ تجویز لائی گئی ہے یہ بتایا گیا ہے کہ تمام دنیائے اسلام ایک ہی دن عید منائے تاکہ اس سے اغیار کے سامنے ان کے باہمی اتحاد و اتفاق اور شوکت کا مظاہرہ ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض سطحی چیز ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اس تجویز کے مجوّزین نے گہرے غور و فکر سے کام نہیں لیا ہے، ذرا سے غور و فکر سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کیا اس نمائش اور مظاہرہ سے واقعی مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جائے گا۔ اور کیا دنیا بھر کے دشمنانِ اسلام اتنے بھولے ہیں کہ صرف یہ دیکھ کر کہ دُنیا کے سارے ملکوں میں مسلمان ایک ہی دن عید مناتے ہیں یقین کر لیں گے کہ مسلمانوں کے تمام اختلافات ختم ہو گئے ہیں۔ اور مصر و شام اور سعودی عرب اور اردن اور ترک اور پاکستان و افغانستان سب بالکل ایک ہو گئے ہیں، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو کم نگاہی کی انتہا ہے۔ کاش ان کھوکھلی تجویزوں کے بجائے مسلمان ملکوں اور مسلمان طبقوں اور فرقوں کے اختلافات ختم کرنے یا کم کرنے کی کوئی ٹھوس کوشش کی جاتی۔

حضرت رائپوری کی تدفین اور تابوت کی منتقلی کا قضیہ

مجلس تحقیقات شرعیہ کا فیصلہ اور دردمندانہ اپیل

[۱۵ / ۱۶ / مئی کو "مجلس تحقیقات شرعیہ" کا ایک اجلاس سرکاری امدادی قرضوں کے مسئلہ پر شرعی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، مجلس نے دو دن تک غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کے بعد اپنے میں سے ۵ ارکان کی ایک کمیٹی بنادی ہے، وہ مسئلہ کے بعض گوشوں کے بارہ میں مزید تحقیق کرکے دو روزہ مذاکرات کی روشنی میں سوالنامہ کا جواب مرتب کرے گی، پھر ارکان مجلس کے آخری غور و فکر کے بعد مجلس کے ضابطہ کے مطابق وہ شائع کردیا جائے گا۔

اسی اجلاس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ارکان مجلس کے سامنے حضرت رائپوری رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین اور تابوت کی رائے پور منتقلی کے افسوسناک قضیہ کے بارہ میں ایک مفصل توجہ نامہ پیش کیا، جس میں انھوں نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ کچھ سنجیدہ حلقوں کی طرف سے یہ تحریک کی گئی ہے کہ "مجلس تحقیقات شرعیہ" اس نزاعی مسئلہ کا جس نے ایک خاص حلقہ کے تعلقات میں سخت تلخی پیدا کردی ہے، شرعی فیصلہ کردے تو اس کی امید ہے کہ یہ اختلاف و نزاع اگر بالکل ختم بھی ہوگا تو اس میں وہ شدت اور گرمی ان شاء اللہ باقی نہیں رہے گی جس سے صورت حال کے زیادہ سنگین ہوجانے اور فتنہ و فساد تک پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ ——— مولانا ندوی کا وہ توجہ نامہ اور اس پر مجلس کا فیصلہ نذر ناظرین کیا جارہا ہے۔]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرات!

مجلس تحقیقات شرعیہ کی اُس نشست سے جو وقت کے ایک اہم فقہی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہو رہی ہو جس کا اس ملک کے مسلمانوں کی معاشی و اجتماعی زندگی سے قریبی تعلق ہو اور جو ایک علمی ضرورت ہو، فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ علمی و فقہی بصیرت رکھنے والے اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی کر سکنے والے علماء اتنی بڑی تعداد میں آسانی کے ساتھ جلد از جلد ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے آپ کے سامنے ایک ایسا مسئلہ رکھنا چاہتا ہوں جو نہ میرے لیے خوشگوار ہے نہ آپ کے لیے اور نہ اس پر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی یا ترقی و خوشحالی کا انحصار ہے نہ اُس کو مسلمانوں کے موجودہ حالات اور زمانہ سے کوئی مطابقت اور مناسبت ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ہماری بدقسمتی کی ایک دلیل اور ہمارے دینی طبقہ کی کم نگاہی کی ایک نشانی ہے، لیکن چونکہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کے ایک منتخب اور وسیع علمی و دینی حلقہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور کچھ عرصہ سے اس نے ایک متنازعہ فقہی مسئلہ اور علمی جدال و بحث کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر خدانخواستہ کسی بڑے فتنہ و فساد کے برپا ہو جانے کا اندیشہ بھی ہے جیسا کہ مجھے باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی ہے، اور اسکے سدِ باب کیلئے بعض سنجیدہ حلقوں کی طرف سے یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ اس مسئلہ کو مجلس تحقیقات شرعیہ کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہ اس پر اپنا فیصلہ دے اور پھر اسکو ایک اجماعی فتوے کی حیثیت سے سب متعلقہ حضرات کو تسلیم کر لینا چاہیے اس لیے میں اس مسئلہ کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے دینی و روحانی مقام سے آپ سب حضرات واقف ہیں اور آپ میں سے اکثر حضرات نے ان کی زیارت بھی کی ہوگی، حضرت مرحوم کا وطنی تعلق ضلع سرگودھا مغربی پاکستان کے ایک گاؤں (ڈھڈیاں) سے تھا اور وہاں آپ کا پورا خاندان حقیقی بھائی، حقیقی بھتیجے اور بھانجے اور ان کے علاوہ دوسرے اعزہ سب اُس گاؤں میں موجود ہیں، انہی کے تعلق سے حضرت اکثر وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت کی ساری زندگی اپنے شیخ و مرشد حضرت شاہ

عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں گذری اور ان کی وفات کے بعد آپ نے ان کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ علالت کا سلسلہ کئی سال سے جاری تھا جس میں نشیب و فراز ہوتا رہتا تھا، اسی حالت میں ۳۰ اپریل ۱۹۶۲ء کو آپ آخری بار اپنے اعزہ اور ارادتمندوں سے ملنے لاہور تشریف لے گئے اور وہیں مرض کا وہ آخری حملہ ہوا جو ظاہری اسباب کے لحاظ سے وفات کا سبب بنا ——— یہ واقعہ ہے کہ اپنے شیخ و مرشد کی خواہش اور اُن کے بعض ارشادات کی بنا پر نیز اپنے غیر معمولی تعلق و محبت کی وجہ سے آپ کی قدرتی خواہش اور تمنا تھی کہ وفات کے بعد اپنے محبوب شیخ کے پاس ہی آسودۂ خاک ہوں ——— لاہور میں ۲۱ اگست ۱۹۶۲ء کو جب یہ واقعہ پیش آیا تو یہ عاجز اس وقت موجود تھا، مقام تدفین کے متعلق اس وقت تین صورتیں ممکن العمل تھیں اور سامنے آئیں۔

اولاً یہ کہ عامۂ مسلمین اور مشائخ و خواص امت کے عام دستور اور شریعت کے مزاج کے مطابق جہاں وفات ہوئی ہے وہیں تدفین عمل میں آئے، جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج و مذاق سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ حضرت کے یہاں روح کے قفس عنصری سے پرواز کر جانے کے بعد جسد خاکی کی تدفین وغیرہ کے مسئلہ کو زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی اور کئی بار مختلف مقامات پر حضرت یہ بھی فرما چکے تھے کہ جہاں یہ واقعہ پیش آئے وہیں سپرد خاک کر دیا جائے اور متعدد مقامات پر مدفون ہونے کی خواہش کا اظہار بھی فرمایا تھا، لائل پور کے خالصہ کالج کی مسجد کے متعلق بھی (جس کے ساتھ حفظ قرآن کا مدرسہ بھی تھا) ایکبار فرمایا کہ میرا انتقال ہو تو یہیں دفن کر دینا کہ بچے قرآن شریف پڑھتے رہیں گے بیکر وطن رائے بریلی دائرہ شاہ علم اللہ میں پہلی بار ۱۹۴۶ء میں تشریف لائے، تو رات کو اچانک طبیعت کچھ زیادہ ناساز ہو گئی۔ میں صبح حاضر ہوا تو خود مجھ سے فرمایا کہ میں تو خوش ہوا تھا کہ اگر انتقال ہوا تو یہیں بزرگوں کے پاس دفن ہو جائیں گے ——— چنانچہ شریعت کے عام مسئلہ کے مطابق بعض اہل علم نے لاہور میں ٹیلیفون پر خود مجھے یہ پیام دیا کہ میں اپنے تعلق سے کام لوں اور حضرت کو حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے پاس دفن کیے جانے پر زور دوں کہ یہ مرکزی مقام بھی ہے اور اسمیں ہندوستان سے آنے جانے والوں کو بھی سہولت ہو گی لیکن میں نے

اپنے طبعی افتاد کی بنا پر اور حضرت کے حقیقی بھائی، اور حقیقی بھتیجوں، بھانجوں کی موجودگی کی وجہ سے بھی اس مسئلہ میں دخل دینے سے معذرت کی۔

دوسری شکل یہ تھی کہ حضرت کی نعش مبارک کو ہندوستان رائے بور لایا جائے اور وہاں اپنے شیخ کے پاس دفن کیا جائے، اسمیں کچھ تو اس وقت انتظامی اور قانونی دشواریاں بیان کی گئیں اور واقعہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے ان ارادتمند دل اور رائے بور کے حضرات نے جو وہاں موجود تھے اس پر پورا زور نہیں دیا اور اس نقطۂ نظر کی کوئی طاقتور وکالت کرنے والا اس وقت موجود نہیں تھا۔

تیسری شکل یہ تھی کہ حضرت کو اپنے قدیم وطن میں جہاں آپ کا خاندان اور آپ کے حقیقی بھائی، بھتیجے موجود تھے۔ دفن کیا جائے، اس وقت آپ کے حقیقی چھوٹے بھائی حافظ محمد خلیل صاحب جو شرعی طور پر ولی بھی تھے اور در اصل انہی کی ملاقات کے شوق کی بنا پر آپ نے علالت اور انتہائی ضعف کی حالت میں یہ سفر اختیار فرمایا تھا جس کا سوانح حضرت رائے بوری میں تذکرہ بھی ہے اور جس سے وہ سب حضرات بھی واقف ہیں جو اس زمانہ میں رائے بور میں مقیم تھے۔ یا سفر سے پہلے حاضر ہوئے تھے، انھوں نے اس پر پورا زور دیا کہ تدفین ڈھڈیاں ہی میں ہو، اُن کے شرعی حق ولایت اور اس تعلق و اختصاص کی بنا پر جو اس وقت کے حاضرین میں کسی کو اس درجہ میں حاصل نہ تھا۔ تمام مقیمین و حاضرین نے سکوت اختیار کیا اور وہ خود اسی وقت ضروری انتظامات کے لیے حضرت کے ایک دوسرے معتمد و مجاز ذہم وطن قاضی عبدالقادر صاحب کو لے کر ڈھڈیاں تشریف لے گئے، وہاں پہونچ کر بستی کے عام قبرستان کے قریب اپنی ذاتی زمین میں قبر کھدوانی شروع کر دی لیکن چونکہ برسات کا موسم تھا اور بارشیں بہت ہو چکی تھیں اسلیے نیچے گیلی مٹی نکلنے لگی تو وہاں تدفین کا ارادہ ترک کر دیا گیا اور حضرت کے اہل خاندان اور گاؤں والوں کی رائے یہ ہو گئی کہ بستی کی مسجد کے صحن کے بالکل برابر میں حجروں کے سامنے جو قطعہ زمین ہے (جو حضرت کے بھائی حافظ محمد خلیل صاحب کی ملکیت تھا۔) اسمیں حضرت کو دفن کیا جائے اور اتفاق کی بات ہے کہ مسجد کو کئی سال پہلے سیلاب سے سخت نقصان پہونچ چکا تھا اس کو دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا اور اس کی کرسی ۵-۶ فٹ بلند کر دی

گئی تھی اور مسجد کے صحن کو بھی مٹی بھر کر اتنا ہی بلند کرنا طے کر لیا گیا تھا اگرچہ ابھی اس میں مٹی بھری نہیں گئی تھی اسی کے ساتھ اس قطعہ زمین کو بھی مٹی بھر کر مسجد اور صحنِ مسجد کے برابر کرنا طے کر لیا گیا تھا۔

جب اس قطعہ زمین میں قبر کی کھدائی شروع ہوئی تو صرف ۱-۲ فٹ کھدائی کے بعد ہی زمین سے راکھ اور کباڑ برآمد ہونے لگا۔ (کیونکہ یہ جگہ بھی کچھ سال پہلے بھراؤ ڈال کر بلند کی گئی تھی۔) تو اندازہ ہوا کہ یہاں قبر بہت گہری کھودنی پڑے گی اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ نیچے گیلی مٹی نکلنے لگے، اس لیے ان حضرات نے یہ سوچا کہ جب اس قطعہ زمین کو مٹی بھر کر ۵-۶ فٹ بلند کرنا پہلے ہی سے طے ہے تو بجائے نیچے کی جانب قبر کھودنے کے ایسا کیا جائے کہ اوپر کی جانب کو شق کی شکل میں دیواریں کھڑی کر دی جائیں اور حضرت کا تابوت اسمیں دفن کر دیا جائے اور اس کے بعد سابقہ تجویز کے مطابق اس پورے قطعہ کو مٹی سے پاٹ دیا جائے اور اوپر کی جانب قبر کا نشان بنا دیا جائے، تو یہ شق ہی کی شکل ہو جائے گی، متعدد علمائے کرام جو اس وقت موجود تھے اور تدفین میں شریک تھے اُن سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ اسمیں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بہرحال اسی طرح تدفین عمل میں آئی حضرت کا جنازہ لاہور سے آدھی رات کے قریب ڈھڈیاں پہونچا تھا، رات کے آخری حصہ میں مذکورہ بالا طریقہ پر تدفین مکمل ہوئی اور اسی وقت مٹی دی گئی پھر سابقہ تجویز کے مطابق اس پورے قطعہ زمین کو مٹی بھر کر ۵-۶ فٹ بلند کر دیا گیا اور پھر اینٹوں سے بنی ہوئی وہ شق جس میں تابوت مدفون ہے بالائی سطح سے دو تین فٹ نیچے ہو گئی اور اس کے اوپر قبر کا کوہان نما نشان بنا دیا گیا۔

حضرات! تدفین کا واقعہ جس طرح عمل میں آیا بغیر کسی حاشیہ آرائی اور رائے زنی کے آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے یہ واقعہ کی حقیقی تصویر ہے میں اگرچہ اس موقع پر حاضر تھا لیکن مجمع کی کثرت اور اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے اول سے آخر تک واقعہ کا شاہد عینی اور اس کی تمام جزئیات سے واقف نہیں ہو سکا میں قبر پر اس وقت پہونچا جب آخر میں مٹی دینے کے لیے پکارا گیا، اسلیے سوانح حضرت رائے پوری میں یہ پوری

تفصیل اس طرح نہیں لکھی گئی اور اس وقت اس کا کوئی اندازہ اور اندیشہ نہیں تھا کہ اس تدفین کے بارے میں کوئی اختلاف و نزاع پیدا ہوگا، اس لیے سوانح لکھتے وقت اس کا کوئی خاص اہتمام بھی نہیں کیا گیا، اب اس واقعہ کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرنے میں ان حضرات کے بیانات پر اعتماد کیا گیا ہے جو اول سے آخر تک تدفین کے وقت نہ صرف حاضر و موجود بلکہ شریک کار اور ذمہ دار تھے اور جن کے تقویٰ اور دیانت پر مجھے اعتماد ہے اور دوسرے حاضر الوقت علماء و صلحاء اسکی تصدیق کرتے ہیں۔

اب اسکے بعد ایک فریق کی رائے یہ ہے کہ تدفین شرعی طور پر متحقق نہیں ہوئی اس لیے جسد کا وہاں سے نکالنا اور شرعی طریقہ پر تدفین کا عمل میں لانا ضروری ہے اور جب ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر جسد کی تدفین وہاں ہونی چاہیے جہاں حضرت کی خواہش و تمنا تھی، اور ان کے شیخ کا منشا اور بہت سے ارادتمندوں کا مطالبہ ہے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ یہ تدفین اگرچہ عام معروف متوارث طریقہ سے کچھ مختلف طریقہ پر ہوئی لیکن شرعی طریقہ پر تدفین متحقق ہوگئی اور اب نبش جائز نہیں ہے، اس لیے انتقال تابوت اور دوسری جگہ تدفین خارج از بحث ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے ہندوستان اور پاکستان کے تمام معروف اکابر اہل فتویٰ نے اسی دوسرے نقطہ نظر کی تائید کی ہے، حضرت کی وفات کے بعد ہی یہ اختلاف و نزاع وہاں شروع ہوگیا تھا، اسی زمانہ میں اس مسئلہ پر دو فتوے بہت مفصل اور مدلل شائع ہوئے تھے جن میں اسی نقطہ نظر کی تائید کی گئی تھی، ان پر پاکستان کے قریب قریب تمام اکابر علماء اور مشاہیر اہل فتویٰ کی تصدیقات ثبت ہیں، ہندوستان کے بھی ممتاز اہل فتویٰ و اکابر علماء نے ان کی تصدیق و توثیق کی ہے یہ دونوں مطبوعہ فتوے[1] یہاں موجود ہیں، ان کے علاوہ کچھ غیر مطبوعہ فتوے بھی

---

[1] ان میں ایک فتویٰ تو مولانا حضرت مفتی زین العابدین صاحب لائل پوری کا ہے جس کی تمام اکابر علماء و اہل فتویٰ نے تصدیق و توثیق کی ہے یہ الفرقان کی گزشتہ اشاعت میں لفظ بلفظ شائع کیا جا چکا ہے۔ دوسرا فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد صاحب انوری مالکپوری کا ہے اس پر بھی پاکستان کے تمام اکابر علماء و اہل فتویٰ کی تصدیقات ثبت ہیں، اس کا زیادہ تعلق نبش اور منتقل کے مسئلے سے ہے، اس کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ موجودہ صورت میں نبش اور منتقل کی نقل منقل میں خطا بھی گنجائش نہیں ہے، اور فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت یعقوب و یوسف جو پیغمبر تھے ان پر غیر نبی کو قیاس کرنا غلط ہے، اور تدفین کے بعد نبش و منتقلی سوائے ان خاص صورتوں کے جنکا کتب فقہ میں ذکر ہے حرام و ناجائز ہے۔ نعمانی

ہیں کہ ابھی حال میں ہندوستان کے دو ممتاز ترین ماہرین فتویٰ (یعنی حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب (اعظمی) سے اس مسئلہ کے بارہ میں استفتاء کیا گیا تھا، اُن حضرات کے جوابات بھی آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہیں اور میں درخواست کروں گا کہ آپ حضرات یہ دونوں فتوے ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

ان کے علاوہ ایک وہ فتویٰ بھی پیش ہے جس میں فریق اوّل کے نقطۂ نظر کی تائید کی گئی ہے یعنی یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ تدفین متحقق نہیں ہوئی اور تابوت میت کو دوسری جگہ منتقل کرنا اب بھی جائز ہے، لیکن اولاً تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کے سوال میں تدفین کا واقعہ صحیح اور پورے طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا علاوہ ازیں جن حضرات کا وہ فتویٰ تھا جب اس کے بارے میں بعض اہل علم نے ان سے مراسلت کی تو انھوں نے اپنی رائے میں یہ ترمیم کرلی کہ تدفین متحقق ہوگئی لیکن کراہت تحریمی کے ساتھ، اور دوسرے یہ کہ اب اتنی مدت کے بعد بہر حال نبش اور انتقال درست نہیں لہٰذا اب جس طرح ہے اسی طرح رہنے دیا جائے ——— اور میرا خیال ہے کہ اگر طریقۂ تدفین کی صحیح تفصیل رکھ کر اُن حضرات سے استفتاء کیا جائے تو ان کا جواب بھی وہی ہوگا جو عام طور سے اکابر و مشاہیر اہل فتویٰ نے دیا ہے۔

بہر حال! اس سلسلہ کے یہ سب فتاویٰ آپ حضرات کے سامنے ہیں، میں درخواست کروں گا کہ مجلس اس مسئلہ پر غور کرے اور اپنا فیصلہ دے۔ امید ہے کہ مجلس کا یہ فیصلہ اس اختلاف و نزاع کو بالغرض اگر ختم نہیں کرسکے گا تو اس فتنہ و فساد کا انشاء اللہ سد باب ہو جائے گا جس کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہو نیز مجلس کے اس فیصلہ سے اصلاح ذات البین کی سعی و کوشش کا اہم فرض بھی ادا ہو جائے گا جو اس کے حسنات میں شمار ہوگا۔

ابوالحسن علی ندوی

مجلسِ تحقیقاتِ شرعیہ کا فیصلہ اور متعلقہ حضرات سے اپیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس تحقیقات شرعیہ کے اجلاس میں مجلس کے مستقل صدر جناب مولانا سید ابوالحسن علی

ندوی کی تحریر پڑھی گئی جس میں موصوف نے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین اور اس کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس افسوسناک اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے جس کا تذکرہ بعض اخبارات و رسائل میں آچکا ہے اور ہندوستان و پاکستان کے اکابر علماء و اہل فتوی کے ان فتاوی کا بھی ذکر کیا ہے جو اس سلسلہ میں لکھے گئے ہیں ان میں دو فتوے جو حال ہی میں لکھے گئے ہیں۔ ـــــ ایک مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری کا دوسرا مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کا، مجلس میں پڑھ کر سنائے گئے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ کے ہم ارکان اس شرعی رائے سے متفق ہیں جو مسئلہ کے بارہ میں ان دونوں فتووں میں ظاہر کی گئی ہے۔ اور فیما بیننا و بین اللہ اس پر مطمئن ہیں کہ تدفین کی جو صورت بیان کی گئی ہے اس میں تدفین شرعاً متحقق ہو گئی اور پھر قطع نظر اس سے کہ تدفین کس طرح ہوئی اور اس میں کیا اور کس درجہ خامی رہی ـــ اب میت کو وہاں سے منتقل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت بڑے اور دور رس مفاسد ہیں ـــــ اور ہندوستان یا پاکستان کی حکومت کو اس میں مداخلت کی دعوت دینا تو بہت ہی خطرناک ہے بالخصوص ایسی صورت میں کہ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے اہل خاندان جو شرعی ولی بھی ہیں اس منتقلی کے لیے کسی طرح راضی نہیں ہیں ـــــ اس لیے مجلس ان حضرات سے جو غالباً حضرت رائے پوری کی محبت کے جذبہ ہی سے مغلوب ہو کر رائے پور منتقلی کی تجویز پر اصرار کر رہے ہیں درد مندانہ اپیل کرتی ہے کہ جو کچھ ہو چکا اس کو تقدیر الٰہی سمجھ کر اس مسئلہ کو اب ختم کر دیا جائے، یقین ہے کہ اصلاح ذات البین اور رفع نزاع کی نیت سے اور حکم شریعت کے تحت اپنے جذبات کے خلاف یہ اقدام کرنا ان حضرات کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت اور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک روح کی مسرت کا باعث ہوگا۔ واللہ الموفق

اسمائے گرامی شرکاء اجلاس مجلس تحقیقات شرعیہ: جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی۔ جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، جناب مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی۔ جناب مولانا مفتی نظام الدین صاحب (مفتی دار العلوم دیوبند) جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔ جناب مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی۔ جناب مولانا شاہ عون احمد صاحب پھلواروی۔ جناب مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی۔ جناب مولانا سید احمد صاحب شریح قادری۔ جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی جناب مولانا ظفیر الدین صاحب (دیوبند) جناب مولانا شاہ عمران خاں صاحب ندوی۔ جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی۔ جناب مولانا محمد رضا صاحب انصاری جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی وغیرہم

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا فتویٰ

مجلس تحقیقات شرعیہ کے مندرجہ بالا فیصلہ اور اپیل میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری اور حضرت مولانا اعظمی کے فتووں کا خصوصیت سے تذکرہ کر کے ان میں ظاہر کی گئی رائے سے اتفاق کیا گیا ہے، اسلئے ان فتووں کا بھی ناظرین کے سامنے آجانا ضروری ہے ــــ حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب کا فتویٰ تو الفرقان کے اس سے پہلے ہی شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ حضرت مولانا اعظمی کا فتویٰ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے ــــ

ملحوظ رہے کہ مولانا ممدوح کو بھی وہی سوال بھیجا گیا تھا جو مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، جس سے الفرقان کے ناظرین الفرقان کے گزشتہ شمارہ کے ذریعہ واقف ہو چکے ہیں ــــ اس لیے حضرت مولانا کا صرف جواب ہی درج کیا جا رہا ہے۔

باسمہ سبحانہ

صورت مسئولہ میں جو طریقۂ دفن اختیار کیا گیا وہ اگرچہ سنت متوارثہ کے خلاف ہے مگر دفن متحقق ہو گیا، اور اب اس توہم کی بنا پر کہ دفن متحقق نہیں ہوا نبش جائز نہیں ہے ــــ

شامی کی عبارت (ومفادہ انہ لا یجزیٔ دفنہ علی وجہ الارض ببناء علیہ) سے عدم اجزاء کے باب میں استناد صحیح ہونے کا امکان اس وقت تھا جب ڈاٹ لگانے کے بعد مٹی نہ پاٹی گئی ہوتی اور صرف "وضع المیت علی وجہ الارض والبناء علیہ" پر اکتفا کیا گیا ہوتا، مٹی پاٹنے کے بعد تو وجہ الارض بنا بحیث لبطن الارض ہو گیا، دفن کے اختیار کردہ طریق میں اگرچہ ایک طرح کی خامی ہے مگر نبش المیت اس سے کہیں زیادہ شرعاً اقبح واشنع ہے ــــ

یہاں تو دفن کا طریقہ خلاف سنت تھا اور انتہا یہ اس نقص کی تلافی بھی ہو گئی پھر نبش کے لیے کونسی وجہ جواز نکل سکتی ہے جبکہ فقہائے کرام نے اس سے بڑی بڑی مخالفت سنت

کی موجودگی میں بھی نبش کو ممنوع قرار دیا ہے۔ عالمگیری میں ہے۔

ولو وضع المیت لغیر القبلة او علی شقه الایسر او جعل راسه موضع رجلیه واهیل علیه التراب لم ینبش (اگر میت کو قبر میں قبلہ رخ نہ رکھا جائے یا بجائے داہنی کروٹ کے بائیں کروٹ پر لٹا دیا جائے یا اس کے سر کو پیروں کی جگہ کر دیا جائے اور مٹی ڈال دی جائے تو نبش جائز نہیں)۔

بلکہ کتب فقہ میں یہاں تک مذکور و مصرح ہے کہ غسل میت ایک حق واجب ہے اور اس پر اجماع ہے اور نماز جنازہ فرض کفایہ ہے لیکن اگر کسی وجہ سے بلا غسل یا بلا نماز کے دفن کر دیا گیا تب بھی نبش جائز نہیں ہے۔ مراقی الفلاح میں ہے "حرمة نبشه" اور طحطاوی نے خلاصہ وجامع صغیر حاکم سے نقل کیا ہے "لو دفن قبل الغسل او قبل الصلوٰة لا ینبش، فان دفنوه ولم یهیلوا علیه حتی علموا انه لم یغسل لکنهم سووا اللبن لا ینبش ایضاً" (یعنی اگر میت کو غسل دینے سے پہلے یا اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے پہلے دفن کر دیا گیا تو غسل دینے اور نماز جنازہ پڑھنے کے لیے بھی اس کو قبر سے نہیں نکالا جائے گا۔ اگر میت کو لوگوں نے دفن کر دیا یعنی قبر میں رکھ دیا اور ابھی اس پر مٹی نہیں ڈالی، یہاں تک کہ یہ بات علم میں آگئی کہ اس میت کو غسل نہیں دیا گیا تھا لیکن وہ قبر کو بند کرنے کے لیے اینٹیں لگا چکے ہیں، تو اس صورت میں بھی غسل دینے کے لیے میت کو نکالا نہیں جائے گا۔)

الحاصل صورت مسئولہ میں نبش کے لیے کوئی وجہ جواز موجود نہیں ہے، جو لوگ ایسا کریں گے وہ فقہاء کی تصریحات کے بموجب حرام کے مرتکب ہوں گے۔

اس سلسلہ میں اقوال فقہاء و عبارات کتب کے استقصا کا ارادہ کیا جائے تو کلام بہت طویل ہو جائے گا۔ وفیما ذکرناه کفایة۔ واللہ اعلم وعلمه اتم واحکم۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی - ۸ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ

ان دو فتووں کا امتیاز:

مجلس تحقیقات شرعیہ کے مندرجہ بالا فیصلہ اور اپیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرت

مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب اور حضرت مولانا اعظمی کے فتووں کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ علوم شریعت اور خاص کر فقہ و فتاویٰ میں ان حضرات کا امتیازی مقام ہے ـــــ حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب کے متعلق معلوم ہے کہ عرصہ دراز تک دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی رہے، اور اب جبکہ ضعف پیری اور مرض فالج کی وجہ سے بالکل معذور ہو کر اپنے وطن میں مقیم ہو گئے ہیں، علماء و اہل فتویٰ مشکل مسائل میں اب بھی اُن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حضرت ممدوح اسی حال میں جوابات دیتے ہیں۔ اور حضرت مولانا اعظمی کی عمومی شہرت اگرچہ ایک وسیع النظر محدث اور فن حدیث کے ایک محقق کی حیثیت سے ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عام علوم شریعت اور خاص کر فقہ و فتوے میں بھی آپ کا خاص الخاص مقام ہے ـــــ اب سے قریباً ۱۵ سال پہلے ممدوح کو دار العلوم دیوبند کی صدارت افتاء کے منصب پر لانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن مولانا نے اس وقت کی اپنی دوسری مشغولیتوں کی وجہ سے معذرت کر دی تھی۔ ـــــ پھر اسکے بعد ایک موقع پر دار العلوم کی مجلس شوریٰ نے جس کے مولانا خود بھی ایک رکن ہیں دار العلوم کی صدارت تدریس کے منصب پر لانے کی بھی کوشش کی، لیکن آپ نے فن حدیث اور نوادر کتب حدیث کی جس خاص خدمت کو اپنی زندگی کا مصرف بنا لیا ہے اس کی وجہ سے مجلس شوریٰ کی اس پیش کش کے قبول کرنے سے بھی معذرت فرما دی ـــــ الغرض یہ دونوں حضرات کم از کم ہندوستان میں بالخصوص فتاویٰ کے لیے آخری مرجع ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ان کے فیوض سے استفادہ کی امت مسلمہ کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک توفیق عطا فرمائے۔

اردو یونیورسٹی کی تجویز

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی عہ)

اردو دنیا کی اہم زبانوں میں سے ہے۔ اور اس کے بولنے والوں کی تعداد شمالی چینی اور انگریزی کو چھوڑ کر دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اردو بولنے والوں کی آبادیاں فیجی، قدیم برٹش گیانا، ٹرینی ڈاڈ، جنوبی اور مشرقی افریقہ، انگلستان، عدن، افغانستان، پاکستان، مارشیس، برما، ملیشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ....

.... اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی، یہیں پلی اور بڑھی اور یہیں سے مختلف ملکوں میں پھیلی۔ پچھلی مردم شماری کی رو سے ہندوستان میں اردو کے بولنے والوں کی تعداد ۲۳ ملین ہے لیکن روزنامہ "ملاپ"(۱) کا خیال ہے کہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہندوستان اردو کا گھر ہے اور اس کے بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستان میں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اردو کا مستقبل اصلاً ہندوستان سے وابستہ ہے اور اس کے تحفظ اور ترقی کی ساری ذمہ داری ہندوستانی عوام کی ہے۔ اردو کو جو دولت ارثاً ملی ہے وہ مشترکہ تہذیب کی دولت ہے۔ اس نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے انقلاب کی چنگاریاں روشن کی ہیں غریبوں کو جگایا ہے۔ ایک بہتر سماج بنانے کی کوشش کی ہے دل میں ٹھنڈک اور نظر میں وسعت پیدا کی ہے۔ وہ اتحاد اور سالمیت کی زندہ علامت ہے اور اس کے نقصان میں در اصل پورے ملک کا نقصان پوشیدہ ہے۔

عہ خواجہ صاحب کی یہ تحریر زیادہ طویل تھی ذیل میں اس کا اختصار دیا جا رہا ہے۔ (الفرقان)

۱۔ ملاپ نئی دہلی بحوالہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۰ء

کسی ملک کی ترقی کا انحصار تعلیم پر ہے اور ماہرین اس پر متفق ہیں کہ طالب علم کی زبان اور تعلیم کی زبان میں فرق نہیں ہونا چاہیے اور وہ تعلیم یکسر بے وقعت اور بے معنی ہے جو مادری زبان میں نہ دی جائے یا جو اپنی تمدنی بنیادوں سے ناآشنا ہو۔ تعلیم کا مقصد چند کتابوں کو حفظ کر لینا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد شخصیت کی تعمیر اور جذبات کی تہذیب ہے۔ اس کا مقصد فرد اور جماعت کے درمیان صحیح ہم آہنگی پیدا کرنا ہے اور خوابیدہ صلاحیتوں کو اس طرح ابھارنا اور سنوارنا ہے کہ طالب علم اپنے سماج کی ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے اٹھا سکے۔ زبان ایک تہذیبی عمل ہے جس کے ذریعے سماج کی تہذیبی قدروں کا اعلان اور اظہار ہوتا ہے اور جو اس کے وجودِ قومی اور خوش حالی کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے ملٹن نے لکھا تھا کہ:

"کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوش حالی اور فلاح سے محروم کی جا سکی ہو جس وقت تک کہ اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے ہوں یا اس کی طرف کافی توجہ دیتے ہوں۔"

ذہنی زندگی کی تربیت کے لئے جو اصل معنوں میں انسانی زندگی ہے، مادری زبان میں تعلیم سب سے زیادہ اہم ہے۔ جاپان نے اپنی علمی اور تہذیبی دولت کو عام کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ مغربی علوم کو سیکھنے کے لیے مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے۔ یہی اس کی ترقی اور خوشحالی کا راز ہے اور اسی کی وجہ سے آج تخلیقی فکر اور صنعت و حرفت کے میدان میں وہ بہت سے ملکوں سے آگے ہے۔

قومی تعلیم کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ یہ اتنا سیدھا سادہ اور فطری اصول ہے کہ اس کے سمجھانے کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کسی سے کہیں کہ پاؤں سے چلنا چاہیے اور آنکھوں سے دیکھنا چاہیے، لیکن ہندوستان میں جو غلط طریقۂ تعلیم انگریزوں کی بدولت مروّج رہا ہے اس کی وجہ سے اتنی واضح اور بدیہی بات کے لیے بھی دلیلیں لانا ضروری ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جرمنی میں سفر کرتے ہوئے ایک جرمن

پادری سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو میں اس نے پوچھا۔"آپ کے یہاں کس زبان میں تعلیم ہوتی ہے؟"۔ انھوں نے جواب دیا۔"انگریزی میں"۔ پادری نے کہا۔"یسوع کی قسم! کبھی ہزار برس میں بھی آپ ترقی کا منھ نہیں دیکھ سکتے"۔

جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے ہندوستان کے آئین و دستور نے ہمیں یہ حق دیا ہے کہ ہم اسے اپنی مادری زبان (اُردو) میں حاصل کریں۔ جب تک یہ دستور زیرعمل ہے یہ حق دنیا کی کوئی طاقت ہم سے نہیں چھین سکتی۔ اسکول کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی منزل آتی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسکول میں تعلیم مادری زبان میں ہو اور ثانوی اور اعلیٰ سطح پر یہ رشتہ کٹ جائے۔ اور پھر ایک نئی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے اسی لیے ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ (۶۶-۱۹۶۴ء) میں لکھا ہے کہ چونکہ ہم نے اسکول کی سطح پر علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم مانا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال تعلیم کی اعلیٰ سطح پر بھی ہو۔ (ص ۱۳) جذباتی ہم آہنگی کی جو کمیٹی قائم ہوئی تھی۔ اس نے بھی یہ ہی کہا تھا کہ علاقائی (یا مادری) زبان کا استعمال ابتدائی سے اعلیٰ سطح تک قومی یک جہتی کے لیے لازمی ہے۔ جون ۱۹۶۲ء میں اس کی تائید قومی یک جہتی کاؤنسل نے کی اور کہا بغیر علاقائی زبانوں کی مدد کے ہماری یونی ورسٹیوں کے دانش ور عوام سے کوئی رشتہ اور تعلق قائم نہیں کر سکتے۔ جو جمہوری اشتراکیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔

ایجوکیشن کمیشن نے یہ بات اپنی رپورٹ میں صراحت سے لکھی ہے کہ ہندی یا انگریزی کو آڑ بنا کر علاقائی زبانوں کی حق تلفی نہیں کرنا چاہیے۔ ہندی، غیر ہندی علاقوں کی مادری زبان نہیں بن سکتی۔ اور انگریزی، پورے ملک کی ضروریات کے پیش نظر ابدالآباد تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اس نے یہ بھی واضح طور پر لکھا ہے کہ اُردو ہر چند کہ عوام میں علاقائی زبان نہیں ہے لیکن اس کی ہندوستان گیر اہمیت ہے اور ہر تعلیمی سطح پر اس کی ہمت افزائی کرنا چاہیے۔ (ص ۱۵)۔ آگے چل کر اس رپورٹ نے اس پر زور دیا ہے کہ اقلیتوں کی دلداری اور ان کے مفاد کے تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے کہ اُردو میڈیم کے

کالج اور دوسرے ادارے ہوں اور ان کے قیام کی نہ صرف اجازت ہو بلکہ ان کی ہمت بڑھائی جائے (ص ۲۹۳)۔ اسی طرح کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ نئی دہلی ۵ اگست ۱۹۴۹ء کی تجویز میں یونی ورسٹی کی سطح پر اُردو کو صوبائی یا علاقائی زبان کی حیثیت سے تعلیم کا ذریعہ مانا ہے۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۴ء کی تجویز میں پھر اس پر اصرار کیا ہے کہ آئین کے آٹھویں شیڈول کی خاص زبانوں میں اُردو بھی شامل ہے اور اس کو قومی زندگی میں "مناسب جگہ" ملنا چاہیئے۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء کی تجویز میں خاص طور پر یہ وضاحت کی ہے کہ اُردو ہماری قومی زبان ہے اور صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ علاقائی زبان کی حیثیت سے اُردو کی تعلیم اور اس کے استعمال کی تمام ضروری سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۶۵ء کی تجویز میں لکھا ہے کہ آل انڈیا سروس کے جملہ امتحانات علاقائی زبانوں میں بھی ہوں۔ اور امیدواروں کو یہ اختیار ہو کہ وہ جس علاقائی یا قومی زبان کو چاہیں اختیار کریں۔

ان بیانات اور واقعات سے معلوم ہوگا کہ اب ہر سطح پر یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ہمیں ذریعۂ تعلیم کے لیے چودہ قومی زبانوں میں سے کسی ایک ہندوستانی زبان کو انتخاب کرنا ہے۔ اس میں انگریزی کا قدم درمیان میں نہیں ہے (رپورٹ سرکاری زبان کمیشن ۱۹۵۶ء ص ۹۴ و ۹۹ و ۱۰۱) اس تجویز پر کہ تعلیم علاقائی یا مادری زبان میں ہو، عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ گجرات میں زیادہ تر تعلیم گجراتی میں ہو رہی ہے، تامل ناڈو میں تامل پر زور دیا جا رہا ہے۔ پونا اور کرناٹک کی یونی ورسٹیاں علاقائی زبانوں میں تعلیم کا فیصلہ کر چکی ہیں۔ اندھرا کے اُردو کالج میں ساری تعلیم اُردو میں ہو رہی ہے۔ اسی طرح پنجاب میں پنجابی یونی ورسٹی قائم ہوئی ہے جس میں تمام اعلیٰ منزلوں پر پنجابی ہی ذریعۂ تعلیم ہو۔

اب اُردو والوں کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ چودہ قومی زبانوں میں سے کس زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائیں گے؟ اُردو کو؟ یا آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی یا کنڑ کو۔ انتخاب اُردو یا انگریزی میں کرنا نہیں ہے بلکہ اُردو یا آٹھویں شیڈول کی جدید ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو انتخاب کرنا ہے۔

مجھے یقین ہے اُردو والوں کا فیصلہ اُردو کے حق میں ہوگا جو ان کی مادری زبان ہے اور جو ہندوستان کی بین ریاستی، قومی زبان ہے۔ اسی کے ذریعے ہم اپنے تمدنی نصب العین کو پا سکیں گے اور علم کی تخلیقی توانائیوں کو وسیع تر علاقے میں پھیلا سکیں گے۔ یہ جمہور کا دور ہے اور ہمیں پورے سماج کو ساتھ لے کر چلنا ہے ان کی رہنمائی اُس تعلیم سے نہیں ہو سکتی جو صرف چند خواص کے لیے محدود ہو۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم ایک اردو یونی ورسٹی قائم کریں اور اس کو نئے ہندوستان اور نئی سائنسی تہذیب کا مرکز بنا دیں۔ یہ ہماری مشترکہ زندگی کی آئینہ دار، اُردو کے اتحاد پسندانہ کردار کی مظہر، اور علوم جدیدہ کی اعلیٰ دانش گاہ ہو۔ اس کا مقصد ایک ایسے متحرک ہندوستانی معاشرے کی تخلیق کرنا ہو جس میں جوشِ کردار کے ساتھ ساتھ فکرِ تازہ اور جرأتِ اندیشہ ہو، اور جس کی بدولت نئے صبح و شام پیدا ہو سکیں اور اس قدیم ملک میں علم و ہنر کی بہترین روایات زندہ ہو جائیں۔

اُردو یونی ورسٹی کسی ایک مذہبی طبقے سے وابستہ نہیں ہوگی۔ اردو کا کردار سیکولر رہا ہے اور اس کے بنانے اور سنوارنے میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب برابر کے شریک رہے ہیں۔ یہی خصوصیت اُردو یونی ورسٹی کی بھی ہو گی۔ اس کے دروازے بلا امتیازِ مذہب و ملت ان تمام لوگوں کے لیے کھلے ہوں گے جو اپنی مادری زبان یعنی اُردو میں جدید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

اُردو یونی ورسٹی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس میں صرف اُردو کی تعلیم ہو گی یا اس کا تعلق دوسری اہم زبانوں سے نہیں ہو گا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام علوم و فنون اُردو کے ذریعے پڑھائے جائیں گے۔ فلسفہ بیکن کا ہو گا۔ لیکن جس طرح انگریز اسے لاطینی کے بجائے انگریزی میں پڑھتے ہیں اسی طرح ہم اُردو میں پڑھیں گے۔ ہمارا مقصد درسِ نظامیہ کی طرف لوٹنا نہیں ہے۔

وہ رات ہو چکی، وہ فسانے گزر گئے

بلکہ جس طرح انگریز شوپن ہار یا نطشے کا فلسفہ جرمن کے بجائے انگریزی میں پڑھتے ہیں،

اسی طرح ہم اسے اُردو میں پڑھیں گے۔

اُردو یونی ورسٹی کے طلبا صرف اُردو ہی سے واقف نہیں ہوں گے بلکہ وہ انگریزی اور ہندی بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ ان کی مہارت ان زبانوں میں زیادہ ہو گی۔ اس لیے کہ وہ اپنی زبان کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ اور ایک زبان کو اچھی طرح جاننے کے بعد ہی دوسری زبان اچھی طرح سیکھی جا سکتی ہے۔ ہالینڈ چھوٹا سا ملک ہے لیکن وہاں ہر بچہ بڑا چار زبانیں جانتا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ ضروری ہے کہ ہم کم سے کم تین زبانوں سے واقف ہوں۔ مادری زبان سے ہماری صاحب سلامت دور کی نہ ہو۔ بلکہ وہ ہمارے دل اور دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو اور ہماری شخصیت کا ایک ضروری حصہ ہو۔ دوسرے ہم سرکاری زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے اُردو ہندی سے ہندستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ قریب ہے اور اگر ہمیں جمہوریت اور یونی ورسل سفرج کے تجربوں کو کامیاب بنانا ہے تو ان دونوں زبانوں کو اور زیادہ قریب لانا ہو گا۔ دستور کی دفعہ ۳۵۱ میں لکھا ہے کہ ہندی زبان کا ایک وسیع تصور سامنے رکھا جائے اور اس کو اس طرح ترقی دی جائے کہ وہ ہندوستان کی مختلف تہذیبوں کے اظہار خیال کا ذریعہ بن جائے۔ یہ بھی اُردو کے لیے ایک بڑا موقع ہے وہ اپنی ملنساری اور عوام دوستی سے نہ صرف یہ کہ ہندی پر بڑا اثر ڈال سکتی ہے بلکہ اس کا رُخ بھی متعین کر سکتی ہے۔ تیسرے ہم ایک یوروپی زبان پر قدرت رکھتے ہوں جس کی بدولت نئی دنیا کے قدم بہ قدم چل سکیں۔ اس زمرے میں بر حالت موجودہ انگریزی ہی آ سکتی ہے۔

ہم اس دور میں ہر چیز کو ترازو میں تولنے لگے ہیں اور جدھر پلڑا جھک جاتا ہے اُدھر خود بھی جھک جاتے ہیں۔ یہ "نقد سودے کا اصول" اگر زندگی پر حاوی ہو گیا تو ہماری زندگی بڑی بے کیف اور غیر مہذب ہو جائے گی۔ ہم مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے اس لیے ڈرتے ہیں کہ اس سے ہمیں ملازمت نہیں ملے گی۔ یہ رونا صرف اُردو کا نہیں بلکہ پوری قومی زندگی کا رونا ہے۔ اس کے پیچھے جو ذہنیت کارفرما ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے

سامنے زندگی اور تعلیم کے وہ اعلیٰ مقاصد نہیں جو اسے با معنی اور با مقصد بنا دیتے ہیں۔ ہم مادری زبان کی تعلیمی اہمیت سے بے خبر ہیں اور کل تہذیبی زندگی میں اس کا جو مقام ہے اس کے شناسا نہیں۔ روٹی کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ بارہویں صدی عیسوی سے جب سے یونی ورسٹیوں کا تصور وجود میں آیا ہے۔ روزگار کی اہمیت پیش نظر رہی ہے(۱) لیکن اسی کے ساتھ ذوقی صلاحیت اور تہذیبی مطالبے بھی نہایت درجہ اہم ہیں۔ بے روزگاری کا مسئلہ اتنا آسان نہیں۔ یہ کسی زبان کے پڑھنے یا نہ پڑھنے سے طے نہیں ہو سکتا۔ یہ اس سے کہیں بڑا معاملہ ہے۔ یہ سارے ملک کی معاشی تنظیم کا مسئلہ ہے۔ پیداوار کی اور دولت کی مناسب تنظیم اور بہتر تقسیم کا مسئلہ ہے۔

صنعتی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان، آسامی اور بنگالی، ہندی اور اردو کے درمیان عصبیت ختم ہو کر رہے گی۔ اس لیے کہ اس وقت کارکردگی کا جو "نیا اخلاق" ابھرے گا اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ کون اچھا ڈاکٹر ہے اور کون لائق انجنیئر۔ یہ نہیں کہ اس نے تعلیم اردو میں حاصل کی ہے یا کسی علاقائی زبان میں، اور چونکہ اردو کی بین ریاستی حیثیت ہے اس لیے اردو کے ذریعے پڑھے ہوئے ڈاکٹر اور انجنیئر کی کھپت ملک کے ہر حصے میں ہوگی۔ بشرطیکہ وہ اہلیت اور لیاقت رکھتا ہو۔

اردو یونی ورسٹی اگر قائم ہو گئی تو اس کے ذریعے اردو کے ریاستی اور علاقائی مفادات کو بھی تقویت پہنچے گی اور کئی ریاستوں میں اس کو جائز مقام مل سکے گا۔ یہ گویا اس ضمن میں پہلا ضروری قدم ہے یہ کبھی ناممکن ہے کہ ہماری فلاحی اور جمہوری حکومت ۴۳ ملین آبادی کو یکسر نظر انداز کر دے یا ان کے روزگار کا خیال نہ رکھے۔

اگر آپ کو نئے ہندوستان کے ترقی پسند ہونے اور قومی تعلیم کے جمہور پسند ہونے پر یقین ہے تو اردو یونی ورسٹی کا تصور بآسانی عمل میں آسکتا ہے۔ آپ کی جدوجہد اس لیے کامیاب ہوگی کہ یہ مطالبہ اردو والوں کی امانت اور آرزو ہے۔ یہ تعلیم کے صحیح اصولوں پر مبنی ہے اور اس سے ملک کی تعلیمی تقدیر وابستہ ہے۔ یہی طریقۂ تعلیم ایسا ہے جو فطرت کے عین مطابق اور نئے ہندوستان کے حالات سے ہم آہنگ ہے۔

۱۔ ملاحظہ ہو پروفیسر ایچ۔ ایس۔ فرلس کا مقالہ آزاد یونی ورسٹی کی جانب۔ مطبوعہ لندن ۱۹۶۹ء ص ۱

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.
VOL 39 NO. 3, 4
Regd. No. L-353

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ	الفرقان لکھنؤ ماہنامہ	سالانہ چندہ
ہندوستان سے .... ۸/۰ پاکستان سے .... ۸/۵۰ ضخامت ۵۶ صفحات قیمت فی کاپی .... ۵۷ پیسے		غیر ممالک سے ۱۵ شلنگ ہوائی ڈاک کے لیے مزید محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۹	بابت ماہ جمادی الاول ۱۳۹۱ھ مطابق جولائی ۱۹۷۱ء	شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کیلیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجکر ہم کو اطلاع دے دیں کیونکہ جن حضرات نے ہمارے خط کے جواب میں لکھا ہے کہ انکو رسالہ برابر پہونچ رہا ہے صرف ان ہی حضرات کو رسالہ بھیجا جا رہا ہے۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اسکی اطلاع ۲۸ جولائی تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

۱۸ر جون کے "صدق" میں مندرجۂ ذیل مراسلہ شائع ہوا ہے۔ اس میں محترم مدیر صدق کو مخاطب کرکے لکھا گیا ہے:۔

"آپ سے درخواست ہے کہ خود تبلیغی اجتماعات میں شریک ہوں اور معتبر علماء کو شرکت پر آمادہ کریں اور بڑے اجتماعات ہی نہیں چھوٹے اجتماعات میں شرکت کریں اور مبلغین کرام کی تقریریں بغور سماعت فرما کر ہم کم علموں کی رہنمائی فرمائیں کہ آیا ان کی تقریریں قابلِ سماعت ہیں یا نہیں؟ اب تو کھل کر ہر تقریر میں تبلیغ میں نکلنے کے استدلال میں جہاد کی آیات پڑھی جارہی ہیں۔ اور اس تبلیغ سے تعلق نہ رکھنے والوں کے لیے جہاد سے گریز کرنے والوں کی وعیدیں سنائی جارہی ہیں۔ اگر تبلیغ میں عمر کے چار چلّے، سال کا چلّہ مہینے کے تین دن نکلنا شرعاً ضروری ہے تو آپ حضرات اس کو چھپا کر ہم عوام کو کیوں جہنم کی طرف ڈھکیل رہے ہیں۔ اور اگر یہ جزو دین نہیں ہے تو براہ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

لکھنے کو تو دل بہت کچھ چاہتا ہے لیکن نہ میرا وہ مقام نہ اتنی جرأت، البتہ یہ آپ حضرات کا کام ہے، مجھ میں تو اتنی جرأت بھی نہیں کہ اپنا نام ظاہر کردوں اس لیے کہ سارے متعلقین تبلیغی ہیں اور سارے مخدوم حضرات اس سے وابستہ ہیں، نکلنا دشوار ہوجائے گا۔"

محترم مراسلہ نگار نے اپنا نام ظاہر نہیں فرمایا اور واقعہ یہ ہے کہ جو مقصد ہے اس کے لیے نام کا اظہار ضروری بھی نہیں۔

راقم سطور کا قریب بہ یقین گمان ہے کہ لکھنے والے صاحب اپنے جذبہ کے لحاظ سے مخلص ہیں،

(اگرچہ تحریر و تعبیر میں ان سے بے احتیاطی ہوئی ہے) اللہ تعالیٰ اُن کے حُسن نیت کی بہتر جزا عطا فرمائے۔ لیکن اگر وہ اس تبلیغی کام سے تعلق و واقفیت رکھنے والے کسی ایسے صاحب سے پہلے گفتگو فرما لیتے جو ان کی نظر میں علم و دین کے لحاظ سے بھی قابل اعتماد ہوتے (اور مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے حضرات سے بھی ان کا اچھا خاصا تعلق ہے) تو مراسلہ نگار کے اخلاص کی بنا پر یقین ہے کہ ان کے دل کا بوجھ بھی بہت کچھ ہلکا ہو جاتا۔ اور پھر مراسلہ کا انداز بھی اس سے مختلف ہوتا اور وہی اصلاح کے مقصد کے لیے زیادہ مفید ہوتا۔

اس عاجز کو گزشتہ ۲۵۔۳۰ سالوں میں بے شمار چھوٹے بڑے تبلیغی اجتماعات میں ان لوگوں کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے، عالموں کی بھی، عامیوں کی بھی، بلکہ کبھی کبھی بیچارے ان پڑھ دیہاتیوں کی بھی۔ اور کبھی کبھی ایسی بے تکی باتیں بھی سنیں جو اپنے لیے بھی سخت انقباض کا باعث ہوئیں اور اُن کی اصلاح یا تصحیح ضروری سمجھی، لیکن آج تک کسی سے یہ بات نہیں سُنی کہ عمر کے چار چلّے سال کا چلّہ مہینہ کے تین دن نکلنا "شرعاً ضروری ہے" یا "جزو دین ہے" اور یہ قرآن و حدیث کا کوئی خاص حکم ہے جس کو علماء اب تک چھپا کر عوام کو جہنم کی طرف ڈھکیلتے رہے ہیں۔

مراسلہ نگار کے اندازِ بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتہائی غلط اور عامیانہ بات گویا اب تبلیغی اجتماعات میں عام طور سے کہی جاتی ہے ـــــ افسوس ہے کہ صاحبِ مراسلہ نے، اپنے اس تاثر کے اظہار میں اس عاجز کے نزدیک بڑی بے احتیاطی اور دین کی خادم، ایک پوری جماعت کے حق میں سخت تعدی ہوئی ہے۔

اصل واقعہ اور حقیقت یہ ہے جس کو ہر وہ شخص جانتا ہے جو اس کام سے تعلق اور واقفیت رکھتا ہو کہ وہ حضرات دینی اصلاح کے ایک عوامی پروگرام کے طور پر جس کی صحت تجربہ سے معلوم ہو چکی ہے اس نظامِ عمل کی دعوت دیتے ہیں ـــــ ان کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ حقیقت جس کا نام ایمان ہے اور جس کے نتیجہ میں آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے اور زندگی ایمانی مبنی ہے مسلمانوں میں وہ مضمحل ہو چکی ہے، اللہ و رسول کے ساتھ تعلق انتہائی کمزور پڑ چکا ہے، بہت بڑی تعداد بلکہ غالب اکثریت اس حال میں ہے کہ عملی طور پر اس کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے، اور موجودہ ماحول و معاشرہ اس بیماری کے جراثیم سے بھرا ہوا ہے ـــــ وہ حضرات سمجھتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اس صورت حال کی اصلاح کا امت کے اکثر طبقات کے لیے ہمارے اس دور میں ایک ممکن العمل طریقہ یہ ہے کہ ہر طبقہ کے مسلمانوں کو

دعوت دی جائے اور اس کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ کچھ مدت تک ایسے ماحول و مشغلہ میں وقت گزاریں جو ایمانی کیفیت اور فکر آخرت پیدا کرنے کے لیے سازگار اور ان کے اندر احساس و طلب پیدا کرنے میں مددگار ہو اور اس میں اسلامی زندگی کی مشق ہو اور دین کے لیے محنت و قربانی کی عادت پڑے (جس کے رواج کے مٹ جانے کو ہماری دینی بربادی میں بڑا دخل ہے) اس کو عملی شکل دینے کے لیے وہ ایک کورس اور نصاب کے طور پر یہ بتاتے ہیں کہ آدمی ایک دفعہ تو اس مقصد کے لیے پورے ۴ مہینے لگائے اور اس پوری مدت میں اپنے ہم مقصد ساتھیوں کے ساتھ ان چار مہینوں کے دن رات مقررہ پابندیوں کے ساتھ اس پروگرام کے مطابق پورا کرے جو تبلیغی جماعتوں کو بتایا جاتا ہے ـــــ اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ اس مدت میں زندگی میں تبدیلی کی بنیاد انشاء اللہ پڑ جائے گی اور آخرت کی اور اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو جائے گی، خدا نے چاہا تو اللہ و رسول سے اور دین سے تعلق اور طاعت کا شوق بڑھ جائے گا۔ نماز و دعا وغیرہ عبادات کا کچھ ذوق پیدا ہو جائے گا۔ اور استعداد و صلاحیت کے مطابق مزاج کسی درجہ کا دینی بن جائے گا ـــــ پھر اس کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لیے اللہ کا وہ بندہ یہ معمول بنا لے کہ ہر مہینہ میں تین دن اور سال میں ایک دفعہ مسلسل چالیس دن اس پروگرام کے مطابق جماعت کے ساتھ لگایا کرے ـــــ یہ سب کچھ تو دراصل خود اپنی اصلاح کے لیے اور اپنی آخرت بنانے کے لیے ہے، لیکن چوں کہ دوسروں کو اس کام کی دعوت اور اُن کو بھی اس راہ پر لگانے کے لیے محنت کرنا اس پروگرام کا خاص جزو ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مشیت کے مطابق یہ خیر متعدی بھی ہوتا رہے گا اور دیئے سے دیا جلتا چلا جائے گا۔ (اور اس کام کے اسی جزو کی وجہ سے اس کا نام تبلیغ پڑ گیا ہے)

یہ عاجز تو قریباً ۲۷۔۲۸ سال سے (حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے آخری دورِ حیات سے اس وقت تک) اس کام کے داعیوں سے الفاظ و تعبیر اور اجمال و تفصیل کے اختلاف کے ساتھ یہی سُن رہا ہے اور ان کی باتوں سے یہی سمجھا ہے کہ جو مقصد ہے وہ تو نصوص قرآن و حدیث کا شدید مطالبہ اور اہم دینی فریضہ ہے (یعنی اپنے اندر ایمان اور فکرِ آخرت پیدا کرنے اور زندگی کو اسلامی بنانے کی کوشش کرنا اور اللہ و رسول سے ٹوٹا ہوا تعلق جوڑنا) اور جو عملی پروگرام اور طریق کار ہے جس کی دعوت دی جاتی ہے۔ وہ اس کے لیے ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کی صحت تجربہ نے ثابت کر دی ہے۔

یہ بالکل وہی بات ہوئی کہ سلوک و تصوف کا جو اصل مقصد ہے یعنی کبر و ریا جیسے مہلک رذائل

کا ازالہ اور اللہ کی محبت اور خشیت جیسے ملکات کی تحصیل یہ تو بلاشبہ فرائضِ دینی میں سے ہے، لیکن اس کے لیے مشائخ طریقت جو عملی پروگرام یعنی مخصوص اذکار و اشغال وغیرہ بتلاتے ہیں اور جس قسم کی پابندیاں طالب و سالک کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں وہ اس مقصد کے لیے بس ذرائع اور وسائل ہیں جن کی بنیاد بس تجربہ پر ہے ـــــ یہی نوعیت اس تبلیغی کام کے عملی نظام اور پروگرام کی بھی ہے ـــــ اور ظاہر ہے کہ اس کی ساری بنیاد اس پر ہے کہ لوگ وقت لگانے کے لیے آمادہ ہوں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ اس کام کے داعی حضرات اپنے اجتماعات میں مخاطبین سے اس کے لیے بڑا اصرار کرتے ہیں جو بہت سے لوگوں کو گراں گزرتا ہے۔

لیکن خدارا سوچنے کی بات ہے کہ یہ اصرار وہ کس مقصد کے لیے کرتے ہیں، کیا ان لوگوں سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں؟ سب جانتے ہیں کہ وہ ان سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے۔ اس اصرار میں لذتِ نفس کا بھی کوئی سامان نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پورے نظام میں چندہ، رکنیت اور ممبری کا سسٹم بھی نہیں کہ کثرت سے لوگوں کو شامل کر کے تعداد بڑھانا مقصود ہو ـــــ صرف ان کے بھلے کے لیے اور خاص کر انکی اُخروی فلاح کے لیے اصرار کرتے ہیں اور اُن سے دین کی راہ میں کچھ قربانی کرانا چاہتے ہیں۔

اس کے باوجود راقم سطور کو یہ اعتراف ہے کہ بسا اوقات یہ اصرار حد سے متجاوز ہو جاتا ہے جو حکمتِ دعوت کے بھی خلاف ہوتا ہے اور بہت سے لوگوں کے لیے وحشت اور بُعد کا سبب بن جاتا ہے اس لیے اس کی اصلاح بہرحال ضروری ہے۔

ایک اور چیز جو بہت زیادہ توجہ طلب اور اصلاح طلب ہو گئی ہے یہ ہے کہ باوجودیکہ اصل دعوت اپنے اندر اور اُمتِ محمدیہ کے عام افراد کے اندر ایمان اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کی دعوت ہے جس کی بنیاد کتاب و سنّت کے محکمات و بیّنات پر ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ بعض داعی حضرات بالکل بے ضرورت ایسے نکات اور نوادر بیان کرتے ہیں جن سے بہت سے اہلِ علم کو اختلاف ہو سکتا ہے، پھر جب دوم اور سوم درجہ کے وہ داعی اور مقرر جو بے چارے خود علمِ دین کا سرمایہ بھی نہیں رکھتے ان حضرات کی نقل و پیروی میں وہی باتیں اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں تو بعض اوقات وہ سخت قابلِ اعتراض ہو جاتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ تقریروں میں دور از کار نکات و دقائق اور نوادر کے بیان سے احتراز کیا جائے اس کے لیے اس تبلیغی کام کے اس وقت کے سب سے بڑے ذمہ دار مولانا انعام الحسن صاحب کی تقریریں بہترین مثال

اور قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ ان کی زبان سے آج تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں سنا گیا جس سے کسی صاحبِ علم کو اس طرح کے اختلاف کی گنجائش ہو۔

مراسلہ نگار نے ایک شکایت یہ بھی فرمائی ہے کہ "اب تو کھل کر ہر تقریر میں تبلیغ میں نکلنے کے استدلال میں جہاد کی آیات پڑھی جارہی ہیں اور اس تبلیغ سے تعلق نہ رکھنے والوں کو جہاد سے گریز کرنے والوں کی وعیدیں سنائی جارہی ہیں۔"

مراسلہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ مراسلہ خود بھی صاحبِ علم ہیں۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو وہ خود ہی تھوڑے سے غور و مطالعہ سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ "جہاد" اور "جہاد فی سبیل اللہ" کا لفظ جو قرآن مجید میں جابجا استعمال ہوا ہے اسکے معنی ہیں دین کی راہ میں اور اللہ کی رضا کے لیے امکانی جدوجہد" ——— اور حالات و امکانات اور وقتی تقاضوں کے لحاظ سے اس کی مختلف شکلیں ہوں گی۔ بلاشبہ جہاد بالسیف اس کی ایک اعلیٰ شکل ہے اور قرآن مجید کی بعض آیات کا مضمون اور سیاق و سباق متعین کر دیتا ہے کہ ان میں لفظ جہاد سے مراد جہاد بالسیف ہے ——— اور بعض آیات کا مضمون متعین کر دیتا ہے کہ یہاں جہاد کے لفظ سے ہرگز جہاد بالسیف مراد نہیں ہے، بلکہ دین کی راہ میں اور حکمِ الٰہی کی تعمیل میں جدوجہد اور مشقت مراد ہے۔ مثلاً سورۂ الفرقان میں فرمایا گیا ہے:

وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۝ اے پیغمبر! تم اس قرآن کے ذریعہ ان منکرین سے "جہاد کبیر" (بڑا جہاد) کرو

ظاہر ہے کہ اس آیت میں قرآن پاک کے ذریعہ جس جہاد کا حکم دیا گیا ہے اُس سے مراد دین کی دعوت کی جدوجہد ہے۔ یہ معلوم و مسلم ہے کہ سورۂ فرقان از اول تا آخر مکّی ہے اور مکّی زندگی میں جہاد بالسیف کی اجازت بھی نہیں آئی تھی۔

اور بعض آیات وہ ہیں جن میں غور کرنے سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان میں جہاد کا استعمال اسکے اصل وسیع معنی میں ہوا ہے۔ یعنی دین کی نصرت کے لیے یا خود اپنی ایمانی ترقی کے لیے امکانی جدوجہد اور جان و مال اور عیش و راحت وغیرہ کی قربانی ——— تو جس وقت دین کی نصرت اور حالات کا تقاضا جہاد بالسیف کے لیے ہو اور اس کا میدان سامنے ہو تو ان آیات کا مطالبہ اہلِ ایمان سے جہاد بالسیف کا

ہوگا۔ اور جس وقت حالات یہ ہوں کہ نہ جہاد بالسیف کے امکانات ہوں نہ کوئی میدان ہو اور مسلمان خود حقیقتِ ایمان سے محروم اور دین سے دور ہوتے جارہے ہوں اور خدا فراموشی اور دنیا پرستی کی تیز آندھیاں ان کو روز بروز دور تر کررہی ہوں اور خود ان بیچاروں میں اس کا کوئی احساس اور کوئی فکر نہ ہو اور اصلاحِ حال کی کوئی صورت اس کے سوا نظر نہ آتی ہو کہ اللہ کے بندے اپنے اوقات اور اپنے دنیاوی مشاغل اور اپنے آرام و راحت کو کچھ قربان کرکے ان میں محنت کریں، اور رضاکارانہ طور پر اس راستہ کی تکلیفیں اٹھائیں، مصارف برداشت کریں اور اس طرح خود اپنی ایمانی ترقی اور رضاءِ الٰہی حاصل کرنے کا بھی سامان کریں، تو ان آیات کا تقاضا اسی جہاد کا ہوگا۔ اور اخلاص کے ساتھ یہ کام کرنا (خواہ وہ کسی بھی صحیح طریقہ پر ہو اور اس کا کوئی بھی پروگرام ہو) بلاشبہ ان آیات کے مطالبۂ جہاد کی تعمیل کرنا ہوگا اور یقیناً یہ مخلصین اُس اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے جس کا ان آیات میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اور امکان و استطاعت کے باوجود بغیر کسی عذرِ شرعی کے اُمت کے اس اہم مسئلہ کی طرف سے بے پروا رہنے والوں اور بس اپنے حال مست رہنے والوں کو ان وعیدوں سے ڈرنا چاہیے جو ان آیات میں سنائی گئی ہیں۔

مندرجہ ذیل آیات کو اس کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله وابتغوا إليه الوسيلة وجاهدوا في سبيله لعلكم تفلحون ○ (المائدہ آیت ۳۵)

وجاهدوا في الله حق جهاده. هو اجتباكم وما جعل عليكم في الدين من حرج..... الآية (الحج آیت ۷۸)

اگر استیعاب کا ارادہ کیا جائے تو اس نوع کی آیتیں بھی قرآن مجید میں اچھی خاصی تعداد میں نکل آئیں گی ـــ تو ان آیات کے متعلق بھی یہ سمجھنا کہ ان کا تعلق جہاد بالسیف سے ہے، اور موجودہ حالات میں ان کا ہم سے کوئی مطالبہ نہیں ہے اپنے کو اور اُمت کو بڑی سعادت سے محروم کردینے والی غلطی ہو۔ حدیث پاک میں تو اُس بندہ کو بھی "مجاہد" قرار دیا گیا ہے جو اللہ کی رضا اور اپنی دینی اصلاح کے لیے اپنی خواہشاتِ نفس کا مقابلہ کرے۔ فرمایا گیا ہے۔ "المجاهد من جاهد نفسه"۔

حضرت مولانا سید محمود صاحب مدنیؒ

مدینہ طیبہ کی تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے حقیقی چھوٹے بھائی مولانا سید محمود صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۴ر ربیع الثانی کو مدینہ طیبہ میں وفات پائی اور اپنی خواہش و تمنا کے مطابق جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقش حیات" میں اپنے والد ماجدؒ کے عزم ہجرت اور پھر سفر ہجرت کا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے، نیز اپنے بڑے اور چھوٹے بھائیوں کے اس وقت کے حالات بھی خاصی تفصیل سے لکھے ہیں۔

مولانا سید محمود صاحب مرحوم سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ والد صاحب کی ہجرت کے وقت ان کی عمر بہت کم تھی اس لیے ان کی نشو ونما اور تعلیم بھی مدینہ طیبہ ہی میں ہوئی۔ یہ ترکی حکومت کا زمانہ تھا اور سرکاری زبان ترکی تھی۔ انھوں نے دینی تعلیم کے علاوہ ترکی زبان میں بھی مہارت حاصل کی اسکے بعد اچھے سرکاری عہدوں پر بھی رہے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے آخری دور میں جس وقت ترکی حکومت کا حجاز مقدس سے خاتمہ ہوا اس وقت مولانا موصوف جدہ میں محکمۂ قضا کے افسر اعلیٰ یعنی جج تھے ـــــ پھر شریف حسین کی چند روزہ حکومت کے بعد جب حجاز مقدس سعودی حکومت کے زیر اقتدار آگیا تو آپ مدینہ طیبہ ہی میں مقیم ہو گئے اور گزر بسر کے لیے کچھ کاروبار شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت عطا فرمائی اور آپ مدینہ طیبہ کے درجۂ اول کے رؤسا میں شمار ہونے لگے۔ حکومت میں بھی آپ کا بڑا اعزاز اور رسوخ تھا۔ آپ کے صاحبزادے سید حبیب صاحب آج بھی گورنر مدینہ کے معتمد اور مشیر خصوصی ہیں۔

مولانا سید محمود صاحب کی اس عاجز کے نزدیک سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ حجاز مقدس کے گذشتہ قریباً ستر برس کی وہ زندہ تاریخ تھے۔ انھوں نے وہ دور بھی خوب دیکھا اور برتا جب حجاز مقدس میں ترکی حکومت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھی ـــــ پھر پہلی جنگ عظیم میں شریف حسین کی غداری کے نتیجہ میں حجاز مقدس اور خاص کر اہل مدینہ پر جو مصائب آئے وہ ان سے بھی گزرے۔ پھر شریف حسین کی چند روزہ حکومت بھی دیکھی، پھر ابن سعود کی آمد اور شریف کو شکست دے کر سعودی نجدی حکومت کا اپنی خصوصیات کے ساتھ قیام بھی دیکھا۔ اس کا وہ ابتدائی دور بھی دیکھا جب حاجیوں سے وصول ہونے والا ٹیکس ہی

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

کتابُ المُعاشِرۃ والمُعاملات

معارفُ الحدیث

(مُسلسل)

مشروبات کے احکام — (۲)

اسی عنوان کے تحت وہ احادیث اس سے پہلی قسط میں پیش کی جاچکی ہیں جن میں شراب کی حُرمت اور اس کے بارے میں شریعتِ الٰہی کا نقطۂ نظر اور شرابیوں کے لیے سخت ترین وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ کی بقیہ حدیثیں اس قسط میں درج کی جارہی ہیں۔

ہر نشہ آور چیز حرام ہے :-

عَنْ اَبِیْ مُوسیٰ قَالَ بعثنی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمعَاذاً اِلَی الْیَمَن فَقَالَ اُدْعُوا النَّاسِ وَبَشِّرا وَلَا تنفرا ویسرا وَلَا تعسّرا قَالَ فَقُلْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ افتنا فی شرابین کنا نصنعہما بالیمن البتع وھو من العسل ینبذ حتی یشتد والمزر وھو من الذرۃ والشعیر ینبذ حتی یشتد قَالَ وکان رَسُوْلُ اللّٰہ صلی اللّٰہُ عَلَیْہِ وسَلَّمَ قَدْ اُعطِیَ جوامع الکلم بخواتمہ فقال انھیٰ عن کل مسکر اسکر عن الصّلوٰۃ　——— (رواہ البخاری ومسلم واللفظ لہ)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے (دعوت و تبلیغ اور دوسرے دینی مقاصد کے لیے) مجھے اور معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا اور ہم لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ لوگوں کو دین حق کی دعوت دینا اور اُن کو (خوش انجامی کی) بشارتیں سنانا اور اُن سے ایسی باتیں نہ کرنا جن سے وہ دور بھاگیں اور اُن کو وحشت ہو، نیز لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، اُن کو مشکلات میں نہ ڈالنا! — ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ہمیں دو شرابوں کے بارے میں شریعت کا حکم بتا دیجئے جو ہم یمن میں بنایا کرتے تھے (یعنی وہاں اُن کے پینے کا عام رواج تھا) ایک وہ جسے بِتع کہا جاتا ہے (وہ شہد سے بنائی جاتی ہے (مقررہ حساب سے) شہد میں پانی ملا کر چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس میں جوش آجائے۔ اور دوسری وہ شراب جسے مِزر کہا جاتا ہے، اور وہ جینار اور جو سے بنائی جاتی ہے، اُسے بھی پانی میں چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس میں جوش پیدا ہو جائے، (الغرض ان دو شرابوں کے بارے میں ابوموسیٰ اشعری نے شرعی حکم دریافت کیا۔) ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "جوامع الکلم اور خواتم الکلم" کی نعمت عطا فرمائی تھی، یعنی آپ کو اس کی خاص صلاحیت بخشی تھی کہ (بہت مختصر الفاظ میں) انتہائی جامع، مانع اور فیصلہ کن بات فرما دیتے تھے (چنانچہ آپ نے میرے سوال کے جواب میں) ارشاد فرمایا۔ "اَنْهٰى عَنْ كُلِّ مُسْكِرٍ اَسْكَرَ عَنِ الصَّلٰوةِ" (میں ہر اُس چیز کی ممانعت کرتا ہوں جو نشہ آور ہو اور نماز سے آدمی کو غافل کر دے) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) اس حدیث سے بطور قاعدہ کلیہ کے معلوم ہو گیا کہ جس چیز کے کھانے پینے سے نشہ پیدا ہو اور نماز جیسی چیز سے غفلت ہو جائے وہ شریعتِ اسلام میں ممنوع اور ناجائز ہے — اس سے بھنگ وغیرہ اُن تمام نباتات کا حکم بھی معلوم ہو گیا جو نشہ پیدا کرتی ہیں اور نشہ ہی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

اُمت کی شراب نوشی کے بارے میں ایک پیشین گوئی:-

شراب کی حرمت کے بارے میں شریعتِ اسلام کا جو بے لاگ فیصلہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے اس سے متعلق جو سخت ترین رویہ اختیار فرمایا، وہ مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہو چکا ہے، لیکن آپ پر یہ منکشف کیا گیا تھا کہ شریعت کے ان واضح احکام اور آپ کے اس سخت رویہ کے باوجود آپ کی امت کے کچھ غلط کار لوگ شراب پئیں گے اور اپنے بچاؤ کے لیے بطور حیلہ کے اس شراب کا کوئی اور نام رکھیں گے اور اس نام کی تبدیلی سے دوسروں کو یا خود کو فریب دینا چاہیں گے، حالانکہ صرف نام بدل دینے سے حقیقت نہیں بدلتی اور شریعت کا حکم بھی نہیں بدلتا اس لیے خدا کے نزدیک وہ شراب نوشی کے مجرم ہوں گے اور نام بدلنے کا فریب ان کا دوسرا جرم ہوگا۔

عَنْ اَبِي مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِنْ اُمَّتِيَ الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا

ـــــــ رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا آپ ارشاد فرماتے تھے کہ میری امت میں سے کچھ لوگ شراب پئیں گے اور (از راہ فریب) اس کا کوئی دوسرا نام رکھیں گے۔

(سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

شراب کے سلسلہ میں کچھ سخت ہنگامی احکام :-

یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ جب سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد شراب کی قطعی حرمت کا اعلان کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں بعض ایسے سخت ہنگامی احکام بھی جاری فرمائے جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ اہل ایمان کے دلوں میں اس ام الخبائث سے سخت نفرت پیدا ہو جائے اور پرانی عادت کبھی اس کی طرف میلان اور رغبت پیدا نہ کر سکے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی حدیثیں پڑھی جائیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُزَفَّتِ وَالنَّقِيْرِ وَاَمَرَ اَنْ يُّنْبَذَ فِيْ اَسْقِيَةِ الْاَدَمِ۔

ـــــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ دُبّا، یا حنتم، یا مزفّت یا نقیر میں نبیذ بنائی جائے، اور حکم دیا کہ بس چمڑے کے مشکیزوں میں نبیذ بنائی جائے　(صحیح مسلم)

(تشریح) کھجور یا منقّی یا انگور یا اس طرح کی کوئی چیز پانی میں ڈال دی جائے اور اتنی دیر پڑی رہے کہ اس کا ذائقہ اور شیرینی پانی میں آجائے اور نشہ کی کیفیت پیدا نہ ہو تو اُس کو نبیذ کہتے ہیں۔ عربوں میں اس کا بھی رواج تھا اور جیسا کہ آگے آنے والی بعض حدیثوں سے معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کو نوش فرماتے تھے ___ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں چار قسم کے جن برتنوں میں نبیذ بنانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے، یہ عام طور سے شراب بنانے میں استعمال ہوتے تھے ___ دُبّا، کدو کی تونبی ہوتی تھی، حنتم اور مزفّت یہ خاص طرح کی ٹھلیاں ہوتی تھیں، اور نقیر کھجور کی لکڑی سے بنا ہوا ایک برتن ہوتا تھا ___ بہر حال یہ چاروں قسم کے برتن عام طور سے شراب میں استعمال ہوتے تھے، جب شراب کی قطعی حرمت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے بھی منع فرما دیا ___ غالباً اس ممانعت کا مقصد یہ تھا کہ یہ برتن شراب کو یاد دلا کر دل میں اس کی طلب اور خواہش پیدا نہ کریں، ___ پھر جب شراب کی نفرت پوری طرح دلوں میں جاگزیں ہوگئی اور اس کا اندیشہ باقی نہیں رہا کہ یہ برتن شراب کو یاد دلا کر اس کی طلب اور خواہش پیدا کریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان برتنوں کے استعمال کی اجازت دے دی جیسا کہ آگے درج ہونے والی حدیث میں صراحةً مذکور ہے۔

عَنْ بُرَيْدَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَهَيْتُكُمْ عَنِ الظُّرُوفِ فَإِنَّ ظَرْفًا لَا يُحِلُّ شَيْئًا وَلَا يُحَرِّمُهُ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ ___ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ نَهَيْتُكُمْ عَنِ الْأَشْرِبَةِ إِلَّا فِي ظُرُوفِ الْأَدَمِ فَاشْرَبُوا فِي كُلِّ وِعَاءٍ غَيْرَ أَنْ لَا تَشْرَبُوا مُسْكِرًا ___ رواہ مسلم

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم کو کچھ برتنوں کے استعمال سے منع کر دیا تھا (اب میں اس کی اجازت دیتا

ہوں، کیونکہ صرف برتن کی وجہ سے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ہو جاتی ـــ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ، ہر نشہ آور چیز حرام ہے (لہٰذا اس سے بچو) ـــ اور یہی حدیث اس طرح بھی روایت کی گئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "میں نے تم کو منع کیا تھا کہ چمڑے کے برتنوں (مشکیزوں) کے سوا کوئی اور برتن استعمال نہ کرو، (اب میں اجازت دیتا ہوں کہ) ہر قسم کے برتن میں پی سکتے ہو، لیکن کوئی نشہ پیدا کرنے والی چیز ہرگز نہ پی جائے۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے یہ بات واضح طور سے معلوم ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی قطعی حرمت نازل ہو جانے کے بعد اس کے بارہ میں کچھ زیادہ سخت احکام مذکورۂ بالا مصلحت سے وقتی اور عارضی طور پر بھی دیئے تھے جو بعد میں واپس لے لیے گئے۔

عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنْ خَلِیْطِ التَّمْرِ وَالْبُسْرِ وَعَنْ خَلِیْطِ الزَّبِیْبِ وَالتَّمْرِ وَعَنْ خَلِیْطِ الزَّھْوِ وَالرُّطَبِ وَقَالَ اِنْتَبِذُوْا کُلَّ وَاحِدَةٍ عَلٰحِدَةٍ ـــ رواہ مسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا (نبیذ بنانے کے لیے) پکی خشک کھجوروں اور ادھ پکی کھجوروں کے ملانے سے، اور اسی طرح خشک انگور اور پکی خشک کھجوروں کے ملانے سے، اور کچی کھجوروں اور پکی تازہ کھجوروں کے ملانے سے اور ارشاد فرمایا کہ ان سب چیزوں کی علیحدہ علیحدہ نبیذ بنایا کرو۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں جن مختلف چیزوں کو باہم ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا گیا ہے اُن کو ملا کر پانی میں ڈالنے سے نشہ کی کیفیت جلدی پیدا ہو جانے کا امکان ہوتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور احتیاط کے یہ ممانعت فرمائی تھی اور حکم دیا تھا کہ ان چیزوں کی نبیذ علیحدہ علیحدہ ہی بنائی جائے۔ اور غالباً یہ حکم بھی آپ نے اسی زمانہ میں دیا تھا جبکہ شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا تھا۔ اور آپ اُمت کی تربیت کے لیے اس بارہ میں ایسے سخت احکام بھی دے رہے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ اہل ایمان شراب اور نشہ کے ادنیٰ

شبہ سے بھی نفرت کرنے لگیں ___ لیکن جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو پھر وہ سخت احکام واپس لے لیے گئے جو اس مقصد کے لیے ہنگامی طور پر دیے گئے تھے۔ آگے درج ہونے والی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خشک انگور اور کھجوریں پانی میں ساتھ ڈال کر نبیذ تیار کی جاتی تھی اور آپ نوش فرماتے تھے۔

نبیذ حلال طیب ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعمال فرماتے تھے:۔

عَنْ عَائِشَةَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُنْبَذُ لَهٗ زَبِيْبٌ فَيُلْقٰى فِيْهِ تَمْرٌ اَوْ تَمْرٌ فَيُلْقٰى فِيْهِ زَبِيْبٌ ___ رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خشک انگوروں سے نبیذ بنائی جاتی تھی اور اس میں کھجوریں بھی ڈال دی جاتی تھیں، یا کھجوروں سے نبیذ بنائی جاتی تھی اور اس میں خشک انگور بھی ڈال دیے جاتے تھے (سنن ابی داؤد)

تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انگور اور کھجور وغیرہ مخلوط اجناس کی نبیذ بھی جائز ہے ہاں اس کی شدید احتیاط ضروری ہے کہ اس میں نشہ کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے نبیذ بنانے کے لیے ہم پانی میں کھجوریں وغیرہ شام کو ڈال دیتے تھے جس کو آپ صبح کو نوش فرما لیتے تھے اور پھر ہم شام کے واسطے اسی طرح صبح کو ڈال دیتے تھے اور اس کو آپ شام کے وقت نوش فرما لیتے تھے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَقَدْ سَقَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَدَحِيْ هٰذَا الشَّرَابَ كُلَّهٗ الْعَسَلَ وَالنَّبِيْذَ وَالْمَاءَ وَاللَّبَنَ ___ رواہ مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے (اپنے ایک پیالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہا کہ میں نے اس پیالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پینے والی سب چیزیں پلائی ہیں، شہد بھی، نبیذ بھی، پانی بھی اور دودھ بھی۔ (صحیح مسلم)

تشریح) ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبیذ استعمال فرماتے تھے اور آپ کے واسطے اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈا میٹھا مرغوب تھا:۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ اَحَبَّ الشَّرَابِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحُلْوُ الْبَارِدُ ـــــــ رواہ الترمذی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے. فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پینے میں ٹھنڈا میٹھا محبوب و مرغوب تھا۔ (جامع ترمذی)

حضورؐ کے لیے میٹھے پانی کا اہتمام :۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْتَعْذَبُ لَهُ الْمَاءُ مِنْ بُيُوتِ السُّقْيَا۔ (قَالَ قُتَيْبَةُ عَيْنٌ بَيْنَهَا وَبَيْنَ الْمَدِيْنَةِ يَوْمَانِ) ـــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "بیوت سُقیا" سے میٹھا پانی لایا جاتا تھا ــــ امام ابوداؤد کے استاذ قتیبہ جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں. اُن کا بیان ہے کہ یہ مقام (بیوت سُقیا) جہاں سے حضورؐ کے لیے یہ میٹھا پانی لایا جاتا تھا مدینہ سے دو دن کی مسافت پر تھا۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح) ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ مشروبات میں ٹھنڈے میٹھے کی رغبت، یا اسی طرح کھانے پینے کی کسی اچھی چیز کی رغبت جو فطرتِ سلیم کا تقاضہ ہے مقامِ زہد کے منافی نہیں ہے۔ اور للّٰہی تعلق و محبت کی بناء پر اس کا اہتمام کرنا سعادت ہے۔

حضرت عمرؓ کی سیاسی اصلاحات

(از مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۲)

(۹) حضرت عمرؓ نے افسر اعلیٰ مقرر کرتے وقت اس کے مال اور اسباب کی مفصل فہرست تیار کر کے دفتر میں محفوظ رکھنے کا حکم دیا پھر اگر اس کی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتے ہوئے دیکھا تو اس سے مواخذہ کیا۔

کان عمر بن الخطاب یکتب اموال عمالہ اذ ولاھم ثم یقاسمھم ما زاد علی ذالک[۱]

حضرت عمرؓ جب کسی کو حاکم اعلیٰ مقرر کرتے تو اس کے اموال کی فہرست تیار کرتے پھر جو اس سے زیادہ ہوتا اس میں سے بیت المال کا حصہ لے لیتے تھے۔

(۱۰) حضرت عمرؓ نے حکومت کا انتظام چلانے کے لیے قدیم سلطنتوں اور حکمرانوں کے انتظامات و قوانین سے کافی استفادہ کیا اور جس کی جو چیز دیکھی اس کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کیا چنانچہ عشور، خراج، دفتر اور رسد وغیرہ میں ایران و شام کے قوانین کو سامنے رکھا جیسا کہ طبری نے نوشیرواں کے انتظامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وھی الوضائع التی اقتدیٰ بھا عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد الفرس[۲]

یہ وہ قواعد ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جب ایران فتح کیا تو ان پر عمل کیا۔

---

[۱] فتوح البلدان　[۲] تاریخ کبیر طبری صـ ۲۶۳

علامہ ابن مسکویہ نے لکھا ہے۔

وکان عمر یکثر الخلوۃ بقوم من الفرس یقرؤن علیہ سیاسات الملوک ولاسیما ملوک العجم وسیما انوشیروان فانہ کان معجبا بھا کثیر الاقتداء بھا [1]	حضرت عمرؓ فارس (ایران) کے چند لوگوں کو اپنے پاس رکھتے تھے جو بادشاہوں کے آئین حکومت سے انھیں واقف کراتے تھے خصوصاً شاہان عجم کے اور ان میں بھی خاص طور پر نوشیرواں کے آئین پیروی کے لیے ان کو بہت پسند تھے۔

ایران کا رئیس "ہرمزان" جب اسلام لایا تو حضرت عمرؓ نے اس کو اپنے خاص لوگوں میں اس لیے داخل کیا تاکہ ملکی انتظامات سے متعلق مشورہ لینے میں سہولت ہو۔ اسی طرح عراق کے بندوبست کا وقت آیا تو خلیفہؓ اور عثمان بن حنیف کو لکھا کہ عراق کے دو بڑے زمینداروں کو میرے پاس بھیجدو بالآخر یہ زمیندار مترجم کے ساتھ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور انھوں نے مالگزاری سے متعلق امور دریافت کیے[2]۔

(۱۱) حضرت عمرؓ نے حکومت کا انتظام چلانے کے لیے خفیہ محکمہ قائم کیا تاکہ کوئی اہم بات ان کی نظروں سے مخفی نہ رہنے پائے۔

وکان عمر لا یخفی علیہ شئ فی عملہ [3]	عمرؓ پر کوئی بات مخفی نہ رہتی تھی۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ افسران وعہدیداران ان کے مشورہ کے بغیر کوئی اہم قدم نہ اٹھا سکتے تھے[4]

(۱۲) حضرت عمرؓ نے بیت المال کا دائرہ وسیع کرکے کوئی رقم اس سے باہر نہ ہونے دی۔ چنانچہ خانہ کعبہ میں مدت کا پڑا ہوا جمع تھا اس کے بارے میں فرمایا:

لقد ھممت ان لا ادع فیھا صفرا ولا بیضاء الا قسمتہ [5]	میں نے ارادہ کیا ہے کہ جو کچھ اس میں سونا چاندی ہے سب کو لوگوں میں تقسیم کردوں۔

ایک مرتبہ ام کلثوم (حضرت عمرؓ کی زوجہ) نے قیصر کی بیوی کے پاس بطور تحفہ عطر کی چند شیشیاں بھیجیں۔ اس نے شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر واپس کیا جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی

۱؎ تجارب الامم از الفاروق جلد ۲ صفحہ ۱۹ ۲؎ کتاب الخراج ص ۲۱ ۳؎ تاریخ طبری ص ۲۵۲۶ ۴؎ طبری ص ۲۴۸۶ ۵؎ بخاری باب کسوۃ الکعبہ

تو انھوں نے فرمایا کہ "عطر اگرچہ تمہارا تھا لیکن جو آدمی لے کر گیا تھا وہ سرکاری تھا اور اس کے مصارف بھی سرکاری خزانہ سے ادا کیے گئے تھے۔ اس بنا پر وہ جواہرات سرکاری خزانہ کے ہیں پھر ام کلثوم کو کچھ معمولی معاوضہ دیکر جواہرات خزانہ میں داخل کر لیے[۱]۔

(۱۳) حضرت عمرؓ نے حالات کی مناسبت سے ہر ملک کو قابو میں رکھنے کے لیے الگ الگ انتظامات کیے اور کسی ایک انتظام میں اپنے آپ کو پابند نہیں بنایا چنانچہ عراق و ایران فتح ہونے کے بعد وہاں کے زمینداروں اور سرداروں کی سیاسی تنخواہیں مقرر کیں۔ شام و مصر کے لوگوں کے ساتھ دوسرے قسم کے فیاضانہ سلوک کیے۔ اور عرب میں سیاسی لوگوں کو عہدہ دیکر اور افسران کا تبادلہ کر کے لوگوں کو قابو میں رکھا۔

(۱۴) حضرت عمرؓ نے عملاً معاشرتی امتیازات ختم کر کے اصول مساوات کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا چنانچہ حج کے زمانہ میں ایک مرتبہ ملک کے اونچے عہدیداروں کو طلب کر کے عام مجمع میں اعلان کیا کہ جس کو ان لوگوں سے شکایت ہو وہ آکر پیش کرے۔ ایک شخص نے کہا کہ فلاں گورنر (عامل) نے بلا وجہ مجھ کو سو کوڑے مارے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اٹھ کر اس سے بدلہ لے لو"۔ اس پر عمرو بن العاص (گورنر) نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ اس طرح افسران بددل ہو جائیں گے اور کوئی عہدہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "میں بدلہ ضرور دلواؤں گا"۔ بالآخر عمرو بن العاصؓ نے مدعی کو دو سو دینار دے کر دعویٰ واپس کرا دیا[۲]۔

حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس سہیل بن عمر و حارث بن ہشام "ابو سفیان بن حرب اور قریش کے دوسرے رؤسا حاضر ہوئے۔ صہیب، بلالؓ اور دوسرے آزاد شدہ غلام بھی آئے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ثانی الذکر کو اجازت دی اور اول الذکر کو چھوڑ دیا اس پر ابو سفیانؓ نے کہا۔

لم ار کالیوم قط یاذن ھولاء العبید	ایسا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان غلاموں
وبترکنا علی بابہ لا یلتفت	کو اجازت ملتی ہے اور ہم دروازہ پر کھڑے
الینا۔	رہتے ہیں۔ ہماری طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی۔

---

[۱] الفاروق ج ۲ ص ۱۹۳ [۲] کتاب الخراج۔

سہیل رض زیادہ سمجھدار تھے۔ انھوں نے جواب دیا۔

ایھا القوم اِنی واللہ لقد اری الذی فی وجوھکم ان کنتم غضبانا فاغضبوا علیٰ انفسکم دعی القوم ودعیتم فاسرعوا وابطأتم فکیف بکم اذا دعوا یوم القیمۃ وترکتم لہ

اے لوگو۔ میں تمھارے چہروں کی ناگواری دیکھ رہا ہوں۔ اگر تم غصہ کرتے ہو تو اپنے اوپر غصہ کرو۔ اسلام کی دعوت ان لوگوں کو بھی دی گئی اور تمھیں بھی دی گئی لیکن انھوں نے قبول کرنے میں جلدی کی اور تم لوگوں نے دیر کی اسوقت تمھارا کیا حال ہوگا جبکہ قیامت کے دن بھی یہ لوگ پہلے بلائے جائینگے اور تم چھوڑ دیے جاؤ گے۔

مکہ میں ایک دعوت کے موقع پر خدام کھانے میں شریک نہ ہوئے تو حضرت عمر رض نے پوچھا۔

مالی اری خدامکم لا یاکلون معکم اترغبون عنھم۔

"کیا بات ہے کہ ہم خدام کو کھانے میں شریک نہیں دیکھ رہے ہیں۔ کیا تم لوگ ان سے اعراض کرتے ہو۔"

صاحب خانہ نے جواب دیا:۔

ولکنا نستاثر علیھم۔

"ہم اپنے کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔"

اس پر حضرت عمر رض سخت ناراض ہوئے اور فرمایا:

"ما لقوم یستاثرون علیٰ خدامھم"

"اس قوم کا کیا حال ہوگا جس نے اپنے کو خدام پر ترجیح دی۔"

پھر خادموں کو کھانے کا حکم دیا اور خود نہیں کھایا۔

ثم قال للخدام اجلسوا فکلوا فقعد الخدام یاکلون ولم یاکل امیر المومنین ؎

پھر خادموں سے کہا کہ بیٹھو اور کھاؤ، خادم کھانے لگے اور امیر المومنین نے نہیں کھایا

لہ تاریخ عمر لابن جوزی الباب الثالث والثلثون صفحہ ؎ تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الثامن والثلثون صفحہ ۹۶

(۱۵) حضرت عمرؓ نے رفاہی حکومت قائم کی تھی جس سے نہ کسی فرد کو محروم ہونے دیا اور نہ کسی میں کاہلی اور مفت خوری کی عادت پیدا نہ ہونے دی۔ جیسا کہ اس کی تفصیلات "معاشی اصلاحات" میں ذکر ہو چکی ہیں۔

(۱۶) حضرت عمرؓ نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کیا اور علیحدگی کے بعد عدالت کے قواعد مقرر کیے۔ قاضیوں کے انتخاب کے طریقے وضع کیے اور ان کو حالات کے لحاظ سے خاص ہدایتیں دیتے رہے ۔۔۔ چنانچہ ابو موسیٰ اشعری گورنر کے نام فرمان میں صیغۂ عدالت کے یہ اصول درج ہیں۔

"اس معاملہ کو خوب سمجھ جس کے لیے تمہاری طرف رجوع کیا جائے۔ جس حق کا نفاذ نہ ہو، اس پر گفتگو نفع نہیں دیتی۔ اپنی مجلس اور اپنے فیصلہ میں لوگوں کو برابر رکھو تاکہ طاقتور تم سے بے انصافی کی توقع نہ رکھے اور کمزور تمہارے انصاف سے مایوس نہ ہو۔ مدعی کے ذمہ ثبوت ہے اور مدعا علیہ پر قسم ہے مسلمانوں کے درمیان صلح کی بڑی قیمت ہے بشرطیکہ وہ کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کر دے۔ جو شخص کسی غائب حق کا دعویٰ کرے یا غائب گواہ کا نام لے تو اس کو مہلت دو تاکہ اس تک پہونچ سکے۔ اگر حاضر کر دے تو اسکے حق میں فیصلہ کر دو اور اگر عاجز رہے تو اس کے خلاف ڈگری دیدو۔ یہ بات عذرداری میں زیادہ مناسب اور تاریکی کو زیادہ دور کرنے والی ہے۔ اگر تم نے آج کوئی فیصلہ کیا پھر حق واضح ہو گیا تو اس میں اپنی رائے سے رجوع کرنے اور نظر ثانی کرنے کا تمہیں اختیار ہے۔ بے شک حق قدیم ہے جس کو کوئی شئی باطل نہیں کر سکتی اور باطل میں پھنسنے سے حق بات کی طرف رجوع کرنا زیادہ بہتر ہے۔ مسلمان ثقہ ہیں ان میں بعض کی شہادت بعض کے لیے مقبول ہے۔ البتہ جن پر حد لگی ہو یا جھوٹی شہادت کے مجرم ہوں یا ولاء و وراثت میں خیانت کے متہم ہوں وہ مستثنیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خفیہ باتوں سے اعراض کیا ہے اور حدود سے پردہ پوشی کی ہے۔ اگر گواہ قائم ہوں تو علیحدہ بات ہے۔ تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ معاملات میں انتہائی سمجھ بوجھ سے کام لو۔ بالخصوص وہ معاملات جن کی قرآن و سنت میں صراحت نہیں ہے ایسی صورتوں میں امثال و نظائر کو تلاش کرو اور غور و فکر کے بعد ان پر قیاس کرو پھر تمہاری رائے میں جو بات اللہ کو زیادہ محبوب اور حق کے

زیادہ مشابہ ہو اس پر اعتماد کرو۔ غصہ ڈانٹ ڈپٹ اضطراب، لوگوں کی ایذا رسانی اور عدالت کے وقت لعنت ملامت سے پرہیز کرو۔ حق کے مواقع پر ٹھیک فیصلہ سے اللہ کے نزدیک اجر اور ذکر خیر کے مستحق ہو گے۔ حق کے معاملہ میں جس کی نیت خالص ہوئی اگر اس کے خلاف کوئی بات پیش آگئی تو اللہ کی اس کی مدد کرتا ہے اور جو شخص کسی ایسی بات سے اپنے کو مزین کرتا ہے جو اس کے اندر نہیں ہے تو اس کو اللہ عیب دار کر دیتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں سے خلوص ہی قبول کرتا ہے۔ خلوص پر دنیوی اور اخروی زندگی میں اللہ کے پاس جو اجر و رحمت کے خزانہ ہیں وہ بے شمار ہیں [۱]

(۱۷) حضرت عمرؓ نے اپنے خطوط و ہدایات میں صحت فہم و حسن نیت پر کافی زور دیا ہے گویا یہ دو بنیادی ستون ہیں جن پر عدلیہ کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں۔

صحة الفهم نور یقذفه الله فی قلب العبد یمیز به بین الصحیح والفاسد والحق والباطل والهدیٰ والضلال والغی والرشاد	صحت فہم ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے دل میں ڈالتا ہے اور جس کے ذریعہ صحیح و فاسد، حق و باطل ہدایت و ضلالت اور رشد و گمراہی میں تمیز ہوتی ہے۔

(۱۸) حضرت عمرؓ نے عدالت کے ججوں کی زیادہ تنخواہیں مقرر کیں اور حالات کے لحاظ سے یہ حکم دیا کہ جج دولت مند اور معزز شخص ہی کو بنایا جائے کیونکہ دولت مند سے رشوت نہ لینے کی زیادہ توقع تھی اور معزز سے مرعوب نہ ہونے کی زیادہ امید تھی [۲]

(۱۹) حضرت عمرؓ نے عدالت کا معیار اس حد تک بلند کیا کہ گھر والوں کے ساتھ رعایت کے بجائے مزید سختی کا برتاؤ کیا چنانچہ ان کا دستور تھا کہ

اذا نهی الناس عن شیٔ جمع اهله فقال انی قد نهیت عن کذا وکذا	جب لوگوں کو کسی چیز سے روکتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے فرماتے کہ میں نے فلاں

---

[۱] اعلام الموقعین ج۱ رسالۃ عمر الی ابی موسیٰ ص۹۹ [۲] ایضاً فصل النوع الرابع من الرای المحمود ص۱۰۱
[۳] اخبار القضاۃ لمحمد بن خلف از الفاروق۔

وان الناس ینظرون الیکم کما ینظر الطیر الی اللحم فان وقعتم وقعوا وان هبتم هابوا وانی واللہ لا اوتی برجل وقع فیما نهیت الناس عنه الا اضعفت له العقوبة لمکانه منی فمن شاء منکم فلیتقدم ومن شاء فلیتاخر[1]

فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے ہی دیکھ رہے ہیں جیسے پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے اگر تم بچ گے تو وہ بھی بچیں گے اور تم مبتلا ہو گے تو وہ بھی مبتلا ہوں گے۔ اگر تم میں سے کسی نے منع کی ہوئی باتوں کا ارتکاب کیا تو اپنے تعلق کی وجہ سے خدا کی قسم میں اس کو دوگنی سزا دوں گا اب اختیار ہے جو چاہے آگے بڑھے اور جو چاہے پیچھے ہٹے۔

(۲۰) حضرت عمرؓ نے حکومتی طبقہ کے لیے عام حالات میں متوسط درجہ کا معیار زندگی پیش کیا اور اس پر سختی کے ساتھ قائم رہے چنانچہ آپ نے فرمایا:

وقوتی وقوت اهلی کقوت رجل من قریش لیس باغناهم ولا بافقرهم[2]

میری اور میرے اہل وعیال کی روزی بس اس قدر ہے جتنی کہ قریش میں سے ایک متوسط درجہ شخص کی ہوتی ہے جو نہ زیادہ مالدار ہو اور نہ زیادہ مفلس ہو۔

(۲۱) حضرت عمرؓ نے خاص حالات میں جب تک دوسروں کے لیے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی بھی نہ ہو جائے اس معیار کو بھی گوارہ نہ کیا جیسا کہ قحط کے زمانہ میں گھی، دودھ اور دوسری چکنائی کی چیزوں کا استعمال ترک کر دیا اور فرمایا:

لیس انا بذائقة حتی یحیی الناس[3]

میں اس کو اس وقت تک نہ چکھوں گا جب تک لوگوں کو زندگی نہ حاصل ہو۔

اور جب صاحبزادہ نے تنگیٔ رزق کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا:

---

[1] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب السادس والسبعون ص ۲۳۶ [2] ایضاً الباب التاسع والثلثون ص ۱۰۳
[3] ایضاً الباب الثالث والثلثون ص ۸

واللہ مالک عندی غیر سہمک	خدا کی قسم میرے پاس تمہارا اتنا ہی حصہ
فی المسلمین وما انا اوعجز	ہے جتنا دوسرے مسلمانوں کا ہے اس میں
عنک لہ	تمہیں وسعت ہو تا تنگی۔

(۲۲) حضرت عمرؓ نے حکومت کے سب سے بڑے نمائندہ "خلیفہ" کو ایک فرد کی حیثیت دی، نہ اس کی رائے کو دو رائے کے برابر قرار دیا اور نہ اس کو "ویٹو" کا حق دیا جیسا کہ مجلس شوریٰ میں فرمایا:۔

انی واحد کاحد کم لہ	میری حیثیت تم میں کے ایک فرد کی ہے۔

(۲۳) حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے کسی نامزد نہیں کیا بلکہ حالات کے لحاظ سے چھ آدمیوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی اور ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کرنے کی ہدایت فرمائی۔ ممبران کمیٹی کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حضرت علیؓ ۲۔ حضرت عثمانؓ ۳۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف ۴۔ حضرت سعد بن وقاص ۵۔ حضرت زبیرؓ بن العوام ۶۔ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ۔

بالآخر حضرت عثمانؓ خلیفہ مقرر کیے گئے۔

(۲۴) حضرت عمرؓ نے خلافت کے معاملہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ کوئی رعایت گوارا نہ کی حتیٰ کہ مذکورہ کمیٹی میں بھی اس کو شریک نہ کیا نیز لوگوں کی خواہش کے باوجود گورنری کا عہدہ اس کے سپرد نہ کیا۔ کوفہ والوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان پر کوئی نرم گورنر مقرر کیا جاتا تو وہ اس کو اہمیت نہ دیتے اور سخت گورنر مقرر کیا جاتا تو اس کی شکائتیں کرتے تھے ایک مرتبہ نہایت حسرت کیساتھ حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

لوددت انی وجدت رجلا قویا	کاش مجھے کوئی امانتدار اور مسلمان شخص
امینا مسلما استعملہ علیھم۔	ملتا تو اس کو میں کوفہ کا گورنر مقرر کرتا۔

ایک شخص نے عرض کیا کہ خدا کی قسم میں آپ کو ایک ایسا ہی آدمی بتاتا ہوں جو قوی امین اور مسلمان سب کچھ ہے، حضرت عمر نے پوچھا وہ کون ہے اس نے کہا عبداللہ بن عمر۔ جواب

لہ ایضاً الباب الثالث والثلثون صنک لہ الخراج لابی یوسف صت ۲۵، ۲۶

سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

قاتلک اللہ[1] — اللہ تجھے محروم کرے۔

(۲۵) حضرت عمرؓ نے سیاست کو (مکر و فریب سے پاک کر کے) مستقل ادارہ کی حیثیت دی اور سیاست شرعیہ کے تحت بہت سے اہم فیصلے کیے جن کی تفصیل مستقل عنوان کے تحت آئے گی — مذکورہ اصلاحات سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے سیاست کا معیار کس قدر بلند کیا کہ جس کے ذریعہ اسلامی تنظیم اپنی افادیت برقرار رکھ سکی۔

---

[1] تاریخ عمر لابن الجوزی الباب الاربعون ص ۱۲۱

دامانِ کوہ سے ایک مردِ حق آگاہ کی آوازِ بازگشت

اِرشادات

حضرتِ خواجہ محمد عثمان دامانی نقشبندی مجددیؒ

ترجمہ و تلخیص :۔۔۔۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

ایک دن حاجی حافظ محمد خاں صاحب ترین خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، حضرت والا نے اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ بے شک ' انسان کے لیے کتب بینی' نعمتِ عظمیٰ ہے ۔۔۔ مگر کارِ سلوک بغیر حصولِ باطن اور بغیر دوامِ کثرتِ ذکر' حاصل نہیں ہوتا ۔۔۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا ۔۔۔ کہ حافظ قرآن اگر باخلاصِ نیت ' خالصاً لوجہ اللہ ۔۔۔ قرآن شریف پڑھتا ہے تو غنا (اور خوشحالی) اُس کی بغل میں رہتی ہے۔

مُلّا فقیر محمد سوداگر نے حضرت والا کی خدمت میں ایک عریضہ بمبئی سے روانہ کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ امسال گرانیٔ غلّہ حد سے گزر گئی ہے۔ اور اطراف و جوانب سے صدائے قحط سالی آرہی ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ میں چند ہزار روپے کے انگور خرید کر برائے تجارت بمبئی لایا ہوں تادمِ تحریرِ عریضہ وہ انگور فروخت نہیں ہوئے۔ نقصانِ عظیم کا خوف ہے۔ دوسری بات یہ ہے شہر بمبئی میں ایک مرضِ مُہلک ظاہر ہوا ہے کہ پنڈلی کے اوپر ایک دانہ پیدا ہوتا ہے اور اس کا ورم اوپر کو چڑھتا ہے۔ کچھ گھنٹوں کے بعد مریض ' دارِ فانی سے مُلکِ جاودانی کی طرف رخصت ہو جاتا ہے ۔۔ اِس مرض کے خوف سے کئی لاکھ باشندگانِ بمبئی شہر چھوڑ چھوڑ کر اطراف میں

بھاگ گئے ہیں۔ لہٰذا دعا کی درخواست ہے۔ دعائے غائبانہ سے اس خادم کو فراموش نہ فرمائیں اور پڑھنے کے واسطے کوئی وظیفہ عنایت فرمادیں جو ان پریشان کن حالات میں مفید ہو۔"

حضرت والا نے اس خادم (یعنی جامع ملفوظات) سے فرمایا کہ اس خط کے جواب میں لکھ دو کہ کثرتِ استغفار کو اپنا وظیفہ بنالیں۔ یہ استغفار تمام حالات اور مہمات میں مفید ہوگا۔ خود خدا وندِ کریم (حضرت نوح علیہ السلام کے وعظ کی حکایت کرتے ہوئے) فرماتا ہے ـــ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا۔ [عـہ]

پھر فرمایا کہ ایک بزرگ تھے۔ بہت سے لوگ اُن کے پاس آتے تھے اور وظیفہ معلوم کرتے تھے۔ وہ بزرگ ہر ایک کو ہر ایک حاجت کے لیے استغفار پڑھنے کی تاکید فرمادیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک شخص نے اُن سے عرض کیا آپ تمام مطالب و مقاصد کے لیے استغفار ہی بتاتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے علاوہ استغفار کے اور کوئی عمل ایسا معلوم نہیں ہے کہ وہ حلِ مشکلات و مہماتِ دارین میں مفید ہو۔

ایک دن حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اس زمانے کے پیروں نے جو پیری مریدی شروع کر رکھی ہے۔ اگر یہ سلسلہ کسی نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ فلاں امیر یا فلاں سوداگر میرا تابع و مطیع ہوجائے تاکہ دنیاوی منفعت اس سے حاصل ہو۔ پس یہ صورت مسلکِ صوفیہ میں شرکِ جلی ہے اس لیے کہ رازقِ مطلق اللہ تعالےٰ ہے۔ اور اُس پیر نے تکیہ اور بھروسہ غیر اللہ پر کیا ـــ اور اگر اس خیال سے پیری کرتا ہے کہ میں صاحب فیض ہوں دوسروں کو فیض یاب کردوں گا، اس کو بھی پیرانِ کرام کے طریقے میں شرک جلی قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے

عـہ میں نے (اُن سے یہ) کہا کہ تم اپنے پروردگار سے استغفار کرو (یعنی گناہ بخشواؤ) بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال و اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لیے باغ لگادے گا اور تمہارے لیے نہریں بہادے گا۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو۔ (ورنہ شرک نہ کرتے)

کہ مبدءِ فیض، ذاتِ حق تعالیٰ ہے، اور وہ اس کے برعکس خود کو مبدءِ فیض تصور کرتا ہے۔

بزرگانِ اہلِ تصوف اور صاحبِ نسبت اکابر نے جو کچھ لکھا ہے اور وہ جو اجرائے طریقہ کرتے ہیں۔ اُن کا مقصد دوسرا ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو فیض عطا فرمایا ہے اور وہ فیض ہر وقت ہم سے پرنالے کے پانی کی طرح بہہ رہا ہے اور وہ رائگاں جا رہا ہے پس وہ چاہتے ہیں اور جستجو کرتے ہیں کہ لوگ اس نعمتِ عظمیٰ سے فیض یاب ہوں۔ اسی خیال سے اُن کو مرید کرتے ہیں اور توجہ فرما کر لوگوں کے قلوب میں القاءِ فیض کرتے ہیں۔ ایسے بزرگوں کے فیض میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔

جامع ملفوظات لکھتے ہیں ایک دن احقر حاضرِ خدمت ہوا اُس وقت محفلِ مبارک میں قاضی صاحب (غالباً قاضیٔ شہر) بھی موجود تھے۔ انھوں نے حضرتِ والا کی خدمت میں اس حقیر کے بارے میں عرض کیا کہ "یہ حضرت والا کے ملفوظات و مکتوبات نصائح اور سوانح و حالات جمع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انھوں نے لوگوں پر بڑا احسان کیا ہے"۔ حضرت والا نے از کمالِ کسرِ نفسی ارشاد فرمایا کہ میں کیا اور میرے ملفوظات و مکتوبات ہی کیا؟۔ ایک لحظے کے بعد احقر کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ نصائحِ فقیر جو تم نے جمع کیے ہیں اگر یہ کام محض اپنے نفس کے لیے کیا ہے تو یہ تمہارے اوپر (اور تمہارے برخلاف) حجت ہے اور اگر (اللہ کے لیے اور) اس خیال و نیت سے اس کام میں محنت کی ہے اور اپنے اوقاتِ عزیز لگائے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو اس سے دینی فائدہ حاصل ہو تو یہ کام تمہارے لیے صدقۂ جاریہ بن جائے گا۔ پھر فرمایا کہ اس دورِ پُرفتن میں لوگ قرآن مجید اور حدیث شریف پر عمل نہیں کر رہے ہیں میرے ملفوظات و مکتوبات کیا کریں گے؟ پھر فرمایا کہ تم کو چاہیے کہ ذکر و مراقبہ اور شب خیزی میں برابر مشغول رہو اس لیے کہ یہی کام کا وقت ہے کہ صحت و جوانی کا عالم ہے۔ بڑھاپے میں سوائے افسوس کے اور اوقاتِ گزشتہ پر ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ (بعد ازاں یہ شعر پڑھا)

دادیم ترا ز گنجِ مقصود نشاں　　گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

(ہم نے تجھ کو گنجِ مقصود کا پتہ بتا دیا ہے اگر ہم وہاں تک نہیں پہونچ سکے تو شاید تو وہاں تک پہونچ جائے)۔۔۔

ارشاد فرمایا ۔ کہ مرشد نا مولانا حضرت حاجی دوست محمد قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ ذکرِ قلبی میں مشغول رہے یہاں تک کہ موت کے وقت بھی یہی کیفیت طاری ہو۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ بحکم حدیث' جدّدوا ایمانکم بقول لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ۔ ہر وقت تجدیدِ ایمان اس کلمے سے کرنی چاہیے۔

ذکر کن ذکر تا ترا جان است پاکئی دل ز ذکر رحمٰن است

(جب تک تیری جان میں جان ہے. ذکرِ رحمٰن کیے جا. ذکرِ رحمٰن سے پاکئی دل حاصل ہوتی ہے)

ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مشکل پیش آجائے تو آدمی کو چاہیے کہ صدقِ دل سے توبہ کرکے گریہ و زاری اور نیازمندی کے ساتھ خداوندِ کریم سے اُس مشکل کا حل چاہے خداوند کریم اُس مشکل کو آسان فرمادے گا۔

ارشاد فرمایا ۔ جس وقت بندہ اپنے صفات و افعال کو کچھ نہ سمجھے گا اور اُن کو منسوب بخدا کردے گا تو اُس کے بعد وہ جو کوئی نیکی کرے گا اُس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آئے گا کہ یہ نیک کام میں کرتا ہوں. جیسے ایک خادم اپنے آقا کے حکم سے اور اس کی اجازت سے کوئی چیز تقسیم کرتا ہے تو اُس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں گزرتا کہ میں یہ چیز دے رہا ہوں بلکہ اپنے آقا کی طرف سے سمجھتا ہے اور خود کو مفلس و مسکین تصور کرتا ہے۔

ایک دن مولانا حُسین علی شاہ صاحب کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا ۔ مولوی حُسین علی صاحب ۔ تم کو جو مسائل' مستحضر نہیں رہتے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کو (اچھی طرح) خیالِ عمل نہیں رہتا. مجھ کو (الحمد للہ) خیالِ عمل رہتا ہے اس لیے مسائلِ ضروریہ دینیہ مجھے یاد ہیں۔

ارشاد فرمایا کہ رُسوم عوام سے اور حسب رسُوم شادی بیاہ میں زیادہ خرچ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

مولوی نور خاں صاحب کو مخاطب کرکے بارہا یوں ارشاد فرمایا کہ تہلیل اور ذکرِ اسم ذات زیادہ سے زیادہ کرو. وقتِ نزع بجز کلمۂ طیبہ کوئی شغلہ اور کوئی آشنا خویش کام نہیں آئے گا. سب اس بات کے خواہاں اور منتظر ہوں گے کہ اس مبتلائے نزع کی زبان سے کلمۂ طیبہ نکلے ۔ جو مشکل بھی پیش آئے. کلمۂ طیبہ اور اسم ذات کی کثرت کرو اور مشکل کا حل زاری د

نیازمندی کے ساتھ خداوند کریم سے طلب کرو۔ برابر کلمۂ طیبہ میں مشغول رہو اور کسی سے (بلا ضرورت دینی) آشنائی و علاقہ نہ رکھو سب ضرر رساں ہیں اور بغیر غرض کے کوئی دوستی نہیں کرتا (الا ماشاء اللہ)۔

.... جس قدر اہل وعیال پر خرچ کرو وہ بلحاظ شرع اور بطور شرع ہو۔ کلمہ طیبہ کی یہ خاصیت ہے کہ وہ خطرات اور رذائل کو دور کرتا ہے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ خانقاہ شریف برائے ذکر ہے مُطالعۂ کتاب کی جگہ نہیں ہے۔ مُطالعۂ کتاب گھر پر ہونا چاہیے ___ ہاں ایسی کتاب جو معاملۂ ذکر سے تعلق رکھتی ہو اُس کے دیکھنے میں کوئی مُضائقہ نہیں ہے ___ ذکر خوب کرو تاکہ عادت ہوجائے ___

ارشاد فرمایا کہ کم کھاؤ اور سادہ لباس پر اکتفاء کرو۔ پھر فرمایا کہ میں کیا کرسکتا ہوں جب تک تم ہی خود محنت نہ کرو ___ صبر اختیار کرو اور تمام اُمور میں بدرگاہ الٰہی یوں کہو ؎

انت کافٍ انت شافٍ فی مہمات الامور

انت حسبی انت ربی انت لی نعم الوکیل

(تو میرے لیے کفایت کرنے والا ہے۔ تو ہی تمام مشکلات و مہمات کو حل کرنے والا ہے۔ تو میرے لیے کافی ہے اور میرا بہترین کارساز ہے)

ارشاد فرمایا کہ ___ مقصود طریقہ یہ ہے کہ سختی و خوشحالی کے وقت قلب میں کوئی خلل نہ آنے پائے ___ فرمایا ___ شانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندی کو ظاہر کرنے والی اس سے زیادہ کون سی آیت ہوگی جس میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے ___ مَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) پھر فرمایا اس آیت سے زیادہ ڈرانے والی کون سی آیت ہوگی جس میں فرمایا گیا ہے ___ اِنَّ اِلَیْنَا اِیَابَھُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ ___ (بے شک اُن کو ہماری طرف رجوع ہونا ہے پھر بے شک اُن کا حساب ہمارے اوپر ہے یعنی ہم اُن سے حساب لیں گے)

ارشاد فرمایا ___ ہجومِ خطرات و وساوس سے تنگدل نہ ہونا چاہیے۔ ذکر میں مشغول رہو اور خطرات و وساوس کو دور کرنے کے لیے استغفار کرتے رہو۔

ارشاد فرمایا کہ ___ ہماری ریاضت تو دہقان کی تلاوتِ قرآن کی طرح ہے کہ دن بھر

کھیتی کے کام کرتا ہے اور جب کچھ فراغت ہوتی ہے تب تلاوت کر لیتا ہے۔

فرمایا کہ ـــ سالک کو چاہیے کہ خشک روٹی نہ کھائے ایسا نہ ہو کہ دماغ خشک ہو جائے۔

مولوی نذر خاں نے عرض کیا کہ قبلہ! اگر درود خالص (ماثور) پڑھتا ہوں تو تاثیر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بہ نسبت دلائل الخیرات کے ـــ جواب میں ارشاد فرمایا۔ ہاں دلائل الخیرات میں درود خالص کی طرح تاثیر نہیں ہے اس لیے کہ وہ خالص کلام رسول صلعم نہیں ہے۔ کلام غیر رسول بھی اُس میں ممتزج و مخلوط ہے۔

صاحب فوائد عثمانی سید محمد اکبر علی شاہ نقشبندی دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ بتاریخ ۳ محرم الحرام ۱۳۱۳ھ بروز پنجشنبہ بعد از نماز عصر یہ خادم دیرینہ حاضر خدمت تھا۔ حضرت والا نے اپنے کچھ ابتدائی حالات سُناتے ہوئے ارشاد فرمایا ـــ ہمارا آبائی وطن شہر لونی (؟) ہے ـــ ایک مرتبہ میں اپنے بھائی محمد سعید کے پاس اُن کے کپڑے پہونچانے کے لیے کھوٹیہال (؟) گیا۔ میرے بھائی وہاں پر ماموں نظام الدین صاحب کے پاس یوسف زلیخا پڑھ رہے تھے ـــ ماموں صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تم میرے پیر و مرشد کو بھی جانتے ہو؟ اُن کا نام نامی حضرت حاجی دوست محمد ہے۔ وہ فلاں قصبے کے قریب (جو ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ہے) رہتے ہیں۔ اگر اُن کی کوئی خیر خبر رکھتے ہو تو بیان کرو۔ میں نے کہا کہ مجھے اُن کی کوئی خبر نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کے پیر و مرشد کون بزرگ ہیں اور کہاں قیام رکھتے ہیں؟ ـ جب میں واپس ہونے لگا تو ماموں صاحب نے فرمایا کہ میرے پیر و مرشد کی قیام گاہ تمہارے راستے ہی میں ہے وہاں سے گزر ہو تو اُن کو میرا سلام پہونچا دینا اور عرض کرنا کہ آپ کے درویش (خدام) جو فلاں مقام پر ہیں کل حاضر خدمت ہونے والے ہیں چنانچہ میں اُس مقام پر پہونچا جہاں حضرت حاجی دوست محمدؒ قیام پذیر تھے اور بطور عابر سبیل (کھڑے کھڑے) حضرت صاحبؒ کی خدمت میں گیا اور ماموں صاحب کا سلام پہونچا دیا۔ حضرت صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ہمارے درویش وہاں سے یہاں کب آئیں گے؟ میں نے عرض کیا کل آئیں گے۔ بس اسی قدر گفتگو کر کے میں وہاں سے روانہ ہو گیا اور اپنی قیام گاہ پر پہونچکر اسباق کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد غلبۂ ذوق و شوق لاحق ہوا۔ ہر وقت استغراق کی سی کیفیت

طاری رہتی تھی حتیٰ کہ مطالعۂ کتاب اور سبق بھی چھوٹ گیا۔ میں نے اپنے اُستاد سے عرض کیا کہ اب مجھ سے تحصیل علم نہیں ہوتی۔ روز بروز محبت الٰہی کا غلبہ ہو رہا ہے۔ میرا مصمم ارادہ ہے کہ کسی اہل اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہو جاؤں۔ اُستاد صاحب نے فرمایا کہ ہدایہ کا کچھ حصہ باقی ہے اس کو ختم کر لو اُس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں کسی بزرگ سے ایک ساتھ بیعت ہوں گے۔ میں نے کہا کہ ہدایہ کے ختم کرنے کے انتظار میں چند روز اور ٹھہرنا ہوگا اور مجھ کو اضطراب' بدرجہ کمال ہے۔ استغراق ہو کہ ہر وقت غالب ہے' کوئی کام کرنے نہیں دیتا۔ میں کل دا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے' چلا جاؤں گا۔ اسی اثناء میں اُستاد صاحب کے برادر کلاں نے جو کہ اُستاد کے اُستاد تھے' فرمایا کہ اگر تمہارا فقیری اختیار کرنے کا پختہ ارادہ ہے تو مناسب یہی ہے کہ اس کام کے لیے کمر ہمت کس لو۔ میں نے بیان کیا کہ اب تہ دل سے یہی آواز نکلتی ہے کہ حضرت حاجی دوست محمدؒ کی خدمت میں پہونچکر اُن سے بیعت ہو جاؤں۔ بعد ازاں پیر و مرشد کے آستانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ فقط دوپہر کو کسی جگہ آرام کر کے پاپیادہ غروب آفتاب تک چلتا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا مگر گرمی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ غلبۂ نسبت کی وجہ سے ایک سخت حرارت میرے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ اثنائے راہ میں ایک نہر میں غسل کیا۔ بالآخر ۸ رجمادی الثانیہ ۱۲۶۶ھ کو جمعہ کے دن عصر کے وقت حضرت حاجی دوست محمد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی درخواست کی۔ حضرتؒ نے انکار کیا اور فرمایا کہ فقیری اختیار کرنا کھیل نہیں ہے' بہت مشکل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں محض بیعت ہونے کے لیے حاضر ہوا ہوں اور ہر چیز کے تعلق سے میں نے اپنے دل کو آزاد کر لیا ہے۔

حضرتؒ نے ارشاد فرمایا اچھا ابھی ٹھہرے رہو۔ بعد نماز مغرب مجھے شرف بیعت سے مشرف فرمایا۔ اُس وقت میری ایک عجیب و غریب حالت ہو گئی تھی۔ بیعت سے پہلے میں علم صرف' نحو' عقائد' فقہ' اُصول فقہ' تفسیر اور دیگر علوم ضروریہ پڑھ چکا تھا اور وہ یاد بھی تھے۔ بیعت کے بعد علم حدیث میں مشکوٰۃ شریف' صحاح ستہ (یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' جامع ترمذی' سنن ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ) علم اخلاق میں احیاء العلوم کامل اور علم تفسیر میں معالم التنزیل مکمل اور علم سیر تمام و کمال اور علم تصوف میں مکتوبات امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی ہر سہ جلد

اور مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصومؒ ہر سہ جلد بہ تحقیق تمام اور دیگر کتب تصوف کما حقہ' سنداً اپنے پیر و مرشد (حضرت حاجی دوست محمد قندھاریؒ) سے پڑھیں۔

ایک دن حضرت پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب قندھاریؒ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہیں وہ دن یاد ہے کہ تم اپنے ماموں کا سلام مجھے پہونچانے آئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے یہ حاضری خوب یاد ہے۔ بعد ازاں زبان گوہر فشاں سے ارشاد فرمایا کہ میں نے اُس دن تمہاری پیشانی میں اپنے حضرات کی "نسبت" مشاہدہ کی تھی۔ اپنے دل میں کہتا تھا کہ یہ شخص ضرور ہمارے حضرات کی نسبت سے رنگین اور مالا مال ہوگا۔ اُس کے بعد بہت دن گزر گئے کہ تم نہیں آئے۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید کشف میں غلطی واقع ہوگئی۔ آج وہ بات ظہور میں آئی ہے۔ حضرت پیر و مرشد مجھ سے کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے' تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ کچھ علم منطق بھی پڑھو۔ میں عرض کر دیتا تھا کہ حضرت! منطق پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ منطق اللہ کے راستے میں مقصود اور ضروری بھی نہیں ہے۔ پھر ایک دن حضرت پیر و مرشد (حضرت حاجی دوست محمد قندھاریؒ) نے فرمایا کہ مجھ سے ایک سفید ریش بزرگ نے (خواب میں یا مُراقبے میں) فرمایا ہے کہ عثمان کو علم منطق پڑھنے پر مجبور نہ کرو، علمِ منطق اللہ کے راستے میں مقصود نہیں ہے۔

درس قرآن

(۱۳ جون ۱۹۷۱ء یکشنبہ)

مرکز والی مسجد

سورۂ توبہ کی اہمیت اُس کے ناقابل فراموش اسباق

اور اُس کا خاص پیغام

حمد و صلوٰۃ ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ (خاتمۃ سورۃ البراءۃ)

یہ سورہ توبہ کی آخری دو آیتیں ہیں جو آج میں نے پھر تلاوت کی ہیں، پچھلے ہفتہ اس سورت کے آخری دو رکوع کا درس ہوا تھا اور ان دونوں آخری آیتوں کا بھی ترجمہ کر دیا گیا تھا اور مختصر تشریح بھی کر دی گئی تھی، ــــــ اس کے بعد آج سورۂ یونس کا درس شروع ہونا چاہئے تھا، لیکن سورۂ توبہ کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے مضامین کی خاص نوعیت کی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ آج بھی اسی سورت کے اہم مضامین کا اعادہ کیا جائے اور اس میں اُمّت کو جو خاص سبق دیے گئے ہیں اُن کو دُہرایا جائے اور سمجھنے اور یاد کرنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ سورۂ توبہ کا علم حاصل کرنے کی خاص طور سے تاکید فرماتے تھے ــــــ دراصل اس سورت کے ذریعہ اُس ہدایت کی تکمیل ہوئی ہے جو

آغازِ نبوت سے نازل ہونا شروع ہوئی تھی اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کیسا ایمان اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہے اور اللہ و رسول کے ساتھ اور دین کے ساتھ مومن کا تعلق کیسا ہونا چاہیئے۔

یہ سورت حضورؐ کے آخری دورِ حیات میں نازل ہوئی ہے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت کو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایکؔ۔ آغازِ نبوت سے مدینۂ طیبہ ہجرت فرمانے تک کے قریباً ۱۳ سال، یہ پورا مکی دور ہے۔

دوسرا۔ ہجرت سے فتح مکہ تک کے قریباً ۸ سال، یہ گویا درمیانی دور ہے۔

تیسرا۔ فتح مکہ سے وفات تک کے قریباً ڈھائی سال۔ یہی آپ کا آخری دورِ حیات ہے، اسی میں ہر حیثیت سے دین کی تکمیل ہوئی ہے۔

یہ سورۂ براءۃ جیسا کہ آپ حضرات کو بھی اس کے مضامین سے اندازہ ہو چکا ہوگا اسی آخری دور میں نازل ہوئی ہے ——— سنہ ۹ھ ہجری کے وسط میں، مشہور روایت کے مطابق رجب کے مہینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک والا سفر فرمایا، یہ آپ کا اور آپ کے اصحاب کرام کا سب سے طویل اور نہایت پر مشقت جہادی سفر تھا اور اس لحاظ سے بھی نہایت پُر خطر تھا کہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت یعنی رومی حکومت کی باقاعدہ اور نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ فوج سے جنگ کا امکان تھا جو لاکھوں کی تعداد میں تھی اور اس دور کے لحاظ سے بہترین اسلحہ اور ہر قسم کے سامانِ جنگ سے لیس تھی، اور آپ کے ساتھ صرف تیس ہزار کی جمعیت تھی جو رومی فوج کے مقابلہ میں بالکل ہی بے سر و سامان تھی، حد یہ ہے کہ ان مجاہدین کے لیے غذا کی اتنی کمی تھی کہ بعض دنوں میں اللہ کے بندوں نے ایک ایک کھجور کھا کر گزارا کیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ موسم سخت گرم تھا اور بعض منزلوں پر پینے کے لیے پانی بھی نصیب نہیں ہوتا تھا، اسی لیے اس غزوہ کا ایک نام "غزوۃ العسرۃ" بھی ہے۔ یعنی تنگی اور فقر و فاقہ والا غزوہ۔

سورۂ توبہ کا کچھ حصہ غزوۂ تبوک سے کچھ پہلے اسی کے سلسلہ میں نازل ہوا تھا، اور کچھ حصہ تبوک کے سفر کے دوران میں نازل ہوا، اور زیادہ تر اس سفر سے واپسی کے بعد نازل ہوا ہے۔

بہر حال اس کے مضامین کا بہت کچھ تعلق غزوۂ تبوک اور اس کے سلسلہ کے واقعات سے ہے۔ میں اس غزوہ کے واقعات پوری تفصیل سے پچھلے ہفتوں کے درس میں موقع بہ موقع بیان کرتا رہا ہوں۔

مختصر طور سے اس وقت پھر ذکر کرتا ہوں۔

واقعات کا سلسلہ یوں ہے کہ عرب کی مغربی سرحد پر جو شام کے علاقہ سے ملتی ہے عرب عیسائیوں کی کئی ریاستیں تھیں جو رومی شہنشاہی کی باج گزار تھیں اور گویا اس کی سرپرستی میں تھیں۔ جب ۸ھ ہجری میں مکہ معظمہ اور طائف کے فتح ہو جانے کے بعد قریباً پورے عرب پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو سرحد کی ان عیسائی ریاستوں نے محسوس کیا کہ یہ ابھرتی ہوئی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی نئی طاقت کسی وقت ہمارے لیے بھی خطرہ کا باعث بن سکتی ہے، وہ ایک ہی سال پہلے غزوہ موتہ میں مسلمانوں کی حوصلہ مندی اور جرأت و جانبازی کا تجربہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اس بات کو رومی حکومت تک بھی پہونچایا جس کا اس وقت شام پر اقتدار تھا اور پھر رومی حکومت کی پوری امداد اور پشت پناہی کا اطمینان حاصل کر کے یہ منصوبہ بنایا کہ پوری طاقت سے مدینہ پر ایک بھرپور حملہ کر کے اس نئی ابھرتی طاقت کو اسی مرحلہ میں کچل دیا جائے! اور پوری تیز رفتاری کے ساتھ اس کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے وحی الٰہی کی رہنمائی میں اور جنگی حکمت عملی کے طور پر یہ طے کیا کہ ان کو حملہ کرنے کا موقع دینے کے بجائے خود پیش قدمی کر کے ان پر ضرب لگائیں اور مسلمانوں کی ایمانی طاقت اور ان کی مجاہدانہ اسپرٹ کا ان کو اندازہ کرا دیں تاکہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں ـــــ اس کے لیے عالم اسباب میں یہ ضروری تھا کہ مجاہدین کی زیادہ سے زیادہ تعداد آپ کے ساتھ ہو اس لیے آپ نے مدینہ طیبہ اور قرب وجوار کے تمام مسلمانوں کو اس جہادی مہم کے لیے تیاری کا اور اس میں حصہ لینے کا اعلان عام جاری فرما دیا، اس سے پہلے کسی مہم اور جنگ کیلئے کبھی اس طرح کی نفیر عام نہیں دی گئی تھی ـــــ غزوہ تبوک ہی میں آپ نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر مسلمان جو معذور و مجبور نہیں ہے اس میں شرکت کرے۔ اور اتفاق کی بات کہ موسم انتہائی گرم تھا، اور مدینہ کے باغوں میں کھجوروں کے تیار ہونے اور پکنے کا زمانہ تھا اور اسی پر اہلِ مدینہ کی معیشت کا دارومدار تھا، اس حالت میں اپنے باغوں کو چھوڑ کر جانا بڑا سخت امتحان تھا۔ اس کے علاوہ سفر دور دراز کا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی فوج کے مقابلہ کے لیے جانا تھا جو اس وقت کی دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور فوج تھی اور جس نے چند ہی سال پہلے دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت فارس کی فوجوں کو شکست دے کر دنیا بھر پر اپنی برتری کا سکہ جما دیا تھا اور اپنی دھاک بٹھا دی تھی ـــــ اسی بنا پر منافقین یہ سمجھتے

تھے کہ اس سفر میں جانا موت کے منھ میں جانا ہے اور جو جائے گا وہ واپس نہیں آئے گا، وہیں کے چیل کوّے اور جانور ان کی لاشوں کو کھائیں گے۔ اس لیے ان منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے کیے اور نہیں گئے ـــــ ان منافقین کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے ایمانوں میں کچھ ضعف تھا اور اس لیے کم ہمتی تھی وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح بچ جائیں تو اچھا ہے۔

انہی حالات میں یہ پرجلال آیتیں نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا"

یعنی اے مسلمانو تمہارا یہ کیا حال ہے کہ جب تم کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کے راستے میں قربانی اور جانبازی کے لیے قدم اٹھاؤ اور چلو تو تم بجائے اُٹھ کھڑے ہونے کے زمین پر پڑ جاتے ہو، کیا تم نے آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کی خوش عیشی کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے، حالانکہ دنیا کا ساز و سامان آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے ـــــ اگر تم نے اس دعوت پر لبیک نہیں کہا اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نہیں چلے تو اللہ کی طرف سے تم پر بڑی سخت مار پڑے گی اور پھر وہ اپنے دین کی خدمت کے لیے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے خود ہی محروم ہو جاؤ گے۔

ان پرجلال آیتوں کا روئے سخن دراصل اُن مسلمانوں کی طرف تھا جن میں کچھ ضعف اور تذبذب تھا۔ ان آیتوں نے اس تذبذب کو ختم کر دیا اور ہر مخلص مسلمان نے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اللہ کی شان کہ کعب بن مالک جیسے کئی ایسے مخلص مسلمانوں سے جو صفِ اول کے مخلصوں میں تھے لغزش ہو گئی اور وہ صرف سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے پیچھے رہ گئے، ان کے واقعات تفصیل سے پہلے بیان کیے جا چکے ہیں اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان واقعات میں اُمت کے لیے کتنے اہم سبق ہیں۔

الغرض ان کے علاوہ مدینہ طیبہ اور قرب و جوار کے قریباً سب ہی مسلمان حضورؐ کی نفیر عام پر لبیک کہہ کے آپ کے ساتھ تبوک کے لیے روانہ ہو گئے، ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی ـــــ مدینہ طیبہ سے تبوک تک کا ۱۴۔۱۵ دن کا راستہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا بڑا ہی پُر مشقت اور بڑے سخت مجاہدہ کا یہ سفر تھا۔ لیکن مسلمانوں کی اس پیش قدمی نے اُن عرب ریاستوں کے حوصلے پست کر دیے جو مدینہ طیبہ پر حملہ کا منصوبہ بنا رہے تھے اس لیے انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ مدینہ کی اسلامی حکومت سے مصالحت کر لی جائے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی بڑی کامیابی تھی، چنانچہ قریباً بیس دن تبوک میں قیام کر کے اور اس سرزمین پر اللہ کا نام بلند کر کے، اذانیں دے کے اور نمازیں پڑھ کے آپ واپس تشریف لے آئے۔ اور آپ کے اس سفر نے اس علاقہ میں اسلام کے نفوذ کی اور آگے کی بڑی کامیابیوں کی راہ ہموار کر دی، اور دور دور تک مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی ـــــ اس کے علاوہ بہت سے داخلی فائدے ہوئے۔ وہ مارِ آستین منافقین جن کا نفاق اب تک دبا ہوا اور چھپا ہوا تھا، اس غزوۂ تبوک نے اُن کا پردہ فاش کر دیا۔ اور سورۂ توبہ کی آیات نے ان کو بالکل عریاں کر دیا۔ پھر ان میں سے بہت سوں کا نفاق ختم ہو کر اُن کے اندر ایمان آ گیا۔ اور اس غزوہ کے سخت مجاہدہ نے مومنین صادقین کو اور نکھار دیا اور اُن کے ایمانوں میں بڑی ترقی ہوئی ـــــ اور کعب بن مالک وغیرہ چند مخلصین جو محض سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے اس غزوہ میں جانے سے رہ گئے تھے ان پر سخت عتاب ہوا اور اُن کو مقاطعہ کی ایسی سخت سزا دی گئی کہ قرآن پاک میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے "ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ" (یعنی ان کیلئے دُنیا تنگ و تاریک ہو گئی اور وہ اپنی زندگی سے تنگ آ گئے) مگر انھوں نے اللہ و رسول اور دینؐ کے ساتھ اپنی وفاداری اور اپنے اخلاص کا پورا پورا ثبوت دے دیا تو ان کی سچی توبہ کی بنا پر ان کی معافی اور توبہ کی قبولیت کا اعلان فرما کر اُمت کو قیامت تک کے لیے ایک بڑا سبق دے دیا گیا۔

اسی سفر تبوک کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ جس طرح منافقین یہ سمجھتے تھے کہ یہ تبوک جانے والے مسلمان اب واپس نہ آ سکیں گے اور رومی فوج ان سب کا وہیں خاتمہ کر دے گی اسی طرح عرب کے مختلف علاقوں کے وہ مشرکین جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدے کر لیے تھے

انھوں نے بھی یہی سمجھا اور ایسی شرارتیں شروع کر دیں جو معاہدوں کے بالکل خلاف تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے واپس آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان معاہدوں کو فسخ کیے جانے کا اعلان فرمادیا اور ان سب کے لیے چار مہینے کی مہلت کا بھی اعلان فرمادیا گیا۔ اور جن قبیلوں اور علاقوں کے مشرکوں نے عہد شکنی نہیں کی تھی اُن کے متعلق اعلان فرمادیا گیا کہ اُن سے معاہدہ مقررہ میعاد تک قائم رہے گا لیکن آئندہ اس میں توسیع نہ ہوگی ـــــــ اس سورۂ توبہ کے سوا رکوع قریباً ۳۰ آیتوں میں تمام مشرکین عرب کے سلسلہ میں اسی نئے فیصلے اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔
اس حکم اور فیصلہ کا مقصد یہ تھا کہ عرب کا وہ خاص علاقہ جس کو دعوت توحید اور دین حق اسلام کا مرکز بنا تھا وہ شرک سے بالکل پاک صاف ہو جائے، بتوں سے اور بُت پرستی سے کعبۃ اللہ کی تطہیر کی طرح یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے خاص مقاصد میں سے تھی، اور اب اس کی تکمیل کا وقت آگیا تھا ـــــــ اسی سلسلہ میں یہ بھی حکم دیا کہ آئندہ مشرکوں کو اپنے مشرکانہ عقائد اور رسوم کے ساتھ حج میں شریک ہونے کی اور کعبہ کے طواف وغیرہ کی بلکہ مسجد حرام میں داخلہ کی بھی اجازت نہ ہوگی ـــــــ یہ سب نہایت اہم احکام اور فیصلے تھے ـــــــ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ ہجری کے حج سے کچھ ہی پہلے سورۂ توبہ کا یہ ابتدائی حصہ نازل ہوا تھا ـــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طے فرمایا کہ ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) آپ کے خاص نمائندہ اور امیر حج کی حیثیت سے اس سال حج کریں اور آپ کی طرف سے اللہ و رسول کے ان اہم فیصلوں کا حج میں شریک ہونے والے تمام عربوں کے سامنے اعلان کریں ـــــــ صدیق اکبر کے روانہ ہو جانے کے بعد بعض تجربہ کار لوگوں نے حضور کو توجہ دلائی کہ عربوں کا پرانا دستور یہ ہے کہ کسی معاہدہ کے فسخ کرنے کا اعلان یا تو صاحب معاہدہ خود کرے یا پھر اس کا کوئی قریبی عزیز اور رشتہ دار کرے۔ اس بات کے سامنے آنے کے بعد آپ نے حضرت علی مرتضیٰ کو روانہ کیا جو آپ کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے، چنانچہ صدیق اکبر نے یہ اعلان انھیں سے کرایا۔ تو جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ سورۂ براءۃ کی شروع کی قریباً تیس ۳۰ آیتوں کا تعلق انہی اہم فیصلوں سے ہے۔

سورۂ براءت کی ان آیتوں میں ایک طرح سے گویا تمام مشرکین عرب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا تھا، قدرتی طور پر اس کے اثرات بہت سے مسلمانوں پر بھی پڑ سکتے تھے۔ کسی کے باپ یا

بھائی ابھی شرک ہی کی حالت میں تھے، کسی کے دوسرے قریبی عزیز مشرک تھے، اب ان سب ہی کے خلاف اعلان جنگ ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ اس نئی پالیسی کے اعلان کے بعد جنگوں کا ایسا سلسلہ چھڑ جائے جن سے کبھی فرصت نہ ملے اور سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے ۔۔۔ غالباً ان خیالات نے کچھ کچے مسلمانوں کے دلوں میں کچھ وسوسے پیدا کیے ہوں گے۔ اور اگر اس وقت ایسے وسوسے پیدا نہ بھی ہوئے ہوں تو اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ ایسے سخت حالات میں ایسے وسوسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور قرآن مجید کو قیامت تک کے حالات اور امکانات کے بارہ میں رہنمائی دینی تھی۔ اس لیے اس سلسلہ کی آیتوں کے آخر میں مسلمانوں کو مخاطب فرما کر یہ سخت آگاہی بھی دے دی گئی۔

"قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ○"

اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل کو ٹٹول لے اور جانچ لے اگر اس کا حال یہ ہو کہ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد، اپنی چہیتی بیویوں اور دوسرے قریبی عزیزوں رشتہ داروں سے یا اپنی کمائی ہوئی دولت اور اپنے چلتے ہوئے کاروبار سے یا اپنے مکانات اور جائداد سے اس کو ایسا تعلق ہے جو اللہ و رسول کے حکم کی تعمیل میں اور دین کے راستے میں قربانی دینے سے رکاوٹ بن سکتا ہے تو وہ اللہ کے اُن بندوں میں سے نہیں ہے جو اس کی رحمت اور عنایت کے مستحق ہوں بلکہ وہ "فاسقین" میں سے ہے جس کو خدا کے عذاب کا انتظار کرنا چاہیے۔ اور ایسے لوگ ہدایت کی نعمت سے محروم رہیں گے۔ اور پھر خداوندی رحمت اور جنت سے بھی محروم رہیں گے۔

میرے محترم بھائیو! اگر ہمارے دلوں میں کچھ بھی ایمانی رمق ہو تو یہ بڑی لرزا دینے والی آیت ہے، آج جہاد اور جاں فروشی کا وہ میدان تو ہمارے سامنے نہیں ہے جو اس آیت کے نازل ہونے کے وقت صحابۂ کرام کے سامنے تھا، لیکن امتحان کے دوسرے میدان ہمارے سامنے ہیں۔ روزمرہ ایسے حالات اور معاملات سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے کہ اگر خدا و رسول کے دا شریعت کے

حکم پر چلیں اور دین کے مطالبہ اور تقاضے کو پورا کرنے کا فیصلہ کریں تو ہمیں کچھ مالی نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوتا ہے یا ہماری بیویوں اور دوسرے گھر والوں کی ناراضگی کا خطرہ ہوتا ہے، —— تو ذرا سوچیں کہ ایسے موقعوں پر ہمارا طرز عمل کیا ہوتا ہے؟ ہم چھوٹے چھوٹے مقدموں میں جیت حاصل کرنے کے لیے اور بس اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے بے تکلف جھوٹی گواہیاں دے دیتے ہیں جو اشد حرام ہے۔ دین کے تقاضے ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے اس کے لیے اپنا آرام بھی قربان نہیں کیا جاتا۔ اس آیت کا کھلا فیصلہ یہ ہے کہ جن کا یہ حال ہو وہ اللہ کی نگاہ میں سخت مجرم ہیں اور اس کے مستحق ہیں کہ ان پر خداوندی عذاب کے کوڑے برسیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کو جو آگاہی دی تھی وہ ہم آپ کو سب کو اور قیامت تک کے مسلمانوں کو دی گئی ہے —— سورۂ توبہ کی یہ آیت ایک کسوٹی ہے جس سے ہر ایک اپنا ایمان جانچ سکتا ہے، اور ایک آئینہ ہے جس میں ہم میں سے ہر ایک اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ سورۂ برارت کی ابتدائی قریباً ۳۰ آیتوں کا تعلق مشرکین عرب سے اور اُن کے بارہ میں نئے فیصلہ اور نئی پالیسی سے ہے۔

اس کے بعد ان اہلِ کتاب کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اور ان سے جہاد کی دعوت دی گئی ہے جو اس وقت اسلام کو مٹا دینے اور نورِ حق کو گل کر دینے کے منصوبے بنا رہے تھے اور انھوں نے اپنے پیغمبروں کا لایا ہوا دین اور ان کی شریعت کو چھوڑ کے اپنے نفس کی اور شیطان کی پیروی اختیار کر لی تھی —— اس موقع پر قرآنِ پاک نے اُن کے ٹھیٹ مشرکانہ عقائد کا بھی ذکر کیا ہے، فرمایا گیا ہے:

”اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ بْنَ مَرْیَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝

یعنی انھوں نے اپنے اَحْبَارُ و رُهْبَان کو یعنی عالموں اور درویشوں کو خدا کے علاوہ پروردگار بنالیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی خدا بنالیا ہے حالانکہ توریت وانجیل کے ذریعہ ان کو توحید کی تعلیم دی گئی تھی، لیکن انھوں نے اس خداوندی تعلیم کو پس پشت ڈال کر

یہ مشرکانہ طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

پھر اس کے آگے کی آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ اُن کے مذہبی پیشواؤں، پیروں اور پادریوں کی سیاہ باطنی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ"

یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے یہ پیر پادری جو بظاہر بڑے مقدس اور مہاتما بنے ہوئے ہیں — ان میں سے بہت سوں کا حال یہ ہے کہ وہ ریاکار اور مکار ہیں اور حرام و ناجائز طریقوں سے بس دنیا بٹورتے ہیں اور اپنے ماننے والے سیدھے سادے عوام کو لوٹتے ہیں اور اپنی جیبیں اور اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ یہ بالکل دولت کے پجاری ہو گئے ہیں، اور انھوں نے خدا کے بجائے مال و دولت کو اپنا مقصود و معبود بنا لیا ہے۔

ان آیتوں کا اگرچہ براہ راست تعلق بگڑے ہوئے یہود و نصاریٰ اور اُن کے حرام خور اور ریاکار پیروں، پادریوں سے ہے، لیکن ہم مسلمانوں کے لیے اور خاصکر ہم جیسوں کے لیے جن کو لوگ مذہبی عالم اور دینی پیشوا سمجھتے ہیں، ان آیتوں میں بڑا سبق اور بڑی آگاہی ہے — حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے "لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ" جس کا مطلب یہ ہے کہ میری اُمت کے لوگ وہ سب کچھ کریں گے جو پہلی اُمتوں یہودیوں اور نصرانیوں نے کیا اور بالکل اُن کے قدم بقدم چلیں گے۔ یہاں تک کہ اگر پہلی اُمتوں کے کسی بدبخت نے اپنی ماں کے ساتھ حرام کیا تھا تو میری اُمت میں بھی یہ ہو کر رہے گا۔

حضورؐ کے اس ارشاد کا مقصد دراصل اُمت کو خبردار کرنا تھا کہ وہ اس خطرے سے اپنی حفاظت کرے — لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ حضورؐ نے فرمایا تھا وہ سب سامنے آ رہا ہے۔ اُمت میں اعمال و اخلاق کی وہ ساری خرابیاں اور وہ سب اعتقادی گمراہیاں پیدا ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں جو یہود و نصاریٰ میں تھیں — وہ کون سا جرم اور گناہ ہے جو مسلمانوں میں نہیں ہے۔ اور وہ کون سا فسق و فجور ہے جو، دین و مذہب ہی کے نام پر بزرگانِ دین کے عرسوں میں نہیں ہو رہا ہے اور وہ کون سا شرک ہے جو ان کے مزاروں پر نہیں ہو رہا ہے، قبروں کو سجدے ہو رہے ہیں، مرادیں مانگی جا رہی ہیں،

نذریں چڑھائی جارہی ہیں، الغرض وہ سب کچھ ہورہا ہے جو یہود و نصاریٰ کرتے تھے۔

اور جس طرح اُن کے پیر پادری دین کے نام پر دُنیا کماتے اور بیچارے عوام کو لوٹتے تھے اُن کے نمونے بھی اس اُمّت کے مولویوں اور پیروں میں موجود ہیں ـــــ لیکن اللہ کا قانون بے لاگ ہے، اس کی کسی سے رشتہ داری نہیں، یہ نہیں ہے کہ بیچارہ یہودی یا نصرانی کہلانے والا شرک یا کوئی جرم کرے تو جہنم میں جائے اور مسلمان کہلانے والا کرے تو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ وہاں کا قانون تو یہ ہے۔ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ"

ـــــ (جاری)

"توحید اہلّہ" کی تجویز سے متعلق سوال کا

دوسرا جواب

(از جناب مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری استاذ دار العلوم اشرفیہ راندیر)

محرم کے الفرقان میں رمضان وعید وغیرہ سے متعلق بعض ممالک اسلامیہ کے کچھ علماء کی اس رائے اور تجویز کا ذکر کیا گیا تھا کہ کسی ایک ملک میں رویت ہلال ثابت ہو جانے پر دنیا کے تمام ملکوں کے لیے اسی رویت کو تسلیم کر کے پورے عالم اسلام میں ایک ہی دن رمضان شروع اور ختم ہو اور ایک ہی دن عید اور بقرعید منائی جائے ۔۔۔ "توحید اہلّہ" ان حضرات کی اسی تجویز کا عنوان ہے اور ان کے اس نقطۂ نظر کی بڑی دلیل اکثر ائمہ مجتہدین کا یہ نظریہ ہے کہ رویت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں۔

اس سلسلہ میں الفرقان میں مندرجہ ذیل سوالات کیے گئے تھے۔

(۱) اس بارہ میں ہمیں براہ راست کتاب وسنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟

(۲) جن ائمہ نے اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کیا ہے اُن کا مقصد اس انکار سے کیا ہے؟ اور اس مسئلہ میں اختلاف حقیقی ہے یا صرف لفظی اور تعبیری؟

(۳) کیا حنفیہ کے مشہور مذہب عدم اعتبار اختلاف مطالع کی بنا پر ہندوستان و پاکستان کے احناف کے لیے اس تجویز کو قبول کرنے کی گنجائش ہے؟

گزشتہ اشاعت میں اس سوال کا ایک جواب شائع ہو چکا ہے، دوسرا جواب جو مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دار العلوم اشرفیہ (راندیر ضلع سورت) کے قلم سے ہے۔ اس

اشاعت میں نذر ناظرین کیا جا رہا ہے — جوابات کا یہ سلسلہ انشاء اللہ ابھی جاری رہے گا۔

(نعمانی)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

پہلے سوال کا جواب

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمیں "تعدد اہلہ" کے لیے واضح حکم ملتا ہے، اس لیے "توحید اہلہ" کا نظریہ قرآن و حدیث کے خلاف جائے گا۔ کتاب اللہ کی دو آیتیں مسئلہ ہلال سے بحث کرتی ہیں۔ ایک مسئلہ باب میں عبارت النص ہے اور دوسری کے "اشارہ" سے مسئلہ باب ثابت ہوتا ہے۔

پہلی آیت

یسئلونک عن الاھلۃ، قل ھی مواقیت للناس والحج (البقرہ ۱۸۹)	مہینہ کے پہلے روز کے چاندوں کے سلسلہ میں لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اوقات (متعین کرنے والے) ہیں۔

(تشریح) آیت کی تشریح پڑھنے سے پہلے ایک حدیث بھی ملاحظہ فرمالیں کیونکہ حدیث قرآن کا "بیان" ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور طلق بن علیؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

ان اللہ جعل ھذہ الاھلۃ مواقیت فاذا رأیتموہ فصوموا و اذا رأیتموہ فافطروا، فان غم علیکم فعدوا ثلاثین کنز العمال ج ۴ ص ۳۰۲ روایت ابن عمرؓ حدیث نمبر ۶۰۸۴ " طلقؓ " ۶۰۶۲	اللہ پاک نے پہلی رات کے چاندوں کو اوقات مقرر کرنے والا بنایا ہے لہٰذا جب اس کو دیکھو تو روزے رکھنا شروع کرو اور روزوں کا اختتام بھی اسے دیکھ کر ہی کرو اور اگر پہلی رات کا چاند تم سے چھپا لیا جائے تو پھر (شعبان یا رمضان کے تیس دن شمار کرو (اور شمار پورا ہونے پر رمضان کی ابتدا

کر دیا روزوں کو ختم کرو۔)

اس حدیث میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے اور چاند دیکھ کر رمضان پورا کرنے کا حکم آیت پاک ہی سے مستنبط کیا گیا ہے یعنی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم کا مدار "رویت" پر رکھا ہے اور وہ حکم اسی آیت سے مستنبط اور مستفاد ہے لہٰذا مندرجہ ذیل حدیث بھی جو مختصر ہے اسی آیت کی تفسیر ہوگی۔

اذا رأیتم الھلال فصوموا واذا رایتم فافطروا، وان غم علیکم فعدوا ثلاثین یوما (رواہ جابر و ابو ہریرۃ و ابن عباس و حذیفۃ و طلق بن علی رضی اللہ عنہم)

جب ہلال دیکھو تو روزے شروع کرو اور جب اسے دیکھو تو روزے ختم کرو اور اگر وہ تم سے چھپ جائے تو پھر تیس دن شمار کر لو۔

بہر حال احادیث کے پیش نظر تمام علماء نے آیت کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ہر مہینے کی پہلی رات کو نمودار ہونے والے چاند (اہلہ) لوگوں کے لیے تعین اوقات کا ذریعہ ہیں یعنی ان کے ذریعہ مہینوں کا نظام بنتا ہے جس کے مطابق معاملات، وکاروبار بھی چلتے ہیں اور تمام عبادات ادا کی جاتی ہیں...... علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے ربط ماقبل سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسائل صیام کے بعد یہ آیت اس لیے بیان ہوئی ہے کہ روزوں کا مدار رویت ہلال پر ہے۔ (دیکھیے روح المعانی)

خلاصہ یہ ہے کہ حج کے علاوہ تمام عبادات و معاملات میں "تعدد اہلہ" ہی اصل ہے۔ چاند ان کے لیے ایک وقت نہیں مقرر کرے گا بلکہ ان کے مطالع کے اختلاف سے علیحدہ علیحدہ اوقات مقرر کرے گا۔ صرف حج میں "توحید اہلہ" (اگر یہ تعبیر مناسب اور صحیح ہو) ہوگا اور حج کے لیے مکہ شریف کا ہلال معتبر ہوگا اور اسی کے لحاظ سے حج کا وقت مقرر ہوگا اور دنیا کے تمام خطوں کے لوگوں کو اس کی اتباع لازم ہوگی۔

دوسری آیت

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ (البقرہ ۱۸۵)

سو جو کوئی تم میں سے مہینہ (رمضان) پا موجود ہو وہ اس کا روزہ رکھے۔

(تشریح) شھد کا مصدر الشہادۃ ہے اور اس کے معنی ہیں "الاخبار بصحۃ الشئ عن

مشاهدة وعيان، مشتقة من المشاهدة التي تنبئ عن المعاينة ۔ (عنایہ شرح ہدایہ فی اول کتاب الشہادات)، جس سے معلوم ہوا کہ شہادت کے مفہوم میں رویت (دیکھنا) ملحوظ ہے۔ اور مہینہ کا دیکھنا موقوف ہے چاند کے دیکھنے پر۔ اور چاند کا دیکھنا موقوف ہے اسکے افق پر موجود ہونے پر۔

اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "توحید اہلہ" کی صورت میں سارے عالم اسلامی میں "ہلال" کا علم تو حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تو من علم منکم الشہر ہوا۔ حالانکہ قرآن پاک نے من شهد منكم الشهر فرمایا ہے لہٰذا صرف علم کافی نہ ہوگا بلکہ اس سے مزید کسی چیز کی ضرورت ہوگی۔ اب اگر ہمارے مطلع پر چاند ہے ہی نہیں تو پھر اس کے دیکھنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے لہٰذا اس آیت پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جبکہ ہمارے مطلع پر چاند ہو ۔۔۔ بلکہ صرف وجود بھی کافی نہیں اس کا دیکھنا بھی شرط ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ

صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته، فان حالت دونه غياية فاكملوا ثلاثين۔ (کنز العمال)	چاند دیکھ کر روزہ شروع کرو اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو لیکن اگر ہلال کے ورے بادل آجائے اور وہ نہ دیکھا جا سکے تو پھر تیس دن کا شمار کر لو۔

بہرحال یہ آیت عبارۃ النص (ما سیق لاجلہ الکلام) نہیں ہے بلکہ لفظ شہد کے اشارہ سے مسئلہ مفہوم ہوتا ہے۔ عبارۃ النص سے تو مسئلہ یہ بیان ہو رہا ہے کہ جو ماہ رمضان میں موجود ہو اسے ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہیے۔ اور فدیہ کی اجازت جو اوپر مذکور ہوئی تھی منسوخ و موقوف کی گئی ہے۔ (بیان القرآن، تھانویؒ)۔ البتہ پہلی آیت عبارۃ النص ہے جیسا کہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے وكفى به قدوةً۔

جواب ۲

اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں ہے ۔۔۔ اس مسئلہ کو بیان کرنے والے فقہاء کرام تین ادوار میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ متقدمینؒ، زمانۂ وسطی کے فقہاء اور متاخرینؒ اور

تینوں زمانوں میں مسئلہ کی نوعیت علیحدہ علیحدہ رہی ہے ذیل میں اجمالاً اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

(الف) متقدمین کے یہاں اس میں اختلاف حقیقی ہے صرف لفظی اور تعبیری اختلاف نہیں ہے لیکن پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ ان کے نزدیک مسئلہ کی نوعیت کیا تھی؟

مطالع جمع ہے۔ مطلع کی جس کے معنی ہیں "طلوع کی جگہ" ـــ لیکن "اختلاف مطالع" کی بحث میں اس لفظ کے معنی میں وسعت کر دی گئی ہے یہاں "طلوع کی جگہ اور غروب کی جگہ" ترجمہ ہوگا ـــ اور یہ فقہاء کی اپنی اصطلاح ہے۔ لغت کا اس کے بالکل موافق ہونا ضروری نہیں۔

اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سورج کے طلوع و غروب کے نقاط اسی طرح چاند کے طلوع کا افقی نقطہ ہر مقام کے لیے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی دو مقام متحد المطلع نہیں ہوتے البتہ جو مقامات بہت ہی قریب ہوتے ہیں (مثلاً میل دو میل کے فاصلے والے مقامات) وہاں اس اختلاف کا فرق عام طور پر محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

فقہاء کرام نے پانچوں نمازوں کے اوقات اور یومیہ سحر و افطار میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے بلکہ اس پر امت کا اجماع ہے مثلاً ایک جگہ آفتاب غروب ہو گیا تو وہاں نماز مغرب شروع کی جا سکتی ہے اور اس سے مغربی مقام میں جہاں غروب میں ابھی ایک منٹ باقی ہے۔ مغرب کی نماز شروع کرنا جائز نہیں ہے۔ وقس علیٰ ہذا

اب سوال سامنے آتا ہے طلوع ہلال کا اور مشاہدہ یہ ہے کہ اس میں معمولی بُعد مسافت سے اختلاف مطالع نہیں ہوتا۔ پھر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیہات کے اعرابی کی رؤیت کو تسلیم کرنا بھی مروی ہے[1] نیز یہاں مطالع کے اختلاف کا اعتبار کرنا باعث حرج بھی ہے اور فلکیات کا سہارا بھی لینا پڑے گا جسے شریعت میں پسند نہیں کیا گیا[2] ـــ یہ تمام امور ملحوظ رکھتے ہوئے جمہور کی رائے یہ ہوئی کہ "طلوع ھلال" کے مسئلہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار نہ کیا جائے مثلاً ایک مقام پر رویت ہوئی تو اس مقام سے جانب مغرب جو جو مقامات ہوں گے وہاں رویت

---

[1] رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی مشکوٰۃ ص ۱۷۴ [2] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انا امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب الخ حوالہ مذکور

یقینی امر ہے لیکن مذکور مقام سے جو مقامات جانب مشرق واقع ہوں وہاں رویت اور عدم رویت دونوں احتمال ہیں لیکن جمہور نے مندرجۂ بالا وجوہ سے اس احتمال کو نظر انداز کر دیا۔ جمہور نے مسئلہ کی تعبیر اس طرح کی ہے۔ لا اعتبار لاختلاف المطالع فیلزم اهل المشرق برؤیۃ اهل المغرب الخ (در مختار) ۔ لیکن حضرات شوافع نے دقیقہ سنجی سے کام لیا اور فقہ کی مشہور اصل کہ "شک سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ثابت حکم ختم ہو سکتا ہے" پیش نظر رکھ کر اختلاف مطالع کا اعتبار کیا اور مذکور مقام کے مشرقی مقامات کے لیے اس رویت کو حجت نہیں مانا کیوں کہ احتمال سے نہ رمضان ثابت ہو سکتا ہے نہ ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ نہ تو دلائل کے اعتبار سے اس قول کو قوت مل سکتی تھی نہ ہی عملی آسانی سے اس کی تائید ہو سکتی ہے اس لیے بعض شوافع نے بھی مجبور ہو کر جمہور کی ہمنوائی اختیار فرمائی۔

یہاں یہ بات بالکل فراموش نہ ہونی چاہیے کہ مشرق و مغرب دو اضافی لفظ ہیں کوئی بھی دو بستیاں ایک دوسرے کے لیے مشرقی اور مغربی مقامات کہلائیں گی بعد میں ان لفظوں کے معنی میں جو وسعت ہوئی ہے وہ متقدمین کی عبارتوں میں ہرگز مراد نہیں لی جا سکتی۔

(ب) از منۂ وسطی میں آکر یہ مسئلہ فقہاء کرام کے اذہان کا آماجگاہ بن جاتا ہے اور فقہاء کرام تین طرح کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

وہ حضرات جنھوں نے مسئلہ کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا اور مشرق و مغرب (جو اضافی لفظ تھے) کا مفہوم بھی ان کے زمانہ میں بدل گیا کیونکہ اب مغرب سے اندلس اور مشرق سے ایشیا مراد لیا جانے لگا اور اس وسیع مفہوم پر "ظاہر روایت" کے الفاظ (فیلزم اهل المشرق برؤیۃ اهل المغرب) ان کو فٹ نظر نہ آئے تو وہ مجبور ہوئے اور ظاہر روایت کے حقیقی مفہوم کو وہ اچھی طرح سمجھ کر مسئلہ کی دوسری تعبیر کرنے لگے اور انھوں نے بلدان نائیہ اور قریبہ کی اصطلاح وضع کی اور ظاہر روایت کو انھوں نے بلدان قریبہ پر محمول کیا اور انہیں اختلاف مطالعہ کا اعتبار نہیں رکھا اور بلدان نائیہ میں مطالع کے اختلاف کے اعتبار کرنے پر قرآن و حدیث کی روشنی میں وہ مجبور ہو گئے۔

متقدمین میں اور فقہاء کرام کے اس طبقہ میں اختلاف صرف لفظی ہے جیسا کہ بیان ہو چکا

دوسرے وہ فقہاء ہیں جنھوں نے یا تو اس لیے کہ مشرق و مغرب کے مفہوم کو اتنی وسعت نہیں دی تھی یا کچھ اور وجوہ ہوں گے بہر حال وہ اسی راہ پر جمے رہے جو انھوں نے متقدمین کے کلام سے متعین کی تھی چنانچہ وہ بلدان شاسعہ اور قریبہ کا فرق کیے بغیر اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کرتے رہے۔

کچھ حضرات وہ بھی ہیں جن کے ذہن میں مشرق و مغرب کا بدلا ہوا مفہوم ہے اور اس سلسلہ میں ظاہر روایت کا اعتبار کرنے سے جو الجھنیں رونما ہوتی ہے اور قرآن و حدیث کے خلاف ظاہر روایت چلی جاتی ہے وہ اس سے بے خبر نہیں ہیں نیز بعض حضرات نے جو بلدان نائیہ اور قریبہ کی تقسیم کر کے ظاہر روایت کا مصداق بلدان قریبہ کو بنا دیا ہے اس سے بھی وہ مطمئن نہیں ہیں یا یہ کہ قدیم مسلک کے خلاف صاف صاف واضح اور غیر مبہم انداز میں اعلان کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں اس لیے یہ حضرات کچھ مبہم سی گول گول باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً در مختار کی مذکورہ عبارت پیش نظر ہوتے ہوئے بھی علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ رد المختار میں "عدم اعتبار اختلاف" کی مثال دوسری دی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"اگر مشرق میں جمعہ کی رات کو چاند دیکھا گیا اور مغرب میں سنیچر کی رات کو چاند دیکھا گیا تو کیا اہل مغرب پر اہل مشرق کی رویت کا اعتبار (جو ایک دن مقدم ہے) ضروری ہوگا؟ —— بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اختلاف کا اعتبار ہوگا اور ہر مقام کے لوگوں کے لیے ان کی اپنی رویت ہی حجت ہوگی۔ یہ زیلعی، صاحب فیض اور بعض شوافع کا مختار ہے لیکن ظاہر روایت یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ جسکی رویت سابق ہے اسی کا اعتبار ہوگا — مالکیہ، حنابلہ اور ہمارا یہی مختار ہے۔"

(رد المختار الی الدار المختار جلد ثانی بحث اختلاف مطالع)

حالانکہ علامہ نے جو مثال فرض کی ہے اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے کیونکہ جب چاند سورج سے بوقت غروب ایک خاص مقدار سے منفصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی رویت ہوتی ہے لہٰذا اس کے بعد والے مغربی ممالک میں چاند لامحالہ موجود ہوگا کیونکہ چاند کا انفصال بڑھتا ہی جائے گا —— اور جب افق پر چاند کا وجود قطعی طور پر ہے تو اب اہل مشرق کی خبر ان کو

لامحالہ ماننا ہوگی۔

اختلاف اس کے برعکس صورت میں ہے جو در مختار کی عبارت میں مذکور ہے لیکن علامہ نے اس مثال کو چھیڑا ہی نہیں ـــــ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مثال اُلٹ کر مسئلہ کو بالکل ہلکا کردینا چاہتے ہیں یا ظاہر روایت ان کے خیال میں جو اُلجھن پیدا کر رہی ہے وہ اس کا صاف محمل تیار فرما رہے ہیں۔

مذکور تفصیل سے واضح ہو چکا ہوگا کہ اس دور کی ان تینوں جماعتوں میں اختلافِ حقیقی ہے لیکن پہلی جماعت اور ظاہر روایت کے درمیان اختلاف صرف لفظی ہے۔

(ج) تیسرا دور متاخرین فقہاء کا ہے۔ اس دور میں مشرق و مغرب کے ایک نئے معنی جغرافیہ والوں نے وضع کر لیے ہیں اور آج کے ہر فقیہہ کے ذہن میں مشرق و مغرب کے تقریباً وہی معنی ہیں جو آج کا جغرافیہ نویس لکھتا ہے۔

بہر حال متاخرین فقہاء کے یہاں بھی وہ تین جماعتیں موجود ہیں جو دوسرے دور میں تھیں۔ کوئی آج کے جغرافیہ کی اصطلاح ذہن میں رکھ کر ظاہر روایت کو مستدل بنا کر بانگ دہل کہتا ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے اور مغرب یعنی امریکہ اور بلاد افریقہ کی رویت جب اہل مشرق یعنی ہند و چین میں طریق موجب سے پہنچ جائے تو اس کا اعتبار ضروری ہے لیکن یہ مفتی زمانہ خوب جانتا ہے کہ اگر ایسا عمل ہونے لگا تو قرآن و حدیث کی صریح خلاف ورزی ہوگی اس لیے وہ بضد ہے کہ فتویٰ تو اس کا وہی رہے لیکن عملاً وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے اسلیے اس نے سہارا لیا طریق موجب کا۔ اور وہ ریڈیو ٹیلی وژن ٹیلیفون وغیرہ جدید ذرائع خبر رسانی سے علم حاصل ہونے کا قطعاً انکار کر دیتا ہے۔ دنیا کے دیگر تمام معاملات میں اس کو ان ذرائع سے علم حاصل ہو سکتا لیکن نہیں حاصل ہو سکتا تو صرف اس مسئلہ میں نہیں حاصل ہو سکتا فیا للعجب! لیکن اب تو ہوائی جہاز اور راکٹ تیار ہو گئے ہیں اور خود چاند دیکھنے والا رات بھر میں سب جگہ سفر کر کے اطلاع کر سکتا ہے اور شہادت دے سکتا ہے۔ ممکن ہے اب یہ کہا جانے لگے کہ طریق موجب یہ ہے کہ چاند دیکھنے والا پیدل چل کر آکر گواہی دے!

دوسری جماعت متاخرین فقہاء کی وہ ہے جو بلدان شاسعہ میں اختلاف کا اعتبار

کرتی ہے اور قریبہ میں نہیں کرتی اور ظاہر روایت کا محمل وہ اسی کو قرار دیتی ہے اور بلدان نائیہ کا مسئلہ ایک بالکل جدید مسئلہ قرار دیتی ہے اور اس کا حکم قرآن و حدیث سے اخذ کرتی ہے۔

اسی طرح مذبذبین کی ایک جماعت بھی آج موجود ہے وہ حیران ہے کہ کیا کرے ظاہر روایت جو اس کے خیال میں عام ہے چھوڑے یا پھر توحید اھلہ کی صدا بلند کرے حالانکہ قرآن پاک کی نصوص، احادیث اور صحابہ کا عمل ـــ (ہماری مراد حضرت کریب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے جس میں انھوں نے حضرت معاویہؓ کی شب جمعہ کی رویت کی اطلاع حضرت ابن عباسؓ کو دی تھی لیکن انھوں نے اپنی سنیچر والی رویت ہی کا اعتبار کیا اور فرمایا ھکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) بلدان نائیہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار کرنے کے بارے میں نص قطعی ہیں

اب رہ جاتا ہے سوال ممالک شاسعہ اور قریبہ کی تعین کا تو اس سلسلہ میں احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ حساب و تجربہ سے جن دو جگہوں میں تاریخیں نہیں بدلتی وہ تمام ممالک قریبہ ہیں اور جہاں کی تاریخیں ہمیشہ الگ رہتی ہیں یا گاہے گاہے بدل بھی جاتی ہیں وہ ممالک بعیدہ اور شاسعہ ہیں۔

بہرحال یہ ہے اختلاف مطالع کے اعتبار کرنے نہ کرنے کے سلسلہ میں تفصیل ـــ سال بھر ہوا حضرت مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک سوال آیا تھا اس میں ضمنی سوال یہ بھی تھا اس کے جواب میں میں نے عرض کیا تھا کہ

"متقدمین فقہاء احناف نے جو فرمایا تھا لا اعتبار لاختلاف المطالع اسمیں اس ہیچ میرز کے خیال میں فقہاء متاخرین نے مراد متکلم سے زیادہ عموم پیدا کر دیا ہے۔"

وہ تفصیل کا محل نہیں تھا اسلیے بات مجمل کہی گئی تھی آج اللہ کے فضل سے اسکی تفصیل ہو گئی کہاں "دو ادل کے شرق و مغرب" کا سیدھا سادہ مفہوم اور کہاں آج کے جغرافیہ کی وضع کردہ اصطلاح؟ متقدمین کی اصطلاح کو اس قدر وسعت دینا کیسے جائز ہے؟

جواب ۳۔ ہندو پاک کے حنفیہ کے لیے ہی نہیں بلکہ کسی بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ مصر، ترکی کے دیکھے ہوئے چاند کی خبر پر عمل کرے خواہ کیسے ہی قوی ترین ذرائع سے وہ خبر کیوں نہ پہونچ جائے۔ اللھم اھدنا فیمن ھدیت۔ وصل وسلم علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

نئی مطبوعات

حیات عبد الحیؒ
مصنف۔ مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی
صفحات۔ ۴۴۸۔ قیمت مجلد گیارہ روپیہ۔ غیر مجلد دس روپیہ۔
ناشر:- ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔ کتابت و طباعت بہت بہتر۔

گزشتہ نسل کی علم دوستی کی یاد تازہ کرنا اس زمانے میں اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ یہ زمانہ تقریباً علم دشمنی کا ہے۔ وہ چیز جس کو انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل نے علم سے "غیر شخصی دل چسپی" کے نام سے یاد کیا ہے جدید اور قدیم طرز کے حلقوں سے تیزی سے رخصت ہو چکی ہے۔ یہ سانحہ اتنی حیرت انگیز تیزی سے رونما ہوا ہے کہ کبھی کبھی یہ یقین ہی نہیں آتا کہ اس صدی کے نصف اوّل میں علوم وفنون سے علمی شغف رکھنے والے نہ صرف موجود تھے بلکہ بکثرت موجود تھے۔

اسی نسل کے ایک فرد مولانا حکیم سید عبد الحیؒ حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء بھی تھے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنے ان نامور باپ اور اپنے باکمال بھائی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کے کے حالات پر قلم اٹھا کر در اصل اس گزشتہ نسل کے ذہن اور اس کے ذوق عمل کا خاکہ کھینچا ہے جس نے ہندستان پر مغربی طرز فکر کی یورش کے زمانے میں مشرقی اور اسلامی علوم کی بقا و اشاعت کا بڑا کام کیا تھا۔ یہ کام یوں تو بے شمار افراد نے مختلف محاذوں پر انجام دیا لیکن ان میں فکر و جذبے کی ایسی ہم آہنگی تھی کہ کسی فرد کا تذکرہ گویا اس پوری نسل کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صدی کے نصف اول تک ہمارے تمدن و تہذیب پر شکست و ریخت کا عمل پورا

نہیں ہوا تھا۔ روایتوں کا وہ سلسلہ سلامت تھا جس کے بل پر افراد کے ذہن اور سیرت کی تعمیر اس طرح ہوتی رہتی تھی کہ حال کا رشتہ ماضی سے یکسر منقطع نہیں ہوتا تھا۔

حیات عبدالحئی میں مصنف نے زیر نظر شخصیت کا تجزیہ کرنے میں خاندانی اثرات، ابتدائی زندگی پر پڑنے والی پرچھائیوں، تعلیم و تدریس کے احوال کا جائزہ دو ابتدائی ابواب میں لیا ہے۔ تیسرا باب بیعت و ارادت، دینی مرکزوں کے اسفار اور اس دور کے مشائخ و علمار سے استفادے کی تفصیل کے لیے وقف ہے چوتھے اور پانچویں میں اصلاحی اور علمی سرگرمیوں سے ابتدائی دلچسپی سے لیکر ندوۃ العلماءؑ کی تحریک سے مولانا سید عبدالحئی کی دلچسپی، اس کے اہتمام و انصرام میں شرکت پھر طلبا کی ہڑتال۔ (جس کا اصل سبب مولانا شبلی سے ارباب ندوہ کے ذہنی اور مزاجی اختلاف تھے) کا بڑا غیر جانبدارانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ نازک مرحلہ ہے جہاں ندوہ کی تاریخ لکھنے والوں میں سب کے قلم ڈگمگا جاتے ہیں اور توازن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ مصنف کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے باب پنجم میں اس ٹکراؤ اور اس کے اسباب و عوامل کو بلا کم و کاست بیان کرنے کے باوجود بے جا جانبداری کی ایک چھینٹ بھی اپنے دامن پر نہیں پڑنے دی۔ اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جن کو یہ اندازہ ہے کہ شبلی کی حمایت و مخالفت کی منظم تحریکوں کا سلسلہ اب بھی برقرار ہے اور آج کے ندوۃ العلمار کے لیے بھی ان تحریکوں کے مضمرات کیا ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے یہ ۲۳ صفحات دراصل ندوۃ العلمار کی تحریک، اس کے نتیجہ میں اس ادارے کے قیام اور اس کے مقاصد کی تکمیل اور عدم تکمیل کے بارے میں ایسے لکھ دیے ہیں کہ بین السطور سب کچھ آگیا ہے۔

حیات عبدالحئی میں باب نہم ہندوستان کی دینی و علمی عظمت، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کی تدوین اور اس سلسلے میں مولانا سید عبدالحئی کی گراں قدر قلمی کاوشوں کے احوال سے لبریز ہے اور یہی وہ مرکزی نکتہ ہے جس پر زیر نظر شخصیت پر قلم اٹھانے والوں کی توجہ ہونی چاہیے۔ مولانا عبدالحئی حسنی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنی گوناگوں دلچسپیوں، سرگرمیوں اور مصروفیات کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب، ان کے علوم و فنون، ان کی ذہنی اور قلمی کوششوں کے بارے میں ساری زندگی اس نوعیت کی توجہ برقرار رکھی جس کو برٹرینڈ رسل نے "غیر شخصی دلچسپی" کہا ہے۔ اس "غیر شخصی دلچسپی" کا سب سے بڑا نتیجہ تو وہ ہے جو تقریباً

ساڑھے چار ہزار مشاہیر و رجال کے حالات پر "نزہۃ الخواطر" کی آٹھ جلدوں کی شکل میں مصنف کی وفات کے بہت بعد دنیا کے سامنے آیا۔ ہندوستان کے مسلمان دانشوروں کے ایک بے حد سود مند دائرۃ المعارف کی حیثیت سے "نزہۃ الخواطر" کو اولیت کا شرف بھی حاصل ہے اور ابھی مدتوں تک اس کے بعد کی منزلوں پر کوئی کام ہونے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ اکیلی یہ کتاب ہی ایک پورے علمی ادارے کے ہاتھوں مرتب ہونے کی تھی مگر علم سے "غیر شخصی دلچسپی" نے اس محال کو ممکن کر دکھایا۔ یہ کتاب مصنف کی ساری عمر کی محنت، دیدہ ریزی اور لاتعداد غیر متعلقہ تحریروں کے علاوہ تراجم و احوال کی تقریباً تین سو کتابوں کی ورق گردانی کا نتیجہ ہے جن کی بہت بڑی تعداد نایاب اور نادر قلمی کتابوں پر منحصر تھی۔ اسی سلسلے میں مولانا عبدالحی حسنی نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و تدریس کے نصاب، اس کے ارتقا اور تبدیلیوں کی تاریخ بھی "معارف العوارف" میں قلمبند کی اور ہندوستانی مسلمانوں کے تاریخی، تہذیبی اور تمدنی آثار پر "جنۃ المشرق" بھی لکھی۔ ان دو کتابوں کو "نزہۃ الخواطر" سے ہم جہت سمجھنا چاہیے۔

باب دہم میں مولانا سید عبدالحی حسنی کی کتاب "گل رعنا" اور دیگر تحریروں کا جائزہ ہے۔ "گل رعنا" کی وجہ سے محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا بڑا ازالہ ہوا ہے اگرچہ خود "گل رعنا" کے مصنف نے اس کی تصنیف بیماری کے زمانہ میں محض دل بہلانے کے شغل کے طور پر کی تھی۔

اس کے بعد ضمیمہ کے طور پر مولانا عبدالحی کے فرزند اول اور خود مصنف کے برادر بزرگ، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی ایک سوانح ہے جس میں ان کی دلآویزی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس سب سے بڑے کارنامے کا ذکر اس میں فطری طور پر نہیں آ سکا کہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی تربیت و تعلیم اس طرح کی کہ آج علی میاں جو کچھ ہیں اس میں بڑا حصہ ان ہی کا ہے۔

کوئی کتاب اپنی جگہ حرف آخر نہیں ہوتی۔ زیر نظر کتاب بھی مولانا سید عبدالحی حسنی کے شاگردوں کے پورے جائزے سے خالی ہے۔ مثال کے طور پر ان سے باقاعدہ استفادہ کرنے والوں میں ایک معروف بزرگ حکیم بہاء الدین گوپاموی کا ذکر چھوٹ گیا ہے جو اپنے استاد

کی طرح تاریخ کا غیر معمولی مذاق رکھتے تھے اور گویا سو کی علمی اور تاریخی مرکزیت پر ایک مفصل اور ضخیم تالیف اور علماء وصوفیا کی کئی سوانح عمریوں کے مصنف تھے۔ (از۔ حسن واصف عثمانی)

شواہد تقدس | از مولانا سید محمد میاں صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی
صفحات ۲۶۴ سائز ۱۸×۲۲/۸ کتابت وطباعت اعلیٰ۔ مجلد قیمت ۶/-
ناشر:- کتابستان۔ گلی قاسم جان۔ دہلی۔۶

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت بڑی مظلوم ہے۔ حالانکہ آپ کے اور سب شواہد عظمت سے قطع نظر صرف اسی ایک پہلو پر اگر توجہ دی جائے کہ اپنے وقت کی سب سے عظیم سلطنت کا سربراہ ہوتے ہوئے اور اس بات کی طاقت رکھتے ہوئے کہ ایک اشارہ پر بڑے بڑے لشکر حرکت میں آجائیں کس ضبط نفس کے ساتھ اپنی شہادت گوارا کرلی اور مسلمانوں کے درمیان خونریزی کا جو ماحول تیار ہوچکا تھا اس میں حصہ دار ہونے سے بچنے کے لیے کسی کو ایک انگلی تک بھی اپنے خون کے پیاسوں کے مقابلے میں ہلانے کی اجازت نہیں دی تو آپ کی سیرت کا صرف یہی ایک پہلو اس بات پر حیران کردینے کے لیے کافی ہے کہ کیسے کسی کو اس شخصیت کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرنے کی ہمت ہوتی ہے جو بہت کمزور کردار کے لوگوں ہی سے ممکن ہیں۔

منجملہ اور لوگوں کے ہمارے دور میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بھی شروع سے اس بات کے مدعی ہیں کہ بحیثیت خلیفہ کے حضرت عثمان کے کردار میں بعض خامیاں تھیں جن کی بدولت اسلام کو بڑا نقصان پہنچا۔ اپنے اس نقطۂ نظر کو زیادہ تفصیل کے ساتھ موصوف نے اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں پیش کیا ہے۔ جو ابھی چند سال پہلے شائع ہوئی ہے اور رد وقدح کا ایک نیا اکھاڑہ تیار کردینے کا باعث ہوئی، مولانا سید محمد میاں صاحب کی یہ زیر تبصرہ کتاب اسی کے جواب میں ہے۔

بدقسمتی سے ہمیں اب تک مولانا مودودی کی تصنیف کا مطالعہ میسر نہیں آیا ہے اس لیے اپنی ذمہ داری پر یہ کہنا تو ہمارے لیے مشکل ہے کہ اس کے جواب کی حیثیت سے زیر تبصرہ کتاب کا مرتبہ کیا ہے، البتہ خود اسی کتاب سے مولانا مودودی کے دعووں اور دلائل کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اس کی رو سے جواب نہایت وقیع اور بلند پایہ ہے لہجہ البتہ کچھ زیادہ سخت اور تلخ ہوگیا ہے۔

جوابی حیثیت سے قطع نظر کر کے اس لحاظ سے تو کتاب بلاشبہ بہت ہی قیمتی ہے کہ اس کے ساتھ صحت کی روشنی میں حضرت عثمان مظلوم رضؓ کی شخصیت اتنی ہی بے داغ نظر آنے لگتی ہے جتنا اُسے نصوص کتاب و سنت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ بڑے عرصے سے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جسے ایک حد تک اس کتاب نے پورا کردیا ہے۔ اس قلم سے اگر ایک "سیرت عثمان رضؓ" نکل جائے تو اُمید ہے کہ یہ ضرورت بھرپور طریقے سے پوری ہو جائے گی۔

(ع۔ س)

حضرت مولانا سید محمود مدنیؒ ۔ بقیہ صفحہ

حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مد تھی۔ سارا نظام حکومت گویا اسی سے چلتا تھا۔ اور مہینوں کی چڑھی تنخواہیں موسم حج کے خاتمہ پر اسی ٹیکس سے ادا ہوتی تھیں۔ بادشاہ سلطان ابن سعود کو حجاز کے بعض دولت مندوں سے قرض بھی لینا پڑتا تھا اور موسم حج آنے پر ہی اس کی ادائیگی ہوتی تھی۔ اور پھر وہ دور دیکھا جب تیل کے چشموں کی دریافت کے بعد دولت کی ریل پیل ہو گئی ——— بہرحال مولانا سید محمود صاحب حجاز مقدس کی گزشتہ پون صدی کے انقلابات اور مادی و روحانی ترقیات و تنزلات کی زندہ تاریخ تھے اور حافظہ ایسا تھا کہ اس طویل مدت میں جو کچھ گزرا تھا وہ ایک کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے رہتا تھا۔

ہم جیسے لوگوں کے لیے مولانا موصوف کی ذات میں محبت اور کشش کی ایک خاص چیز یہ تھی کہ چہرہ بشرے میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے بہت زیادہ مشابہت تھی، اور آواز و لب و لہجہ میں تو اس قدر یکسانیت تھی کہ ہم لوگ بالکل یہی محسوس کرتے تھے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ گفتگو فرما رہے ہیں ——— اب اللہ کے حکم سے وہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔

اللّٰھم اغفرلہٗ وارحمہٗ رحمۃ الابرار الصالحین

تذکرۂ مجدد الف ثانی
"مجدد الف ثانی نمبر الفرقان" کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی
شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک
صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دو ہزار سالہ (از ۱۰۰۱ھ تا ۲۰۰۰ھ) کا مجدد امت نے
مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں اس عرصہ میں خاصکر
اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور انکے دینی
تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے "الف ثانی" کے
مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعے سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانی کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپکے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
صفحات … سائز متوسط … قیمت
کتب خانۂ الفرقان لکھنؤ

Rs. 5-00

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.
VOL 39 NO. 5 Regd. No. L-353

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

قرآن آپ سے — کیا کہتا ہے؟
تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے، یہاں تک کہ اسکو "کلامِ الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
یہ کتاب
اسی صورتِ حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جسمیں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجازِ بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/۰
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۶۰ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵ پیسے

جلد ۳۹ | بابت ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۱ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۷۱ء | شمارہ (۶)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ر اگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہو گا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور کو بھیجکر ہم کو اطلاع دیدیں۔ صرف ان ہی حضرات کو رسالہ بھیجا جا رہا ہو جنھوں نے ہمارے خط کے جواب میں لکھا ہو کہ انکو رسالہ برابر مل رہا ہو باقی تمام حضرات کا رسالہ فی الحال بند رہے گا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہو۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو، اگر ۱۰ر تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں انکی اطلاع ۱۵ر تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ؕ

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔

قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ (الانعام ع ۶)

اے پیغمبر ان کو بتلادو اور جتلادو کہ وہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے (یعنی فضاء آسمانی سے) عذاب بھیج دے یا تمہارے پیروں کے تلے سے (یعنی زمین ہی سے) کوئی عذاب برپا کر دے یا ایسا کر دے کہ تم کو دستحاوت (گروہوں اور پارٹیوں میں تقسیم کر دے اور آپس میں ٹکرا دے اور پھر ایک دوسرے کو اپنی ملہ کا مزا چکھائے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا ہی میں آسکنے والے اور بھیجے جانے والے تین قسم کے عذابوں سے ڈرایا گیا ہے جن میں آخری یہ ہے کہ کوئی قوم گروہوں اور پارٹیوں میں تقسیم ہو جائے اور پھر وہ آپس میں ٹکرائیں اور ایک دوسرے کا خون بہائیں ــــ یہ وہ عذاب ہے جو قرآن ہی کے بیان کے مطابق اگلی امتوں یہود و نصاریٰ پر بھی بھیجا گیا جب انھوں نے ایمان کے عہد و میثاق اور اپنے پیغمبروں کی تعلیم و ہدایت کو پس پشت ڈالکر خدا فراموشی اور نافرمانی کی زندگی اختیار کی ــــ نصاریٰ کے بارے میں سورہ مائدہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَمِنَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَهُمۡ فَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ فَاَغۡرَيۡنَا بَيۡنَهُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ

اور جو لوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں اُن سے ہم نے (ایمان پر قائم رہنے اور احکام پر چلنے کا) عہد لیا تھا اور ان کو نصیحت کی گئی تھی) پھر انھوں نے ہماری ان نصیحتوں کا بڑا حصہ بالکل فراموش کر دیا تو ہم نے (اس کی پاداش میں) اُن میں باہم

(المائدہ ع۱۴) | بغض و عداوت کی آگ بھڑکا دی (اور اُن پر خانہ جنگی کا عذاب مسلط کر دیا)[1]

اور اسی سورہ میں آگے یہودیوں کی بدکاریوں، نفس پرستیوں اور اعتقادی گمراہیوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے۔

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ (المائدہ ع۷)

اور ہم نے (اُن کے اِن کرتوتوں کی وجہ سے) قیامت تک کیلئے انکو باہمی بغض و عداوت کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔[2]

ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپس میں کشت و خون اور قتل و غارتگری کا یہ عذاب خاصکر کتاب و پیغمبر پر ایمان لانیوالی کسی قوم اور امت پر جب ہی بھیجا جاتا ہے جب اسمیں اجتماعی اور قومی پیمانہ پر خدا فراموشی، محاسبۂ آخرت سے بے فکری اور اپنے پیغمبر کی لائی ہوئی ہدایت اور اسکے احکام سے انحراف پیدا ہو جائے۔ اسکے علاوہ بھی قرآن مجید میں جا بجا فرمایا گیا ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ،

یہ حقیقت ہے کہ اللہ کیطرف سے لوگوں پر ظلم نہیں ہوتا (یعنی وہ بے قصور کسی قوم کے حالات خراب نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود ہی (اپنی بداعمالیوں سے خدا کے عذاب کو دعوت دیکے) اپنے پر ظلم کرتے ہیں (اسلیے وہ خود ہی اپنے ظالم ہیں)

قرآن مجید کے ان صاف صریح بیانات کو سامنے رکھکر اب ذرا آج کے عالم اسلامی پر نگاہ ڈالیے اسی مہینہ (جولائی کے صرف ایک ہفتہ عشرہ کے اندر اندر مراکش، اردن اور پھر سوڈان میں جو کچھ ہوا جسمیں بعض دوسرے اسلامی ممالک بھی (علانیہ یا درپردہ) شریک رہے۔ اور کہنے کو سب سے بڑی خداداد اسلامی مملکت" پاکستان کے شرقی حصہ میں شروع مارچ سے اب تک جو کچھ ہو رہا ہے اور جسطرح مسلمان کہلانیوالوں کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کہے جانیوالوں کا خون بہا اور بہہ رہا ہے کیا قرآن مجید پر ایمان اور اسکی سچائی پر یقین رکھتے ہوئے اس سب کی کوئی توجیہ اسکے سوا کی جا سکتی ہے کہ یہ خداوند قہار کا قہر و عذاب ہے، جو خدا فراموشی محاسبۂ آخرت سے بے فکری اور دین و شریعت سے بے پرواہ نفس پرستانہ زندگی کی (باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ ہو)

---

[1] عیسائیوں میں پہلے مذہبی عقائد کی بنیاد پر صدیوں تک جو خونریزیاں ہوئیں اور اس کے بعد سیاسی اور اقتصادی، اختلافات کے نتیجہ میں جو جنگیں ہوئیں، تاریخ ان کی تفصیلات سے بھری پڑی ہے۔ ۱۲

[2] یہودیوں میں صدیوں تک جو خانہ جنگی برپا رہی ہے اس کی تفصیلات ان کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے ۱۲

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

کھانے پینے کے آداب

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُمت کے لیے اشیاء خورد و نوش کے بارے میں حلت و حرمت کے احکام بھی بیان فرمائے اور کھانے پینے کے آداب بھی تبلائے جن کا تعلق تہذیب و سلیقہ اور وقار سے ہے، یا ان میں طبی مصلحت ملحوظ ہے یا وہ اللہ کے ذکر و شکر کے قبیل سے ہیں اور ان کے ذریعہ کھانے پینے کے عمل کو جو بظاہر خالص مادی عمل ہے اور نفسِ حیوانی کے تقاضے سے ہوتا ہے، روحانی و نورانی اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ کی گزشتہ تین قسطوں میں جو احادیث درج ہوئیں اُن کا تعلق اشیاء خوردنی و نوشیدنی کی حلت و حرمت سے تھا، آگے وہ حدیثیں درج کی جا رہی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کے آداب کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے —— ان حدیثوں میں ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کھانے پینے کے جن آداب کی تعلیم و تلقین فرمائی گئی ہے اُن کا درجہ استحباب اور استحسان کا ہے، اس لیے اگر اس پر عمل نہ ہو تو کوئی گناہ کی بات نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا:-

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَرَأْتُ فِي التَّوْرَاةِ اَنَّ بَرَكَةَ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ

بَعْدَہٗ فَذَكَرْتُ ذَالِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَرَكَةُ الطَّعَامِ الْوُضُوْءُ قَبْلَهٗ وَالْوُضُوْءُ بَعْدَهٗ ـــــ رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے کے بعد ہاتھ منھ دھونا باعثِ برکت ہے ـــ میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی، تو آپ نے فرمایا کہ کھانے سے پہلے اور اس کے بعد ہاتھ اور منھ کا دھونا باعث برکت ہے۔ (جامع ترمذی، ابوداؤد)

(تشریح) قرآنِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تعلیم و ہدایت اگلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ آتی رہی اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی تکمیل فرمائی ہے (اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ) اس کی روشنی میں حدیث کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تورات میں آدابِ طعام کے سلسلے میں صرف کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کو باعثِ برکت بتلایا گیا تھا اور اس کی ترغیب دی گئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کھانے سے پہلے بھی ہاتھ اور منھ دھو لینے (یعنی کلی کر لینے) کی ترغیب دی گئی، اور آپ نے بتلایا کہ یہ بھی موجب برکت ہے۔

برکت بڑا وسیع المعنیٰ لفظ ہے ـــ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں اسی حدیث اور کھانے میں برکت کے سلسلہ کی بعض دوسری احادیث کا حوالہ دے کر جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی کھانے میں برکت ہونے کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ غذا کا جو اصل مقصد ہے وہ اچھی طرح حاصل ہو، کھانا رغبت اور لذت کے ساتھ کھایا جائے، طبیعت کو سیری نصیب ہو، جی خوش ہو، اور دلجمعی حاصل ہو اور تھوڑی سی مقدار کافی ہو اور اس سے صالح خون پیدا ہو کر جزو بدن بنے اور اس کا نفع دیرپا ہو، پھر اس سے نفس کی طغیانی اور غفلت نہ پیدا ہو بلکہ شکر اور طاعت کی توفیق ملے ـــ در اصل یہ سب اس حقیقت کے آثار ہیں جس کو حدیث میں برکت کہا گیا ہے، اور کنز العمال میں معجم اوسط طبرانی کے حوالے سے حضرت عبداللہ ابن عباس کی روایت سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ منھ دھونا دافع فقر ہے اور انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے۔" اس کے علاوہ یہ بات بھی بالکل ظاہر ہے کہ صفائی اور اصولِ صحت کا تقاضا بھی یہی ہو کہ

ہاتھ اور منہ جو کھانے کے آلے ہیں، کھانے سے پہلے بھی ان کو دھو کر اچھی طرح ان کی صفائی کر لی جائے — اور پھر کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی دھو کر صاف کر لیا جائے۔[1]

حضرت سلمان فارسی کی اس حدیث میں بلکہ اس سلسلہ کی اکثر دوسری حدیثوں میں بھی ہاتھ اور منہ دھونے کے لیے "وضو" کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے اس سے وہ وضو مراد نہیں ہے جو نماز کے لیے کیا جاتا ہے، بلکہ بس ہاتھ منہ دھونا ہی مراد ہے، دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نماز کا وضو تو وہ ہے جو معلوم و معروف ہے اور کھانے کا وضو بس یہ ہے کہ ہاتھ اور منہ جو کھانے میں استعمال ہوتے ہیں اُن کو دھو لیا جائے اور ان کی صفائی کر لی جائے بعض حدیثوں میں اس کی تصریح بھی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ بَاتَ وَفِیْ یَدِهٖ غَمَرٌ لَمْ یَغْسِلْهُ فَاَصَابَهٗ شَیْئٌ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ۔ ——— (رواہ الترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی رات کو اس حال میں سو جائے کہ اُس کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی کا اثر اور اُس کی بو ہو اور اس کی وجہ سے اسے کوئی گزند پہونچ جائے (مثلاً کوئی کیڑا کاٹ لے) تو وہ بس اپنے ہی کو ملامت کرے (اور اپنی ہی غلطی اور غفلت کا نتیجہ سمجھے)

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

تشریح) اس حدیث کا مدعا اور تقاضا یہی ہے کہ کھانے کے بعد خاصکر جب ہاتھ میں چکنائی وغیرہ کا اثر ہو تو ہاتھوں کو اس طرح دھو لیا جائے کہ اس کا اثر باقی نہ رہے — اور چونکہ یہ صرف استحبابی حکم ہے اس لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی اس کے خلاف بھی عمل فرمایا جیسا کہ اگلی حدیث سے معلوم ہوگا۔

کھانے کے بعد صرف ہاتھ پونچھ لینا:-

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ اُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِخُبْزٍ وَلَحْمٍ وَهُوَ فِی الْمَسْجِدِ فَاَکَلَ وَاَکَلْنَا مَعَهٗ

[1] ظاہر ہو کہ یہ حکم اسی صورت میں ہوگا جبکہ کھانے میں ہاتھ استعمال کیا جائے۔ اگر بالفرض ہاتھ نہ لگے مثلاً چمچہ ہی سے کھایا جائے تو یہ حکم نہ ہوگا۔

ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى وَصَلَّيْنَا مَعَهٗ وَلَمْ نَزِدْ عَلٰى اَنْ مَسَحْنَا اَيْدِيَنَا بِالْحَصْبَاءِ۔

رواہ ابن ماجہ

حضرت عبد اللہ بن الحارث بن جزء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، کسی شخص نے آپ کی خدمت میں روٹی اور گوشت لاکر پیش کیا، آپ نے مسجد ہی میں تناول فرمایا اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ کھایا، پھر آپ اور آپ کے ساتھ ہم بھی نماز کے لیے کھڑے ہوگئے، اور (اس وقت) اس سے زیادہ ہم نے کچھ نہیں کیا کہ اپنے ہاتھ بس سنگریزوں سے پونچھ ڈالے (جو مسجد میں بچھے ہوئے تھے)

(سنن ابن ماجہ)

تشریح) اس حدیث کے راوی حضرت عبد اللہ بن الحارث کا مقصد اس واقعہ کے بیان کرنے سے بظاہر یہی ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے ساتھ آپ کے اصحاب کرام نے کھانا کھایا اور اس کے بعد ہاتھ نہیں دھوئے۔ جیسا کہ شارحین حدیث نے لکھا ہے یہ بات قرین قیاس ہے کہ آپ نے یہی بات ظاہر کرنے کے لیے (کہ کھانے کے بعد ہاتھ منھ دھونا کوئی فرض و واجب نہیں ہے اور اس کے بغیر نماز بھی پڑھی جاسکتی ہے) یہ عمل کیا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کو رخصت اور جواز کے حدود بتلانے کے لیے بسا اوقات اولیٰ اور افضل کو ترک کر دیتے تھے، اور معلم اور ہادی ہونے کی حیثیت سے ایسا کرنا آپ کے لیے ضروری تھا ——
اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ بظاہر واقعہ اس طرح پیش آیا کہ نماز کے لیے کھڑے ہونے کا وقت قریب تھا، صحابہ کرام بھی نماز کے لیے مسجد میں آچکے تھے، اُس وقت کوئی صاحب آپ کی خدمت میں کچھ کھانا روٹی اور گوشت لے آئے، ممکن ہے بلکہ اغلب یہی ہے کہ حاضرین مسجد میں کچھ وہ بھی ہوں جو بھوک میں مبتلا ہوں اور ان کو کھانے کی اشتہا ہو، ایسی صورت میں آپ نے مناسب یہی سمجھا کہ کھانا نماز سے پہلے ہی کھا لیا جائے، آپ نے صحابہ کرام کو بھی شریک فرمالیا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سب نے بھر پیٹ تو کھایا نہ ہوگا، تبرک کے طور پر کم و بیش کچھ حصہ لے لیا ہوگا۔ اس لیے ہاتھوں پر کھانے کا کچھ زیادہ اثر بھی نہ آیا ہوگا —— پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ مسجد شریف میں پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا، اگر اس وقت ہاتھ دھونا ضروری سمجھا جاتا تو لوگوں کو اپنے گھروں پر جانا پڑتا —— راقم سطور کا خیال ہے کہ ہاتھ نہ دھونے

میں ان تمام باتوں کا کچھ نہ کچھ دخل ہوگا۔ واللہ اعلم ـــــ

حدیث میں سنگریزوں اور کنکریوں سے ہاتھ صاف کرنے کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت ایسا ہی کیا، اس سے یہ بھی رہنمائی ملی کہ کھانا کھا کر تولیہ یا کاغذ یا کسی بھی ایسی چیز سے ہاتھ صاف کیے جا سکتے ہیں جس سے ہاتھوں کی صفائی ہو جائے اور ایسا کرنا بھی سنت کے دائرہ ہی میں ہوگا۔

کھانے سے پہلے اللہ کو یاد کیا جائے اور اُس کا نام لیا جائے :-

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ فَإِنْ نَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اللّٰهَ فِي أَوَّلِهِ فَلْيَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ ـــــ ابوداؤد والترمذی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی کھانا کھانے کا ارادہ کرے تو چاہیئے کہ اللہ کا نام لے (یعنی پہلے بسم اللہ پڑھے) اور اگر شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو بعد میں کہہ لے "بِسْمِ اللّٰهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ"۔ (سنن ابی داؤد وجامع ترمذی)

تشریح) ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام پاک لینا باعث برکت ہے، اور جیسا کہ دوسری احادیث میں صراحۃً وارد ہوا ہے اس نام پاک کی یہ بھی ایک خاص تاثیر ہے کہ پھر شیاطین پاس نہیں آتے، اس لیے وہ کھانا جس پر اللہ کا نام لیا جائے شیاطین کی شرکت اور ان کے شر سے محفوظ رہے گا۔ اس کے علاوہ اس تعلیم وہدایت کا یہ بھی ایک مقصد ہو کہ بندہ کے سامنے جب کھانا آئے تو اس حقیقت کو یاد کرلے کہ یہ کھانا اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا عطیہ ہے اور اسی کے کرم سے میں اس لائق ہوں کہ اسکو کھا سکوں اور اس سے لذت اور فائدہ حاصل کرسکوں، اس طرح کھانے کا عمل جو بظاہر ایک خاص مادی عمل ہے اور حیوانی تقاضے سے ہوتا ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ سے جڑ جاتی ہے اور وہ ایک ایمانی اور نورانی عمل بن جاتا ہے ـــــ اور چونکہ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کھانا شروع کرتے وقت بندہ اللہ کا نام لینا اور بسم اللہ کہنا بھول جاتا ہے تو اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث

میں ارشاد فرمایا کہ ایسی صورت میں جب یاد آ جائے اسی وقت بندہ کہہ لے "بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ" (میں اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتا ہوں شروع میں بھی اور آخر میں بھی)

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَا يُذْكَرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ــــــ رواہ مسلم

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان اپنے لیے کھانے کو جائز کر لیتا ہے (یعنی اس کے لیے کھانے میں شرکت اور حصہ داری کا امکان اور جواز پیدا ہو جاتا ہے) جبکہ اس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اللہ کا نام شیطان کے لیے تازیانہ بلکہ گرز ہے، جب کسی کھانے پر اللہ کا نام لیا جائے گا اور بسم اللہ پڑھ کے کھانا شروع کیا جائے گا تو شیطان اس میں شریک نہ ہو سکے گا، لیکن جب کسی کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اور کھانا یونہی شروع کر دیا جائے تو پھر شیطان کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو گی، اگرچہ کھانے والے کی آنکھ نہ دیکھ سکے گی مگر شیطان اُس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گا۔

صحیح مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب کوئی آدمی اپنے گھر میں جہاں وہ رات کو رہتا اور سوتا ہے اللہ کا نام لے کر داخل ہوتا ہے اور پھر کھانے کے وقت بھی اللہ کا نام لیتا ہے تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ یہاں سے چلو یہاں ہمارے تمہارے لیے نہ رہنے کا ٹھکانا ہے نہ کھانے کا سامان ہے۔ اور اس کے برعکس جب کوئی آدمی اپنے گھر میں آ کر اللہ کا نام نہیں لیتا اور کھانے کے وقت بھی اللہ کو یاد نہیں کرتا تو شیطان اپنے رفیقوں سے کہتا ہے کہ آجاؤ یہاں تمہارے لیے آرام سے شب باشی کی جگہ بھی ہے اور راشن کھانا بھی ہے ــــــ

الغرض اللہ کا نام پاک شیطانوں کے لیے ایسی ضرب ہے جس کا وہ کوئی مقابلہ نہیں کر سکتے، بالکل اس طرح جس طرح اندھیرا آفتاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہاں اس ایمانی حقیقت کو ذہن میں تازہ کر لینا چاہیے کہ ملائکہ اور شیاطین کا وجود اور اُن کے افعال وصفات اُن امورِ غیب میں سے ہیں جن کا علم ہم بندے اپنے طور پر اپنے حواس آنکھ کان وغیرہ کے

ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے، خود خدا کی ذات و صفات کا حال بھی یہی ہے۔ مومن کا مقام یہ ہے کہ ان تمام غیبی حقائق کے بارے میں بس اللہ کے صادق و مصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر اعتماد کرے۔

کھانا داہنے ہاتھ اور اپنے سامنے سے کھایا جائے :-

عَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِیْ سَلَمَۃَ قَالَ کُنْتُ غُلَامًا فِیْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَکَانَتْ یَدِیْ تَطِیْشُ فِی الصَّحْفَۃِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمِّ اللّٰہَ وَکُلْ بِیَمِیْنِکَ، وَکُلْ مِمَّا یَلِیْکَ ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں (بچپن میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ شفقت میں پرورش پا رہا تھا تو (کھانے کے وقت) میرا ہاتھ پلیٹ میں ہر طرف چلتا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت فرمائی کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھا کرو اور اپنے داہنے ہاتھ سے اور اپنے سامنے ہی سے کھایا کرو

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) ابو سلمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی، اور سابقین اولین میں سے تھے، اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اُن کی بیوی تھیں اور بڑی مخلص مومنہ تھیں، حدیث کے راوی عمر بن ابی سلمہ انہی کے بیٹے تھے، ۳ھ یا ۴ھ ہجری میں ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی بیوہ اُم سلمہ سے ان کی دلداری کے لیے نکاح کر لیا، ان کے یہ بیٹے عمر بن ابی سلمہ جو اُس وقت کم عمر بچے تھے آپ کی آغوشِ تربیت میں آگئے، وہ بیان کرتے ہیں کہ بچپنے کے اُس زمانہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھلاتے تو میرا ہاتھ پلیٹ میں ہر طرف چلتا تو حضور نے مجھے بتلایا اور سکھایا کہ بسم اللہ پڑھ کے کھانا کھایا کرو اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنی طرف سے اور اپنے سامنے سے کھایا کرو، ـــ (دوسری بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سامنے مختلف الانواع کھانے یا مختلف قسم کے پھل ہوں تو ہر طرف ہاتھ بڑھانے کی اجازت ہے۔)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَکَلَ اَحَدُکُمْ فَلْیَاْکُلْ بِیَمِیْنِہٖ وَاِذَا شَرِبَ فَلْیَشْرَبْ بِیَمِیْنِہٖ ـــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی کچھ کھائے تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور جب کچھ پیے تو داہنے ہاتھ سے پیے۔

(صحیح مسلم)

تشریح) انسان اپنے ہاتھوں کو پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں استعمال کرتا ہے، اسلئے اس کی فطری طہارت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ نجاست و گندگی کی صفائی جیسے کاموں کے لیے ایک ہاتھ کو مخصوص کر دیا جائے، اور دوسرے کاموں میں دوسرا ہاتھ استعمال ہو۔ اس فطری تقاضے کے مطابق دفع نجاست وغیرہ کے لیے بایاں ہاتھ خاص کر دیا گیا ہے۔ اور باقی کھانے پینے وغیرہ دوسرے سارے اچھے اور پاکیزہ کاموں کے بارے میں حکم ہے کہ وہ داہنے ہاتھ سے انجام دیے جائیں۔ اور خلقی اور فطری لحاظ سے بائیں ہاتھ کے مقابلہ میں داہنے ہاتھ کی فضیلت اور برتری ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ لہٰذا یہ حکم اور یہ تقسیم بالکل فطرت کے بھی مطابق ہے ـــــ اس بنا پر بائیں ہاتھ سے کھانا بالکل ایسی الٹی بات ہے کہ کوئی آدمی بجائے پاؤں کے سر کے بل چلے، اسی لیے آگے درج ہونے والی حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ بائیں سے کھانا شیطان کا طریقہ اور اس کا عمل ہے، کیونکہ شیطان کی فطرت یہی ہے کہ ہر کام الٹا کرے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَأْكُلَنَّ أَحَدُكُمْ بِشِمَالِهٖ وَلَا يَشْرَبَنَّ بِهَا فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهٖ وَيَشْرَبُ بِهَا ـــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی نہ بائیں ہاتھ سے کھائے اور نہ اس سے پیے۔ کیونکہ (یہ شیطانی طریقہ ہے) وہ بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔　　(صحیح مسلم)

جوتا اتار کے کھانے میں زیادہ راحت ہے :-

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا وُضِعَ الطَّعَامُ فَاخْلَعُوْا نِعَالَكُمْ فَإِنَّهٗ أَرْوَحُ لِأَقْدَامِكُمْ ـــــ رواہ الدارمی

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کھانا سامنے رکھ دیا جائے تو اپنے جوتے اتار دیا کرو اس سے تمہارے پاؤں کو زیادہ

راحت ملے گی (مسند دارمی)

تشریح اس حدیث میں کھانے کے وقت جوتا اتار دینے کا حکم دیتے ہوئے اسکی جو حکمت اور مصلحت بیان فرمائی گئی ہو (کہ اس سے پاؤں کو زیادہ آرام ملے گا) اس سے یہ بات ظاہر ہو کہ یہ حکم شفقت کی بنا پر دیا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ جوتا پہنے کھانا کوئی گناہ کی بات ہو۔

کھانا زیادہ گرم نہ کھایا جائے :-

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ اَنَّهَا کَانَتْ اِذَا اُتِیَتْ بِثَرِیْدٍ اَمَرَتْ بِهٖ فَغُطِّیَ حَتّٰی تَذْهَبَ فَوْرَةُ دُخَانِهٖ وَتَقُوْلُ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ هُوَ اَعْظَمُ لِلْبَرَکَةِ ـــــــــــــــ رواہ الدارمی

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہو کہ اُن کا یہ طریقہ تھا کہ جب ثرید پکا کر اُن کے پاس لائی جاتی تو وہ اُن کے حکم سے اُسوقت تک ڈھکی رکھی رہتی کہ اس کی گرمی کا جوش اور تیزی ختم ہو جاتی (اسکے بعد وہ کھائی جاتی)، اور (اپنے اس طرز عمل کی سند میں) وہ فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس طرح (کچھ ٹھنڈا کر کے) کھانا زیادہ برکت کا باعث ہوتا ہے۔ (مسند دارمی)

تشریح ثرید ایک معروف و مرغوب کھانا ہو، جس کا عہد نبوی میں زیادہ رواج تھا، ایک خاص طریقہ سے گوشت کے ساتھ روٹی کے ٹکڑے پکا کر تیار کیا جاتا تھا ـــــ اس روایت میں اگرچہ خاص ثرید کا ذکر ہو (کیونکہ وہاں وہی زیادہ پکتا تھا) لیکن ظاہر ہو کہ حدیث پاک میں جو تعلیم دی گئی ہو وہ ہر پکے ہوئے کھانے سے متعلق ہو کہ زیادہ گرم نہ کھایا جائے۔ اس کو موجب برکت بتلایا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہو کہ برکت کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہو کہ غذا کا جو مقصد ہو وہ اس طرح کھانے سے بہتر طریقہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اصول طب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کھانا زیادہ گرم نہ کھایا جائے۔

کنز العمال میں مختلف کتب حدیث کے حوالہ سے متعدد صحابہ کرام کی روایت سے مختلف الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت روایت کی گئی ہے کہ کھانا ٹھنڈا کر کے کھایا جائے اس میں برکت ہے۔

ـــــــــــــــ (کنز العمال صـ۹۳ ج ۸)

حضرت عمرؓ کے چند فیصلے

(مولانا محمد تقی امینی، ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

اسلام جامد مذہب نہیں ہے، بلکہ اس کے احکام میں وقتی و ہنگامی حالات کی رعایت موجود ہے جس کے بغیر نہ کوئی مذہب اپنی "توانائی" برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی نظام اپنی زندگی کا جواز مہیا کر سکتا ہے۔

ذیل میں حضرت عمرؓ کے چند فیصلے ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ اسلام میں کس قدر وسعت اور تغیر پذیر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔

ان فیصلوں کی نوعیت احکام کی تبدیلی کی نہیں بلکہ ان کے نفاذ میں موقع و محل کی تعیین کی ہے۔ جس کی قانون کی دنیا میں بڑی اہمیت ہے اور قانون کے نفاذ میں اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

(۱) حضرت عمرؓ نے کتابیہ (اہل کتاب) عورت سے نکاح کرنے کی ممانعت کر دی، حالانکہ قرآن حکیم میں اس کی اجازت موجود ہے۔

ابوبکر جصاصؒ نے ممانعت کے سلسلہ میں یہ واقعہ نقل کیا ہے:-

"حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودیہ سے نکاح کر لیا، جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو ہوئی تو انھوں نے علیحدگی کا حکم دے دیا۔ حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ حرام ہے؟ اس پر عمرؓ نے جواب دیا کہ میں حرام تو نہیں کہتا ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم لوگ بدکار عورتوں کے جال میں پھنس جاؤ گے۔"[1]

---

[1] احکام القرآن للجصاص باب تزوج الکتابیات ج ۲ ص ۳۲۴

امام محمدؒ نے مدائن کا مذکورہ واقعہ بیان کر کے حضرت عمرؓ کا یہ جواب نقل کیا ہے۔

فانی اخاف ان یقتدی بك المسلمون فیختار وانساء اهل الذمہ لجمالھن وکفی بذلك فتنۃ لنساء المسلمین۔[۱]

میں ڈرتا ہوں کہ دوسرے مسلمان تمہاری پیروی کریں گے اور ذمیہ (کتابیہ) عورتوں کی خوبصورتی کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ان کو ترجیح دیں گے۔ یہ بات بڑی آسانی کے ساتھ مسلمان عورتوں کے لیے فتنہ بن سکتی ہے۔

(۲) حضرت عمرؓ نے بیک وقت تین طلاقوں کو تین قرار دیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایک قرار دیتے تھے۔ یعنی اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ "تجھ پر تین طلاقیں ہیں" تو "وہ تینوں واقع ہو جائیں گی۔

جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے۔

کان الطلاق علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وسنتین من خلافۃ عمر طلاق الثلث واحدۃ فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیھم فامضاہ علیھم۔[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کے زمانہ میں تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں نیز حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانۂ خلافت میں دو سال تک اسی پر عمل درآمد رہا لیکن جب عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ ایسے معاملے میں جلدی سے کام لینے لگے ہیں جس میں انھیں دیر کرنا چاہیے تو انھوں نے تینوں کو نافذ کر دیا۔

ایک اور روایت میں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ایھا الناس قد کانت لکم فی الطلاق اناۃ فانہ من تعجل اناۃ اللہ الزمناہ ایاہ۔[۳]

اے لوگو، تمہارے لیے طلاق میں تاخیر مناسب ہے، جس شخص نے طلاق میں اللہ کی تاخیر کو برقرار نہ رکھا تو ہم یہ جلدی اس پر عائد کر دیں گے۔

---

[۱] کتاب الآثار باب تزوج الیھودیۃ والنصرانیۃ [۲] مسلم کتاب الطلاق ج ۲ [۳] شرح معانی الآثار کتاب الطلاق

ایک اور روایت میں ہے

تتابع الناس فی الطلاق فاجازہ علیہم[1]

جب لوگ (ایک ساتھ) پے درپے طلاق دینے لگے تو عمرؓ نے ان سب کو نافذ کردیا۔

(۳) حضرت عمرؓ نے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے کو ہٹانے کا حکم دیا جبکہ قرآن حکیم میں اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال کیا گیا ہے۔

وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ حِلٌّ لَّکُمْ[2]

اور اہلِ کتاب کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے۔

اسی طرح یہود و نصاریٰ کے صرافے ہٹانے کا حکم دیا جبکہ اس قسم کے پرسنل معاملات میں آزادی ثابت ہے۔

دراصل یہ لوگ سودی کاروبار کرتے تھے اگر خلافت کی جانب سے ان کے ایسے کاروبار پر نکیر نہ کی جاتی تو لوگ اس خیال میں مبتلا ہوجاتے کہ مسلمان اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ نے دونوں کو ہٹانے کا حکم دیا۔

(۴) حضرت عمرؓ نے بیت المال (سرکاری خزانہ) میں چوری اور مالکہ کے آئینہ (جس کی قیمت ساٹھ درہم تھی) کی ایک خادم کے ہاتھوں چوری میں ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں دیا چنانچہ بیت المال میں سب کی شرکت کی بنا پر فرمایا

لیس علیہ قطع[3]

ایسے چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر ہاتھ کاٹنے سے منع کردیا کہ

خادمکم سرق متاعکم[4]

تمہارے خادم نے تمہارے مال کی چوری کی۔

(۵) حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جنھوں نے ایک اونٹ چرایا تھا جب انھیں معلوم ہوا کہ غلاموں کا مالک ان کو بھوکا رکھتا ہے چنانچہ ہاتھ کاٹنے کا حکم واپس لیتے ہوئے فرمایا۔

اراک تجیعھم[5]

میں دیکھتا ہوں کہ تم ان کو بھوکا رکھتے ہو۔

---

[1] ابوداؤد ومشکوٰۃ باب خلاالحمز [2] سورۂ مائدہ رکوع ۱ [3] الخراج لابی یوسف فصل مایجب فیہ الحدود فی سرقہ۔
[4] موطاامام مالک باب الاقطع فیہ [5] ایضاً

حالاں کہ قرآنِ حکیم میں سزا کا حکم مذکورہ صورتوں کو بھی عام ہے کسی صورت کی تخصیص نہیں ہے۔

(۶) حضرت عمرؓ نے عورت کو اُس شخص کے لیے (بطورِ سزا) حرام قرار دیا جس نے اس کے ساتھ عدت میں نکاح کیا اور اس سے قربت کر لی حالانکہ قرآن وسنت سے دائمی حرمت کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔[1]

(۷) حضرت عمرؓ نے ضحاک بن خلیفہ کو آب پاشی کے لیے محمد بن مسلمہ کی زمین سے ان کی مرضی کے بغیر پانی لے جانے کا حکم دیا اور فرمایا

لو لم اجد للماء مسیلاً الا علی بطنك لاجرینه۔[2]

پانی لے جانے کے لیے اگر تیرے پیٹ کے سوا اور کوئی راستہ نہ ملے گا تو تیرے پیٹ کے اوپر سے پانی لے جانے کا حکم دوں گا۔

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا

لا یحل مال امرئ مسلم الا عن طیب نفس۔[3]

کسی مسلمان کا مال اُس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

(۸) حضرت عمرؓ نے حلالہ کرنے اور کرانے والے کے لیے سنگساری کی سزا تجویز کی فرمایا۔

لا اوتی بمحلل ولا محلل له الا رجمتهما۔[4]

حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہو جو بھی میرے پاس لایا جائے گا میں اس کو سنگسار کردوں گا۔

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی سزا نہیں تجویز کی صرف لعنت پر اکتفا کیا ہے۔

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحلل والمحلل له۔[5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہے دونوں پر لعنت کی ہے۔

(۹) حضرت عمرؓ نے ایک حلالہ کے واقعہ میں واسطہ بننے والی عورت کو سزا دی، چنانچہ ایک شخص نے

---

[1] تعلیل الاحکام النوع الرابع صہ ۹۳ [2] الخراج لیحیی صہ ۱۱۱ [3] ایضاً [4] اعلام الموقعین ج ۲ فی تغییر الفتویٰ [5] ترمذی کتاب الطلاق

اپنی بیوی کو تین طلاق دے کر جدا کر دیا جب اس کی خبر مطلقہ عورت کی ایک دلالہ سہیلی کو ہوئی تو اس نے ایک مسکین اعرابی (جو مسجد نبوی کے دروازہ پر رہتا تھا) کو بلا کر کہا کہ اگر تم اس شرط پر ایک عورت سے نکاح کرنا چاہو کہ اس کے پاس ایک رات گزارنے کے بعد طلاق دے دو تو میں اس کا انتظام کرا سکتی ہوں" اعرابی نکاح کے لیے تیار ہو گیا اور نکاح کے بعد جب شب باشی ہوئی تو منکوحہ عورت نے تاکید کر دی کہ لوگوں کے اصرار کے باوجود تم مجھے طلاق نہ دینا۔ تمھاری کفالت میں خود کروں گی۔ اور اگر لوگ جبر و زبردستی کریں تو اس معاملہ کو امیر المومنینؓ کے پاس لے جانا۔ بالآخر معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا تو آپ نے اعرابی سے فرمایا کہ تم اپنی بیوی کو ہر گز طلاق نہ دینا اور دلالہ عورت کو بلا کر سزا دی۔[1]

(۱۰) حضرت عمرؓ نے ایک ایسی بستی کو جلانے کا حکم دیا جس میں شراب بیچی جاتی تھی۔

حرق قریۃ یباع فیہا الخمر[2]	ایک ایسی بستی کو جلایا جس میں شراب بیچی جاتی تھی۔

اسی طرح رویشد ثقفی (شراب بیچنے والا) کی دوکان جلانے کا حکم دیا۔

وامر ایضا بتحریق حانوت رویشد	رویشد ثقفی کی دوکان جلانے کا حکم دیا
الثقفی الذی کان یبیع الخمر فقال	جو شراب بیچتا تھا اور کہا کہ تو رویشد نہیں
لہ انت فویسق ولست برویشد[3]	بلکہ فویسق ہے۔

(۱۱) حضرت عمرؓ نے بعض مسلمانوں کی کھیتی جلانے کا حکم دیا۔

ان المسلمین زرعوا بالشام فبلغ	مسلمانوں نے شام میں کھیتی کی جب یہ خبر
عمر بن الخطاب فامر باحراقہ[4]	عمرؓ کو پہونچی تو اس کے جلانے کا حکم دیا۔

یہ روایت مرسل ہے اس میں "اسد" راوی ضعیف ہے، ممکن یہ ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا ہو جبکہ ہر ایک کا وظیفہ مقرر کر کے مسلمانوں کو کھیتی باڑی کرنے سے روک دیا تھا۔ ان صورتوں میں تضییع مال اور پرسنل معاملات میں مداخلت ہے جس کی بالعموم اجازت نہیں ہوتی ہے۔

(۱۲) حضرت عمرؓ نے زنا کی حرمت کا علم نہ ہونے کی صورت میں مقررہ سزا نہ دینے کا حکم دیا۔

---

[1] فقہ عمر مسائل الطلاق [2] الطرق الحکمیہ فصل سلوک الصحابۃ لبعض الاحکام [3] تبصرۃ الحکام فی القضاء بالسیاسۃ الشرعیۃ الفصل الاول [4] المحلی ج ۸ احکام المزارعۃ والمساقاۃ

چنانچہ کسی گورنر نے ایک ایسے شخص کے بارے میں معلوم کیا جس نے زنا کیا تھا لیکن کہتا تھا کہ مجھے اس کی حرمت کا علم نہیں ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا

ان کان علم ان الزناء حرمة فحدوہ	اگر زنا کی حرمت کا اس کو علم ہے تو حد
وان لم یعلم فاعلموا وان عاد	لگاؤ اور اگر علم نہیں ہے تو اس کو مطلع کرو پھر
فحدوہ[1]	اگر دوبارہ کرے تو اس کو حد لگاؤ۔

حالانکہ قرآن کا حکم عام ہے اس میں عالم و جاہل کی تخصیص نہیں ہے۔

(۱۳) حضرت عمرؓ نے شخص واحد کے قتل میں شریک پوری جماعت کو قتل کرنے کا حکم دیا حالانکہ یہ "نص" سے ثابت نہیں ہے۔

علامہ شاطبیؒ کہتے ہیں۔

تجوز قتل الجماعة بالواحد والمستند	ایک شخص کے بدلہ جماعت کا قتل کرنا جائز ہے
فیہ المصلحة المرسلة اذ لا نص	اور دلیل اس میں مصلحت مرسلہ ہے کیونکہ
علی عین المسئلة لکنہ منقول عن	اس میں کوئی نص نہیں ہے، لیکن حضرت
عمر بن الخطاب[2]	عمرؓ سے یہ منقول ہے۔

(۱۴) حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنے کے بجائے مال کی دوگنی قیمت وصول کی، اسی طرح بھوک اور قحط کے زمانہ میں چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا جبکہ قرآن حکیم کی آیت

والسارق والسارقة فاقطعوا	چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی
ایدیھما[3]	عورت ان کے ہاتھ کاٹ دو۔

عام ہے جس میں کسی خاص صورت کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

(۱۵) حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ دینے کی ممانعت کر دی کہ

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم دونوں کی اس وقت

---

[1] کنز العمال ج ۳ کتاب الحدود من قسم الافعال [2] الاعتصام للشاطبی ج ۲ الفرق بین البدع والمصالح [3] سورۂ مائدہ رکوع ۵

کان یتالفھما والاسلام یومئذ قلیل وان اللہ قد اغنی الاسلام اذھبا فاجھدا اجھد کما[۱]

تالیف کیا کرتے تھے جبکہ اسلام کمزور تھا اور مسلمان تعداد میں کم تھے، اب اللہ نے اسلام کو قوت بخشی ہے تم لوگ جاؤ اور اپنی والی جدوجہد کرو۔

جبکہ قرآن حکیم کی یہ آیت عام ہے

والمولفۃ قلوبھم[۲]

اور انکو زکوٰۃ دی جائے جنکی تالیف قلب مقصود ہو۔

(۱۶) حضرت عمرؓ نے اہلِ صنعت وحرفت سے ضائع شدہ مال کے تاوان کو لازم کر دیا۔

ان عمر ضمن الصیاغ الذین انتصبوا للناس فی اعمالھم ما اھلکو فی ایدیھم[۳]

حضرت عمرؓ نے اس مال کا رنگریزوں کو (جو بطور پیشہ کام کرتے تھے) ضامن ٹھہرایا جو ان کے ہاتھ سے ضائع ہو جاتا تھا۔

جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر اہل صنعت وحرفت کے پاس کسی کا مال ضائع ہو جاتا تو اس کا تاوان نہ دینا پڑتا تھا کیونکہ اس کی حیثیت امانت کی ہوتی ہے اور امانت کا مال امین کی حفاظت میں کوتاہی کے بغیر ضائع ہو جائے تو اس کا تاوان نہیں واجب ہوتا ہے۔

(۱۷) حضرت عمرؓ نے تعزیری سزا حدود کی حد تک پہونچا دی اس شخص کو سو کوڑوں کی سزا دی جس نے بیت المال کی جعلی مہر بنائی تھی۔

ان عمر بن الخطاب ضرب من نقش علی خاتمہ مائۃ[۴]

حضرت عمرؓ نے اس شخص کو سو کوڑے مارے جس نے ان کی مہر کے مطابق نقش کیا تھا۔

جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس بات کا لحاظ کیا جاتا تھا کہ تعزیری سزاؤں کی مقدار حدود تک نہ پہونچے جیسا کہ آپ نے ایک موقع پر فرمایا۔

لا یجلد فوق عشر جلدات الا فی حد من حدود اللہ[۵]

حدود کے علاوہ اور کسی سزا میں دس کوڑے سے زیادہ نہ مارے جائیں۔

---

[۱] احکام القرآن للجصاص ج ۳ مطلب فی المولفۃ القلوب [۲] سورۂ توبہ رکوع ۸ [۳] کنز العمال ج ۲ کتاب الاجارہ من قسم الافعال فی احکامہا [۴] نووی شرح مسلم ج ۲ باب قدر اسواط التعزیر [۵] ایضاً۔

(۱۸) حضرت عمرؓ نے اس صورت میں پورا مہر واجب کیا جس میں شوہر اور بیوی کے درمیان خلوت صحیحہ ہو جائے اور پھر طلاق ہو جائے۔

عن عمر فی اغلاق الباب وارخاء الستر انه یوجب المهر[1]	حضرت عمر دروازہ بند کر دینے اور پردہ گرا دینے میں پورا مہر واجب کرتے تھے۔

حالانکہ قرآنِ حکیم میں ہے کہ نکاح کے بعد اگر کوئی شخص تعلقات کی ادائیگی کے بغیر طلاق دے دے تو نصف مہر واجب ہوتا ہے۔

وان طلقتموهن من قبل ان تمسوهن وقد فرضتم لهن فريضة فنصف ما فرضتم[2]	اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو اور ان کا مہر مقرر کیا ہو تو مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔

(۱۹) حضرت عمرؓ نے گھوڑوں میں صدقہ کا حکم دیا جبکہ تجارت اور افزائش نسل کے لیے گھوڑوں کی کثرت ہو گئی چنانچہ یہ فرمان جاری کیا۔

"گھوڑے میں دو بکری لی جائیں ورنہ دس یا بیس درہم لیے جائیں۔"[3]

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کے بارے میں فرمایا

ليس على المسلم صدقة فی عبده ولا فی فرسه[4]	مسلمان پر اس کے غلام اور گھوڑے پر صدقہ نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

قد عفوت عن الخيل والرقيق[5]	میں نے غلام اور گھوڑے سے صدقہ معاف کر دیا ہے۔

(۲۰) حضرت عمرؓ نے فوجی شوہروں کو چار ماہ سے زیادہ باہر رہنے سے روک دیا حالانکہ اس سے پہلے ایسا کوئی قانون نہ تھا۔

یہ چند فیصلے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فیصلے ہیں جن میں

---

[1] مختصر المزنی باب الدخول واغلاق الباب بر حاشیہ کتاب الام ج ۴۔ [2] سورہ بقرہ۔ رکوع ۳۰۔ [3] فقہ عمر کتاب الزکوٰۃ۔ [4] القضاء فی الاسلام قضاء عمر ص ۱۰۴ [5]

حضرت عمرؓ نے اُس "اختیار" کو استعمال کیا ہے جو اسلامی حکومت میں "قوت نافذہ" کو حاصل ہوتا ہے اور جس کی حیثیت حالات کے لحاظ سے احکام کے موقع و محل کے تعیین سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔

اس اختیار کا استعمال بھی اُس حکمت و مصلحت کے تحت تھا جو احکام کے مقرر کرنے میں ملحوظ ہوتی ہے، جیسا کہ درج ذیل تصریح سے ظاہر ہے۔

وکان عمر یجتہد فی تعرف الحکمۃ التی نزلت فیہا الاٰیۃ ویحاول معرفۃ المصلحۃ التی جاء من اجلہا الحدیث ویاخذ بالروح لا بالحرف [۱]

حضرت عمرؓ اس حکمت کی تلاش میں سرگرداں رہتے جس میں آیت نازل ہوئی اور اُس مصلحت کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتے جس کی وجہ سے حدیث وارد ہوئی ہے۔ اور روح و مغز کو لیتے ظاہری الفاظ پر اکتفا نہ کرتے تھے۔

قانون کی دنیا میں اس نزاکت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے اور عدل و توازن نہ برقرار رکھ سکے۔

---

[۱] القضاء فی الاسلام، قضاء عمر صد۱۰۱

اکابر علم جن سے میں متأثر ہوا

(۲) حضرت مولینا بدر عالم میرٹھیؒ

از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

میرٹھ سے چند میل کے فاصلہ پر ہاپوڑ کی سڑک پر ایک چھوٹا سا پرانا قصبہ ہے "اُلّان" یہ پرانے شرفاء اور شیوخ کی بستی ہے، جن کے رشتہ داری کے تعلقات شرفاءِ میرٹھ (قاضی و مفتی صاحبان) کے خاندانوں سے چلے آرہے ہیں۔

اسی خاندان کے ایک فرد حاجی تہور علی صاحب تھے جو سی۔ آئی۔ ڈی۔ پولیس میں انسپکٹر کے عہدہ پر مامور تھے۔ حاجی صاحب مرحوم یوں تو پولیس افسر تھے مگر بزرگانِ سہارنپور و دیوبند سے ان کے ہمیشہ روابط رہے اور ان کے فیض صحبت سے ان کا مذاق دینی و مذہبی رہا۔

میرے بچپن کا زمانہ تھا کہ وہ اپنے عہدہ سے پنشن لے کر میرٹھ آئے اور شاہ پیر دروازہ میں ایک شاندار مکان خرید کر اس میں رہائش اختیار کی اور میرٹھ کے دینی و مذہبی کاموں میں گہرا حصہ لینا شروع کیا۔ میرٹھ میں ایک قدیم مدرسہ ہے "مدرسہ اسلامیہ عربیہ" جو میرے مکان سے چند قدم کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولینا محمد قاسم صاحبؒ نے اپنے قیام میرٹھ کے زمانہ میں اس کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ مدرسہ "دارالعلوم دیوبند" کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا نصاب تعلیم دیوبند ہی کا نصاب تعلیم تھا اور اس کے اساتذہ دیوبند ہی کے فارغ التحصیل فضلاء... چنانچہ ابتدائی زمانہ میں حضرت مولینا ناظر حسن دیوبندی (جو بعد میں ڈھاکہ کے مدرسہ عالیہ کے پرنسپل ہوئے اور وہیں ان کو انگریزی حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا) اور حضرت مولینا مفتی عزیز الرحمن اور حضرت مولینا حبیب الرحمن دیوبندی (جو بعد میں علی الترتیب دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم اور نائب

مہتمم ہوئے، اس مدرسہ کے مدرسین میں شامل تھے۔

اسی زمانہ میں والد محترم حضرت مولینا قاضی بشیر الدین مرحوم و مغفور (قاضی شہر و خطیب جامع مسجد میرٹھ) نے ان ہی بزرگوں سے علوم عربیہ دینیہ کی تکمیل فرمائی۔ اور صحاح ستہ کی جو سند ان کو دی گئی اس پر مذکورہ بالا بزرگوں کے علاوہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور دیوبند کے دوسرے اکابر کے بھی دستخط ثبت ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ طریقہ تھا کہ دار العلوم کی شاخوں کی اسناد پر بھی' اکابر دیوبند کے دستخط اور مہریں ہوتی تھیں۔ والد مرحوم کے رفقاء درس میں حضرت مولینا حکیم محمد اسحاق کٹھوری مرحوم (رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند) اور حضرت مولانا قاری محمد اسحٰق صاحب مرحوم (جن کا ذکر بعد میں آئے گا) شامل تھے۔

مدرسہ سے فکری و مکانی تعلق کی وجہ سے شروع سے میرے بزرگ مدرسہ کے دائرہ انتظام میں شامل رہے چنانچہ والد مرحوم اور حاجی تہور علی صاحب دونوں مدرسہ کے ممبر تھے۔

جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت مدرسہ کے حالات میں اہم تبدیلی ہوئی۔ مدرسہ پر کسی طرح غیر دیوبندی عناصر کا غلبہ ہوگیا۔ والد مرحوم اور حاجی تہور علی مرحوم اور میرے رشتہ کے چچا مولوی محمد سراج صاحب مالک مطبع ہاشمی میرٹھ نے' اس صورت حالات سے اکتا کر مدرسہ کی ممبری سے استعفا دیدیا۔ اور ایک نیا مدرسہ میرٹھ کی جامع مسجد میں "مدرسہ دار العلوم" کے نام سے قائم کیا۔ اس مدرسہ کے صدر مدرس حضرت مولینا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے مشورہ سے مولینا مبارک حسین سنبھلی مقرر ہوئے جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور اچھے واعظ اور مناظر تھے چونکہ حاجی تہور علی صاحب پنشن لے کر آگئے تھے اور فارغ البال تھے' اس لیے وہی مدرسہ کے مہتمم تجویز ہوئے۔

میں پہلے "مدرسہ اسلامیہ" میں میزان و منشعب پڑھتا تھا۔ نئے مدرسہ کے قیام کے بعد اس کے سب سے پہلے طالب علموں میں شامل ہوگیا۔

حاجی تہور علی صاحب مرحوم کا دستور تھا کہ سرکاری ڈیوٹی کی طرح جس کے وہ عمر بھر عادی رہے تھے، ۸ بجے مدرسہ میں تشریف لے آتے اور مدرسہ کے کاموں کی نگرانی کرتے۔

بڑا سا قد' سپیدی مائل چہرہ' شرعی ڈاڑھی' سر پر ترکی ٹوپی' بدن پر کبھی کوٹ اور کبھی شیروانی اور اور ہاتھ میں بید۔ یہ تھا حاجی صاحب کا ظاہری حلیہ' مگر باطن حاجی صاحب کا سراسر مولویانہ تھا۔

حضرت مولینا خلیل احمد صاحب سہارن پوری سے بیعت تھے اور ان سے گہرا رابطہ رکھتے تھے اور غالباً کئی بار حج کر چکے تھے۔

یہ تھے ہمارے صاحب سوانح کے والد ماجد۔ ان کے چار فرزند تھے اور غالباً ایک صاحبزادی صاحبہ، بڑے فرزند مولانا شمس الحق مرحوم تھے جو سہارن پور کے فارغ التحصیل تھے اور دار العلوم میرٹھ کے مدرس۔ دوسرے فرزندوں میں مولانا محمد حامد صاحب (لکچرر پشاور یونیورسٹی و بعدہ استاذ دار العلوم نیو ٹاؤن کراچی جو ماشاء اللہ بقید حیات ہیں) اور حضرت مولینا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ایک چوتھے بھائی محمد محمود جو پاکستان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر فائز ہوئے اور غالباً بقید حیات ہیں۔

حاجی صاحب کے دینی ذوق کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے ان چوتھے فرزند پر برابر طالب علمی کے زمانہ میں زور دیتے رہے کہ وہ انگریزی چھوڑ دیں اور اپنے دوسرے تینوں بھائیوں کی طرح دینی تعلیم حاصل کریں تاکہ ان کے انتقال کے بعد ان کے جنازہ کے چاروں پایوں کے تھامنے والے ان کے چار عالم بیٹے ہوں۔

حاجی تہور علی مرحوم نے دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری شادی خاندان سے باہر غالباً شاہجہانپور کے کسی شریف خاندان میں کی۔ ان ہی بیوی سے شہر بدایوں میں (جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت گاہ ہے اور جہاں حاجی صاحب اس زمانہ میں بسلسلہ ملازمت متعین تھے) ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں علم و دین کا یہ حامل پیدا ہو جو بعد میں بدر کامل بن کر چمکا۔

تعلیم و تربیت | مولانا بدر عالم صاحب ابتداء میں انگریزی تعلیم میں لگا دیئے گئے۔ حاجی صاحب الٰہ آباد میں مقیم تھے اور مولینا وہاں کسی انگریزی اسکول کے طالب علم تھے کہ حضرت حکیم الامۃ مولینا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہاں ورود ہوا اور جامع مسجد میں حضرت کے وعظ کا اہتمام ہوا۔ وعظ سننے یہ صاحبزادہ بھی تشریف لے گئے۔ واپس آئے تو یہ ضد ہوئے کہ میں عربی پڑھوں گا۔ حاجی صاحب نے حضرت مولینا خلیل احمد صاحب سہارنپوری سے استشارہ کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ بچہ کو جلد سہارنپور بھیج دیجئے۔ چنانچہ آپ گیارہ سال کی عمر میں مظاہر العلوم سہارنپور میں تحصیل علوم دینیہ میں مصروف ہو گئے۔ ذہانت، شوق، اور محنت نے سہارا دیا۔ حضرت سہارنپوری نے رہنمائی فرمائی اور اس ہونہار طالب علم نے انیس سال کی عمر میں، ادبیات، معقولات اور منقولات، مدارس دینیہ کی تینوں اصناف

علوم میں مہارت حاصل کرلی۔ پھر اسی مدرسہ میں مدرسین کی صف میں شامل ہو گئے اور دو سال تک تعلیم دی۔

اس زمانہ میں والد بزرگوار کے حکم کے مطابق، خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے بھی تعلق قائم رہا، اور حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کی برکتوں سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

دار العلوم دیوبند میں | اسی زمانہ میں (سنہ ۱۳۳۹ھ) بلبل چمنستان نبوت حضرت الاستاذ مولینا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی نغمہ سرائی اور خوش نوائی سے دنیائے اسلام کی علمی و دینی فضا معمور تھی۔ مولینا بدر عالمؒ اور ان سے قبل ان کے دوسرے فاضل رفیق مولینا محمد ادریس کاندھلوی مدظلہ العالی (سہارنپور کے ابر فیضان نبوت سے سیراب ہونے کے بعد علوم رسالت کے اس بحر مواج سے ھل من مزید کے طالب ہوئے اور علامہ کشمیریؒ کے درس حدیث میں شامل ہو گئے۔ استاذ علام نے اپنے ان دونوں فاضل شاگردوں کو سینہ سے لگایا اور اپنے علوم و معارف کے خزینوں کو ان کے سپرد کیا۔ یہ دونوں دورہ سے رسمی فراغت کے بعد دار العلوم کی تدریسی خدمات پر متعین کیے گئے۔

مولینا بدر عالم صاحب نے سنہ ۱۳۴۰ سے سنہ ۱۳۴۵ھ تک دار العلوم کی تدریسی خدمات انجام دیں۔ دو سال بے ضابطہ اور پھر باضابطہ۔ مولینا نے اس زمانہ میں دار العلوم سے جو تنخواہ وصول کی آخری زمانہ میں اس کی کل رقم واپس فرمادی۔ اس سال دار العلوم دیوبند میں ہنگامہ اختلاف گرم ہوا۔ بات ابتدا میں معمولی سی تھی۔ دار العلوم کے ایک کارپرداز نے جو طلبہ کی ضروریات زندگی کی فراہمی کے شعبہ سے متعلق تھے کسی طالب علم کے ساتھ غیر مناسب سلوک کیا۔ حضرت کشمیریؒ نے طالبعلم کی حمایت کی اور دارہ اہتمام سے اُن کارپرداز سے بازپرس کا مطالبہ کیا۔ اہتمام نے ڈسپلن کی بنیاد پر اپنے ملازم کی طرفداری کی۔ افسوس ہے کہ بات بڑھتی چلی گئی اور بعض سیاسی انداز کے دماغوں نے اپنے مقاصد و مصالح کے لیے اس فتنہ کو ہوا دی۔ خاکسار اس زمانہ میں دیوبند ہی تھا۔ دیوبند کی ساری مسلم آبادی دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ دیوبند کی شاندار جامع مسجد جلسہ گاہ قرار پائی تھی اور آتش بیان اور شعلہ نوا مقررین نے ساری بستی میں آگ لگا رکھی تھی۔ ایک طرف سے مولینا محمد علی رئیس الاحرار کی تقریر ہوتی تھی اور دوسری طرف سے مولینا ظفر علی

خاں کی "الانصار" اور "مہاجر" کے نام سے دو اخبار بھی نکال دیے گئے تھے۔

اصحاب غرض کی سازشوں سے جو صورت حالات پیدا ہو گئی تھی اکابر دیوبند کو اس کا اندازہ نہ تھا اب دونوں گروہوں کا یکجا رہنا ممکن نہ تھا۔ بعض اصحاب کی طرف سے تجویز پیش کی گئی کہ دیوبند کی جامع مسجد میں دوسرا دارالعلوم قائم کیا جائے۔ اور حضرت علامہ کشمیریؒ اور ان کے دست راست حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اس میں درس دینا شروع فرمادیں۔ مگر حضرت کشمیری اور حضرت عثمانی نے اس تجویز کو رد کر دیا اور ڈابھیل ضلع سورت کے بعض مخلص عقیدتمندوں کی پیش کش قبول فرما کر وہاں کا عزم کیا۔ اور یہ قافلہ بہار جس کے قافلہ سالار حضرت کشمیری تھے، اپنے رفقاء کے ساتھ ڈابھیل روانہ ہو گیا اور وہاں علوم نبوت کا ایک نیا نخلستان قائم کیا۔

دیوبند سے ڈابھیل

مولانا بدر عالم صاحب بھی حضرت کشمیری کے ساتھ تشریف لے گئے۔ وہاں درس اعلیٰ کتابوں کا دیتے تھے اور ایک طالب علم کی حیثیت سے، اپنے قدیم معمول کے مطابق، استاذ جلیل کے علوم و معارف سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ اس طرح مولانا بدر عالم نے چار بار صحیح بخاری حضرت شاہ صاحبؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی۔ یوں بھی مولانا کے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے کمرے برابر برابر تھے اور ہونہار شاگرد کے لیے استاذ علام سے اخذ علوم و معارف و حقائق و لطائف میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔

حضرت شاہ صاحب پانچ سال ڈابھیل میں رہے۔ ۱۳۵۱ھ میں خرابی صحت کی وجہ سے آپ نے اس درس گاہ سے قطع تعلق فرمالیا اور اپنے وطن ثانی دیوبند تشریف لے آئے اور ایک سال علیل رہ کر یہیں ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء میں آغوش رحمت خداوندی میں چلے گئے۔

"فیض الباری" کی ترتیب

حضرت شاہ صاحب کے بعد آپ کے علوم و معارف کو قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ قرعہ فال اسی ہونہار شاگرد کے نام نکلا۔ چنانچہ آپ نے اپنے استاذ کے امالی "فیض الباری علی صحیح البخاری" کے نام سے چار جلدوں میں عربی زبان میں مرتب کیے اور اس طرح استاذ علام کے نادر تحقیقات علمی اور نکات فنی کو اپنے گراں قدر حواشی "البدر الساری" سے مرصع و مزین کر کے، خزینہ نبوت کے گوہر شناسوں کے لیے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب آخری زمانہ میں آیۃ من آیات اللہ اور فقیہ النفس محدث تھے۔ آپ کا انداز فکر اور طرز تقریر مجتہدانہ

اور محدثانہ تھا۔ آپکی تقریر و تحریر کو سمجھنا ہر "مولوی" کے بس کا نہ تھا۔ مولینا بدرعالم کا یہ علماء پر بڑا احسان ہے کہ آپ نے حضرت شاہ صاحب کے افکار کو اچھی طرح سمجھا اور پھر انھیں تسہیل و تذییل کے ساتھ سلیس عربی میں منتقل کر دیا۔ مولینا بدرعالم نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ "میں کبھی عرب ملکوں میں نہیں رہا، عربی ادب کی تحصیل بھی میں نے کسی خاص کوشش و کاوش سے نہیں کی۔ یہی درس نظامی کی کتب ادبیہ، مقامات حریری، متنبی، حماسہ، اور معلقات پڑھی تھیں۔ مگر جب میں نے "فیض الباری" مرتب کرنے کے لیے قلم ہاتھ میں لیا تو مجھے عربی میں مطالب ادا کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ یہ بظاہر تو ان کی اعلیٰ علمی استعداد اور فرط ذہانت کی بات تھی لیکن فی الحقیقت توفیق الٰہی۔ پھر یہ بات اور بھی قابل تعجب ہے کہ حضرت مولینا کی صحت کبھی بھی بہتر نہ رہی۔ اور اس زمانہ میں تو آپ کو دق کے انجکشن لگائے جا رہے تھے، اور آپ کو آدھی آدھی رات کھانستے گزر جاتی تھی۔

ندوۃ المصنفین کی رفاقت

حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد بھی مولینا بدرعالم اپنے استاذ کے لگائے ہوئے چمن کی آبیاری کرتے رہے اور سترہ سال تک ڈابھیل میں حدیث نبوی کا درس دیا۔ پھر آپ وہاں سے خرابی صحت کی بنا پر بھاولپور منتقل ہو گئے۔ یہاں بھاولپور کے مقام پر آپ ہی کے لیے، آپ کے ارادتمندوں نے ایک مدرسہ قائم کر دیا تھا۔ مگر قدرت کو ابھی آپ سے امت محمدیہ کی طرف سے بارگاہ نبوت کی ایک اور خدمت لینی تھی۔ چنانچہ آپ سنہ ۱۹۴۳ء میں "ندوۃ المصنفین" دہلی کے رفقاء کرام میں شریک ہو گئے۔ اور "ترجمان السنۃ" کے نام سے حدیث کے ایک جامع مجموعہ کی ترتیب آپ کے سپرد ہوئی۔ ندوۃ المصنفین کے ارباب انتظام کی خواہش تھی کہ حدیث نبوی کا ایک ایسا منتخب مجموعہ تیار ہو جائے جس میں اردو زبان میں مطالب، معانی کی اس انداز سے تشریح ہو کر جدید فکر و ذہن کے لوگ بھی اس سے مطمئن ہو سکیں۔ مولینا نے یہ کام بڑی شان سے شروع کیا مگر اپنی مشکل پسند طبیعت کے تقاضہ سے دقیق علمی مباحث بھی چھیڑ دیئے۔ جس کی وجہ سے یہ کتاب "فیض الباری" کا اردو ایڈیشن بن گئی اور اس کی سطح عام اردو داں طبقہ کی دسترس سے بلند ہو گئی۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ کتاب بہت پھیل گئی اور اس کے اتمام سے پہلے آپ کی حیات مستعارہ کی مدت پوری ہو گئی اور کتاب نامکمل رہ گئی۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس جامہ مخلیں میں مخمل کا پیوند لگے گا یا نہیں۔

میرٹھ کا قیام اور ترجمان السنۃ کی ترتیب

"ترجمان السنۃ" کی ترتیب کا کام زیادہ تر میرٹھ میں ہوا۔ مولینا

اپنے آبائی مکان میں مقیم تھے جو بڑا وسیع اور شاندار تھا۔ اس کے ایک وسطی کمرہ میں مولینا لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ مولینا کے بھانجے مولوی عقیل محمد جو میرٹھ کے مشہور وکیل اور اس زمانہ میں جو مسلم لیگ کے عروج کا تھا، ضلع میرٹھ کی مسلم لیگ کے سکریٹری تھے۔ وہ اس مکان ہی کے ایک حصہ میں سکونت پذیر تھے میرا عقیل محمد صاحب سے گہرا دوستانہ تعلق تھا۔ جس دن وہ (۱۹۴۷ء میں) پاکستان گئے میں انکو رخصت کرتے ہوئے اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ اپنے حقیقی بھائیوں کو رخصت کرتے ہوئے میری یہ کیفیت نہیں ہوئی۔ عقیل صاحب کے اس تعلق کی وجہ سے وہ اکثر میرے ہاں اور میں ان کے ہاں جاتا آتا رہتا تھا۔ ادھر حضرت مولینا سے میں نے ابتدائی زمانہ میں مرقات پڑھی تھی۔ پھر ندوۃ المصنفین میرے اور ان کے درمیان ارتباط کے لیے ایک نئی کڑی بن گئی تھی۔ ندوۃ المصنفین سے مجھے "تاریخ ملت" مرتب کرنے کا کام حوالہ کیا گیا تھا۔ جس کے تین حصے "نبی عربی" "خلافت راشدہ" اور "خلافت بنی امیہ" میں نے اپنے دوسرے تعلیمی و دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ ترتیب دیے۔ یہ واقعات ۴۵ تا ۴۹ء کے ہیں۔ بہرحال ان گوناگوں تعلقات کی وجہ سے مولینا کے دولتکدہ پر میرا برابر آنا جانا رہتا تھا اور علمی و سیاسی موضوعات پر بھی طویل گفتگو رہتی تھی۔

لطافت مزاج و لباس مولینا جس قدر حسین و جمیل تھے، ان کا لباس بھی اتنا ہی صاف ستھرا اور دلکش ہوتا تھا کھانے پینے اور رہنے سہنے میں بھی نفاست اور حسن ملحوظ خاطر رہتا تھا۔ کبھی کبھی مولینا کھانے پر بھی مدعو کرتے تھے اور چائے شام کی تو اکثر ان کے ساتھ پینی ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی مولینا اپنے حسین چہرہ پر تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے پوچھتے "شام کی چائے کے ساتھ اگر کوئی ہلکی کھانے کی چیز ہو تو اس میں تو ہرج نہیں؟ میں منظور کرتا تو وہ ایک نفیس مرادآبادی ٹرے میں حسین چلے کے برتنوں میں خوشبودار چائے لاتے (چائے کا یہ اعلیٰ ذوق ان کو غالباً حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ سے حاصل ہوا تھا) چائے کے ساتھ لذیذ کیک کے ٹکڑے اور انگور یا سیب یا اور کوئی موسمی پھل ہوتے۔ پھر اصرار کر کر کے کھلاتے۔

وادیٔ سلوک میں مولینا بدر عالم نے سلوک کی ابتدائی منزلیں، دیوبند کے قیام کے زمانہ میں حضرت قدوۃ السالکین مولینا عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند سے طے کی تھیں۔ حضرت مفتی صاحب کا ۱۳۴۷ھ میں وصال ہوا تو ان کے جانشین، ان کے ایک لائق شاگرد اور مسترشد مولینا

قاری محمد اسحٰق صاحب میرٹھی منتخب ہوئے۔ مفتی صاحب کے دوسرے منتسبین کی طرح حضرت مولینا بھی حضرت قاری صاحب کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور سلوک کی بقیہ منازل ان سے طے کیں۔ حضرت قاری صاحب نے آخری زمانہ میں دہلی پل بنگش پر سکونت اختیار فرمائی تھی۔ حضرت مولینا قاری محمد اسحٰق صاحب نے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے میرٹھ کے قیام کے زمانہ میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ میرٹھ میں تحصیل علوم ظاہری کی تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ والد مرحوم مولینا قاضی بشیر الدین صدیقی قاضی شہر و خطیب جامع مسجد میرٹھ حضرت قاری صاحب کے بچپن کے ساتھیوں میں سے تھے۔ والد صاحب اور قاری صاحب کے اس قدر گہرے اور بے تکلف روابط تھے۔ کہ یہ ناممکن تھا کہ حضرت قاری صاحب میرٹھ تشریف لے آئیں اور وہ والد صاحب سے ملنے اور والد صاحب ان سے ملنے تشریف نہ لے جائیں۔ اور پھر جب ملاقات ہو تو یہ بھی ناممکن تھا کہ آپس میں چھیڑ چھاڑ بلکہ دستر خوان پر کھانے پینے کی چیزوں کی چھین جھپٹ نہ ہو۔ جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں حضرت قاری صاحب بہت ضعیف ہو گئے تھے اور بغیر سہارے کے اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ تاہم حضرت قاری صاحب کا معمول برابر قائم رہا۔ اور میرے مکان پر تشریف آوری ہوتی رہی۔ حضرت مولینا بدر عالم کے جدید تعلق کی وجہ سے (اگرچہ حضرت قاری صاحب کے اعزہ و احباب میرٹھ میں موجود تھے) حضرت قاری صاحب کی مستقل قیام گاہ مولینا بدر عالم کا مکان بن گیا تھا۔ مولینا کے ہمشیر زادہ عقیل محمد صاحب اور جملہ متعلقین بھی ان ہی سے بیعت ہو گئے تھے۔

حضرت قاری صاحب کی مجلسیں

اب جب حضرت قاری صاحب میرٹھ تشریف لاتے تو مولینا بدر عالم کا مکان جلسہ گاہ بن جاتا۔ صحن میں فرش بچھائے جاتے گاؤ تکیے لگائے جاتے اور حضرت قاری صاحب کی روحانی مجلس گرم ہوتی۔ کھانے پینے کے کم مگر ہمارے سلسلے کے دوسرے بزرگوں کی طرح کھلانے پلانے کے، حضرت قاری صاحب بھی بڑے شوقین تھے۔ پھر مولینا بدر عالم اور مولوی عقیل محمد صاحب جیسے میزبان ہوں تو کیا کہنے۔ بڑی مکلف دعوتیں ہوتیں اور پھر یہ سلسلہ متعدی ہوتا۔ غرض جب تک حضرت قاری صاحب رہتے ایک جشن سا رہتا۔ مگر دن کی روشنی میں یہ جشن ہوتا اور رات کی اندھیریوں میں محفل معرفت آراستہ ہوتی۔

حضرت قاری صاحب کے دل میں اپنے فاضل مسترشد کی محبت ہی نہیں عزت بھی تھی

اور مولینا بدر عالم کو ان سے عشق۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت قاری صاحب جب میرٹھ سے دہلی رخصت ہونے لگے تو سب ان کو پہنچانے اسٹیشن تک گئے۔ میں اس گاڑی سے دہلی جارہا تھا۔ اس لیے حضرت قاری صاحب کا ہم سفر تھا۔ پہلے پلیٹ فارم پر سہارنپور کی طرف جانے والے گاڑی آئی اور دوسرے پلیٹ فارم پر دہلی جانے والی۔ حضرت قاری صاحب اور ان کے ساتھی ایک تھرڈ کلاس کے نسبتاً خالی ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ جب گاڑی میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ چکے تھے اور گاڑی چھٹنے میں کچھ دیر تھی تو حضرت قاری صاحب نے مولینا سے فرمایا "مولوی بدر عالم اب آپ جائیں۔" مولینا شیخ کے حکم کی تعمیل میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میری نگاہ سہارنپور والی گاڑی کے دریچوں کو پار کرتی ہوئی اتفاقاً جب پہلے پلیٹ فارم پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولینا بدر عالم پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں اور حضرت قاری صاحب کے چہرے پر اس طرح نگاہ جمائے ہوئے ہیں جیسے کوئی عاشق دلگیر اپنے محبوب کو دیکھتا ہے۔

میں نے حضرت قاری صاحب سے عرض کیا، آپ نے مولینا بدر عالم کو فضول یہاں سے رخصت کیا۔ جب تک جناب رہیں گے وہ آپ کو نہ چھوڑیں گے۔ حضرت قاری صاحب مسکرانے لگے۔

حضرت قاری صاحب سیاسی رجحانات کے اعتبار سے پکے مسلم لیگی تھے۔ حضرت قاری صاحب کی مجلسوں میں بھی سیاسیات حاضرہ پر گفتگو ہوتی اور وہ بے تکلف اپنے خیالات کا اظہار فرماتے حضرت مولانا بدر عالم کا ان خیالات سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ (جاری)

درسِ قرآن (۱۳ر جون ۱۹۷۱ء)
مرکز والی مسجد لکھنؤ

سورۂ توبہ کی اہمیت، اُس کے ناقابلِ فراموش اسباق اور اُس کا خاص پیغام

(۳)

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سورۂ توبہ کی ان آیات "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" سے لے کر "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ" الآیۃ تک کا تعلق اگرچہ براہِ راست یہود و نصاریٰ سے ہے، لیکن ان میں ہم مسلمانوں کے لیے بھی بڑا سبق ہے۔

یہ آیتیں جن میں اہلِ کتاب کی گمراہیوں اور اُن کے صریح مشرکانہ عقائد اور اُن کی اسلام دشمنی اور نورِ اسلام کو مٹا دینے کے منصوبوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن کے خلاف جہاد و قتال کی تیاری کی مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے، یہ دراصل غزوۂ تبوک کی تمہید ہے جس کا میں ابھی تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ مختلف پہلوؤں سے اس غزوہ میں بڑے خطرات تھے اور بڑی سخت آزمائش تھی اس لیے منافقوں کے علاوہ بعض کچے دل کے اور کم ہمت مسلمان بھی اس سے کترانا چاہتے تھے تو آگے کی آیتیں نازل ہوئیں۔

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ۔ الآیۃ ـــــــ

میں ابھی آپ کے سامنے ان آیتوں کا ترجمہ کرچکا ہوں، اور بتا چکا ہوں کہ ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد ہر مخلص مسلمان تیار ہوگیا ـــــ ان جن کے دلوں میں کسی درجہ کا نفاق تھا انھوں نے حیلے بہانے کیے اور طرح طرح کے عذر پیش کیے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کے عذر قبول کرلیے، ان کی تعداد روایات میں اسّی کے قریب بتائی گئی ہے ـــــ بعض منافق ساتھ بھی گئے لیکن اپنے منافقانہ ذہن اور منافقانہ کردار کو ساتھ لے کر گئے اور وہاں بھی شرارتیں اور ناپاک سازشیں کرتے رہے ـــــ اور اُن کے جو ساتھی مدینہ میں رہ گئے تھے ان کا چونکہ یہ خیال اور گمان تھا کہ رومی فوج اس پورے اسلامی لشکر کو موت کے گھاٹ اتار دے گی اور اب یہ زندہ واپس نہ آئیں گے اس لیے اس زمانہ میں ان کی زبانوں پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسی باتیں بھی آئیں جو ان کے ناپاک دلوں میں چھپی ہوئی تھیں لیکن کبھی زبان پر نہیں آتی تھیں، اور ان میں سے بہت سوں کا نفاق بالکل عریاں ہوگیا۔

سورہ توبہ کی شروع کی قریباً چالیس آیتوں کے بعد مسلسل قریباً ۵۰-۶۰ آیتیں (۵-۶ رکوع کے قریب) ایسی ہیں جن میں ان منافقین کے نفاق ہی کا بیان ہے۔ اور جس طرح اس سورت کی شروع کی آیتوں میں مشرکین عرب کے بارہ میں ایک نئے فیصلے اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے اسی طرح بعد کی ان آیتوں میں منافقین کے متعلق وہ سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اور اُن پر اور ان کے نفاق پر وہ ضربیں لگائیں اور ایسے کوڑے برسائے جنھوں نے نفاق کا گویا خاتمہ کردیا۔ اور اسلامی معاشرہ میں منافقین کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

منافقین کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہاں تک فرما دیا گیا۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً لَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ" یعنی یہ منافقین ایسے مردود ہیں کہ اے نبی اگر تم بھی ان کی بخشش کے لیے ہم سے دعا کرو اور ایک دو دفعہ نہیں ستر دفعہ دعا کرو تو ہم تمھاری دعا بھی ان کے بارہ میں نہیں سنیں گے اور ان کو نہیں بخشیں گے۔ اس کے بعد آپ کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ "وَلَا تُصَلِّ عَلٰى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ" یعنی ان میں سے جب کوئی مر جائے تو اے نبی تم اس کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھو اور اس کی قبر کے پاس بھی نہ کھڑے ہو۔

ـــــ جیسا کہ میں نے عرض کیا منافقین کے بارہ میں یہ نیا حکم تھا اور نئی پالیسی کا اعلان تھا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہت سے منافقین کے دل بدل گئے اور ان کو حقیقی ایمان نصیب ہوگیا ـــــ قریباً

۵۰..۶۰ آیتیں ساتویں رکوع سے بارھویں رکوع تک منافقین ہی سے متعلق ہیں، درمیان میں کہیں کہیں بطور مقابلہ مومنین صالحین کے کردار کا بھی ذکر آگیا ہے ــــــ اس کے بعد ان چند مخلص مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو صرف سستی اور لیت ولعل کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے اور خود ان کو اس کا بے انتہا رنج و غم تھا اور انھوں نے پوری سچائی کے ساتھ حضورؐ کے سامنے اپنے قصور کا اقرار کرلیا تھا اور بعضوں نے تو مسجد نبویؐ کے ستون سے اپنے کو باندھ دیا تھا اور طے کرلیا تھا کہ حضورؐ ہی معافی دے کے اپنے ہاتھ سے کھولیں گے تو کھلیں گے ورنہ اسی طرح بندھے بندھے مرجائیں گے ہیں ان حضرات کے واقعات متعلقہ آیتوں کے درس میں تفصیل سے بیان کرچکا ہوں ــــــ سورہ کے تیرھویں رکوع میں ان کے بارہ میں فرمایا گیا ہے ــــــ

"وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا ۚ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝"

یعنی کچھ بندے وہ ہیں جنھوں نے دلی ندامت کے ساتھ اپنے جرم و قصور کا اقرار کرکے خود اپنے کو پیش کردیا ہے، ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اچھے اعمال بھی کیے ہیں اور برے عمل بھی ان سے سرزد ہوئے ہیں، وہ امید کرسکتے ہیں کہ اللہ مہربانی فرماکر ان کو معاف کرنے اور ان کی توبہ قبول کرلے، اللہ غفور رحیم ہے۔

پھر دو تین آیتوں کے بعد فرمایا گیا ہے "وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝" یعنی غزوۂ تبوک میں نہ جانے والے اہل ایمان میں سے کچھ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم کے انتظار میں ملتوی ہے، وہ انھیں عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرماکر معاف فرمادے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر! ــــــ قرآن مجید کا یہ انداز بیان کعب بن مالک اور ابولبابہ انصاری جیسے صفِ اول کے مخلصین کے حق میں ہے جو ہمیشہ اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت اور دین کی خدمت اور اس کی راہ میں ہر قربانی کرتے رہے، ان میں سے کئی ایک بدری بھی تھے ــــــ اُن سے بس یہ غلطی ہوئی تھی کہ سستی کی وجہ سے غزوۂ تبوک سے پچھڑ گئے تھے، اسی پر اتنا سخت عتاب ہوا کہ کعب بن مالک اور اُن کے دو اور ساتھیوں کا پچاس دن تک مکمل مقاطعہ رہا، کوئی مسلمان ان سے بات نہیں کرتا تھا،

اُن کے سلام کا جواب تک نہیں دیتا تھا ــــ اس آیت میں اُن کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے حکم پر موقوف ہے، وہ احکم الحاکمین چاہے عذاب دے چاہے معاف فرما دے۔

ذرا غور کیجیے ان آیات میں کعب بن مالک اور اُن کے ساتھیوں کا ایسے انداز میں ذکر کیا گیا ہے جیسے کہ وہ بڑے ہی مجرم تھے، ــــ ذرا ہم اپنے بارہ میں سوچیں کہ اللہ و رسول کے احکام کی فرمانبرداری اور دین کے لیے جان و مال کی قربانی کے معاملہ میں ہمارا حال کیا ہے اور ہمارا انجام کیا ہونے والا ہو۔

پھر اس سے اگلے رکوع میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ سچے مسلمان کا اللہ کے ساتھ کیا معاملہ اور دین کی راہ میں قربانی کے بارہ میں کیا رویہ ہونا چاہیے اور اس کی زندگی کا کیا رنگ ہونا چاہیے۔ سُنیے فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

مطلب یہ ہے کہ جو سچے ایمان والے ہیں اُن کی جانیں اور اُن کے مال اللہ نے جنّت کے عوض خرید لیے ہیں، اب کسی سچے مسلمان کی جان و مال اس کی اپنی ملک نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کے ہاتھ بیچ چکا ہے، اب اُن کا کام یہ ہے کہ جب ان کو راہِ خدا میں جہاد اور جانبازی کے لیے پکارا جائے وہ لبیک کہہ کے میدان میں آجائیں، خدا کے اور اُس کے دینِ حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں جنگ کریں، ماریں اور مریں ــــ اور اس طرح خدا کے ہاتھ بیچی ہوئی جان و مال اس کی راہ میں قربان کر دیں اور اس کے عوض جنّت اور اس کی لازوال نعمتیں اور ابدی عیش و آرام حاصل کرلیں ــــ

آگے فرمایا گیا ہے "وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ" ــــ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ بالکل پکا ہے، کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، پہلے مقدس صحیفوں تورات و انجیل میں بھی اس کا اعلان ہو چکا ہے اور اب قرآن میں بھی اس کی ضمانت دی جا رہی ہے ــــ اور خدا سے زیادہ وعدہ کا سچّا کون ہو سکتا ہے ــــ آگے فرمایا گیا ہے کہ مومنین کا اپنے اللہ کے ساتھ یہ ایسا نفع بخش سودا ہوا ہے جس پر انھیں جتنی بھی خوشی

اور مسرت ہو برحق ہے، یہ ان کی بہت ہی بڑی فیروزمندی ہے۔ ذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔

ذرا غور کیجئے اللہ ہی کی دی ہوئی ایک فانی جان جو دیر سویر ختم ہوتے ہی والی ہے اور مال و دولت جس کو یا خرچ ہونا ہے یا مر کر ترکہ میں چھوڑ دینا ہے، اس کو اللہ کے حکم پر اس کی راہ میں قربان کر کے آخرت کی حیاتِ ابدی اور جنت حاصل کر لینا کتنا نفع بخش سودا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدر دانی دیکھئے کہ وہ خود ہمارا خریدار اور طالب بنا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ مومنین نے اپنی جان و مال کے عوض ہم سے جنت خرید لی ہے، بلکہ یوں فرمایا کہ ہم نے جنت اُن کے لیے لکھ دی ہے اور اس کے بدلے اُن کی جانیں اور اُن کے مال ہم نے خرید لیے ہیں، ہم اُن کے خریدار بنے ہیں ——— خرید و فروخت کے معاملہ میں ہمیشہ خریدنے والا طالب ہوتا ہے جو قیمت ادا کر کے مطلوب چیز کو خرید لیتا ہے۔ قیمت کی حیثیت تو خرید و فروخت کے ایک وسیلہ کی ہوتی ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان مومنین کی زندگی کا کیا ڈھنگ ہوتا ہے اور کیا ان کے اوصاف و احوال ہوتے ہیں ——— فرمایا گیا ہے

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ
السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۝ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

یعنی یہ اپنی خطاؤں قصوروں سے توبہ کرنے والے اور اللہ کے عبادت گزار بندے ہوتے ہیں۔ ان کی زبانوں پر خدا کی حمد و تسبیح رہتی ہے، یہ خدا کی راہ میں حسبِ ضرورت و موقع دور یا قریب کے علاقوں میں پھرتے ہیں ——— (جس دن ان آیتوں کا درس تھا میں نے بتایا تھا کہ "السَّائِحُوْنَ" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، میرے نزدیک اس کو ترجیح ہے کہ اس سے دین کی راہ میں پھرنا مراد ہے۔ عبادت اور ذکر و تسبیح کی طرح خدا کی راہ میں پھرنا بھی صحابہ کرام کی زندگی کا خاص جز تھا، ہمارے اس دور میں تبلیغی جماعت کے مخلصوں کا پھرنا دیکھ کر یہ بات خوب سمجھ میں آتی ہے) ——— آگے فرمایا گیا ہے "الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ" یعنی یہ لوگ ذوق و شوق سے نمازیں پڑھتے ہیں اور اس سے روحانی غذا حاصل کرتے ہیں۔ "الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی ان ذاتی اعمال و اشغال کے علاوہ اللہ و رسول کے حکم کے مطابق یہ دوسرے بندگانِ خدا کی بھی فکر کرتے ہیں۔

اچھے کام کرنے اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لیے کہتے ہیں اور بُرے کاموں سے ان کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ آخر میں فرمایا گیا ہے "وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی محافظت اور پابندی کرتے ہیں، یعنی جن کاموں اور جن باتوں سے منع فرمادیا گیا اُن کی طرف قدم نہیں اٹھاتے ـــــ یہ ہے سچے ایمان والوں کی پوری تصویر! ـــــ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ" ٥ یعنی اے پیغمبر ہمارے ان صاحب ایمان بندوں کو جو اپنا جان ومال اور سب کچھ ہمارے ہاتھ بیچ چکے اور جن کے یہ اوصاف واحوال ہیں ـــــ ان کو ہماری رضا اور جنت کی خوشخبری دے دیجئے، ہماری طرف سے وہ ان کے لیے لکھی جاچکی ہے۔

ان دو آیتوں نے ہمارے سامنے سچے مسلمانوں کی ایسی مکمل تصویر رکھ دی ہے کہ اسکو سامنے رکھ کے ہم میں سے ہر ایک اپنی ایمانی حالت اور اسلامیت کو جانچ پرکھ سکتا ہے۔ اس میں جتنی کمی ہو سمجھنا چاہیئے کہ اتنی ہی ایمان میں اور اسلامیت میں کمی ہے۔

چو میگویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

پھر چند آیتوں کے بعد اسی سچی اسلامیت اور ایمان صادق کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ" ٥

یعنی اے مسلمانو جنھوں نے اسلام کو بطور دین کے قبول کرلیا ہے اللہ سے ڈرو، اپنے اندر تقویٰ اللہ کی کیفیت پیدا کرو اور مومنین صادقین کے ساتھ ہو جاؤ ـــ

سورۂ توبہ کے ان تمام مضامین کے بعد جن میں ہر قسم کے اور ہر درجہ کے نفاق اور دین کی راہ میں قربانی سے گریز، بلکہ معمولی کوتاہی اور سستی پر بھی سخت عتاب کیا گیا ہے اور انتہائی جلال کے کوڑے برسائے گئے ہیں تو ان مضامین کے بعد یہ آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" بڑی معنویت رکھتی ہے ـــــ اس آیت کی جو دعوت و پکار صحابۂ کرام کے لیے تھی وہ میرے اور آپ کے لیے بھی ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی مخاطب کرکے فرمارہا ہے "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ" ٥ ـــــ مجھے اور آپ کو دل سے

اور عمل سے جواب دینا چاہیئے کہ اے ہمارے اللہ ہم نے فیصلہ کر لیا، تو توفیق دے کہ تیرا تقویٰ اور صادقین کی معیت نصیب ہو جائے۔

اس کے بعد اب اس سورۃ کی اُن آخری دو آیتوں پر آجائیے جو میں نے شروع میں تلاوت کی تھیں اور جن پر یہ سورۃ ختم ہوئی ہے۔

آپ حضرات نے اس پوری سورت کے درس سے خود بھی محسوس کیا ہوگا اور میں بھی برابر عرض کرتا رہا ہوں کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے جلال کا بڑا ظہور ہوا ہے ـــــ مشرکین، یہود و نصاریٰ، منافقین اور وہ مسلمان جن کے ایمانوں میں کچھ ضعف تھا اور وہ صحابہ کرام جن سے دین کے بارہ میں کچھ بھی سستی اور کمزوری ظاہر ہوئی تھی اُن سب کے خلاف اس سورت میں بڑا سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے اور سب ہی کو جھنجھوڑا گیا ہے، اسی لیے حضرت حذیفہ اس سورت کو سورت العذاب کہا کرتے تھے ـــــ لیکن اس کا خاتمہ ایسی آیت پر کیا گیا ہے جو رحمت سے بھرپور ہے ـــــ ارشاد ہوا ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

مطلب یہ ہے کہ خدا نے تم سب طبقوں پر یہ رحمت فرمائی ہے کہ ایسا رسول تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے جو خود تمھیں میں سے ہے، تم اس کو جانچ پرکھ سکتے ہو۔ اور وہ تمہارا ایسا غمخوار و غمگسار ہے کہ تمہاری تکلیف و مشقت اس پر بھاری اور شاق ہے، اس کو تمہاری فوز و فلاح کی بڑی حرص اور فکر و لگن ہے اور خاص کر ایمان والوں کے لیے وہ بڑا ہی شفیق و ہمدرد ہے اور اس کا قلب رافت و رحمت سے معمور ہے۔ تو اے سب لوگو تمھیں اللہ کی اس نعمت اور رحمت کی قدر کرنی چاہیئے اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرنا چاہیئے۔ اور اس کے رؤف و رحیم پیغمبر کی رافت و رحمت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے! خاصکر ایمان والوں کو چاہیئے کہ اس کی ہدایات پر چل کر اور اس کا اتباع کر کے اللہ کی رضا اور رحمت اور جنت حاصل کریں ـــــ

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے

"فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝

یعنی اگر یہ لوگ رحمت کی اس پکار کو بھی نہ سنیں اور اے پیغمبر تمہاری طرف نہ آئیں تو پھر تم ان سے کہہ دو کہ مجھے تم سے کچھ لینا نہیں، میرا اللہ مجھے کافی ہے، وہی اور صرف وہی معبود و مقصود ہے، میرا اسی پر اعتماد و بھروسہ ہے، اور وہ "رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْم" ہے ــــ اس آیت پر یہ سورت ختم ہے۔

یہ سورۂ توبہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات میں نازل ہوئی ہے اور اس کے مضامین کی نوعیت ایسی ہے کہ گویا یہ الوداعی پیغام اور وصیت نامہ ہے، غالباً اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی تاکید فرماتے تھے کہ ہر مسلمان اس کا علم حاصل کرے تاکہ اس سے اس کو برابر ہدایت اور روشنی ملتی رہے ـــــ میں نے بھی آج اسی لیے اس کے اہم مضامین کو دہرا دینا مناسب سمجھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب حضرات کو اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں اس کی بالکل آخری آیت کے متعلق ایک حدیث اور سن لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے سنن ابی داؤد میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صبح و شام سات سات دفعہ یہ کلمہ پڑھ لیا کرے "حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْم" تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مشکلات و مہمات حل ہوتی رہیں گی اور اللہ اس کے لیے کافی ہوگا۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ نَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی نَبِیِّہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن۔

بقیہ نگاہِ اولیں

کی بارش میں برس رہا ہے ـــ اور پھر عذاب بالائے عذاب یہ ہے کہ جو اس میں مبتلا ہیں وہ اور تو سب کچھ سوچتے ہیں لیکن یہ سوچنا اُن کے لیے گویا حرام ہو گیا ہے۔ اس خونی طوفان و سیلاب کا ان کی اپنی زندگی سے اور خداوند کائنات کے فیصلہ اور ارادہ سے بھی کوئی تعلق ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ عذاب پر عذاب ہے کہ اہلِ ایمان کی طرح حقیقتوں کو سوچنے سمجھنے سے بھی محروم کر دیے گئے

فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ ۝ ان کے دلوں پر مہر ہو گئی ہے اب وہ (ایمانی حقائق کو) بالکل نہیں سمجھتے۔

ہندوستان میں علمِ حدیث

(از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری)
(استاذ حدیث دار العلوم فلاح دارین ترکیسر، سورت)

مسلمانوں کا علم حدیث سے غیر معمولی شغف

علم حدیث درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کی پوری تاریخ ہے، مسلمانوں کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی سے جو غیر معمولی عشق و محبت کا تعلق ہے، اس کی نظیر دیگر امتوں اور گزشتہ تاریخ میں نہیں مل سکتی، انھوں نے اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے ہر ہر گوشہ و ہر ہر خد و خال کو کمال دیانت و احتیاط سے محفوظ کر دیا ہے، آج اگر کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی تصویر و نقشہ دیکھنا چاہتا ہو تو اس کے لیے حدیث کی کتابیں کافی ہیں۔

حدیث چونکہ قرآن مجید کی شرح و تفسیر ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحفظون ۝" اس لیے ضروری تھا کہ قرآن مجید کے شرح و بیان کی بھی حفاظت کی جائے، حق تعالیٰ کے اس غیبی نظام کے تحت مسلمانوں نے علم حدیث کی حفاظت و اشاعت کے لیے جو محیر العقول کارنامے انجام دیے ہیں، وہ تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں۔ انھوں نے اس علم کی حفاظت و تدوین، نقل و اشاعت اور جمع و ترتیب، حفظ و اتقان اور تمام ان علوم پر خصوصی توجہ صرف کی، جن کا اس علم سے کوئی ادنیٰ تعلق یا رشتہ تھا۔

اس علم کی حفاظت و صیانت اور نشر و اشاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت بالغہ اور عنایت خاصہ رہی ہے، اس کی بنا پر اس امت میں غیر معمولی ذکی و ذہین افراد کا ایک سیلاب نما لشکر نظر آتا ہے، جو علم حدیث کی خدمت کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا، ان کے لیے پہاڑوں اور سمندروں

کو پار کرلینا، اس راہ میں بڑے بڑے مصائب کو برداشت کرلینا، اور دشوار گزار راستوں کو طے کرلینا آسان بن گیا، انھوں نے اس علم کی خدمت و اشاعت کا ایسا کارنامہ انجام دیا کہ سابق تاریخ و گزشتہ امتوں میں اس شغف و انہماک، عشق و محبت، بلند ہمتی و جفاکشی ایثار و قربانی کی نظیر نہیں مل سکتی، یہ محض اتفاقی امر نہیں، بلکہ قدرت الٰہی کا ایک بڑا معجزہ اور مادہ پرست و ظاہر بین انسانوں کے لیے ایک بڑا سبق، اور انسانی تاریخ کی پیشانی پر ایک علامت استفہام ہے کہ ایسا کیونکر ہوا؟

یہ درحقیقت اسرار الٰہی میں سے ایک سر اور اس آسمانی فیصلہ کی روشن دلیل ہے کہ یہ رسالت آخری ہے، اور اس شریعت کا تاقیامت بقاء و دوام نوشتہ الٰہی ہے۔ یہی اس امت کے لیے حدیث نبوی کی حفاظت اور مسائل کے استنباط و استخراج اور تمام علوم اسلامیہ کی تدوین کا سبب، اور مدارس کے قیام کا ذریعہ بنا۔

تمام ممالک جہاں جہاں مسلمان فاتحین اور مجاہدین، صوفیاء و مبلغین، اساتذہ و معلمین، فقہاء و محدثین کے قدم پہونچے، وہ اپنے ساتھ علم حدیث کو بھی لے گئے، اور وہاں اس کی نشر و اشاعت کی۔

ہندوستان میں صحابہؓ و تابعینؒ کی آمد

عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے محمد بن قاسم نے ۹۲ھ میں سندھ کو فتح کر کے عرب و ہند کے درمیان تعلقات قائم کیے تھے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے مسلمان یہاں بحری راستے سے آچکے تھے، کیونکہ عرب تاجروں اور سواحل ہند کے سوداگروں میں باہم تعلقات بہت قدیم زمانے سے قائم تھے، ان کا آغاز بہت پہلے سے ہوچکا تھا، البتہ اسلام کے بعد عرب تاجر پہلے کی طرح صرف تجارتی اسباب و سامان و پیداوار ہی ہندوستان میں نہیں لاتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ وہ اپنی بڑی قیمتی دولت جو ان کو اپنے پیغمبرؐ سے ورثہ میں ملی تھی، وہ بھی رفتہ رفتہ لانے لگے تھے۔ سندھ و گجرات، کوکن و ملیبار، سواحل ہند و جزائر ہند کی قوموں نے ان کو فرشتۂ رحمت سمجھ کر اُن کے اس تحفہ کو قبول کیا۔ عربی سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں میں ان مقامات کے نام کثرت سے ملتے ہیں۔

غالباً انھیں تاجروں کے ذریعہ جب سرندیپ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو نبی کریم صلعم کا حال معلوم ہوا، تو انھوں نے ایک فہیم آدمی کو تحقیق حال کے لیے مدینہ منورہ روانہ کیا، تاکہ وہ حضورؐ اور آپؐ کی دعوت کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کرے، چنانچہ وہ حضرت عمرؓ

کے زمانے میں مدینہ منورہ پہونچا، اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات حاصل کیں، واپسی میں اس کا انتقال مکران (قریب بلوچستان) میں ہوگیا، اس کا ایک رفیق سفر اور تھا، جو واپس سرندیب پہونچا، اور سارے حالات سنائے، حضرت عمرؓ کی سادگی، تواضع، اور ان کے اخلاق کی ساری تفصیلات بیان کیں، جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے ایک تعلق و محبت پیدا ہوگئی[1] اس طرح اس علاقہ میں اشاعت اسلام کے لیے راستہ ہموار ہوگیا، حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں عثمانؓ بن ابی العاص ثقفی کو بحرین و عمان کی حکومت پر نامزد کیا، جن کا شمار صحابہؓ کرام میں ہے، انھوں نے ایک لشکر تیار کر کے اپنے بھائی حکمؓ بن ابی العاص ثقفی کو تھانہ و بھروچ کی مہم کے لیے روانہ کیا، اور اپنے دوسرے بھائی حضرت مغیرہ بن ابی العاص ثقفی کو دیبل (کراچی کے قریب) کی مہم پر روانہ کیا[2] یہ دونوں حضرات بھی طبقۂ صحابہ میں شامل ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ ثقفی بذات خود ان تینوں مقامات پر تشریف لائے، علامہ ابن حزم لکھتے ہیں۔

"وعثمان منهم من خيار الصحابة ولاه رسول الله صلى الله عليه وسلم بالطائف وغزا فارس وثلاثة من بلاد الهند وله فتوح[3]	حضرت عثمانؓ خیار صحابہؓ میں تھے۔ انکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا حاکم بنایا تھا، انھوں نے فارس اور ہندوستان کے تین شہروں پر غزوہ کیا اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔

ان حملوں میں مسلمانوں کو خاصی کامیابی کے باوجود حضرت عمرؓ دریائی سفر کے عرصہ تک مخالف رہے، اس لیے ایک زمانہ تک مسلمانوں نے ادھر توجہ نہیں کی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلہ کا دوسرا راستہ سندھ ہے، سندھ کا علاقہ مدت دراز سے شاہان ایران کا باجگزار تھا، بعد میں ایران جب مسلمانوں کے قبضے میں آیا، تو چونکہ ایران کی حکومت کی آخری حد سندھ سے مل جاتی تھی، اس لیے قدرتی طور پر سندھ سے مسلمانوں کو تعلق پیدا ہوگیا، عہد فاروقی میں اسلامی سلطنت کے حدود سندھ تک پہونچ گئے تھے، بلکہ سندھ کے علاقہ مکران (قریب

---

[1] عجائب الهند ص ۱۵۷ [2] فتوح البلدان ص ۴۳۲ [3] جمهرة انساب العرب ص ۲۶۶

بلوچستان) کو عہد فاروقی میں حضرت حکم بن عمرو تغلبی نے ۲۱ھ یا ۲۲ھ میں فتح کیا، مگر راستہ کی مشکلات کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے آگے بڑھنے سے روک دیا [1]

حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں عبداللہ بن عامر کریز کے ذریعہ حضرت حکیمؓ بن جبلہ کو ہندوستان کے ملکی وسیاسی حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا، مگر یہاں کے دشوار گزار راستہ کی وجہ سے مزید کارروائی مناسب نہ سمجھی۔

اس کے بعد حضرت علیؓ و حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں بھی متواتر حملے ہوتے رہے مگر مستقل دپائدار فتح ولید کے عہد میں حاصل ہوئی [2]

جب حضرت عمرؓ کے عہد سے مسلمان فاتحین کا داخلہ اس ملک میں شروع ہوتا ہے تو یقیناً ان میں صحابہؓ وتابعین کی ایک بڑی جماعت ضرور رہی ہوگی جنھوں نے اپنے مبارک قدموں سے سرزمین ہند کو عزت بخشی۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

کان الصحابة فی زمن عمرو عثمان فتحوا اوائل بلاد الهند [3]	حضرت عمرؓ و حضرت عثمان کے زمانے میں صحابہ کرام نے ہندوستان کے ابتدائی حصوں کو فتح کر لیا تھا۔

ان متبرک نفوس میں کچھ ایسے حضرات بھی ہوں گے جو جام شہادت نوش فرما کر یہاں کی خاک میں مدفون ہوئے ہوں گے۔

حافظ ابن کثیر محمد بن قاسم کی فتوحات کے تذکرہ میں فرماتے ہیں۔

"وکان فی عساکرهم وجیوشهم فی الغزو الصالحون والاولیاء والعلماء من کبار التابعین	(بنی امیہ) کے غزوات کے اندر لشکروں فوجوں میں کبار تابعینؒ میں سے صلحاء واولیاء و علماء کی ایک بڑی جماعت ہر لشکر میں ہوتی

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۲ صہ ۱۲۴ [2] فتوح البلدان باب فتوح السند ص ۴۲۰

[3] البدایة والنهایة صہ ۸۷ ج ۹

من کل جیش منھم شرذمۃ عظیمۃ ینصراللہ بھا دینہ[1] | تھی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی نصرت فرماتا تھا۔

حضرت سعد بن ہشام انصاریؓ یہ حضرت انس بن مالک کے چچازاد بھائی اور اجلۂ تابعین میں سے ہیں، انھوں نے اپنے والد حضرت ہشام، حضرت انسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت سمرہؓ بن جندب رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، ان کے تلامذہ میں حمید بن ہلال زرارہ بن اوفیٰ، حمید بن عبدالرحمٰن حمیری اور امام حسن بصری وغیرہ ہیں صحاح ستہ میں ان کی روایات موجود ہیں، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے۔

"قتل سعد فی مکران علی احسن حال[2] | مکران (علاقۂ سندھ) میں حضرت حضرت سعدؓ بہت مبارک حالت میں شہید ہوئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ان کے مکران کے جہاد میں شرکت و شہادت کی تصریح کی ہے[3]۔

جابر بن نضالہ ان کے بارے میں علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انسؓ کے شاگرد تھے، ہندوستان آنے والی فوج میں ان کا نام لکھا گیا تھا، انھوں نے حضرت انسؓ سے جاکر فتویٰ پوچھا کہ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں جا سکتا ہوں یا نہیں، تو حضرت انسؓ نے واپسی کا مشورہ دیا، اب معلوم نہیں کہ وہ واپس ہو گئے یا ہندوستان آئے[4]۔

ربیعؒ بن صبیح سعدی ۱۵۹ھ میں جو فوج خلیفہ مہدی کی طرف سے ہندوستان روانہ ہوئی تھی اس میں حضرت ربیعؒ بن صبیح سعدی البصری بھی تھے، جن کو تبع تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بعض لوگوں نے ان کو تابعی لکھا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کو طبقہ سابعہ میں شمار کیا ہے جو کبار تبع تابعین کا طبقہ ہے، امام بخاری نے تعلیقاً اور امام ترمذی اور ابن ماجہ نے اپنی کتابوں میں ان کی روایت کی تخریج کی ہے[5]۔ بصرہ کے فقہا و محدثین میں یہ سب سے پہلے مصنف ہیں. صاحب کشف الظنون کا بیان ہے۔

---

[1] حوالہ مذکور [2] التاریخ الکبیر ج ۲ ص ۶۰ [3] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴۸۳ [4] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۰۸ [5] تقریب التہذیب ج ۱ ص ۲۴۵

قیل اول من صنف وبوب ربیع بن صبیح بالبصرة[۱]	بیان کیا گیا ہے کہ ربیع بن صبیح بصرہ میں پہلے آدمی ہیں جنھوں نے تصنیف کی اور باب بندی کی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے رامہرمزی کی کتاب المحدث الفاصل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ بصرہ میں سب سے پہلے مصنف ہیں، ان کی عبادت کا حال یہ تھا کہ رات میں ان کے گھر سے تلاوت قرآن کی وجہ سے مسلسل شہد کی مکھیوں کی سی آواز آتی رہتی تھی[۲]

حافظ نے تقریب میں لکھا ہے۔ "کان عابدا مجاھدا" ان کے حالات میں ابن سعد تحریر فرماتے ہیں۔

"خرج غازیا الی الھند فی البحر فمات فدفن فی جزیرة من جزائر البحر سنة ستین ومأة فی اول خلافة المھدی[۳]	انھوں نے جہاد کے لیے ہندوستان کی طرف سمندر کا سفر کیا، اسی سفر میں ۱۶۰ھ میں مہدی کی خلافت کے ابتدائی دور میں انتقال فرمایا، اور وہیں کسی جزیرہ میں دفن ہوئے

خیال ہے کہ بھروچ (گجرات) کے قریب مقام باربادد (بھاڑ بھوٹ) میں مدفون ہوئے[۴]

اسرائیل[۲] بن موسیٰ بصری ان کا شمار بھی تبع تابعین میں ہے، علامہ سمعانی فرماتے ہیں۔ "ابو موسیٰ اسرائیل بن موسیٰ الہندی کان ینزل الھند فنسب الیھا" یہ ہندوستان اکثر قیام کرتے تھے، اس لیے ان کو ہندی کہا جانے لگا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ابن حبان کی کتاب الثقات کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں، "کان یسافر الی الھند" یہ ہندوستان کا سفر کیا کرتے تھے، ان کے اساتذہ میں امام حسن بصری، ابو حاتم اشجعی اور محمد بن سیرین وغیرہ ہیں۔ سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے[۵]

---

[۱] کشف الظنون ص ۶۳۷ ج ۱ [۲] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۸ [۳] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۷۷ [۴] یاد ایام ص ۶ [۵] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۹

"توحید اہلّہ" کی تجویز سے متعلق سوالات کا تیسرا جواب:-

اِختلافِ مَطالع کی شرعی حقیقت

(از مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

"اختلاف مطالع" ایک ایسا عنوان ہے جو صدیوں سے فقہاء کا موضوع بحث بنا ہوا ہے، ہمیشہ سے اس بارے میں بنیادی طور پر دو رایوں کا۔ کتابوں میں۔ ذکر ملتا ہے۔ ایک یہ کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اعتبار نہ کیا جائے۔

لیکن "خبر رسانی کے جدید تیز تر وسائل" دریافت ہونے سے قبل ان دونوں مسلکوں کا فرق، عملی طور پر اتنا واضح اور نمایاں نہیں تھا، اور نہ اس کا اثر ایسا رونما ہوتا یا ہو سکتا تھا جیسا کہ آج ہو یا ہو سکتا ہو۔ کیونکہ "عدم اعتبار" کا مسلک اختیار کرنے والے بھی۔ زیادہ سے زیادہ دو چار سو میل کے فاصلہ کی خبر رویت پر ہی فیصلہ کر سکتے تھے، ظاہر ہے کہ اتنی ...... مسافت پر تاریخوں میں ایسا اختلاف عموماً نہیں ہوتا کہ ایک جگہ کی رویت کا (ثبوت شرعی مل جانے پر دوسری جگہ) حکم نافذ کر دیا جائے تو قمری مہینہ ۲۸، یا ۳۱ دن کا ہو جائے! اس وجہ سے پہلے یہ اختلاف مذاہب عملی کم، نظری زیادہ تھا، مگر آج اس کا اثر — اگر "عدم اعتبار" والے مسلک کو اسی عموم کے ساتھ اختیار کیا جائے جو کتابوں میں لکھے الفاظ کے اطلاق سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے تو — اتنا غیر معمولی ظاہر ہوگا کہ مہینوں کے ایام کی شرعی و مخصوص تعداد (۲۹ یا ۳۰ دن) زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے گی۔

کیونکہ نقل و حمل اور خبر رسانی کے موجودہ تیز رفتار وسائل نے یہ آسان کر دیا ہے کہ ایک جگہ کی

رویتِ ہلال کی اطلاع ۔ معتبر اور شرعی طریقہ سے بھی ۔ تمام عالم کے اندر بہت تھوڑے وقت میں پہونچا دی جائے ۔ اس طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ مغربِ اقصیٰ میں نظر آجانے والے "ہلالِ عید" کی خبر ۲۸ رمضان ہی کو (ہندوستان کی تاریخوں کے لحاظ سے) ہمارے یہاں پہونچ جائے ۔ تو کیا یہاں ۲۸ روزے رکھنے کے بعد ہی عید منانے کا فیصلہ کیا جائے گا؟! ـــــ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی بھی نہیں کر سکتا ـــــ یہ ہے وہ اہم وجہ جس کی بنا پر آج اس مسئلے نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ، اور علمائے عصر کو مجبور کیا کہ وہ بجشد نظر اور غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہونچیں !

وقت کی اسی اہم ضرورت کی طرف ، ہند کے مؤقر رسالہ "الفرقان" نے علماء کو دعوتِ غور و فکر دی ، اور جواب دہی آسان کرنے کی غرض سے ـ تین سوالات قائم کر کے ، ان کے جوابات دینے کی طرف توجہ دلائی ـ (اس کے مدیر محترم نے ان کا جواب لکھنے کے لیے احقر سے ازراہِ حسنِ ظن ـ زبانی بھی فرمایا)

سطورِ ذیل میں ان تینوں سوالات کے جوابات بالترتیب دینے کی ایک حقیر کوشش کی گئی ہے ، واللہ الموفق للسداد ۔

---

(۱) "اختلافِ مطالع" جیسے جزوی و فروعی مسئلے میں براہ راست "کتاب اللہ" سے راہنمائی نہ ملنا مستبعد نہیں ، کیونکہ قرآن مجید بمنزلہ دستور کے ہے ، جس میں تفصیلات اور جزوی احکام کے بجائے بنیادی اور اصولی قسم کے قوانین ہیں ۔ احقر کو اپنی کم سوادی کے اعتراف میں ذرا بھی پیش نہیں ، اور نہ یہ کہنے میں کہ قرآن مجید کی کسی آیت سے (اس بارے میں) مجھے سیدھے طریقے اور صریحی طور پر کوئی رہنمائی نہیں ملی ـ (بعض حضرات نے ایک دو آیتوں سے مسئلہ کا جوڑ لگانے کی کوشش کی ہے ، مگر احقر نہیں سمجھ سکا)

اسی طرح سنتِ نبوی میں بھی ایسا کوئی صریح نص نہیں ملتا کہ جس کی بنیاد پر دو ٹوک طریقے سے یہ کہا جا سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا ہے ، یا نہیں کیا !

ہاں بعض احادیث ایسی ملتی ہیں جن سے اس مسئلہ میں کچھ روشنی حاصل ہوتی ہے ، انہی احادیث پر تمام فقہاء نے بحث کا مدار رکھا ہے ۔!

یہاں یہ ذکر کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ نماز ، روزہ کے اوقات کی ابتداء و انتہا کے بارے میں

سب کا اتفاق ہے کہ ہر جگہ پر اس مقام کے حالات اور وہاں کی ساعات سے ہی تعیین ہوگا۔ مثلاً لکھنؤ میں جس وقت سورج غروب ہوتا ہے اس وقت مغرب کی نماز اور افطار کا وقت ہوگا۔ تھوڑے سے فاصلے کا بھی۔ جہاں کچھ دیر پہلے یا بعد میں غروب ہوا۔ اعتبار نہ ہوگا، اس قاعدہ کا تقاضا تھا کہ "مہینوں" کی ابتداء و انتہا کے لیے بھی ہر مقام پر صرف وہاں کی رویت سے رمضان وغیرہ کی آمد و رفت کا فیصلہ کیا جاتا (جیسا کہ ایک جماعت کہتی بھی ہے، تفصیل آگے آ رہی ہے)

لیکن اس کے باوجود جمہور علماء اس سلسلہ میں اتنی تحدید اور تنگی کے قائل نہیں، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اس باب میں نسبتہً توسع اختیار کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ "سنن حدیث" کی کتابوں میں بعض واقعات ایسے ملتے ہیں کہ کسی ایک جگہ چاند نظر آجانے کی شہادت مل جانے کی وجہ سے دوسری جگہ (تھوڑے فاصلہ پر) بھی مہینہ کی آمد کے فیصلے کیے گئے، اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کے احکام دیے گئے۔[1]

اس باب میں حضرت کریبؓ والی حدیث سے سب سے زیادہ راہنمائی ملتی ہے، اور اسی میں غور و فکر کرکے علماء نے مختلف نتائج نکالے ہیں جس کے لازمی تقاضہ سے متعدد مذاہب وجود میں آگئے۔ حدیث کریب کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

حضرت کریبؓ نے ملک شام میں جمعہ کی شب کو رمضان المبارک کا چاند دیکھا، ان کے علاوہ اور بہت لوگوں نے بھی دیکھا، جن میں امیر شام حضرت معاویہؓ بھی تھے، (مدینہ طیبہ میں وہ چاند ہفتہ کی شب میں دیکھا گیا تھا) آخر رمضان میں حضرت کریبؓ مدینہ واپس آئے، اور اپنے چاند دیکھنے، نیز شام میں (مدینہ سے ایک دن قبل) رمضان کی آمد پر شہادت دی، مگر حبر الامۃ حضرت عبد اللہؓ ابن عباسؓ نے ان کی شہادت پر فیصلہ کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا:- ھٰکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[2]

اس واقعہ سے بعض علماء نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "کسی مقام پر نظر آنے والے چاند کا حکم اس جگہ کے علاوہ کسی دوسرے مقام کے لوگوں پر لازم نہ ہوگا۔" اس نقطۂ نظر کو اصطلاح فقہ میں "اختلاف مطالع کا

---

[1] دیکھیے ابوداؤد صفحہ ۳۱۹-۳۲۰ ج ۱، ترمذی صفحہ ۸۸ ج ۱، مشکوٰۃ صفحہ ۱۷۴ ج ۱۔ [2] حدیث کی تمام کتابوں میں (بخاری کے علاوہ) یہ واقعہ معمولی جزوی اختلاف کے ساتھ ملتا ہو مثلاً دیکھیے مسلم شریف صفحہ ۳۴۸ ج ۱، ترمذی صفحہ ۸۸ ج ۱، ابوداؤد صفحہ ۳۱۹ ج ۱، اور المنتقیٰ!

اعتبار کرنا" کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ واقعہ "اختلافِ مطالع کا اعتبار کرنے والوں" کی دلیل سمجھا گیا یہاں تک کہ مشہور محدث ابو عیسیٰ ترمذیؒ نے اس حدیث کے لیے عنوان یہ اختیار کیا۔ باب ما جاء لکل اھل بلد رویتھم[1]

علماء و فقہاء کی دوسری جماعت نے مشہور حدیث "لا تصوموا حتیٰ تروہ" اور حدیث "صوموا الرؤیتہ وافطروا الرویتہ" سے اس مسئلہ کا حل نکالا ہے۔ اس طرح پر کہ "صوموا" کا خطاب ہر مسلمان کے لیے ہے۔ لہٰذا چاند نظر آجانے کے بعد (خواہ چاند کہیں نظر آجائے) ہر خطہ کے مسلمان اس بات کے مکلف ہیں کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں گویا چاند کی مطلقاً رویت، تمام عالم کے لیے مہینہ کی آمد کا اعلان ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بیان فرمایا ہے:

لیس المراد تعلیق الصوم بالرؤیۃ فی حق کل احد بل المراد رویۃ بعضھم ...... وقد تمسک بتعلیق الصوم بالرؤیۃ من ذھب الی الزام البلد برؤیۃ اھل بلد غیرھا[2]	ہر شخص کی رویت پر روزہ کی فرضیت موقوف نہیں ہے بلکہ اگر کچھ لوگ بھی چاند دیکھ لیں تو سب کے لیے یہ کافی ہے۔ اس سے ان لوگوں نے بھی استدلال کیا ہے جو دوسرے مقامات پر بھی (مقام رویت کے علاوہ) روزہ رکھنے کو لازم سمجھتے ہیں

تقریباً یہی بات (ذرا وضاحت کے ساتھ) علامہ ابن عابدین شامیؒ بھی۔ اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کرنے والی جماعت کا قول ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وھو المعتمد عندنا وعند المالکیۃ والحنابلۃ لتعلق الخطاب عاما بمطلق الرؤیۃ فی حدیث صوموا الرؤیتہ بخلاف اوقات الصلوٰۃ الخ[3]

احادیثِ نبویؐ کے مشہور شارح علامہ شوکانیؒ چونکہ دوسری جماعت (یعنی اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کرنے والوں) سے فکری طور پر وابستہ ہیں اس لیے وہ حدیث کریبؒ میں بیان کردہ واقعہ (شہادت) کو حضرت عبد اللہ ابن عباس کا اجتہاد سمجھتے ہیں، اسے حدیثِ مرفوع نہیں خیال کرتے ہیں[4]

---

[1] ترمذی ص۱۰ ج۱ [2] فتح الباری ص۱۰۵ ج۴ [3] رد المحتار ص۹۶ ج۲ مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند

[4] تفصیل کے لیے دیکھیے نیل الاوطار ص۲۰۵ ج۴

(۴) اوپر بیان کردہ تفصیلات کے اندر ضمناً اختلافِ مذاہب کی بھی ایک جھلک سامنے آگئی اس مسئلہ میں مختلف علمائے مذاہب کے جو اقوال کتابوں میں ملتے ہیں ان کی تعداد یوں تو نو، دس تک پہونچ جاتی ہے لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو بنیادی طور پر ان کی صرف تین قسمیں ہوتی ہیں، یا یہ کہہ لیجئے کہ تین مذہب ہیں۔

(۱) رویت کا حکم صرف مقام رویت (بلدۂ رویت) میں محصور رہتا ہے، دوسرے کسی مقام پر لازم نہیں ہوتا یہ مذہب، حضرت عکرمہؒ، قاسمؒ، سالمؒ اور بعض اہلِ علم کا بتایا جاتا ہے۔ نیز شافعیہ کے یہاں اس کو ایک وجہ کہا گیا ہے [۱]

(ب) مقام رویت اور اس کے علاوہ ایک محدود علاقہ کے لیے رویت کا حکم واجب العمل ہوگا (اگرچہ علاقہ کی تحدید اور اس کے طول وعرض کی تعیین میں پھر چند رائیں ہو جاتی ہیں)

یہ نقطۂ نظر، عام شوافع اور بعض دیگر علماء کا بیان کیا گیا ہے [۲]

(ج) مقام رویت اور اس کے علاوہ دیگر تمام مقامات کے (بغیر کسی حدبندی کے) لوگوں پر حکم رویت لازم ہوگا۔ اسی مذہب کو فقہی زبان میں "اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ مسلک عام احناف اور مالکیہ کا مشہور ہے [۳]

مؤخر الذکر مذہب کی تعبیر وتشریح۔ کتب فقہ وغیرہ میں۔ ایسے الفاظ میں کی گئی ہے کہ ان سے تمام عالم کے لیے حکم کا عموم مفہوم ہوتا ہے۔ مثلاً درمختار میں یہ بات اس طرح لکھی گئی ہے۔

لا اعتبار لاختلاف المطالع فیلزم اھل المشرق برؤیۃ اھل المغرب [۴]

(اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، اس لیے مغرب میں رویت ہو جانے کی بنا پر اہل مشرق پر بھی عمل لازم ہوگا)

اور حافظ نے یہ الفاظ لکھے ہیں:-

اذا رؤی ببلدۃ لزم اھل البلاد کلھا۔ (فتح الباری ص۱۰۵ ج۴)

(جب کسی ایک شہر میں چاند نظر آگیا تو تمام شہروں کے لوگوں پر اس کا حکم لازم ہوگیا)

مگر یہاں غور طلب یہ بات ہے کہ جس دور کے علماء و فقہاء کا یہ کلام نقل کیا گیا ہے، کیا اس دور میں

[۱،۳] فتح الباری ص۱۰۵ ج۴ [۲] مسلم مع شرح للنووی ص۳۴۷ ج۱ [۴] ردالمحتار ص۹۶ ج۲ مع درمختار

مشرق و مغرب کا مصداق اور مفہوم وہی تھا جو آج ہے؟ اور کیا دنیا کا طول و عرض ان کے ذہن میں اتنا ہی تھا جتنا آج محقق و معلوم ہے؟؟

ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا، کیونکہ اس زمانے کے فقہاء تو الگ رہے، اول درجہ کے جغرافیہ داں اور سیاح بھی دنیا کو ربع مسکون سمجھتے تھے۔ امریکہ دریافت نہیں ہوا تھا، بہت سے مشرقی اور مشرق بعید کے جزائر کا پتہ نہیں چلا تھا، اور مغرب میں "جزائر خالدات" کو دنیا کا آخری سرا تسلیم کیا جاتا تھا، چناں چہ "طول البلد" کا خط وہیں سے شروع ہوتا تھا۔ اس طرح دنیا کو ہفت اقلیم کہا جاتا تھا، اس کا تفصیلی نقشہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے[1]

مشہور ہے کہ اُس زمانہ کے ایک "بہت بڑے" جغرافیہ داں نے پوری دنیا کا ایک عجیب و غریب قسم کا نقشہ بنایا تھا، اس میں دنیا کو اتنا چھوٹا دکھایا گیا تھا کہ آج اسے دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آجائے کہ بس گویا ایک بر اعظم کے برابر! یہ تھی اُس وقت کی صورتِ حال! اور یہ تھا "تمام عالم" کا اُس وقت تصور! — مزید برآں یہ کہ فقہاء کے پیش نظر، صرف وہ علاقے تھے جہاں اسلامی مملکت کا قیام اس وقت ہو چکا تھا۔ حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب مفتیٔ اعظم پاکستان (سابق مفتی دار العلوم دیوبند) نے بھی اپنے رسالہ رویت ہلال میں اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے فقہاء کے کلام کی یہی توجیہہ کی ہے۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ مؤخر الذکر مسلک (عدم اعتبار) کی تعبیر کے لیے کتابوں میں چاہے جتنے عام (اور غیر محدود علاقے کے لیے حاوی) الفاظ استعمال کیے گئے ہوں، مگر حضرات فقہاء کی مراد وہ نہیں ہے جو آج کے حالات میں سمجھی جا رہی ہے یا سمجھی جا سکتی ہے، بلکہ یہ کہنا غالباً حقیقت سے بعید نہیں ہوگا کہ ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند جہاں نظر آیا ہے اس جگہ کے علاوہ دیگر طویل و عریض رقبہ کے رہنے والوں پر بھی اس کا حکم نافذ ہو سکتا ہے (بشرطیکہ شرعی ثبوت بہم پہونچ جائے) حاصل یہ ہے کہ مشرق و مغرب سے فقہاء کی مراد وہ نہیں ہے جو آج جغرافیہ کی اصطلاح ہے بلکہ اس دور کے تصور کے مطابق

---

[1] مثلاً دیکھیے غیاث اللغات لفظ ہفت اقلیم ص ۴۰۵ اور ۴۰۶ کے درمیان نقشہ

اضافی مشرق و مغرب مراد ہے۔ فقہاء کی عبارات کی اس توجیہ کا ایک قوی قرینہ یہ نظر آتا ہے کہ علم اعتبار کا مسلک اختیار کرنے والے دو مشہور مکتبۂ فقہ (حنفی اور مالکی) کے متاخرین علماء میں سے محققین نے اس عموم..... کو اختیار نہیں کیا بلکہ اسے غالباً ناقابل فہم چیز سمجھ کر گویا نظر انداز کر دیا، اور نہایت قوت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا اور اس پر دلائل و براہین قائم کیے کہ مقام رویت سے بہت بعید مواقع (بلدان نائیہ) میں اس کا حکم لازم نہیں ہوگا۔ بلکہ ان علماء میں سے بعض نے تو اسی پر اجماع نقل کیا ہے جیسا کہ حافظ ابن عبد البر مالکی سے ابن حجر نے نقل کیا ہے۔

اجمعوا علیٰ انہ لا تراعی الرؤیۃ فیما بعد من البلدان کخراسان واندلس [1]	مقام رویت سے بہت دور دراز کے شہروں میں رویت کا اعتبار نہ کرنے پر اجماع کیا ہے جیسے کہ خراسان اور اندلس۔

اسی طرح مشہور فلسفی فقیہ ابن رشد اندلسی مالکی نے ذکر کیا ہے۔

اجمعوا انہ لا یراعی ذلک فی البلدان النائیۃ کالاندلس والحجاز [2]	اتنے دور شہروں میں جیسے اندلس اور حجاز رویت کا حکم لازم نہیں ہوگا۔

اگرچہ علامہ شوکانیؒ نے اندلسی کے بیان کو چیلنج کیا، اور اجماع کی حکایت کو غلط قرار دیا ہے [3] مگر واقعہ یہ ہے کہ شوکانیؒ کو یہاں غلط فہمی ہو گئی کہ وہ اس کو تمام امت کا اجماع سمجھے، حالانکہ سیاقِ کلام سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ صرف مالکی فقہاء کا اجماع نقل کر رہے ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی فتح الملہم میں اس کی نشاندہی کی ہے [4]

ان دو مالکی جلیل القدر عالموں کے علاوہ فقہ حنفی کے ماہر و ممتاز علمائے محققین کے بھی ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے اختلافِ مطالع کا اعتبار کرنا یعنی بلادِ بعیدہ میں حکم رویت لازم نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

عہ تمام عالم کے لیے حکم رویت کا لازم ہونا عقلی طور پر بھی ناممکن ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے اس لیے فقہائے کرام (جو یقیناً سب سے زیادہ عقلمند تھے، ان) سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ناممکن الوقوع حقیقت کے منوانے پر اصرار کریں۔ [1] فتح الباری ص۱۵۵ ج۴ [2] بدایۃ المجتہد ص۲۸۶ ج۱ [3] نیل الاوطار ص۲۶۷ ج۴ [4] فتح الملہم شرح مسلم ج۳ ص۱۱۳

ان فقہاء میں سرفہرست کنز کے شارح مشہور فقیہ عثمان بن علی زیلعیؒ ہیں، موصوفؒ نے مضبوط دلائل پیش کر کے نہایت قوت کے ساتھ اس مسلک (اعتبار اختلاف) کی صحت ثابت کی ہے لیجئے آپ نے بھی اس کا صحیح اندازہ لگا لیجئے، فرماتے ہیں:-

والاشبه ان يعتبر لان كل قوم مخاطبون بما عندهم وانفصال الهلال عن شعاع الشمس يختلف باختلاف الاقطار، كما ان دخول الوقت وخروجه يختلف باختلاف الاقطار حتى اذا زالت الشمس في المشرق لايلزم منه ان تزول في المغرب وكذا طلوع الفجر وغروب الشمس فكلما طلعت الشمس درجة فتلك طلوع فجر لقوم وطلوع شمس لآخرين وغروب لبعض ونصف ليل لغيرهم وروى ان ابا موسى الضرير الفقيه صاحب المختصر قدم الاسكندرية فسئل عمن صعد على منارة الاسكندرية فيرى الشمس بزمان طويل بعد ما غربت عندهم في البلد ايحل له ان يفطر؟ فقال لا!

اشبہ یہ ہے کہ اختلافِ مطالع کا ضرور اعتبار کیا جائے کیونکہ ہر قوم اسی حکم کی مخاطب ہے جس کا سبب اس کے یہاں متحقق ہو چکا ہے اور سورج کی شعاع سے ہلال کا انفصال مقام کے بدلنے سے بدل جاتا ہے۔ جس طرح (نماز کے) وقت کا آنا جانا مختلف مقامات پر مختلف ساعات میں ہوتا ہے، چناں چہ مشرق میں سورج کے ڈھل جانے سے مغرب میں بھی ڈھل جانا ضروری نہیں ہوتا اسی طرح طلوعِ فجر اور غروبِ آفتاب کا معاملہ ہے (خلاصہ یہ ہے کہ سورج کی حرکت کے اعتبار سے اوقات کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے) سورج درجہ بدرجہ چڑھتا رہتا ہے اور اسی وجہ سے کسی جگہ فجر کا وقت نمودار ہو رہا ہوتا ہے .... تو کسی قوم پر سورج نکل رہا ہوتا ہے اور کہیں غروب کا وقت ہوتا ہے تو کہیں آدھی رات کا منظر ہوتا ہے۔ نقل کیا گیا ہے کہ فقیہ ابو موسیٰ ضریر صاحب المختصر اسکندریہ آئے۔ ان سے اس شخص کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا گیا

ولیحل لاھل البلد لان کلا مخاطب بما عندہ .... والدلیل علی اختلاف المطالع ماروی عن کریب[۱]....

جو منارہ پر چڑھا ہوا ہے (اور بلندی کی وجہ سے) اس کو وہاں سورج ابھی نظر آ رہا ہے جبکہ نیچے شہر میں کافی دیر پہلے ہی چھپ چکا ہے تو کیا منارہ پر موجود شخص کو روزہ افطار کرنا جائز ہے؟ انھوں نے فرمایا نہیں! اور کہا شہر کے لوگوں کو جائز ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے حسب حال حکم کا مخاطب ہے (اختلافِ مطالع کے اعتبار کے لیے اس قیاسی دلیل کے علاوہ) اصل دلیل حضرت کریب والی حدیث ہے (پھر وہ پوری حدیث نقل کی ہے)

زیلعیؒ کے کلام کی پختگی نیز نقلی و عقلی استدلال کی قوت کا اندازہ کر لینے کے بعد دوسرے جلیل القدر علماء کا کلام بھی سن لیجئے تاکہ معلوم ہو کہ علمائے احناف کے درمیان زیلعیؒ اس رائے میں منفرد نہیں ہیں، اب دیکھیے ملک العلماء علاء الدین کاسانی حنفی کیا فرماتے ہیں:۔

ولو صام اھل بلدٍ ثلٰثین یوماً وصام اھل بلد اٰخر، تسعة و عشرین یوماً فان کان صوم اھل ذٰلك البلد برؤیة الھلال و ثبت ذٰلك عند قاضیھم او عدوا شعبان ثلاثین یوماً ثمّ صاموا رمضان فعلی اھل البلد الاٰخر قضاء یوم لانھم

کسی شہر کے باشندوں نے تیس ۳۰ روزے رکھے، دوسرے کسی شہر میں ۲۹ روزے ہوئے تو اگر پہلے شہر میں یقینی طور پر رویت شرعی متحقق ہو جانے کے بعد روزے رکھے گئے ہیں تو دوسرے شہر میں بھی ایک اور روزہ قضا کا رکھنا ضروری ہوگا کیونکہ ان لوگوں نے رمضان میں (پہلے دن) ایک روزہ نہیں رکھا۔ حالانکہ اس دن (پہلے شہر میں)

---

[۱] تبیین الحقائق شرح کنز الرقائق للزیلعی ص ۳۲۱ ج ۱۔

افطروا يوماً من رمضان لثبوت الرمضانية برؤية اهل ذلك البلد، وعدم رؤية اهل البلد لا يقدح في رؤية اولئك اذ العدم لا يعارض الوجود...... هذا اذا كانت المسافة بين البلدتين قريبة لا تختلف فيها المطالع، فاما اذا كانت بعيدة فلا يلزم احد البلدين حكم الآخر لان مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر في اهل كل بلد مطالع بلادهم دون الآخر[1]

رمضان کی آمد ہو چکی تھی، اور دوسرے شہروں میں چاند کا نظر نہ آنا روزہ کے وجوب میں) مانع نہیں ہے اس لیے کہ عدم سے نفی نہیں ہوتی...... یہ حکم (ایک شہر کی رویت کا حکم دوسری جگہ لازم ہونا) اس وقت ہے جبکہ ان دونوں شہروں کے درمیان ایسا طویل فاصلہ نہ ہو یہ جس سے مطلع بدل جاتا ہو، پس اگر طویل فاصلہ ہے تو ایک شہر کا حکم دوسرے دوسرے شہر کے لوگوں پر لازم نہیں ہوگا، اس لیے کہ بہت زیادہ مسافت پر شہروں کے مطالع بدل جاتے ہیں۔ اس لیے ہر شہر اور علاقہ والوں کے لیے ان ہی کے مطلع کی رویت معتبر ہوگی دوسرے مطلع کی رویت معتبر نہ ہوگی۔

مذکورہ عبارتوں پر غور کرنے سے "اعتبارِ اختلاف" والا مسلک قوی اور راجح معلوم ہوتا ہے اسکے بعد اب کچھ اور معتبر کتابوں سے وہ تفصیل پیش کی جا رہی ہے جس سے استدلال کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

قال في الدر: يؤيده (اعتبار الاختلاف) ما مرّ في اول كتاب الصلوٰة ان صلوٰة الوتر والعشاء لا تجب على فاقد وقتهما، وفي الاختيار وذكر في الفتاوى الحامية اذا صام

درر میں کہا ہے کہ اس مسلک (اعتبارِ اختلاف) کی تائید اس مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جو شروع کتاب الصلوٰۃ میں گزر چکا ہے کہ جو لوگ ایسے مقامات پر رہتے ہیں جہاں وتر (عشاء) کا وقت نہیں آتا، ان پر یہ دونوں

[1] بدائع الصنائع ص۸۳ ج۲

اهل مصر ثلاثين يوماً برؤية و اهل مصر آخر تسعة وعشرين يوماً برؤيته فعليهم قضاء يوم ان كان بين المصرين قرب بحيث يتحد المطالع وان كان بعد بحيث يختلف لا يلزم احد المصرين حكم الآخر[1]

نماز میں ضروری نہیں ہیں اور فتاویٰ حامیہ میں ہے "کہ کسی شہر میں رویت کے بعد تیس ۳۰ روزے رکھے گئے" اور دوسری جگہ ۲۹ تو اگر یہ دونوں شہر اتنے قریب ہیں کہ ان کے مطالع نہیں بدلتے تو ان پر ایک روزہ قضا کا رکھنا ضروری ہوگا۔ اور اگر زیادہ فاصلہ ہے اتنا کہ مطلع بدل جاتا ہو تب ایک شہر کا حکم دوسرے شہر پر لازم نہیں ہوگا۔

حنفی فقہ کی ایک اور مشہور و مستند کتاب مراقی الفلاح (شرح نور الایضاح) کی عبارت بھی ملاحظہ فرمائیے۔ کتاب مذکور میں "اعتبارِ اختلافِ مطالع" کا قول ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے۔

اختاره صاحب التجريد كما اذا زالت الشمس عند قوم و غربت عند غيرهم فالظهر على الاولين لا المغرب لعدم انعقاد السبب في حقهم۔

مراقی الفلاح ص ۱۰۹

مطبوعہ مطبعہ تعلیمیہ مصر ۱۳۱۵ھ

صاحب تجرید نے اسی قول (اعتبارِ اختلاف) کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ (نماز کے بارے میں حکم ہے کہ) جب کسی ایک جگہ سورج ڈھل چکا ہو، اور (اسی وقت) دوسری جگہ غروب ہوا ہو، تو پہلے مقام کے رہنے والوں پر ظہر لازم ہوگی نہ کہ مغرب، کیونکہ مغرب (کی نماز واجب ہونے) کا سبب (غروب آفتاب) ان کے یہاں متحقق ہی نہیں ہوا۔

ان کے علاوہ حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف فقہی کتابوں سے حنفی علماء کے متعدد تائیدی اقوال نقل فرمائے ہیں۔ خاص طور پر شمس الائمہ حلوانی کا قول (جو موصوف کی جلالتِ شان کی بنا پر) بڑا وزن رکھتا ہے۔

---

[1] مجمع الانہر ص ۲۳۹ ج ۱

شمس الائمہ فرماتے ہیں۔ "انه الصحیح من مذھب اصحابنا" تفصیل کے لیے دیکھئے فتاویٰ مولینا عبدالحئی صہ ۳۶۹ تا ۳۷۰ ج ا مطبوعہ (۱۳۴۵ھ) مطبع قیومی کانپور۔ ان قدیم علماء و فقہاء کے علاوہ عصرِ حاضر کے اکثر علمائے محققین نے بھی فی الجملہ اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات اور پیش کردہ قرائن کی روشنی میں اب اس نتیجہ تک پہونچنا چنداں مشکل نہیں رہا کہ "عدم اعتبارِ اختلاف" والے مسلک کو اختیار کرنے والے علماء کا منشاء سارے عالم کے لیے رویت کا حکم لازم کرنا نہیں معلوم ہوتا بلکہ وہ لوگ (دوسرے مسلک والوں کی بہ نسبت) رویت کے دائرۂ اثر کو زیادہ بڑا اور وسیع قرار دیتے ہیں ۔۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب "(ب)" اور "(ج)" میں اختلاف ہے تو تحقیقی مگر وہ صرف اس بابت ہے کہ رویت کا دائرۂ اثر کم وسیع ہے یا زیادہ وسیع اختلاف تحدید اور عدم تحدید کی بابت نہیں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ :: "(ب)" مذہب والے رویت ہلال کا دائرۂ اثر مختصر اور بہت محدود علاقہ قرار دیتے ہیں۔ عام طور پر مسافت قصر۔ مشہور شافعی عالم علامہ نوویؒ نے صحیح قول شوافع کا اسی "حد" کو قرار دیا ہے:

الصحیح عند اصحابنا انّ الرّؤیة لا تعم الناس بل تختص بمن قرب علی مسافة لا تقصر فیھا الصلوٰة [1]

اسی طرح حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے [2] مگر (ج) مسلک والے رویت کا اثر بہت دور تک (سینکڑوں میل تک) مانتے اور رویت کا حکم لازم کرتے ہیں ۔۔ اس جگہ آکر پھر اس بارہ میں رائیں مختلف ہو جاتی ہیں کہ کتنی مسافت تک رویت کا اثر اور اس کا حکم نافذ ہوگا۔ ان آراء میں سے چند یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔

ع۱ ایک مہینہ کی مسافت کے بقدر [3] (یعنی تقریباً ۴۸۰ میل انگریزی)

حضرت مولینا عبدالحئیؒ کے نزدیک یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے [4]

---

[1] مسلم مع شرح للنووی صہ ۳۴۸ ج ا [2] دیکھئے المصفیٰ شرح الموطا صہ ۲۲۹ مطبع فاروقی دہلی۔

[3] مجمع الانہر صہ ۲۳۹ ج ا اور درالمنتقی برحاشیہ مجمع صفحہ مذکورہ

[4] فتاویٰ عبدالحئی صہ ۳۷۰ تا ۳۷۱ ج ا

۲۔ ایک مملکت کا سربراہ اپنی مملکت کے تمام حصوں میں رویت کا حکم نافذ کر سکتا ہے کیونکہ پوری مملکت اس کے لیے بلد واحد ہے [۱]

۳۔ ایک اقلیم کے اندر واقع تمام علاقے رویت کے زیر اثر آجائیں گے [۲]

۴۔ مدینہ طیبہ اور شام کے درمیان جتنا فاصلہ ہے (تین سو میل سے زائد)

ان تمام رایوں پر نظر ڈالنے اور پھر ہندوستان میں رویت کے فیصلہ کرنے کا مدتوں سے جو معمول چلا آرہا ہے ان آراء و اقوال کے جاننے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے علماء ان میں سے کسی رائے کے پابند نہیں رہے ہیں۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک کنارے اور دوسرے کنارے کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، مگر اس کے باوجود اندرون ملک جب کہیں رویت ہو جاتی ہے تو پورے ملک میں ہر جگہ انتظار و اشتیاق رہتا ہے کہ کسی طرح یہاں بھی ثبوت شرعی بہم پہنچ جائے اور رویت کا فیصلہ کر لیا جائے۔ چنانچہ اگر شہادت مہیا ہو جاتی ہے تو اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ (اندرون ملک) شاہد نے یہاں سے کتنے فاصلہ پر چاند دیکھا ہے، اس کی شہادت کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا، اور عمل کیا جاتا ہے۔ بارہا کا تجربہ ہے کہ بمبئی اور کلکتہ کی شہادت پر دہلی میں فیصلہ ہوا (حالانکہ دہلی سے دونوں شہروں کا فاصلہ بالترتیب آٹھ سو اور نو سو میل ہے) لکھنؤ میں ابھی تھوڑی مدت قبل (۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء) عید الفطر کے موقعہ پر کلکتہ سے (بذریعہ ہوائی جہاز) آنے والوں کی شہادت پر فیصلہ ہوا۔ حالانکہ لکھنؤ اور کلکتہ درمیان پانچسو میل سے کچھ ہی زیادہ فاصلہ ہے۔ ان واقعات کے علاوہ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اکابر علماء ہند کے ایک بڑے اجتماع نے جو جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر مراد آباد میں منعقد ہوا تھا طے کیا تھا کہ ہندوستان و پاکستان کے اندر کسی جگہ چاند ہو جائے تو دونوں ملکوں میں اس حکم کو نافذ العمل بنایا جا سکتا ہے گویا اس طرح دونوں ملکوں کا مطلع حکماً ایک مانا [۳]

[۱، ۲] فتح الباری ص۵۰ ج ۴ [۳] فیصلہ مراد آباد کی تفصیل کے لیے دیکھیے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ کا رسالہ "رویت ہلال" یا احقر کا مضمون "خبر رسانی کے وسائل اور رویت ہلال" مطبوعہ رسالہ "برہان" دہلی اکتوبر و دسمبر ۱۹۷۰ء۔ واضح رہے کہ مراد آباد کا یہ فیصلہ بہت اہمیت رکھتا ہے اسلیے کہ اسمیں ہندوستان کے تمام ممتاز علماء کیساتھ استاذ الاساتذہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے، اور تجویز مؤخر الذکر نے تحریر فرمائی تھی۔

ان تمام امور کی روشنی میں رویت کا "دائرہ اثر" متعین کرنے کے لیے وہ بات سب کے نزدیک معیاری اور تسلیم شدہ معلوم ہوتی ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں تحریر فرمائی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اسی کو معیار سمجھکر (شعوری یا غیر شعوری طور پر) سب جگہ فیصلے ہوتے ہیں۔ علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:۔

ینبغی ان یعتبر اختلافہا ان لزم التفاوت بین البلدتین باکثر من یوم واحد لان النصوص مصرحۃ بکون الشہر تسعۃ وعشرین او ثلاثین فلا تقبل الشہادۃ ولا یعمل بھا فیما دون اقل العدد ولا فی ازید من اکثرہ۔[1]

مناسب یہ ہے کہ ایسے مقامات کے درمیان اختلاف مطالع کا ضرور اعتبار کیا جائے جہاں تاریخوں میں ایک دن سے زیادہ کا فرق لازم ہوتا ہو کیونکہ نصوص میں تصریح ہے کہ مہینہ ۲۹ یا ۳۰ دن تک ہوتا ہے (کم نہ زیادہ) تو ایسی جگہ کی شہادت پر عمل دوسری جگہ نہیں کیا جائے گا کہ اس سے مہینہ ۲۹ دن سے کم یا ۳۰ دن سے زیادہ کا بنجاتا ہے

دیکھئے! مولانا عثمانیؒ نے کتنی معقول اور فقیہانہ بات فرمائی ہے کہ کسی مقام کی رویت کی بنا پر ایسے دوسرے مقام پر رویت کا حکم نہیں لگایا جائے گا جس سے مہینہ کے دنوں کی منصوص و مقرر تعداد (۲۹۔۳۰ دن) میں فرق آجائے کیونکہ اس صورت میں تو نصوص صریحہ صحیحہ کی خلاف ورزی لازم آجائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حجاز، مصر، شام، مراکش، ترکی اور ٹیونس وغیرہ ممالک کی رویت کی بنا پر یہاں (ہند و پاک میں) فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ خواہ ثبوت شرعی بھی مل جائے۔ کیونکہ وہاں اور یہاں کی قمری تاریخوں میں کم سے کم ایک دن کا فرق تو اکثر ہوتا ہے، کبھی اس سے زیادہ بھی ہوجاتا ہے۔ برخلاف اس کے، ہندوستان و پاکستان کے کسی حصہ میں ایسا ہونا لازمی نہیں ہے،

[1] فتح الملہم شرح مسلم صہ ۱۱۳ جلد ثالث

اس لیے ان دونوں ملکوں کے درمیان اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ یہی بات حضرت علامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے استدلال سے مترشح ہوتی ہے۔ موصوفؒ زیلعیؒ کے قول (اعتبارِ اختلاف) کی تائید فرماتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

لابد من تسليم قول الزيلعي والا فيلزم وقوع العيد يوم السابع والعشرين او الثامن والعشرين او يوم الحادي والثلاثين او الثاني والثلاثين فان بلاد قسطنطينية ربما يتقدم على هلالنا بيومين فاذا صمنا على هلالنا ثم ياتينا رؤية هلال بلاد قسطنطينية يلزم تقديم العيد او يلزم تاخير العيد اذا صام رجل من بلاد قسطنطينية ثم جاء نا قبل العيد[1]	زیلعی کا قول تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، ورنہ تو لازم آئے گا کہ عید ۲۷، ۲۸ یا پھر ۳۲، ۳۱ دن کے (روزے رکھنے کے) بعد پڑ جائے کیونکہ مثلاً قسطنطنیہ کے شہروں میں اکثر ہمارے یہاں سے دو روز قبل چاند نظر آ جاتا ہو، دریں صورت ہم اگر اپنے یہاں کی رویت کے لحاظ سے روزہ رکھیں پھر بلادِ قسطنطنیہ سے رویت ہلال کی شہادت آجائے تو یقیناً (ہمیں) عید کو مقدم کرنا پڑ جائے گا یا (اس شاہد کو) ایک دو دن کی تاخیر کرنا پڑے گی۔ (دہاں کی رویت مان لینے کی صورت میں) ظاہر ہے کہ یہ بات نصوص کے خلاف ہے لہٰذا اتنی دور کا اعتبار نہ ہوگا)

غور فرمایئے! زیلعیؒ کے قول کو علامہ کشمیری ترجیح دینے کی وجہ یہی بیان فرما رہے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مہینہ کبھی ۲۸ دن بلکہ ۲۷ دن کا بھی ماننا پڑے گا اسی طرح اس کے برعکس ۳۱

---

[1] العرف الشذی ص۳۰۳ واضح رہے کہ علامہ کشمیریؒ کی ترمذی کی درسی تقریر کو ان کے ایک نوعمر شاگرد نے عربی میں قلمبند کر کے چھپوا دیا تھا۔ اسی کا نام "العرف الشذی" ہے۔ اس لیے کتاب کے اندر زبان وبیان یا تعبیر وغیرہ یا کسی اور نوع کی اگر کوئی فروگذاشت نظر آئے تو اسے علامہؒ کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔

اور ۳۲ دن کا۔ اس کلام سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اگر مہینہ کی یہ قطع و برید اور کمی بیشی نہ ہو تو رویت کا حکم لازم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہو (تفصیل کے لیے دیکھئے موصوف کا رسالہ "رویت ہلال"۔

غالباً اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے عصر حاضر کے مشہور محقق عالم حضرت مولینا یوسف صاحب بنوری مدظلہ العالی نے یورپ کے ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کو یورپ سے قریب ترین اسلامی ملکوں (الجزائر، مراکش) میں ہونے والے رویت کے فیصلوں اور وہاں کے ریڈیو کے اعلان پر عمل کرنے کا فتویٰ دیا۔ (مصر، حجاز یا شام کے اعلاناتِ رویت پر عمل کرنے کا نہیں) کیونکہ مراکش، اور الجزائر یورپ سے اتنے قریب ہیں کہ ان کے درمیان قمری تاریخوں میں ایک دن کا فرق ضروری نہیں۔ (برخلاف یورپ اور حجاز وغیرہ کے)

بہرحال خلاصۂ کلام یہ کہ (ب) اور (ج) مسلکوں کے درمیان یہ فرق تو واقعی معلوم ہوتا ہو کہ ان دونوں میں اول الذکر مسلک کو ترجیح دینے والے تو ایک بہت محدود علاقہ میں رویت کا اثر مانتے ہیں اور ثانی الذکر مسلک والے ان کے مقابلہ میں زیادہ وسیع علاقہ کو اس کے زیر اثر سمجھتے ہیں البتہ اس کی تحدید میں مختلف اقوال ہیں۔ ترجیحی قول علامہ عثمانی کا معلوم ہوتا ہے۔

اگر (ج) مسلک کی یہ تعبیر و تشریح (مذکورہ قرأن کی روشنی میں) صحیح ہے تب تو بات صاف ہو جاتی ہے اور کوئی الجھن باقی نہیں رہتی لیکن اگر بالفرض اس قول (ج) کا وہی حقیقی مطلب ہے جو الفاظ کے عموم سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے تو وہ یقیناً مرجوح بلکہ ناقابل عمل ہے (مرجوحیت تو اوپر بیان ہو چکی) ناقابل عمل اس لیے ہے کہ اس دنیا کے مشرق و مغرب، اور اس کے کناروں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ ہے کہ ایک گوشہ میں مثلاً جو وقت رویت ہلال کا ہوتا ہے (غروب آفتاب کے بعد کا وقت) دوسری کسی جگہ اسی لمحہ آفتاب طلوع ہو رہا ہوتا ہے اور کسی جگہ نصف النہار (دوپہر) ہوتا ہے۔

اب بتائیے کہ جس ایک حصہ میں آفتاب کے غروب ہو جانے کے بعد مثلاً عید کا چاند نظر آیا اور دوسری جگہ آفتاب نکل چکا ہے یا ڈھل چکا ہے یعنی عید کی نماز کا وقت شروع ہو چکا ہے

لیکن اتنی جلد کسی طرح تیاری کر کے نماز نہ پڑھی جا سکے گی یا عید کی نماز کا وقت ختم ہو چکا ہے تو سوچئے کہ پہلی جگہ کی رُویت کا حکم دوسری جگہ کس طرح قابلِ عمل ہوگا، کیونکہ دوسری جگہ تو عید کی نماز کا وقت ختم ہو چکا ہے یا اتنا کم رہ گیا ہے کہ تیاری عملاً ناممکن ہے، لامحالہ اگلے ہی دن عید منانا ہوگی تو وہ اصل غرض جو توحید اھلہ کے پیچھے کارفرما ہے کہ سارے عالم میں ایک ہی دن عید منائی جاتی۔ کس طرح پوری ہوگی

صرف یہی نہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے (فقہی) مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اسی مثال میں مزید غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ روزہ رکھنے (اگر رمضان کا چاند ہے) یا توڑنے کے مسائل سامنے آئیں گے۔ کیونکہ دوپہر کے بعد نظر آنے والے چاند کے بارے میں تقریباً تمام علماء کا اتفاق ہے کہ اس دن پہلی تاریخ نہیں سمجھی جائے بلکہ اگلے دن پہلی تاریخ مانی جائے گی۔ یعنی وہ اگلی شام کے وقت (جو چاند نظر آنے کا اصلی وقت ہے) دیکھے جانے والے چاند کے حکم میں ہوگا نہ اس سے روزہ توڑنا درست ہوگا (اگر عید کا چاند ہے) نہ اس دن کا روزہ رکھنا ضروری ہوگا (اگر رمضان کا چاند ہے)

غرضیکہ "توحید اھلہ" کا عنوان سراسر جذباتی اور سطحی طور پر سوچنے والے ذہنوں کی... پیداوار ہے اس سے نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے نہ دین کا۔

(۳) مذکورہ بالا امور کی روشنی میں سوال ۳ کا جواب خودبخود نکل آیا کہ حنفیہ (بلکہ کہنا چاہیے کہ شاید کسی کے یہاں بھی) اس کی گنجائش نہیں ہے کہ توحید اھلہ کی اس تجویز کو قبول کیا جا سکے۔

"توحید اھلہ یا توحید اعیاد" کے عنوان پر غور کرنے والے شاید عید کو صرف ایک تہوار قرار دینے کے پہلو کو نمایاں کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عید میں محض تہوار ہونے کی جہت غالب نہیں ہے کہ جس میں صرف شان و شوکت کا مظاہرہ کیا جائے اور رنگ رلیاں منائی جائیں۔

اگر اس کی اسلام میں یہی حیثیتِ غالب ہوتی تب واقعی اس کے لیے سارے عالم میں (دوسری اقوام کے تہواروں کی طرح ایک ہی دن متعین کرنا مناسب بلکہ شاید

افسب ہوتا۔ مگر اسلام! جس کی حقیقت میں انقیاد و اطاعت اور عبادت داخل ہے، اس کی مقرر کردہ کوئی چیز ایسی ہو ہی نہیں سکتی جس میں شانِ عبدیت کا بھرپور مظاہرہ نہ ہو۔ اس وجہ سے یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ عید کے اندر "اسلامی تہوار" ہونے کے مقابلہ میں عبادت کی جہت غالب ہے اور عبادت کی شان یہ ہے کہ معبود جب حکم دے اس وقت کی جائے نہ کہ جب عابد کا دل چاہے اور یہ بات معلوم ہے کہ معبود نے اپنے رسول صلعم کے ذریعہ یہ حکم دیا ہے:

لاتصوموا حتّٰی تروا الهلال ولا تفطروا حتّٰی تروه فان غم عليكم فاكملوا العدة

(بخاری شریف ۲۵۶ / ج۱)

چاند دیکھے بغیر نہ روزہ رکھو اور نہ عید مناؤ۔ اگر (۲۹ کو) چاند نظر نہ آئے تو (۳۰ کی) گنتی پوری کرلو۔

اگر یہ حقیقت ذہن میں غالب رہے کہ عید بھی ایک عبادت ہے تو پھر یک وقت اور ایک دن میں ساری دنیا کے اندر عید منانے کا جذبہ سرد پڑ جائے۔ جس طرح نمازوں اور روزوں کے بارے میں کوئی مطالبہ نہیں کرتا کہ تمام عالم میں ایک ہی وقت میں نمازیں ہوں اور ایک ہی وقت میں روزہ شروع ہو۔

بقیہ "ہندوستان میں علم الحدیث"

موسیٰ سیلانی شیخ بن صلاح اور ابن ابی حاتم رازی نے موسیٰ سیلانی کا تذکرہ کیا ہے۔ امام شعبہ نے ان سے روایت کی ہے۔ انھیں حضرت انس رضؓ بن مالک کی خدمت میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انھیں تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یحییٰ بن معین نے ان کی توثیق کی ہے[۱]۔ جزیرہ سیلون کو سیلان بھی کہتے ہیں۔ اس لیے اقرب یہ ہے کہ ان کی نسبت اسی کی طرف ہے۔ (جاری)

---

[۱] مقدمہ ابن صلاح ص۳۲۶ کتاب الجرح والتعدیل ص ۱۶۹ / ق۲

نئی مطبوعات

عالم عربی کا المیہ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
صفحات ۲۰۸۔ سائز ۲۲×۱۸ کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۳/۵۰
ناشر:۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو عرب دنیا سے ایک خصوصی تعلق ہے۔ وہ ایک مدت سے عربوں کو انھیں کی زبان میں تحریری اور تقریری خطاب کرتے آئے ہیں، وہ ان کی نشاۃ ثانیہ کے آرزومند اور اسلام کی طرف از سر نو بازگشت کے پرجوش داعی ہیں۔ انھوں نے عربوں کی موجودہ زندگی پر مسلسل اس انجام سے انھیں خبردار کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ایک ظہور ۶۷ء کے المیہ کی صورت میں ہو گیا۔ اس خصوصیت کی بنا پر اس شکست کے جو اثرات مولانا کے دل و دماغ پر پڑے ہوں گے اُن کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مولانا کی یہ تصنیف ان ہی اثرات اور ان ہی خونچکاں صراحتوں کی ایک تصویر ہے۔

اس المیہ کے بعد مولانا نے کئی مضمون وقتاً فوقتاً عربی میں لکھے اور کئی تقریریں خود سرزمین عرب ہی پر کیں۔ یہ کتاب انھیں تقریروں اور تحریروں کے اُردو ترجموں کا مجموعہ ہے۔ ایک مضمون "صدر ناصر کی مخالفت کیوں" اردو ہی میں مولانا کا لکھا ہوا ہے۔ باقی مضامین اور تقریروں کے عنوانات ہیں:۔

۱۔ عالم عربی کا المیہ اور اُس کے حقیقی اسباب ۲۔ فتح و غلبہ کے دو الٰہی نظام ۳۔ سود و زیاں کی میزان ۴۔ عالم عربی کو اصل خطرہ اسرائیل سے نہیں اُس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ۵۔ المیہ فلسطین سے تین سبق ۶۔ اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کو قرآن کی نوید فتح۔

مولانا نے ان تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ عربوں کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھیں جھنجھوڑنے اور جگانے میں کوئی کسر اٹھا کے نہیں رکھی ہے۔ اپنائیت کا درد اور خلوص سطر سطر سے نمایاں ہے۔

مگر یہ صرف عربوں ہی کے پڑھنے اور سننے کی چیز نہیں تھی، اس میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے عبرت و موعظمت اور سبق آموزی کا سامان ہے۔ بڑا اچھا ہوا کہ اسے اردو میں منتقل کر دیا گیا اور اس طرح منتقل کیا گیا کہ مولانا کا اندازِ خطابت اور انشا پردازانہ رنگ بھی برقرار رہا ہے۔

مقالات امینی
از مولانا محمد تقی امینی۔ ناظم سنی دینیات۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
صفحات ۲۶۸۔ سائز ۲۰×۲۶ کاغذ سفید دبیز قیمت ۸/۔
پتہ : یونیورسٹی پبلیکیشنز ظہور وارڈ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ہمارے زمانہ میں بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا حکم کتب فقہ میں نہیں ملتا بعض احکام زمانے کے تغیر سے ازسرِنو غور و فکر کے طالب ہیں، مولانا محمد تقی امینی ایک عرصے سے اس نوع کے احکام و مسائل پر غور و فکر کر رہے ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کے چند مضامین پر مشتمل ہے جن میں سے بعض پورے رسالے کی حیثیت رکھتے ہیں ان مضامین کا تعلق جن مباحث سے ہے اُن میں سے بعض یہ ہیں۔

اجتہاد، فقہ کی تدوین جدید۔ موجودہ مسائل کس طرح حل کیے جائیں؟ ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر۔ سٹہ بازی اور اسٹاک اکسچینج پر خرید و فروخت۔ بیمہ کی حقیقت و شرعی حیثیت۔

کتاب کا تعارف مولینا سعید احمد اکبر آبادی نے تحریر فرمایا ہے۔ مولانا کی چند سطریں یہاں نقل کر دینے سے ان مضامین کی نوعیت اور قدر و قیمت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔ مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ

"یہ ظاہر ہے کہ ان مسائل کا حل اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ مندرجہ ذیل خطوط پر کام نہ کیا جائے

۱۔ چونکہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لیے سب سے پہلے ضروری یہ امر ہے کہ اجتہاد کے ماخذ اور استنباط و استخراج احکام کے اصول و ضوابط کا وسیع النظری کیساتھ مبصرانہ جائزہ لیا جائے ...

۲۔ جب یہ اصول منقح اور واضح ہو جائیں تو اسکا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ان اصول کی روشنی میں زیر بحث مسائل اور ان کے مختلف پہلوؤں کا تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ کر کے ان کی شرعی حیثیت کو متعین کیا جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ مولانا محمد تقی امینی نے اب تک جو کام کیا ہے وہ مذکورہ بالا دونوں خطوط پر مشتمل ہے۔"

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 39 NO. 6

Regd. No. L-353

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصولڈاک کا اضافہ

جلد ۳۹ | بابت ماہ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۱ء | شمارہ (۷)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ ستمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

مخدومنا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری قدس سرہ کی تدفین کے مسئلہ میں جو انتہائی تکلیف دہ اختلاف پیدا ہوا اور چل رہا ہے (اور جو یقیناً حضرت کی روحِ مبارک کے لیے باعثِ اذیت اور پورے سلسلہ کے لیے باعثِ رسوائی ہے) الفرقان کے محرم و صفر کے شماروں سے ناظرین کو اس کی حقیقت اور تفصیل معلوم ہو چکی ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس ناخوشگوار موضوع پر الفرقان میں لکھنے کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی ——— پھر ربیع الاوّل اور ربیع الثانی کے مشترکہ شمارہ میں "مجلس تحقیقاتِ شرعیہ" کا اس مسئلہ سے متعلق اجتماعی فیصلہ اور دونوں فریقوں سے دردمندانہ اپیل شائع کرنے کے بعد ارادہ کر لیا گیا تھا کہ آئندہ اس مسئلہ میں کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ اور قریب بہ یقین گمان تھا کہ ان شاء اللہ اب ضرورت بھی نہ ہوگی ——— لیکن اسکے بعد علم میں آیا کہ پاکستان میں اس اختلاف نے اب افسوسناک معرکہ آرائی کی شکل اختیار کر لی ہے اور طرفین سے فتوے اور رسالے لکھے جا رہے ہیں اور شائع ہو رہے ہیں۔ بعض مطبوعہ تحریریں یہاں بھی پہونچیں اُن سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اب اس بحث میں تلخ کلامی اور الزام تراشی کا عنصر بھی داخل ہو رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جو "اختلاف" کو انشقاق و افتراق تک پہونچا دیتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے۔

اس خطرناک صورتِ حال کے تدارک اور اس سے پیدا ہونے والے فتنوں کے انسداد کیلئے لاہور کے مشہور دینی ہفتہ وار رسالہ "خدام الدین" نے ایک منصفانہ عملی تجویز بھی فریقین کے سامنے پیش کی ہے[1] خدا کرے کہ تمام متعلقہ حضرات اس کو قبول فرمائیں ——— نیز ہماری جماعت کے مسلّم بزرگ اور مخدوم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ نے بھی ایک مکتوب (یا بیان) اس سلسلہ میں اور اسی مقصد کے لیے حال ہی میں لکھا ہے

---

[1] اس تجویز کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان میں سلسلۂ دیوبند سے نسبت رکھنے والے صفِ اوّل کے جو علماء و اصحابِ فتویٰ ہیں (جنکے اسماء گرامی بھی "خدام الدین" میں لکھ دیے گئے ہیں) ان کا ایک اجتماعِ خاص اسی مقصد کیلئے ہو۔ یہ سب حضرات ضلع سرگودھا کے اس گاؤں (ڈسٹریا) خود تشریف لیجائیں اور صورتِ حال اور موقع کا معائنہ کر کے اور ضرورت ہو تو مقامی لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کر کے باہم تبادلۂ خیالات کے ذریعہ ایک رائے قائم فرمائیں اور اگر خدانخواستہ پھر بھی کسی کو اختلاف رہے تو بس رائے کا اختلاف رہے۔ مسئلہ نے جو معرکہ آرائی اور مہم کی شکل اختیار کر لی ہے ایک مشترکہ بیان کے ذریعہ اسکو بہرحال ختم کر دیا جائے۔ ۱۲۔

ناظرین کرام انہی صفحات میں اُس کو ملاحظہ فرمائیں گے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو بارآور فرمائے اور اہل حق کی جماعت کو تشتت و افتراق کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

اسی قضیہ سے متعلق بطور استدراک کے ایک بات کا اظہار ضروری ہے ـــــ الفرقان میں اس مسئلہ پر جو لکھا گیا تھا اس میں بطور واقعہ کے یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ ہند و پاکستان کے اکابر و مشاہیر علماء شریعت اور اصحاب فتویٰ میں سے کسی نے بھی اس رائے کا اظہار نہیں کیا ہے کہ تدفین متحقق نہیں ہوئی اور تابوت یا نعش کا انتقال اب بھی جائز ہو، بلکہ ان سب کا اس بنیادی بات پر اتفاق ہے کہ تدفین اگرچہ متوارث طریقہ کے خلاف ہوئی لیکن اب نبش و انتقال جائز نہیں۔ اور ان سب حضرات کے اسمار گرامی بھی اس موقعہ پر تفصیل سے لکھ دیے گئے تھے، بلکہ سب حضرات کے فتووں کی عبارتیں یا ان کے تصدیقی کلمات بھی مطبوعہ فتاویٰ کے حوالہ سے "الفرقان" میں نقل کر دیے گئے تھے ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری زید مجدہم (جو بلاشبہ پاکستان کے اُن اکابر علماء شریعت اور اور اصحاب فتویٰ میں سے ہیں) انھوں نے اپنے پہلے فتوے سے رجوع کر کے اب اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ اُن کے نزدیک بھی تدفین نہیں ہوئی اور اس بنا پر نبش و انتقال اب بھی جائز ہے ـــــ مولینا موصوف نے اور اُن کے بعض اہل علم رفقاء نے اس مسئلہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بھی اس عاجز کی نظر سے گزر چکا ہے۔ اگرچہ اس کے مطالعہ سے مجھے حیرت ہی ہوئی ہے اور میں نے اپنی فہم و دانست میں اُس کو مولینا کے مقام علم و فضل کے مطابق بھی نہیں پایا، تاہم مجھے یہ اعتراف ہے کہ ان کی اس رائے کے سامنے آجانے کے بعد اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اکابر علماء شریعت میں سے کسی کی بھی وہ رائے نہیں ہے ـــــ مولانا بلاشبہ اکابر علماء میں سے ہیں۔

میں نے پاکستان ہی کے متعدد اہل علم و اصحاب فتویٰ کی وہ تحریریں بھی پڑھی ہیں جن میں مولینا بنوری کے دلائل پر کلام کیا گیا ہے (اور مجھے اصولی و بنیادی طور پر اُن سے اتفاق بھی ہے) لیکن میرے نزدیک اب اس بحث کو ختم ہو جانا چاہیے اور مان لینا چاہیے کہ مسئلہ میں دو رائیں ہیں جو اپنے اپنے دلائل کے ساتھ ظاہر کی جا چکی ہیں ـــــ ایسی صورت میں یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ دیانت داری سے جس کی جو رائے ہے وہ اُس پر قائم رہے اور دوسروں کے لیے بھی یہ حق تسلیم کرے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی تدفین کے معاملہ کا اصل اور براہ راست تعلق حضرت کے شرعی و قانونی اولیاء (قریبی اعزہ) سے ہے۔ پس اگر اُن کا دل یہ شہادت دے کہ حضرت مولینا

بنوری وغیرہ کا فتویٰ راجح اور قابلِ اتباع ہے تو اُن کو اس پر عمل کر لینا چاہیئے ـــــ اور جو لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں، یعنی اب نبش اور انتقال کو قطعاً ناجائز سمجھتے ہیں اور اس رائے کا وضاحت کے ساتھ اعلان کر چکے ہیں (جن میں خود یہ ناچیز راقم سطور بھی شامل ہے) اُن کو چاہیئے کہ وہ کوئی مداخلت نہ کریں۔ یقین ہے کہ اس صورت میں اُن پر کوئی ذمہ داری اور مسئولیت نہ ہوگی۔ اور آخرت میں انشاءاللہ کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ اُنھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

اور اگر وہ حضرات (یعنی حضرت اقدس کے اولیاء و ورثا) فیما بینھم و بین اللہ اس دوسری رائے کو زیادہ صحیح اور واجب الاتباع سمجھتے ہوں جو ہندوستان اور پاکستان کے اکثر اکابر علماء شریعت و اصحابِ فتویٰ کی ہے (یعنی یہ کہ تدفین ہوگئی اور اب نبش و انتقال کی شرعاً گنجائش نہیں) تو وہ اپنے اس موقف کا قطعی اور آخری طور پر اعلان کر کے اپنی طرف سے اس قضیہ کو ختم کر دیں ـــ اور اس کے خلاف رائے رکھنے والے حضرات (جو وضاحت کے ساتھ اپنی شرعی رائے ظاہر فرما چکے ہیں) اپنے کو عنداللہ مسئولیت اور ذمہ داری سے بری سمجھ لیں۔

حضرت مولانا بنوری زید مجدہم اور کسی بھی صاحب علم اور صاحبِ عقل و ہوش کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے اختلافی مسئلہ میں (جس میں بہت سے ایسے حضرات کی رائے بھی ان کے خلاف ہے جو ہمارے اور اُن کے اکابر اور اساتذہ کی صف میں ہیں) حضرت اقدس قدس سرہٗ کے اولیاء شرعی کے اس اعلان کے بعد اُن کے علی الرغم عوام کی طاقت سے (جن کا مزاج معلوم ہے) یا حکومت کی فوج اور پولیس کی طاقت سے (اور اُن کا حال بھی معلوم ہے) جبراً اپنی رائے اور فتوے کی تعمیل ضروری قرار دیں ـــ اور خون خرابہ تک کے امکانات پیدا کرنے کی ذمہ داری لیں ـــ حاشا! ہزار بار حاشا!!

اس عاجز کی طرف سے اس مسئلہ پر یہ آخری اظہارِ رائے اور اعلان ہے۔ واللہ الموفق۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ کا

مکتوب گرامی

مکرم و محترم! ــــــــ بعد سلام مسنون، مجھ پر قریباً ۸-۹ مہینے سے تحریراً و تقریراً اس پر شدید اصرار ہو رہا کہ میں "تابوت" کے سلسلہ میں دوبارہ اپنی رائے کا اظہار کروں، مگر ہر مرتبہ میں نے تقریراً اور تحریراً یہی جواب دیا کہ میں تو قریباً دس برس پہلے اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں، اس لیے اب اس اکھاڑے میں کودنا نہیں چاہتا۔ مگر اکابر احباب کا اصرار ہے کہ بعض اکابر نے چونکہ اپنی رائے سے رجوع کر لیا ہے اس لیے حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہ سے خصوصی تعلق رکھنے والوں بالخصوص اُنکو جن کی آنکھوں کے سامنے حضرت قدس سرہ کا تعلق تیرے ساتھ سالہا سال گزرا تیری رائے موجودہ احوال میں معلوم کرنے کی ضرورت ہے، بالخصوص بعض اکابر کے رجوع کر لینے کی وجہ سے ــــــــ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر میرا رجوع ہو جاتا تو میں بھی اطلاع کر دیتا، مجھے تو موجودہ حالات میں اپنی سابقہ رائے کا نہ صرف بقا بلکہ مزید تاکد پیدا ہو گیا ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ قریباً دس برس اس حادثۂ عظیمہ کو گزر چکے۔ احادیث میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ وارد ہے کہ ــــ "ان اللّٰہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء" (کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر یہ حرام کر دیا کہ وہ انبیاء کے مبارک جسموں کو کھا سکے) مگر اولیاء عظام نور اللہ مراقدھم کے متعلق حدیث میں کوئی نص نہیں ہے۔ جہاں تک حُسن عقیدت کا تعلق ہے اُمید تو یہی ہے کہ ان شاء اللہ کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا ہو گا لیکن یہ کوئی قطعی چیز نہیں، فقہاء کرام نے اُس میت پر جس کو بغیر نماز جنازہ پڑھے دفن کر دیا گیا ہو، مشہور قول میں صرف تین دن تک نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اور اُس کے بعد تفسخ کا احتمال بتلایا ہے، زائد سے زائد جو قول اس میں ملتا ہے وہ ایک ماہ کا ہے۔

(باقی صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ ہو)

کتاب المعاشرۃ والمعاملات

معارف الحدیث

(مسلسل)

کھانے پینے کے آداب — (۲)

ساتھ کھانے میں برکت ہے:-

عَنْ وَحْشِيِّ بْنِ حَرْبٍ قَالَ اِنَّ اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَاْكُلُ وَلَا نَشْبَعُ، قَالَ لَعَلَّكُمْ تَفْتَرِقُوْنَ؟ قَالُوْا نَعَمْ، قَالَ فَاجْتَمِعُوْا عَلٰى طَعَامِكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ يُبَارِكْ لَكُمْ فِيْهِ.

——— رواہ ابو داؤد

وحشی[1] بن حرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے

---

[1] یہ وہی وحشی بن حرب ہیں جنھوں نے غزوۂ احد میں کفر کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محب و محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد یہ اسلام لائے اور برابر اس فکر میں رہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے کوئی ایسا کام لے لے جو کسی درجہ میں قتلِ سیدنا حمزہ کی تلافی کر دے۔ وفاتِ نبوی کے بعد جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے فتنہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت خالد بن الولید کی سرکردگی میں لشکر روانہ کیا تو یہ بھی اس میں گئے اور یہ آرزو لے کر گئے کہ اللہ تعالیٰ مسیلمہ کو انہی کے ہاتھ سے قتل کرائے، ان کی یہ آرزو اور مراد پوری ہوئی اور مسیلمہ انہی کے نیزہ کا نشانہ بنا، ان کا بیان ہے کہ یہ وہی نیزہ تھا جس سے میں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ ۱۲

عرض کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ کھانا کھاتے ہیں اور آسودگی حاصل نہیں ہوتی، آپ نے فرمایا شاید تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ الگ الگ کھاتے ہیں! آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ تم کھانے پر ایک ساتھ بیٹھا کرو! اور اللہ کا نام لے کر (یعنی بسم اللہ کرکے (اجتماعی طور پر) کھایا کرو، پھر تمھارے واسطے اس کھانے میں برکت ہوگی (اور طبیعت کو سیری حاصل ہوجایا کرے گی) (سنن ابی داؤد)

(تشریح) اجتماعی طور پر کھانے کی یہ برکت جس کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے اس کا ہر ایک تجربہ کرسکتا ہے بشرطیکہ کھانے والوں میں ایثار کی صفت ہو جو ہر سچے مسلمان میں ہونی چاہیے یعنی ہر ایک یہ چاہے کہ میرے دوسرے ساتھی اچھا کھالیں اور اچھی طرح کھالیں ـــــ اگر کھانے والوں میں یہ بات نہ ہو تو پھر اس برکت کا کوئی استحقاق نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں اندیشہ ہے کہ اکثر (بیشتر تجربہ اس کے بالکل برعکس ہو۔

آگے درج ہونے والی حدیث کو بھی اسی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ طَعَامُ الْوَاحِدِ یَکْفِیْ الْاِثْنَیْنِ، وَطَعَامُ الْاِثْنَیْنِ یَکْفِیْ الْاَرْبَعَۃَ وَطَعَامُ الْاَرْبَعَۃِ یَکْفِیْ الثَّمَانِیَۃَ ـــــــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپ فرماتے تھے، ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہوجاتا ہے، اور دو کا کھانا چار کے لیے اور اسی طرح چار کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔ (صحیح مسلم)

[کتب حدیث میں اس مضمون کی حدیثیں اور بھی متعدد صحابہ کرام سے مروی ہیں۔]

(تشریح) کنز العمال میں معجم کبیر طبرانی کے حوالہ سے اسی مضمون کی حدیث قریب قریب انہی الفاظ میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے اس کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے "فاجتمعوا علیہ ولا تفرقوا" (لہٰذا تم کو چاہیے کہ الگ الگ نہ کھایا کرو، بلکہ جڑ کے ساتھ کھایا کرو)

اس اضافہ سے معلوم ہوا کہ جن حدیثوں میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "ایک کا کھانا دو کے لیے اور دو کا چار کے لیے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہوجاتا ہے" ان کا مقصد و مدعا بھی یہی ہے کہ لوگ اجتماعی

طور پر ایک ساتھ کھایا کریں اور اس کی برکت سے فائدہ اٹھائیں، لیکن شرط وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

کھانا برتن کے اطراف اور کناروں سے کھایا جائے بیچ میں ہاتھ نہ ڈالا جائے:-

عَنْ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ إِنَّهُ أُتِيَ بِقَصْعَةٍ مِنْ ثَرِيْدٍ فَقَالَ كُلُوْا مِنْ جَوَانِبِهَا وَلَا تَاكُلُوْا مِنْ وَسْطِهَا فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ فِيْ وَسْطِهَا ——— رواہ الترمذی و ابن ماجہ و الدارمی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ثرید سے بھری ہوئی ایک لگن آئی، آپ نے (لوگوں کو اس میں شریک فرمالیا اور) فرمایا کہ اس کے اطراف سے کھاؤ اور بیچ میں ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ برکت بیچ میں نازل ہوتی ہے۔ (جامع ترمذی)

اور سنن ابی داؤد کی روایت میں ثرید آنے کا مذکورہ بالا واقعہ ذکر کیے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ ارشاد روایت کیا گیا ہے

إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلَا يَاكُلُ مِنْ أَعْلَى الصَّحْفَةِ وَلٰكِنْ يَاكُلُ مِنْ أَسْفَلِهَا فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ مِنْ أَعْلَاهَا۔

جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اُسے چاہیئے کہ طباق کے بالائی حصہ سے (یعنی بیچ سے) نہ کھائے بلکہ نیچے والے حصہ سے (یعنی کنارہ سے) کھائے کیونکہ برکت بالائی حصہ سے اترتی ہے۔

(تشریح) ابھی اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ برکت دراصل ایک امر الٰہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا ادراک ہوتا تھا اور آپ محسوس فرماتے تھے کہ برکت براہ راست کھانے کے وسط میں نازل ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے اثرات اطراف وجوانب کی طرف آتے ہیں۔ اس لیے آپ نے ہدایت فرمائی کہ کھانے والے برتن کے کناروں سے کھاتے رہیں بیچ میں ہاتھ نہ ڈالیں ——— کھانے وغیرہ میں برکتیں نازل ہونے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا قانون وہی ہے جو پہلے تھا لیکن یقین اور استحقاق شرط ہے۔

جو کھانا انگلیوں میں یا برتن میں لگا رہ جائے اس کی بھی قدر کی جائے:-

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِلَعْقِ الْاَصَابِعِ وَالصَّحْفَةِ وَقَالَ اِنَّکُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِیْ اَیَّةِ الْبَرَکَةُ ——— رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ (کھانے کے بعد) انگلیوں کو چاٹ لیا جائے اور برتن کو بھی صاف کر لیا جائے، آپ نے فرمایا تم کو معلوم نہیں کہ کھانے کے کس ذرہ اور کس جز میں برکت کا خاص اثر ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کھانا عطیہ خداوندی ہے، اس کے ایک ایک ذرہ کی قدر کی جائے اور کچھ معلوم نہیں کہ کس جز میں اللہ تعالیٰ نے خاص برکت اور خصوصی نافعیت رکھی ہے، اس لیے کھانے کے جو اجزا انگلیوں پر لگے رہ جائیں ان کو چاٹ کر صاف کر لیا جائے۔ اسی طرح جو کچھ برتن میں لگا رہ جائے اس کو بھی اللہ کا رزق سمجھ کر صاف کر لیا جائے ——— اس میں اللہ کے رزق کی قدردانی بھی ہے اور رب کریم کے سامنے اپنے عمل سے اپنی محتاجی کا اظہار بھی ——— موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا تھا۔

رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ○　　پروردگار تو جو کچھ مجھے عطا فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

عَنْ نُبَیْشَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَکَلَ فِیْ قَصْعَةٍ فَلَحِسَهَا اِسْتَغْفَرَتْ لَہُ الْقَصْعَةُ ——— رواہ احمد والترمذی والدارمی وابن ماجۃ۔

حضرت نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا جو کوئی قصعہ (طباق یا لگن) میں کھائے اور اس کو بالکل صاف کر دے (کہ اس میں کچھ لگا نہ رہ جائے) تو وہ قصعہ اس آدمی کے حق میں مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی)

گرا ہوا لقمہ بھی اٹھا کر کھا لیا جائے :-

عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ أَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَأْنِهِ حَتَّى يَحْضُرَهُ عِنْدَ طَعَامِهِ فَإِذَا سَقَطَتْ مِنْ أَحَدِكُمُ اللُّقْمَةُ فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أَذًى ثُمَّ لِيَأْكُلْهَا وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ فَإِذَا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ أَصَابِعَهُ فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي فِي أَيِّ طَعَامِهِ يَكُونُ الْبَرَكَةُ۔

رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا کہ "تمہارے ہر کام کے وقت، یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی، شیطان تم میں سے ہر ایک کے ساتھ رہتا ہے، لہذا جب (کھانا کھاتے وقت) کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو اسے چاہیئے کہ اس کو صاف کر کے کھا لے اور شیطان کے لیے چھوڑ نہ دے۔ پھر جب کھانے سے فارغ ہو تو اپنی انگلیوں کو بھی چاٹ لے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کھانے کے کس جز میں خاص برکت ہے۔ (صحیح مسلم)

تشریح) حدیث کے آخری حصہ میں تو کھانے کے بعد انگلیوں کو چاٹ کر صاف کر لینے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس کے بارے میں ابھی اوپر عرض کیا جا چکا ہے ـــــ اور ابتدائی حصہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کھاتے وقت کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو اس کو مستغنی اور متکبر لوگوں کی طرح چھوڑ نہ دے، بلکہ ضرورت مند اور قدردان بندہ کی طرح اس کو اٹھا لے، اور اگر نیچے گر جانے کی وجہ سے اس پر کچھ لگ گیا ہو تو صاف کر کے اس لقمہ کو کھا لے ـــــ اس میں مزید یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ کھانے کے وقت بھی شیطان ساتھ ہوتا ہے، اگر گرا ہوا لقمہ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ شیطان کے حصہ میں آئے گا۔

کھانے میں شیطانی تصرفات، یہ حقیقت ہے یا مجاز؟

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے فرشتے، اور شیاطین اللہ کی وہ مخلوق ہیں جو یقیناً اکثر اوقات میں

ہمارے ساتھ رہتے ہیں لیکن ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے ___ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارہ میں جو کچھ بتلایا ہے، اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے علم سے بتلایا ہے اور وہ بالکل حق ہے اور آپؐ کو کبھی کبھی اُن کا اس طرح مشاہدہ بھی ہوتا تھا، جس طرح ہم اس دنیا کی مادی چیزوں کو دیکھتے ہیں (جیسا کہ بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے) ___ اس لیے ایسی حدیثوں کو جن میں مثلاً کھانے کے وقت شیاطین کے ساتھ ہونے، اور کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو اس میں شیاطین کے شریک ہو جانے یا گرے ہوئے لقمہ کا شیطان کا حصہ ہو جانے کا ذکر ہے تو ان حدیثوں کو مجاز پر محمول کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ___ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے "حجۃ اللہ البالغہ" میں یہ واقعہ بیان فرمایا ہے ___ کہ ایک دن ہمارے ایک دوست (شاگرد یا مرید) ہمارے ہاں آئے، اُن کے لیے کھانا لایا گیا، وہ کھا رہے تھے کہ اُن کے ہاتھ سے ایک ٹکڑا گر گیا اور لڑھک کے زمین میں چلا گیا، انھوں نے اُس کو اٹھا لینے کی کوشش کی اور اس کا پیچھا کیا مگر وہ اُن سے اور دور ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جو لوگ وہاں موجود تھے (اور اس تماشے کو دیکھ رہے تھے) انھیں اس پر تعجب ہوا، اور وہ صاحب جو کھانا کھا رہے تھے انھوں نے جدوجہد کر کے (آخر کار) اُس کو پکڑ لیا اور اپنا نوالہ بنا لیا ___ چند روز کے بعد کسی آدمی پر ایک جنی شیطان مسلط ہو گیا اور اس آدمی کی زبان سے باتیں کیں اور (ہمارے اس مہمان دوست کا نام لے کر) یہ بھی کہا کہ فلاں آدمی کھانا کھا رہا تھا، میں اُس کے پاس پہونچا، مجھے اس کا کھانا بہت اچھا معلوم ہوا، مگر اس نے مجھے نہیں کھلایا تو میں نے اس کے ہاتھ میں سے اُچک لیا (اور گرا دیا) لیکن اُس نے مجھ سے پھر چھین لیا۔

اسی سلسلہ میں دوسرا واقعہ اپنے گھر ہی کا شاہ صاحبؒ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ایک دفعہ ہمارے گھر کے کچھ لوگ گاجریں کھا رہے تھے، ایک گاجر اُن میں سے گر گئی، ایک آدمی اس پر جھپٹا اور اُس نے جلدی سے اُٹھا کر اس کو کھا لیا، تھوڑی ہی دیر بعد اُس کے پیٹ اور سینہ میں سخت درد اُٹھا، پھر اُس پر شیطان یعنی جن کا اثر ہو گیا تو اُس نے اس آدمی کی زبان میں بتایا کہ اس آدمی نے میری گاجر اُٹھا کے کھالی تھی۔

یہ واقعات بیان فرمانے کے بعد شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ

اس طرح کے واقعات ہم نے بکثرت سُنے بھی ہیں اور ان سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ احادیث

(جن میں کھانے پینے وغیرہ کے سلسلہ میں شیاطین کی شرکت اور اُن کے افعال و تصرفات کا ذکر آیا ہے) مجاز کے قبیلہ سے نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ تبلایا گیا ہے وہی حقیقت ہے ۔ واللہ اعلم

اگر کھانے میں مکھی گر جائے :-

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِیْ اِنَاءِ اَحَدِكُمْ فَامْقُلُوْهُ فَاِنَّ فِیْ اَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً وَفِی الْاٰخَرِ شِفَاءً فَاِنَّهٗ يَتَّقِیْ بِجَنَاحِهِ الَّذِیْ فِيْهِ الدَّاءُ فَلْيَغْمِسْهُ كُلَّهٗ ـــــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی کے کھانے پینے کے برتن میں مکھی آپڑے تو اس کو غوطہ دے کر نکال دو، کیونکہ اسکے دو بازوؤں میں سے ایک میں بیماری (پیدا کرنے والا مادہ) ہوتا ہے اور دوسرے میں (اس بیماری کے اثر کو دفع کر کے) شفا دینے والا مادہ ہوتا ہے، اور وہ اپنے اس بازو سے جس میں بیماری والا مادہ ہوتا ہے بچاؤ کرتی ہے (یعنی جب کسی چیز میں گرتی ہے تو اس کے بل گرتی ہے اور دوسرے بازو کو بچانا چاہتی ہے) تو کھانے والے کو چاہیئے کہ مکھی کو غوطہ دے کر نکال دے۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح) یہ اُن حدیثوں میں سے ہے جو اِس زمانے میں بہت سے لوگوں کے لیے ایمان کی آزمائش کا سبب بن جاتی ہیں، حالانکہ اگر فطرت کے اسرار اور حکمت کے اُصولوں اور تجربوں کی روشنی میں غور کیا جائے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو خلاف قیاس یا مستبعد ہو، بلکہ جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ دراصل حکمت ہی کی لائن کی بات ہے۔

یہ ایک معلوم و مسلم حقیقت ہے کہ بہت سے دوسرے حشرات الارض کی طرح مکھی میں بھی ایسا مادہ ہوتا ہے جس سے بیماری پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر جانور کی فطرت اور طبیعت میں یہ بات رکھی ہے کہ اس کے اندر جو خراب اور زہریلے مادے پیدا ہوتے ہیں طبیعت مدبرہ اُن کو خارجی اعضا کی طرف پھینک دیتی ہے۔ اس لیے بالکل قرین قیاس ہے کہ مکھی کے اندر کے اس طرح

کے فاسد مادہ کو اس کی طبیعت اس کے بازو کی طرف پھینک دیتی ہو کیونکہ وہی اس کا خارجی عضو ہو اور دونوں بازوؤں میں سے بھی خاص اس بازو کی طرف پھینکتی ہو جو نسبتہً کم زور اور کم کام دینے والا ہو، (جس طرح ہمارے داہنے ہاتھ کے مقابلہ میں بایاں ہاتھ)۔

اور ہر جانور کی یہ بھی فطرت ہے کہ جب اس کو کوئی خطرہ پیش آئے تو وہ زیادہ کام آنے والے اور اعلیٰ واشرف عضو کو اُس سے بچانے کی کوشش کرے، اس لیے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ مکھی جب گرے تو اُس بازو کو بچانے کی کوشش کرے جو خراب مادہ سے محفوظ اور نسبتہً اشرف ہو۔

اور جن لوگوں نے اللہ کی مخلوق کے احوال اور اُن کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے عجائبات پر غور کیا ہے انھوں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ جہاں بیماری کا سامان ہے وہیں اس کے علاج کا بھی سامان ہے۔ اس لیے یہ بھی بالکل قرین قیاس ہے کہ مکھی کے اگر ایک بازو میں کوئی مضر اور زہریلا مادہ ہو تو دوسرے بازو میں اس کا تریاق اور شفا کا مادہ ہو۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم بالکل اُصولِ حکمت کے مطابق ہے ـــــ بلکہ دراصل آپ کی اس ہدایت کا تعلق دوسری بہت سی ہدایات کی طرح تحفظ صحت ہی کے باب سے ہے، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے وہ کوئی فرض یا واجب نہیں ہے، جس پر عمل نہ کرنا معصیت کی بات ہو، بلکہ ایک طرح کی طبی رہنمائی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

[ان سطور میں حدیث کی تشریح کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ بھی بنیادی طور پر حجۃ اللہ البالغہ ہی سے ماخوذ ہے۔]

کھانے کے معاملہ میں حضور صلعم کی شانِ بندگی:۔

عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا آکُلُ مُتَّکِئًا ـــــــــ رواہ البخاری

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں تکیہ لگا کر (یا ٹیک اور سہارا لگا کر) کھانا نہیں کھاتا"۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) تکیہ لگا کر یا بلاضرورت کسی چیز کا سہارا لے کر کھانے کے لیے بیٹھنا متکبرانہ طریقہ ہے، حدیث پاک کا مطلب یہی ہے کہ میں متکبرین کی طرح تکیہ وغیرہ لگا کر کھاتا نہیں کھاتا اور اس کو پسند نہیں کرتا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں اور کھانا بھی اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح ایک بندہ کو کھانا چاہیے۔

کنز العمال میں مسند ابو یعلیٰ اور ابن سعد کے حوالے سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے۔

اٰکُلُ کَمَا یَاکُلُ الْعَبْدُ وَاَجْلِسُ	میں ایک غلام اور بندہ کی طرح کھاتا ہوں
کَمَا یَجْلِسُ الْعَبْدُ۔	اور غلام اور بندہ کی طرح بیٹھتا ہوں۔

قریب قریب یہی مضمون بعض دیگر صحابۂ کرام کی روایات کا بھی ہے ـــــــ ان سب احادیث و روایات کا حاصل اور مدعا یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے لیے ایک عاجز بندہ کی طرح بیٹھتے تھے، متکبرین کی طرح نہیں بیٹھتے تھے، اور یہی آپ کی تعلیم تھی۔ اور جو بندہ کھانے کے وقت اس حقیقت سے غافل نہ ہوگا کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا عطیہ ہے اور وہ رب کریم حاضر ناظر ہے اور میں اس کے سامنے اور اس کی نگاہ میں ہوں، وہ کبھی متکبروں کی طرح نہیں بیٹھے گا اور متکبروں کی طرح نہیں کھائے گا۔

عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا اَكَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى خِوَانٍ وَلَا فِي سُكُرَّجَةٍ وَلَا خُبِزَ لَهُ مُرَقَّقٌ ـــــ قِيلَ لِقَتَادَةَ عَلٰى مَا يَاكُلُوْنَ ؟ قَالَ عَلَى السُّفَرِ ـــــــــ (رواہ البخاری)

حضرت قتادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خوان پر کھانا نہیں کھایا اور نہ چھوٹی تشتری یا پیالی میں کھایا، اور نہ کبھی آپ کے لیے چپاتی پکائی گئی۔ ـــــ قتادہ سے پوچھا گیا تو پھر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام) کس چیز پر کھانا کھایا کرتے تھے؟ تو انھوں نے کہا کہ دستر خوانوں پر۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) خوان (جس کا ترجمہ خوان کر دیا گیا ہے) ایک چوکی یا نیچی قسم کی میز ہوتی تھی، جو کھانے ہی میں استعمال ہوتی تھی، بڑے لوگ (مترفین) اسی پر کھانا کھاتے تھے اور نیچے

فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانے کو بڑائی اور امارت کی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح امیر لوگوں کے دسترخوان پر سُکرُّجہ یعنی چھوٹی چھوٹی تشتریاں اور پیالیاں ہوتی تھیں ــــ خود صحابۂ کرام کے آخری دور میں یہ چیزیں خود مسلمان گھرانوں میں بہت عام ہو گئی تھیں۔

حضرت انس رضؓ کی اس حدیث کا مطلب و مدعا بھی بس یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں نہایت سادگی اور بندگی کی شان ہوتی تھی، نہ آپ نے کبھی خُوان پر کھانا کھایا، نہ چھوٹی تشتریوں اور پیالیوں میں کھایا، نہ کبھی خاص طور سے آپ کے لیے گھر میں چپاتیاں بنائی گئیں، ــــ اس سلسلہ معارف الحدیث کی دوسری جلد "کتاب الرقاق" میں وہ حدیثیں گزر چکی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیشت کس قدر سادہ اور غریبانہ بلکہ فقیرانہ تھی۔

سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت :-

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَہٰی عَنِ الْاَکْلِ وَالشُّرْبِ فِی اِنَاءِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ ــــ رواہ النسائی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے اور چاندی کے برتن میں کھانے پینے سے منع فرمایا۔ (سنن نسائی)

(تشریح) سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا دراصل اپنی دولت مندی اور سرمایہ داری کی بیجا نمائش اور ایک طرح کا استکبار ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے ــــ اور صحیحین کی ایک حدیث میں یہاں تک ہے کہ جو شخص سونے یا چاندی کے برتن میں کھاتا یا پیتا ہے تو گویا وہ جہنم کی آگ اپنے پیٹ میں داخل کر رہا ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا!

آنحضرت صلعم کسی کھانے کو برا نہیں بتاتے تھے :-

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ مَاعَابَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَعَامًا قَطُّ اِنِ اشْتَھَاہُ اَکَلَہٗ وَاِنْ کَرِھَہٗ تَرَکَہٗ

ــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا (یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اس میں یہ خرابی ہے یا یہ عیب اور نقص ہے) اگر مرغوب ہوا تو تناول فرمالیا اور نا مرغوب ہوا تو نہ کھایا چھوڑ دیا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

آپ کو کھانے میں کیا چیزیں مرغوب تھیں:-

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ خَيَّاطًا دَعَا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِطَعَامٍ صَنَعَهُ فَذَهَبْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَّبَ خُبْزَ شَعِيْرٍ وَمَرَقًا فِيْهِ دُبَّاءٌ وَقَدِيْدٌ فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَتَبَّعُ الدُّبَّاءَ مِنْ حَوَالِي الْقَصْعَةِ فَلَمْ اَزَلْ اُحِبُّ الدُّبَّاءَ بَعْدَ يَوْمَئِذٍ ــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک درزی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے پر مدعو کیا جو اس نے تیار کیا تھا تو میں بھی آپ کے ساتھ چلا گیا (غالباً خادم کی حیثیت سے ان کو بھی مدعو کیا گیا ہوگا) تو اس نے جو کی روٹی اور شوربا حاضر کیا جس میں لوکی کے قتلے تھے اور سوکھے ہوئے گوشت کی بوٹیاں تھیں، میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوکی کے قتلے پیالے کے اطراف سے چن چن کر تناول فرماتے ہیں، تو اس دن سے لوکی مجھے بھی مرغوب اور محبوب ہوگئی۔　　(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْكُلُ الرُّطَبَ بِالْقِثَّاءِ ــــــــــ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکی تر کھجوریں کھیرے کے ساتھ تناول فرماتے ہوئے دیکھا۔　　(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْكُلُ الْبِطِّيْخَ بِالرُّطَبِ وَيَقُوْلُ يُكْسَرُ حَرُّ هٰذَا بِبَرْدِ هٰذَا وَبَرْدُ هٰذَا بِحَرِّ هٰذَا۔

ــــــــــ (رواہ ابوداؤد)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خربوزہ اور پکی تر کھجوریں ایک ساتھ کھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کھجوروں کی گرمی کا توڑ اس خربوزہ کی ٹھنڈک سے ہو جاتا ہو اور خربوزہ کی ٹھنڈک کا توڑ کھجوروں کی گرمی سے ہو جاتا ہو۔ (سنن ابی داؤد)

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَحَبَّ الطَّعَامِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الثَّرِيْدُ مِنَ الْخُبْزِ وَالثَّرِيْدُ مِنَ الْحَيْسِ۔

رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روٹی (اور گوشت کے شوربے) سے بنی ہوئی ثرید اور ملیدہ والی ثرید (یعنی روٹی، کھجور اور گھی کا ملیدہ یہ دونوں چیزیں) زیادہ مرغوب تھیں۔ (سنن ابی داؤد)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ الْحَلْوَاءَ وَالْعَسَلَ

رواہ البخاری

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میٹھی چیز اور شہد پسند فرماتے تھے۔

(تشریح) "حلوا" عربی میں ہر میٹھی چیز اور میٹھے کھانے کو کہتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر میٹھی چیز اور خاص کر شہد مرغوب تھا۔

کھانے کے بعد اللہ کی حمد اور اُس کا شکر:-

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيَرْضٰى عَنِ الْعَبْدِ اَنْ يَّاْكُلَ الْاَكْلَةَ فَيَحْمَدُهٗ عَلَيْهَا اَوْ يَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدُهٗ عَلَيْهَا

رواہ مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے اس عمل سے بڑا خوش ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھائے اور اس پر اللہ کی حمد اور اس کا شکر کرے یا کچھ پیے اور اس پر اس کی حمد اور شکر ادا کرے۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اَبِی سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا فَرَغَ مِنْ طَعَامِہٖ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ ——— رواہ الترمذی و ابوداؤد

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ ۝	ساری حمد و ستائش اس اللہ پاک کے لیے جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

تشریح: جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کھانے سے پہلے بسم اللہ اور آخر میں اللہ کی حمد اور اس کا شکر، کھانے کے عمل کو جو بظاہر خالص مادی عمل اور ایک بشری تقاضا ہے، نورانی اور روحانی بنا دیتا ہے، اور اس پر خدا پرستی اور عبادت کا رنگ چڑھ جاتا ہے ——— اسی سلسلۂ معارف الحدیث کی جلد پنجم میں کھانے سے فراغت کے بعد کی وہ متعدد دُعائیں درج کی جا چکی ہیں جو کتب حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ——— اس لیے یہاں صرف ایک ہی دُعا پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

پینے کے آداب

ایک سانس میں نہ پیا جائے :-

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَشْرَبُوْا وَاحِدًا کَشُرْبِ الْبَعِیْرِ وَلٰکِنِ اشْرَبُوْا مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَسَمُّوْا اِذَا اَنْتُمْ شَرِبْتُمْ وَاحْمَدُوْا اِذَا اَنْتُمْ رَفَعْتُمْ۔ ——— رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اونٹ کی طرح ایک سانس میں نہ پیا کرو، بلکہ دو دو یا تین تین سانس میں پیا کرو، اور جب تم پینے لگو تو بسم اللہ پڑھ کے پیو اور جب پی چکو اور برتن منھ سے ہٹاؤ تو اللہ کی حمد اور اس کا شکر کرو۔ (جامع ترمذی)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَنَفَّسُ فِي الشَّرَابِ ثَلٰثًا ——— رواہ البخاری ومسلم ——— وزاد مسلم يقول اِنَّهٗ اَرْوٰى وَاَبْرَأُ وَاَمْرَأُ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پینے میں تین دفعہ سانس لیتے تھے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

[اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اس طرح درمیان میں سانس لے لے کر پینے سے زیادہ سیرابی حاصل ہوتی ہے اور یہ زیادہ صحت بخش اور معدہ کے لیے زیادہ خوش گوار ہے۔]

(تشریح) اس حدیث میں سانس توڑ توڑ کے پینے کی جو حکمت بیان فرمائی گئی ہے وہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ حکم طبی مصلحت کی بنا پر دیا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک سانس میں پینا کوئی گناہ ہو ہاں وہ ناپسندیدہ اور نامناسب ہے۔ واللہ اعلم۔

پینے کے برتن میں نہ سانس لیا جائے نہ پھونکا جائے:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّتَنَفَّسَ فِي الْاِنَاءِ اَوْ يُنْفَخَ فِيْهِ ——— رواہ ابوداؤد وابن ماجہ

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے کے برتن میں سانس لینے یا پھونک مارنے سے منع فرمایا۔ (سنن ابی داؤد وابن ماجہ)

(تشریح) بعض لوگ برتن سے پانی پیتے پیتے اسی میں سانس لیتے ہیں، اس حدیث میں اس سے منع فرمایا گیا ہے، اور اس کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ برتن میں پھونک ماری جائے،

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ناپسندیدہ اور تہذیب وسلیقہ کے خلاف ہیں اور صحت کے لیے بھی مضر ہیں۔

کھڑے کھڑے پینے کی ممانعت :۔

عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ نَهَى أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا ــــــــــــــــ رواہ مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے کھڑے پینے سے منع فرمایا (صحیح مسلم)

(تشریح) بعض اور حدیثوں میں بھی کھڑے ہونے کی حالت میں پینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے بیان کیا ہے کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے ہونے کی حالت میں بھی پانی پیتے دیکھا ہے، ــــــ اس سلسلہ کی مختلف احادیث وروایات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کھڑے ہونے کی حالت میں پینا پسندیدہ نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول بیٹھ کر ہی پینے کا تھا۔ لیکن کبھی کبھی آپ نے کھڑے ہونے کی حالت میں بھی پیا ہے، تو یا تو اُس وقت اس کا کوئی خاص سبب ہو گا یا آپ نے بیانِ جواز کے لیے کیا ہو گا۔ کچھ ہی پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ جائز یہ بھی ہے اور اس کی بھی گنجائش ہے، افضل واولیٰ کے خلاف بھی عمل کر لیتے تھے اور چونکہ تعلیم کی نیت سے کرتے تھے اس لیے آپ کے حق میں اُس وقت وہی اولیٰ اور افضل ہوتا تھا۔ واللہ اعلم۔

وقت کا تقاضا

(مولانا عبدالسلام قدوائی)

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا کر صحابہ کرام سے فرمایا کہ...

"میں اور قیامت اسی طرح ہیں جس طرح یہ دونوں انگلیاں۔" آپ کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرے بعد قیامت تک کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ اور جب تک دنیا قائم ہے میری ہی شریعت نافذ رہے گی۔"

اس حقیقت کو ایک اور تمثیل میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

"ایک شخص نے بہت اچھا خوبصورت مکان بنایا لیکن اس میں ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ لوگ اسے دیکھتے ہیں تو بہت پسند کرتے ہیں مگر (خالی اینٹ کی جگہ دیکھ کر) کہتے ہیں یہ اینٹ بھی کیوں نہیں لگا دی (سن لو) کہ وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں[۱]۔"

صحیحین کی ایک اور روایت میں اس کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے:۔

"بنی اسرائیل کی رہنمائی انبیاء فرمایا کرتے تھے کہ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا اس کا جانشین ہو جاتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا[۲]۔"

ان ارشادات کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ آئندہ نہ کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے آنے والا ہے۔ نہ کوئی کتاب نازل ہونے والی ہے۔ قرآن مجید میں جو ہدایات دی گئیں ہیں انہیں کی روشنی میں ہر دور میں زندگی کے ضابطے بنائے جائیں گے۔ قرآنی اصول کو رسول اللہ

---

۱ صحیح بخاری کتاب المناقب باب خاتم النبیین۔ ۲ بخاری و مسلم۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے حالات و ضروریات پر منطبق کرکے امت کے لیے ایک نمونہ قائم کردیا خود قرآن مجید الکریم پوری کتاب کی شکل میں نازل نہیں ہوا بلکہ حوادث و واقعات کے تحت ۲۳ برس کی مدت میں آہستہ آہستہ نازل ہوتا رہا تاکہ ربانی ہدایات کی روشنی میں زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کا سلیقہ پیدا ہو، اصول سے فروع کے استنباط کی صلاحیت نشو ونما پائے، حکم و مصالح پر نظر عمیق ہو احکام الٰہی کے رموز و غوامض ذہن نشین ہوں، علل و اسباب سے واقفیت ہو اور زندگی کے تحت نئے مسائل کو اسلام کے لازوال احکام کی روشنی میں حل کرنے کی مشق ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ آپ اس کے معانی و مطالب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اسباب نزول سے تو آپ پورے طور پر باخبر تھے، حکم و مصالح پر بھی آپ کی نظر گہری تھی حال آپ کے سامنے تھا مستقبل کا پورا اندازہ تھا۔ کلام الٰہی کی وسعت و جامعیت پیش نظر تھی زمان و مکان کے تقاضوں سے بھی واقف تھے اور آئندہ کے امکانات بھی سامنے تھے۔ اسلام کے حلقہ بگوشوں کا وہ سیدھا سادہ معاشرہ بھی سامنے تھا جو احکام الٰہی کا اولین مخاطب تھا۔ آپ اس معاشرہ میں قرآن مجید کے لامحدود اصولوں کو زمان و مکان کے حدود کے اندر اس طرح منطبق کرنا چاہتے تھے کہ آپ کا جادۂ عمل ہمیشہ نشانِ راہ کا کام دے لیکن اجتہاد کا دروازہ مسدود نہ ہونے پائے اسوۂ نبوی نئی نسلوں کے لیے شمعِ ہدایت ہو لیکن جمود کا باعث نہ بننے پائے۔ نظر اصول پر رہے مگر قدم صراطِ مستقیم سے نہ ہٹنے پائیں۔ قانون محکم ہو مگر جامد نہ ہو۔ اس کی گرفت پختہ ہو مگر نمو کی قوت فنا نہ ہونے پائے۔

یہ کام آسان نہ تھا بڑا مشکل تھا، لاکھوں آدمیوں کی رواں دواں زندگی میں اسلامی اصول کا اس طرح نفاذ کہ پورا معاشرہ پوری طرح شریعت کے حدود کے اندر ہو۔ زمان و مکان کی رعایت پیش نظر رہے۔ احکام میں اس وقت کے لوگوں کے حالات اور ضروریات کا لحاظ رہے مگر مستقبل کی طرف سے بھی غفلت نہ ہو اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ آئندہ نسلوں کے لیے دشواری کا باعث ہو۔ لوگ بعض اوقات کچھ سوالات کرتے تھے۔ یہ سوالات ظاہر ہے کہ لوگ اپنی فہم اور اپنے ماحول اور معاشرے کے مطابق کرتے تھے۔ اللہ و رسول کی طرف سے جو جواب دیا جاتا اس کی مستقل حیثیت ہوتی اور جب عرب کا وہ سارا ماحول بدلتا تو یہ جواب دوسری نسلوں

کے لیے مشکلات کا باعث ہوتے اس لیے قرآن مجید میں بار بار سوالات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا۔

لاتسئلوا رسولکم کما سئل موسیٰ من قبل	اپنے رسول سے اس طرح سوال نہ کرو جس طرح اس سے پہلے حضرت موسیٰ سے سوال کیے گئے تھے۔
لاتسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسوءکم۔	ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر تمہارے لیے ظاہر کر دیا جائے تو تم کو برا لگے۔

اس مفہوم کی متعدد آیتیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بڑی شدت سے اس کی ممانعت کی ہے۔ ایک موقع پر اللہ تعالیٰ جن باتوں کو ناپسند کرتا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

یکرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السؤال [1]	وہ تمہارے لیے قیل و قال اور کثرت سوال کو ناپسند کرتا ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:۔

دعونی ما ترکتکم انما اھلک من کان قبلکم کثرۃ سؤالھم [2]	جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں تم مجھے چھوڑے رہو۔ تم سے پہلے کے لوگوں کو سوال کی کثرت نے ہلاک کر دیا۔

آپ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ جو ضروری بات ہوگی وہ میں بتا دوں گا۔ تم اپنی طرف سے سوالات نہ کرو۔ کیونکہ اس طرح بہت سی غیر ضروری باتیں شریعت میں داخل ہو جائیں گی جو بعد کے لوگوں کے لیے دشواری کا باعث ہوں گی۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ حج کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حج تم پر فرض کیا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ کیا ہر سال یا رسول اللہ؟ آپ خاموش رہے لیکن جب اس نے تین بار اپنا سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں تو (ہر سال) واجب ہو جاتا اور تم اسے نہ کر سکتے۔ پس جب تک میں تم کو چھوڑے رہوں تم مجھے چھوڑے رہو،

---

[1] صحیح مسلم ومسند احمد بن حنبل۔ [2] صحیحین

یعنی جب تک میں تم سے کچھ نہ کہوں تم کوئی سوال نہ کرو۔ پھر آپ نے فرمایا جب میں کسی بات کا حکم دوں تو حتی المقدور اسے بجالاؤ اور اگر کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے باز رہو۔[۱]

اسی بنا پر صحابۂ کرام بہت ہی کم سوال کرتے تھے۔ قرآن مجید میں صرف ان کے چند سوالات مذکور ہیں، جواب میں بڑی جامعیت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مثلاً:۔

یسئلونك ماذا ینفقون قل العفو	وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ (راہ حق میں) کریں، کہہ دیجئے جو تمہاری ضرورت سے فاضل ہو۔
یسئلونك ماذا أُحل لهم قل أُحل لكم الطیبات۔	وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے، کہہ دیجئے تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کی گئی ہیں۔
یسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی۔	وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا حکم ہے۔

اس طرح سارے قرآن مجید میں تیرہ چودہ سوال نقل کیے گئے ہیں اور ان کے جامع جواب دیئے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو سوال کی اتنی ممانعت فرمائی تھی کہ سوال سے اجتناب ان کی مستقل عادت بن گئی تھی۔

قرآن مجید میں مختلف قوموں کے تذکرے ہیں۔ اشیاء کائنات کا ذکر ہے۔ آغاز و انجام کی جانب اشارے ہیں، خیر و شر اور جنت و دوزخ کا بیان ہے۔ لیکن کہیں اس انداز میں نہیں ہے کہ بلند تر عقل و ذہن رکھنے والے معاشرہ کو اس کے قبول کرنے میں عقلاً استحالہ نظر آئے۔ چودہ سو برس کی مسلمانوں کی تاریخ موجود ہے کسی ذہنی اور علمی دور میں حقائق قرآنی خلاف عقل و تجربہ نظر نہیں آئے، الفاظ کی وسعت و جامعیت اور ان کی گہرائی اور معنویت نے تاویل و تعبیر کی نئی راہیں دکھائیں۔ حضرت علی رضؓ کا یہ قول تاریخ کے ہر دور میں صحیح ثابت ہوا۔

---

[۱] صحیح مسلم

"اس کتاب کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔"

جب حالات بدلیں گے تو ذہن و دماغ کے سانچے بھی بدلیں گے، اس لیے اگر کسی مخصوص زمانے کے ذہن و دماغ، آداب و معاشرت اور تہذیب و تمدن کو سامنے رکھ کر فکر و عمل کا کوئی معیار مقرر کیا جائے گا تو لازمی ہے کہ اس سے مختلف دور میں یہ معیار باقی نہ رکھا جا سکے گا۔ جن مذاہب و ادیان نے اس پر اصرار کیا وہ فنا ہو گئے یا قصہ کہانی بن گئے۔ اس نت نئی بدلتی ہوئی دنیا میں کوئی جامد نظام کس طرح برقرار رہ سکتا ہے۔ وہی آئین زندگی اور نظامِ حیات، خلعتِ دوام حاصل کر سکتا ہے جس کے اندر لچک اور نمو پذیری ہو۔ جس کے اصول و مقاصد محکم ہوں مگر ان کو بروئے کار لانے کے لیے جو ضابطے بنائے گئے ہوں ان میں زمانے کے تغیرات اور انسانی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہو، اور ہر دور میں مجتہدین کے لیے اجتہاد کے دروازے کھلے رہیں اور نئے حالات میں اصول و کلیات کو نئے جزئیات پر منطبق کرنے کی اجازت ہو۔

جن لوگوں کی قرآن مجید کی تاریخ پر نظر ہے اور ہر دور کی تفسیریں جن کے سامنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر زمانے میں آیات کی کیسی نئی نئی تعبیریں کی گئی ہیں۔ ہر صاحب فکر نے اپنی فکر و عقل کے مطابق منشاء ایزدی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر دور کی تفسیر کا رنگ الگ اور ہر مفسر کا مذاق جدا ہے۔ ابتدائی تفسیری روایتیں پڑھیے تو ان کے اندر نہ علمی مباحث ہیں نہ عقلی موشگافیاں سادہ مزاج عرب، سادہ زبان اور بے تکلف انداز میں مشکل الفاظ کے معانی بیان کرتے ہیں اور پیچیدہ جملوں کو واضح کرتے ہیں۔ آگے بڑھیے تو آیات و قصص قرآنی کی توضیح میں اہل کتاب کے بیانات اور اسرائیلی روایات کا انبار نظر آتا ہے جن کے اندر قرآن مجید کی واقعیت اور صداقت گم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا تھا اور اس کے متعلق شدید ناگواری کا اظہار فرمایا تھا۔[1]

اس ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہماری تفسیریں، حدیث کی شرحیں، تاریخ و سیر کی کتابیں بھی اسرائیلی روایات سے پُر ہیں اور ہر جگہ حقائق پر خرافات کے ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ ص ۱۷۶، عن الشعبی عن عبداللہ بن ثابت

اٹھا کر حقیقت کا مشاہدہ بہت دشوار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ آپ اجمال کی ضروریات سے زیادہ تفصیل پسند نہیں فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان صحیح احادیث کی تعداد بہت کم ہے۔ جن میں آیات الٰہی کی تشریح کی گئی ہے۔ صحیح بخاری ہی میں کتاب التفسیر دیکھ لیجیے۔ خالص مرفوع روایات چند صفحات سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی الفاظ کے معانی اور صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین کے وضاحتی بیانات ہیں۔

آگے چل کر رومی و ایرانی تمدن اور یونانی فلسفہ و حکمت کا دور آیا تو اس عہد کی تفسیروں میں رائج علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ اس زمانے کے علمی نظریات کی روشنی میں آیتوں کی تفسیر کی گئی ہے۔ حکماء ہوں یا فلاسفہ، معتزلہ ہوں یا اشاعرہ، اصحاب ظاہر ہوں یا ارباب باطن، سب اپنے اپنے علوم و تحقیق کے معیار پر قرآن کے معانی و مطالب بیان کر رہے ہیں۔ ابومسلم اصفہانی، جار اللہ زمخشری، ابوالحسن اشعری، فخرالدین رازی اور محی الدین ابن عربی کی تفسیریں پڑھیے اور دیکھیے کہ ایک ہی آیت کی کتنے مختلف طریقوں سے تشریح کی گئی ہے اور الفاظ کے کیسے کیسے معانی بیان کیے گئے ہیں۔

یہ تو تشریح و تعبیر کا ذکر تھا۔ احکامِ شریعت کی تاریخ پڑھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قرآن مجید کے احکام کی کتنے مختلف طریقوں سے توجیہہ کی گئی ہے۔ صحابہؓ کرام کے دور ہی میں فہم و تعبیر کا اختلاف نمایاں تھا۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں غور و فکر کے دائرہ میں اور وسعت ہوئی اور ہر صاحب نظر نے نئے نئے اصول بنائے۔ ان ائمہ فقہ نے قرآن مجید، احادیثِ پاک اور اسلاف کے مسلک کو پیش نظر رکھا اور ان کی روشنی میں قوانین بنائے لیکن الفاظ قرآنی کی حقیقت، احادیث کی صحت اور اسلاف کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں ان کے درمیان بڑا فرق تھا۔ پھر شریعت کا منشا کیا ہے اور زمانے کے حالات پر اسے کس طرح منطبق کیا جائے۔ اس بارے میں بھی مختلف الرائے تھے۔ زبان کے قواعد اور بلاغت کے اصول کی بنا پر بھی مطالب میں فرق ہو جاتا ہے۔ کسی نے اس لفظ کو حقیقت سمجھا۔ کسی نے مجاز، گرامر کے اعتبار سے بھی مطالب مختلف ہو سکتے ہیں۔ خود لفظ کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں۔ آیت زیرِ بحث میں کون سے معانی ہیں۔ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس میں غور و فکر اور قرآن سے کام لینا پڑتا ہے اور قدرتاً مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ قواعد صرف و نحو کی وجہ سے کبھی

بسا اوقات ایک جملہ کا مطلب کئی طرح سے سمجھا جاتا ہے۔ تفسیر کی کتابوں میں اس پہلو کی جانب بھی توجہ کی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ جن میں جمل اور البحر المحیط بہت مشہور ہیں۔

روایت کی صحت وضعف کے معیار بھی مختلف ہیں۔ ایک راوی ایک مجتہد کے نزدیک ثقہ ہے لیکن دوسرے کے نزدیک وہی غیر معتبر ہے۔ وقت اور موقع ومحل کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ راوی نے یہ بات کب اور کس ماحول میں کہی ہے۔ اس کا عمومی پہلو اہمیت رکھتا ہے یا خصوصی یہ اور اسی قسم کی بے شمار باتیں پیش نظر رکھنی ہوتی ہیں۔ چند مثالیں وضاحت کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ گھر والوں کے رونے سے مردے پر عذاب ہوتا ہے۔ کسی نے حضرت عائشہ سے ذکر کیا۔ انھوں نے کہا ایک یہودی کا انتقال ہو گیا تھا، اس کے گھر والے رو پیٹ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ رو رہے ہیں اور میت پر عذاب ہو رہا ہے۔ یہ دونوں جملے دو الگ الگ باتیں بتا رہے تھے۔ لیکن سننے والے نے غلط فہمی سے دونوں کو مربوط سمجھ لیا اور رونے کو عذاب کا سبب قرار دیا۔

گرامر کی وجہ سے اختلاف کی ایک مثال کا آپ رمضان میں افطار کے وقت مشاہدہ کرتے ہیں۔ جب سنی آفتاب غروب ہوتے ہی افطار کر لیتے ہیں اور شیعہ چند منٹ توقف کرتے ہیں۔ دونوں کا استدلال قرآن مجید کی آیت أتموا الصيام الى الليل (روزے کو رات تک پورا کرو) سے ہے لیکن الیٰ یعنی تک کا کیا مفہوم ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ سنی سمجھتے ہیں کہ الیٰ (تک) سے پہلے کا لفظ الیٰ کے بعد والے لفظ میں داخل نہیں ہوگا یعنی روزہ رات کے شروع ہوتے ہی پورا ہو جائے گا لیکن شیعہ سمجھتے ہیں کہ روزہ رات کے حدود میں داخل ہوگا۔ اس اعتبار سے رات شروع ہونے کے بعد افطار کی اجازت ہوگی۔

راوی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کے مختلف وجوہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قبولِ روایت میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مشہور راوی محمد بن جعفر غندر ہیں۔ ان کے بارے میں اسماء الرجال کی کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایک بار انھیں مچھلی کھانے کی خواہش ہوئی، بازار جا کر مچھلی خرید لائے اور بیوی سے کہا کہ اسے پکاؤ۔ بیوی پکانے میں لگ گئیں اور وہ انتظار میں لیٹ گئے۔ بازار کی آمد ورفت میں تھک گئے تھے۔ آنکھ لگ گئی۔ بیوی مچھلی پکا کر لائیں تو دیکھا وہ غافل سو رہے ہیں،

مذاقاً نیم گرم مچھلی ان کے ہاتھ پر لگائی مگر ان کی آنکھ نہ کھلی۔ انھوں نے مچھلی اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ دی۔ کچھ دیر کے بعد جب محمد بن جعفر بیدار ہوئے تو بیوی سے پوچھا کہ کیا ابھی تک مچھلی تیار نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے مذاقاً کہا ارے تم بھول گئے، تم تو کھا کر سوئے تھے۔ انھوں نے انکار کیا۔ بیوی نے کہا اچھا اپنا ہاتھ سونگھو، انھوں نے سونگھا تو انھیں خیال ہوا کہ شاید کھا چکے ہیں اس واقعہ کی بنا پر بعض ناقدِ انھیں غافل قرار دیتے ہیں اور ایسے غافل کی روایت قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے ناقدین کہتے ہیں اس واقعے سے روایت میں ان کی غفلت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ اس بنا پر وہ ان کی روایت قبول کرتے ہیں۔

بازار میں کھانا آج کل معیوب نہیں ہے۔ لاکھوں آدمی ہوٹلوں میں کھاتے ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں بازار میں کھانا بیحد معیوب تھا، ایسے آدمی کو غیر معتبر سمجھتے تھے اس طرح رواج اور مذاق بدل جانے کی وجہ سے معیار اعتبار بدل جاتا ہے۔ اس وجہ سے مجتہد کو رواج اور عرف کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ زمانے کے حالات اور لوگوں کی ضروریات پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے بعض چیزیں جائز نہیں ہوتی ہیں لیکن جب حالات ایسے ہو جائیں کہ ان سے بچنا دشوار ہو جائے تو مجبوراً انھیں جائز قرار دینا پڑتا ہے۔ یہ ایک اصول ہے کہ:-

الضرورات تبیح المحظورات ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔

عموم بلویٰ، یعنی ابتلاء عام کی حالت میں ناجائز چیزوں کو جائز قرار دینا پڑتا ہے۔ برسات میں راستے کی چھینٹوں سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے۔ چھوٹی چڑیوں کی بیٹ ناپاک نہیں ہوتی۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی۔

تفصیلِ بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مجتہد کو مسائل کے اخذ و استنباط میں کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اللہ و رسول پر ایمان اور کتاب و سنت پر اعتقاد و اعتماد کے باوجود مسائل میں کتنا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ جب خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، قرآن ایک ہے، ارشادات نبوی فیصلہ کن ہیں تو پھر امت کے درمیان اتنا عظیم الشان اختلاف کیوں ہے؟ اس موقعہ پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔

میرے ایک بزرگ رشتہ دار ایک دن میرے یہاں تشریف لائے۔ اس وقت حدیث

کی مشہور کتاب جامع ترمذی کا ترجمہ میز پر رکھا تھا۔ حدیث کا نام دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ چند دن کے لیے مجھے دیدو، میں بھی اسے دیکھوں گا۔ اس کتاب میں چونکہ ائمہ کے اختلافات اور ان کے دلائل بیان کیے گئے ہیں اور یہ باتیں ان کے فہم سے بالاتر تھیں اس لیے میں نے کتاب کے دینے میں تامل کیا مگر وہ عمر اور رشتے دونوں میں بڑے تھے، میں انھیں روک نہ سکا۔ وہ کتاب لے گئے اور چند دن کے بعد بڑی ناراضگی کی حالت میں آئے اور کہنے لگے "مولویوں نے دین کا ستیاناس کر دیا ہے اللہ ایک، رسول ایک، قرآن ایک مگر کوئی کچھ کہہ رہا ہے کوئی کچھ۔ رسول کی حدیث بیان ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں یہ کہتا ہے اور فلاں وہ کہتا ہے۔ میں نے انھیں سمجھانا چاہا کہ ایمانداری کے ساتھ آیات و احادیث سے مسائل کے استنباط میں اختلاف ہوتا ہے لیکن یہ باتیں ان کے ذہن و علم کی سطح سے بہت بلند تھیں اس لیے انھیں وہ سمجھ نہ پائے اور یہی کہتے رہے کہ دین کو مولویوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اگرچہ یہ ایک شخصی واقعہ ہے مگر اب بھی ہزاروں آدمی یہی خیال رکھتے ہیں لیکن اصحاب فکر و نظر سمجھتے ہیں کہ مجتہد کو مسائل اخذ کرنے کے لیے کن کن دشوار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اور نتائج میں اختلاف، ممکن ہی نہیں ناگزیر ہے۔ یہ واقفیت اگر عام ہو جائے تو امت کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان بدظنی دور ہو اور حسنِ ظن پیدا ہو اور اس کے نتیجے میں رواداری عام ہو جائے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ کسی بڑے سے بڑے مجتہد اور امام کے نتائجِ تحقیق بے چوں و چرا مان لینے کے لائق نہیں ہو سکتا ہے کہ جن بنیادوں پر اس نے یہ رائے قائم کی ہے دوسرے کے نزدیک وہ محلِ نظر ہوں، اسی طرح ایک زمانے کی تحقیق ضروری نہیں ہے کہ دوسرے زمانے میں بھی صحیح ہو۔ بہت سی باتیں تھیں جو کسی زمانے میں علم و تحقیق کا شاہکار سمجھی جاتی تھیں لیکن آج اس قدر لچر اور پوچ سمجھی جاتی ہیں کہ ایک طفلِ مکتب بھی ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ آج کون ہے جو کہے گا کہ زمین ساکن ہے۔ کون عقلِ اول کے وجود کا قائل ہے کون گردشِ افلاک کو تسلیم کرتا ہے۔ کون ستاروں کو آسمانوں میں جڑا ہوا سمجھتا ہے۔ کون ہے اس نیلگوں فضا کو ناقابل گزر سمجھتا ہے۔ لیکن پرانے اہل دانش ان باتوں پر یقین رکھتے تھے اور انھیں تسلیم نہ کرنے والوں کو فاترالعقل خیال کرتے تھے۔ جس زمانے میں ارسطو کا طوطی بولتا تھا،

اس زمانے کی تفسیریں دیکھیے۔ کیسی کیسی دلیلیں ان حقائق کو ثابت کرنے کے لیے دی ہیں۔ لیکن آج قرآن کا معمولی طالب علم بھی رازی جیسے امام فن کی ان باتوں پر مسکراتا ہے۔ حضرت یوسف کے واقعات میں مصر میں ایک قحط کا ذکر آتا ہے۔ قحط ہمارے یہاں بارش نہ ہونے کا نام ہے اس لیے سورۂ یوسف کی تفسیر میں بے تکلف یہ لکھ دیا گیا کہ سات سال بارش نہ ہوئی پھر اس کے بعد بارش ہوئی۔ لیکن جب جغرافیائی معلومات کی بنیاد پر بعض مستشرقین نے اعتراض کیا کہ مصر میں بارش ایسی کہاں ہوتی ہے جس پر وہاں کی شادابی کا مدار ہو۔ مصر کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے قرآن میں ایسا لکھ دیا گیا ہے تو ذہن الفاظِ قرآنی کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ نظر آیا کہ وہاں سرے سے بارش کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ صرف سبع شداد یعنی سات سخت برسوں کا ذکر ہے پھر کہا گیا ہے

ثم یاتی من بعد ذٰلک عام	پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں
فیه یغاث الناس۔	لوگوں کی فریاد سنی جائے گی۔

لیکن چونکہ ذہنوں میں خشک سالی اور بارش کا تصور تھا اس لیے یُغاث کو غوث کے بجائے غیث سے مشتق سمجھا گیا اور بارش نازل کی جائے گی یا مینھ برسایا جائے گا ترجمہ کر دیا گیا۔

اسی طرح قرآن مجید کی متعدد آیات ہیں جن کے اپنے اپنے زمانے کے علمی خیالات اور ماحول کے اثرات کی بنا پر ترجمے کیے گئے جو آگے چل کر غلط ثابت ہوئے۔ معترضین نے خوش ہو کر قرآن مجید پر اعتراض کیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعتراض کی زد پرانے مفسرین پر پڑتی ہے نہ کہ قرآن پر۔ اللہ تعالیٰ مولانا محمد علی مونگیری ناظم اول ندوۃ العلماء پر رحمت نازل فرمائے۔ انھوں نے کتنے تجربے کی بات کہی ہے۔

"قرآن مجید کو پڑھاتے وقت اس کا خاص طور سے خیال رکھیے کہ قرآن مجید کے الفاظ کیا ہیں اور مفسرین نے اس سلسلے میں کیا لکھا ہے۔ مخالفین کے اکثر اعتراضات قرآن پر نہیں بلکہ مفسرین کے خیالات پر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی آیت سے کئی مفہوم نکلتے ہوں یا کسی لفظ کے کئی معانی ہو سکتے ہوں تو اس معنی کو اختیار کیجیے جس پر اعتراض نہ ہوتا ہو[1]"

---

[1] مولانا محمد علی مونگیری مرحوم سفر میں تھے وہاں سے اپنے نائب حکیم محمد عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مفصل خط لکھا ہے جس میں دار العلوم کے نظم و نسق اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بیش بہا ہدایات دی ہیں۔ یہ قلمی خط میں نے ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم دیا تی[illegible] کے[illegible]

ہماری مشکل یہ ہے کہ لوگ عموماً پرانے ائمہ، بزرگانِ دین، فقہاء اور مفسرین کے اقوال وآراء کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور ان کے دائرہ تقلید سے قدم باہر نکالنا دین سے انحراف سمجھتے ہیں۔ ان کی دیانت، ان کی بزرگی اور ان کے علم وکمال میں ذرہ برابر شک نہیں لیکن زمانہ، حالات، علمی تحقیقات اور ماحول کی تبدیلی کی وجہ سے ان کی بہت سی رائیں اب نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔ ان کی دوربین نگاہوں نے بہت دور تک دیکھا لیکن ان کی دوربینی کی بھی ایک حد تھی۔ انھوں نے آیاتِ الٰہی کا مفہوم متعین کرنے کے لیے بحرِ تحقیق میں بڑی غواصی کی لیکن اعلیٰ درجے کے فضل وکمال کے باوجود ان کی رسائی محدود تھی۔ نہ وہ عالم الغیب تھے نہ علمِ الٰہی کا احاطہ ان کے بس میں تھا۔ اس لیے حالات کی تبدیلی کے بعد ان کے آراء وافکار میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔

جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں عرض کر چکا ہوں، دوام اللہ کی ذات کو ہے۔ اسی کو مستقبل اور اس کی ضرورتوں کا پورا اندازہ ہے۔ اسی کے کلام میں یہ صلاحیت ہے کہ ماضی وحال کی طرح مستقبل کے سوالوں کا بھی جواب دے سکے۔ اس لیے جب زمانے کے نئے تقاضے سامنے آئیں تو کسی فتاویٰ کے مجموعے یا کسی فقیہہ کے مرتب کردہ مسائل کی طرف رجوع ہونے کے بجائے کتاب وسنت پر نظر ڈالی جائے اور محض سرسری طور پر نہیں بلکہ پوری فکر وبصیرت کے ساتھ ایک ایک لفظ پر غور کیا جائے۔ سنتِ نبوی اور آثارِ صحابہ کا مطالعہ کیا جائے۔ اکابر فقہاء کے طرزِ تحقیق کو سمجھا جائے، اور پوری کد وکاوش کے ساتھ اسلامی اصول کو ان حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح امید ہے کہ نورِ اسلام کی شعاعیں عصرِ حاضر کی تاریک راہوں کو منور کر سکیں گی۔ نشان ہائے منزل نظر آنے لگیں گے اور بھٹکتے ہوئے قدم صحیح سمت کی طرف اٹھنے لگیں گے۔

لیکن اس کے لیے ایسے اشخاص کی ضرورت ہوگی جو ایک طرف زمانے کے تقاضوں سے باخبر ہوں اور دوسری طرف اسلامی تعلیمات کے ماخذ پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ ایسے ذی علم اور صاحب نظر بہت ہی کمیاب ہیں۔ اس لیے عصری اور اسلامی علوم کے چند ماہروں پر مشتمل ایک تحقیقی مجلس قائم کی جائے۔ علومِ جدیدہ کے ماہر زمانے کے تقاضوں کو سمجھیں اور اسلامی علوم کے ماہران تقاضوں کی روشنی میں اسلامی

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) ... کے ذخیرۂ نوادر میں دیکھا تھا۔ غالباً اب بھی وہاں محفوظ ہوگا سارا خط مطالعہ کے لائق ہے۔

شریعت کے ماخذوں کا جائزہ لیں، کتاب الٰہی کی زندہ جاوید آیات پر گہری نظر ڈالیں، ارشاداتِ نبوی کا وسعتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کریں اور منشائے الٰہی اور ہدایات نبوی کی روشنی میں عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

علم کی گہرائی، نظر کی وسعت اور زمانے کے تقاضوں سے باخبری کے ساتھ جرأت کردار کی بھی ضرورت ہے۔ تلاش وتفحص اور تفکر وتحقیق کے بعد جس نتیجے پر پہونچیں اسے کھُل کر کہنے کی ہمت ہو۔ ائمہ سلف جنھوں نے مشکل حالات میں دین کی سربلندی کی کوشش کی ہے اور انحطاط پذیر معاشرے کو نئی توانائی عطا کی ہے۔ انھوں نے تقلید پسند عوام اور مصلحت اندیش اور عافیت پسند خواص کی مخالفت کی پروا نہیں کی بلکہ جس بات کو حق سمجھا اسے برسرِ منبر کہا اور اگر اس کی پاداش میں دار و رسن کی نوبت آئی تو بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے اور جلاد کے سامنے زبان سے کلمۂ حق نکلتا رہا۔ حجاج ابن یوسف کی تلوار سعید بن جبیر کی گردن اڑا سکی لیکن آخری سانس تک ان کی آوازِ حق کو نہ دبا سکی۔ منصور کے کوڑے امام مالک کی پیٹھ پر برستے رہے مگر ان کی زبان اظہارِ حق سے باز نہ رکھ سکے۔ معتصم کا جلال وجبروت امام احمدؒ کو حقیقت کے اظہار سے نہ روک سکا۔ ان کے جسم سے خون کے فوارے بہتے رہے مگر زبان سے وہی نکلتا رہا جسے وہ صحیح سمجھتے تھے۔ جن بزرگوں نے تجدیدِ ملت کی جدوجہد کی ان کو عوام کی ناراضگی اور خواص کی آزردگی سے دوچار ہونا پڑا، دین سے انحراف کے الزام بھی لگائے گئے اور کفر وزندقے کے فتوے بھی دیے گئے۔ ابن رشد ہوں یا ابن تیمیہ، غزالی ہوں یا رازی، مجدد سرہندی ہوں یا ولی اللہ دہلوی، اسمٰعیل شہید ہوں یا جمال الدین افغانی، جمود پسندوں اور تقلید پرستوں نے کسی کو معاف نہیں کیا لیکن وہ بے خوف وخطر حق کی آواز کو بلند کرتے رہے اور ملت کی اصلاح کے لیے جس راہ کو صحیح سمجھتے تھے اس پر گامزن رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باطل کا شور دب گیا اور حق کا بول بالا ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا:-

فاما الزبد فیذھب جفاء و	جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے لیکن جو چیز
اما ما ینفع الناس فیمکث	لوگوں کو نفع پہونچاتی ہے وہ زمین میں باقی
فی الارض	رہ جاتی ہے۔

(بشکریہ اسلام اور عصر جدید)

اکابرِ علم جن سے میں متأثر ہوا — (۲)

حضرت مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ

(از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

(دوسری اور آخری قسط)

تقسیم ہند کا حادثہ آخر ۱۹۴۷ء کا قیامت خیز زمانہ آیا۔ برِ عظیم ہند، ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا فضا میں گونجتے ہوئے سیاسی نعرے آگ کی لپٹوں اور خون کی لہروں میں تبدیل ہو گئے، مغربی پنجاب سے شرنارتھیوں کے ستم رسیدہ اور مغلوب الغضب قافلے میرٹھ آنے لگے اور میرٹھ سے بھی اسپشل گاڑیاں لاہور کے لیے جاری ہو گئیں ایک دن حضرت مولٰنا بدر عالم صاحب صبح سویرے میرے مکان پر تشریف لائے، فرمایا آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھا لینا۔ میں نے قبول کر لیا۔ کھانے کے وقت پہنچا تو دیکھا کہ مولٰنا کا سامان منتشر ہے۔ کتابیں کچھ ادھر اور کچھ اُدھر پڑی ہوئی ہیں۔ کھانا آیا تو معلوم ہوا کہ میں تنہا مولٰنا کا مہمان ہوں۔ میں نے صورت حالات کا اندازہ کر لیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے پوچھا "حضرت کیا ارادہ ہے؟"

مولٰنا نے خلاف معمول غم آلود لہجہ میں فرمایا "پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔ میں نے عرض کیا "اور مولوی عقیل محمد؟"

مولٰنا نے فرمایا "وہ بھی جائیں گے"

میں عرض نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور لقمے زہر معلوم ہونے لگے۔ میں نے عرض کیا "اور میرے متعلق کیا رائے ہے؟"

مولٰنا نے فرمایا "جو اپنے متعلق ہے"

میں اور بھی سناٹے میں آگیا۔ دو سال قبل والد محترم راہیِ ملک بقا ہو چکے تھے۔ شہر کی موروثی دینی (ذمہ داریاں) میرے ناتواں کاندھوں پر پڑ چکی تھیں۔ مجھے ہر جمعہ کو جامع مسجد میں شہر کے مسلمانوں کو منبر پر چڑھ کر منھ دکھانا پڑتا تھا۔ شہر کی یہ حالت تھی کہ رؤسا کے قیمتی ساز و سامان کباڑیوں کی دکانوں پر کوڑیوں کے مول بک رہے تھے۔ ہر روز افواہیں اُڑتی تھیں آج فلاں رئیس جا رہے ہیں، آج فلاں نواب صاحب رخصت ہو رہے ہیں، آج فلاں خان بہادر صاحب روانہ ہو رہے ہیں۔ اور عام مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان ظاہری سہاروں کے ٹوٹنے سے ان کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔

پاکستان کو

بہر حال ایک غم آگیں صبح کو، اپنے مختصر خاندان کے ساتھ حضرت مولانا بدر عالم، ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ میرٹھ چھاؤنی کے اسٹیشن سے لاہور روانہ ہو گئے، اور یہ "میرٹھی الاصل" "پاکستانی النقل" بن گیا۔

علامہ سلیمان ندوی کی میرٹھ تشریف آوری

ہاں مولانا بدر عالم کے قیام میرٹھ کے زمانہ کا ایک واقعہ اور ذکر کرتا ہوں۔ سنہ ۳۶ء میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ، میرٹھ کئی مرتبہ تشریف لائے۔ تقریب آمد یہ تھی کہ حضرت علامہؒ کے داماد مخلص مولوی سید حسین صاحب اس زمانہ میں یہاں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر تبادلہ ہو کر آئے تھے۔ میری ابتدائی تالیفات و تراجم اس وقت تک شائع ہو چکے تھے اور بعض پر بحیثیت مدیر "معارف" حضرت علامہ تبصرہ بھی فرما چکے تھے اس لیے وہ مجھ سے ناواقف نہ تھے میں جب پہلی مرتبہ علامہ موصوف کی تشریف آوری پر، مولوی عقیل محمد صاحب ایڈوکیٹ کے ساتھ ملنے پہنچا تو حضرت والا مجھ سے بڑی محبت سے ملے۔ پھر جب میں نے والد مرحوم (حضرت قبلہ کا ایک سال قبل انتقال ہو چکا تھا) کے تعلق سے اپنا مزید تعارف کرایا تو وہ اور بھی زیادہ مسرور ہوئے۔ والد مرحوم کے حضرت علامہ سے دیرینہ تعلقات تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر میں نے انھیں کئی مرتبہ غریب خانہ پر تکلیف فرمائی کی زحمت دی اور کئی مرتبہ وہ از خود بھی کرم فرما ہوئے۔ اس موضوع پر میں کسی وقت ایک مستقل مضمون لکھنے کا خیال کر رہا ہوں۔ بہر حال، اسی زمانہ میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے حضرت علامہ کی پُر تکلف دعوت کی۔ دعوت سے فراغت کے بعد حضرت علامہ غریب خانہ پر تشریف لائے اور مولانا بدر عالم صاحب کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔

"مولانا بدر عالم صاحب حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز ترین شاگردوں میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔"

پھر مولانا کے اخلاص و محبت کا بڑی دیر تک تذکرہ فرماتے رہے۔ یہ واقعہ مجھے اس وقت بہت

یاد آیا جب مادح اور ممدوح دونوں کے سفر آخرت اختیار کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں ترجمان السنۃ کی جلد چہارم شائع ہوئی اور مؤولین معجزات پر مولانا مرحوم نے جس سخت لہجہ میں تنقید کی ہے اسی لہجہ میں علامہ مرحوم کے بعض نیاز مندوں نے اس پر اظہار ناراضگی کیا۔

حالانکہ ترجمان السنۃ کی یہ جلد مولانا کے ان آخری لمحات حیات میں مرتب ہوئی تھی جب کہ بقول خود وہ "اَوْصَالٌ شِلْوٌ مُمَزَّعٌ" بنے ہوئے تھے اور بستر علالت پر کروٹ لینے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔ ان کے جسم غیر متحرک سے فوارہ کی طرح صرف ان کے ارشادات ابلتے تھے، جن کو کسی ترتیب کے دائرہ میں محدود رکھنا ان کی قدرت سے باہر تھا۔ چنانچہ مقدمہ کتاب میں حضرت مولانا نے خود لکھا ہے (بلکہ حقیقۃً لکھوایا ہے) کہ "مولف تین سال سے صاحب فراش ہے اور صرف گزشتہ غیر مرتبہ مسودہ ہی کو پیش کر کے ذمہ داری کا بار کسی قدر ہلکا کرنا چاہتا ہے"

پھر ایک طرف مولانا کی صحت کی یہ حالت تھی دوسری طرف ان کا دل عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جس نے پاکستان کے اعلیٰ دینی مناصب سے کنارہ کش ہو کر انہیں جوار نبیؐ میں آپڑنے پر مجبور کیا تھا) کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور وہ اپنے جذبات و احساسات عشق و محبت کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ کاش مولانا مرحوم کے پاس کوئی صاحب علم و قلم ہوتا جو اس غیر مرتب مسودہ کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو سنوارتا۔

دوسری بات جو دونوں بزرگوں کے منتسبین کو سوچنا تھی یہ تھی کہ مولانا کی یہ تیز و تند تنقید "سیرۃ النبی" کے حصہ معجزات پر تھی جسے حضرت علامہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامۃ تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے سے پہلے لکھ چکے تھے۔ اس تعلق کے بعد تو حضرت علامہؒ نے عمومی طور پر ان تمام افکار و خیالات سے رجوع فرمالیا تھا جو ان کے شیخؒ کے مسلک کے خلاف تھے اور اس رجوع کا بار بار اعلان بھی فرمایا تھا۔ بہر حال جب "صدق لکھنؤ" میں یہ بحث چلی تو خاکسار نے مسئلہ کے اس پہلو کو واضح کر دیا تھا۔

<u>پاکستان میں علمی مشاغل</u> | بہر حال تقسیم کے بعد جلد ہی مولانا بدر عالم پاکستان تشریف لے گئے اور کراچی میں جہاں دوسرے عزیز پہنچ چکے تھے طرح اقامت ڈالی۔

مولانا سراسر علمی و تعلیمی آدمی تھے۔ عملی سیاسیات سے ان کو دلچسپی نہ تھی۔ یہاں بھی وہ یکسو ہو کر

"ترجمان السنہ" کے کام میں لگ گئے۔ کراچی میں یا اس کے اطراف میں اس وقت تک نہ کوئی بڑا دار العلوم تھا اور نہ کوئی کتب خانہ اور لائبریری۔ ترجمان کے علمی و تحقیقی معیار کو قائم رکھنے کے لیے شرح حدیث کی مبسوط کتابوں کی ضرورت تھی۔ مولانا کو اس کے لیے ادھر ادھر کے سفر کرنے پڑے اور بڑی جد و جہد سے ضرورت کی کتابیں فراہم کیں۔ اس طرح ترجمان السنہ کی دوسری جلد کا مسودہ مکمل فرما کر ندوۃ المصنفین دہلی کو اشاعت کے لیے روانہ فرمایا۔

"جامعہ اسلامیہ" کی تاسیس حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی شیخ الاسلام پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ مولانا کے دیوبند کے استاذ اور ڈابھیل کے رفیق اعلیٰ تھے۔ وہ مولانا کے جوہر شناس بھی تھے اور قدر شناس بھی۔ جب پاکستان میں ایک علوم اسلامیہ کے دار العلوم کے قائم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو انھوں نے اس عظیم کام کی ذمہ داری مولانا پر ہی ڈالی۔ مولانا نے بڑی محنت سے اس کا نظام عمل بنایا، ماہر فن اساتذہ کو جمع کیا اور "ٹنڈو الہ یار" میں "جامعہ اسلامیہ" کے نام سے اس ادارہ کی تاسیس عمل میں آئی۔ جب تک آپ پاکستان میں رہے آپ ہی اس کے منتظم و نگراں تھے۔ آپ کے بعد یہ ذمہ داری حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی مدظلہ العالی کے سپرد ہوئی۔

سنا ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے بھی رکن تھے نظام اسلامی کی ترتیب و تدوین کا کام بھی آپ ہی کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر حضرت عثمانی کے انتقال کے بعد پاکستان کے معماروں میں کوئی ایسی اہم شخصیت باقی نہ رہی جو اسلامی نظریات کی بنیادوں پر اس کی تعمیر کی فکر کرتی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

پاکستان سے ارض حرم کو پاکستان میں مولانا بڑی بڑی دینی و علمی صلاح و فلاح کی آرزوئیں لے کر گئے تھے۔ مگر یہاں آپ کو مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔ قائدین کی گندم نمائی اور جو فروشی، علماء و صوفیاء کی خود غرضی اور خانہ جنگی اور عام مسلمانوں کی دنیا طلبی اور دین بیزاری سے وہ بہت دل شکستہ ہوئے۔ ادھر عشق نبوی کی آگ آپ کے دل کو ہمیشہ سے گرماتی رہی تھی آخر آپ نے دیار حبیب میں جا پڑنے کا فیصلہ کر لیا اور پاکستان سے ہجرت فرما کر "مدینۃ الرسول" کے ساکن بن گئے۔

ارض حرم میں پہنچ کر مولانا پوری جمعیت خاطر اور نشاط طبع کے ساتھ اپنے علمی و عملی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا طائر قفس کو سیر گلستان کا موقع مل گیا ہے یا دریا

سے نکالی ہوئی مچھلی دریا میں واپس آگئی ہے۔

کار کا حادثہ اسی زمانہ میں مولانا کو ایک سخت حادثہ پیش آیا۔ ۱۹۵۲ء میں حج بیت اللہ سے فراغت کے بعد جدہ سے مدینہ منورہ واپس آرہے تھے کہ کار اُلٹ گئی۔ آپ کے سر میں زخم آیا، دایاں ہاتھ بھی مجروح ہوا، اور انگشتِ شہادت شہید ہوگئی۔ تقریباً چھ گھنٹے تک کوئی طبی مدد نہ مل سکی اس لیے خون کافی نکل گیا۔ کافی دیر کے بعد مدد مل سکی۔ مولانا کو واپس جدہ لایا گیا اور ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے توجہ اور شفقت سے علاج کیا۔ ذرا افاقہ ہوا تو مولینا نے مدینہ منورہ کی واپسی کے لیے اصرار شروع کر دیا۔ آخر علاج ناتمام چھوڑ کر ہی جدہ سے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ بعد میں یہاں علاج چلتا رہا۔ اور آخر شفایاب ہوئے۔

مگر اس حادثہ سے مولانا کے اعضا رئیسہ پر جو اثر پڑا تھا وہ باقی رہا اور اس نے دوسرے اعصابی اور قلبی و دماغی امراض پیدا کر دیے۔ تاہم اپنی قوت و طاقت سے بڑھ کر آپ علمی و عملی مشاغل میں لگے رہے۔

مولانا کو "طائرِ حرم" کہنا مناسب ہوگا۔ مکان جوارِ حرم میں، حرم نبوی سے بہت قریب تھا۔ دن رات کا اکثر حصہ حرم نبوی میں گزرتا تھا۔ ادب و احترام کا یہ حال تھا کہ نگاہیں پست، گردن خم اور دل بارگاہِ نبوت میں سجدہ ریز۔ گھنٹوں ایک نشست پر بیٹھے رہتے۔ کیا مجال کہ پہلو بدلے۔

دوسری طرف "ترجمان السنۃ" کی تیسری جلد کا کام جاری تھا۔ آخر اسی مقام سراپا احترام میں یہ جلد پوری ہوئی اور پھر ہندوستان آکر زیورِ طباعت سے آراستہ۔

مدینہ منورہ میں میری ملاقات راقم الحروف کو ۱۹۵۵ء میں، زیارت حرمین شریفین کا شرف حاصل ہوا۔ مولینا کے دولتکدہ پر حاضر ہوا تو سینہ سے لگا لیا۔ خوب جی بھر کر ہندوستان پاکستان اور ارضِ حرم کی باتیں ہوئیں۔ ایک شب مولینا نے خصوصی دعوت کی۔ بڑی پُر تکلف ضیافت تھی۔ پھر مولینا کی محبت شفقت اور خلوص نے اس کی لذت کو ہزار چند بنا دیا تھا۔

ضیافت باضابطہ تو ایک دن ہوئی، مگر آنا جانا بار بار ہوا اور چائے ہر بار پی۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح تکلفات سے خالی نہ ہوتی تھی۔

میری کتاب "قاموس القرآن" (جس میں قرآن کریم کے الفاظ کے معانی اور اُن کی مختصر اور

جامع تشریح، بہ ترتیب حروف تہجی لکھی گئی ہے) اسی زمانہ میں چھپی تھی۔ ایک نسخہ میں نے حضرت مولانا کو پیش کیا۔ خوب خوب تعریف کر کے میرا دل بڑھایا اور بہت بہت دعائیں کیں۔ دوسری مرتبہ آیا تو فرمایا "میں ایسی کتاب مرتب کرنا یا مرتب کرانا چاہتا تھا۔ الحمد للہ تم نے یہ کام میری خواہش کے مطابق انجام دے دیا۔" اس دن میں نے سمجھا کہ میری کئی سال کی محنت ٹھکانے لگی اور ساکن جوار نبی، اور شارح کلام نبی کی اس توصیف کو میں نے دربار نبی کی سند قبول سمجھا۔ (الحمد للہ اس کے دو ایڈیشن شائع ہو کر ختم ہو چکے ہیں۔ تیسرا پریس میں ہے)

دیار نبی سے شیفتگی | اسی زمانہ میں ایک دن میں اور مولانا تنہا تھے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا' ہندوستان میں آپ کی بڑی ضرورت ہے جو چند اکابر بقید حیات ہیں وہ چراغ سحری ہیں۔ ان کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے کیا جناب عارضی طور پر بھی ہندوستان تشریف نہیں لاسکتے؟"

مولانا نے ناراضگی کا اظہار کرتے فرمایا "مجھے یہاں دین و دنیا کی ہر قسم کی آسائش میسر ہے۔ جوار حرم میں مجھے جنت کا حظ مل رہا ہے۔ پانچ وقت کی نمازیں حرم نبوی میں ادا کرتا ہوں جب چاہتا ہوں جنت البقیع پہنچ کر رہی سہی حسرتیں پوری کر لیتا ہوں۔ دنیوی زندگی بھی فراغت سے گزرتی ہے۔ تم نے دیکھا کہ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ پھر میں کیوں دین و دنیا کی اس دولت کو چھوڑ کر کسی اور طرف کا رخ کروں؟"

میں خاموش ہو گیا اور معذرت کی اور میں نے محسوس کیا کہ یہ بات کہہ کر میں نے مولانا کو تکلیف پہنچائی۔

حاجی وجیہ الدین مرحوم | مولانا اس وقت غالباً خان بہادر حاجی وجیہ الدین مرحوم (سابق ممبر سنٹرل اسمبلی ہند و تاجر اسلحہ میرٹھ و دہلی) کے ملوکہ مکان میں مقیم تھے۔ حاجی صاحب کا قیام اوپر کے حصہ میں تھا اور مولانا کا نیچے کے حصہ میں۔ حضرت حاجی صاحبؒ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ کے خاص متوسلین میں تھے بعد میں' انھوں نے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ حضرت مولانا بدر عالم صاحب سے تعلق قائم کر لیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں کراچی تشریف لے آئے تھے اور وہاں کامیابی کے ساتھ اپنا کاروبار جاری کر دیا تھا۔ مگر دل کا دھندا دوسرا ہی تھا۔ ہر سال حج کے کئی مہینے پہلے' حجاز مقدس آجاتے تھے اور کئی مہینے بعد تک رہتے تھے۔

ہم وطنی اور ہم مسلکی کی وجہ سے، میرے خاندان کے حاجی صاحب کے خاندان سے قدیم اور عمیق روابط تھے اور ہیں۔ حضرت حاجی صاحب والد مرحوم کے دوستوں میں تھے۔ شرف نیاز حاصل کیا۔ اس زمانہ میں خاصے بیمار تھے۔ تاہم اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ، میرٹھ دہلی اور دیوبند کے حالات پوچھتے رہے۔

حاجی صاحب کا عشق حرم ایک واقعہ حضرت حاجی صاحب کے متعلق بھی عرض کرتا چلوں۔ میں حضرت حاجی صاحب کے پاس جب دوسری مرتبہ گیا تو مجھے مرض بڑھتا ہوا نظر آیا۔ صاحبزادگان میں سے (غالباً) حافظ حاجی فرید الدین احمد صاحب خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ صاحب مجھے پہنچانے نچلی منزل تک آئے تو میں نے ان سے پوچھا "علاج کس کا ہے ؟" انھوں نے فرمایا "کسی کا بھی نہیں۔" میں نے پوچھا "کیوں ؟" جواب ملا۔ کہ "حضرت حاجی صاحب علاج نہیں کرانا چاہتے۔" مزید تفتیش کی تو اندازہ ہوا کہ حضرت حاجی صاحب اس لیے علاج سے کتراتے ہیں کہ مدینہ منورہ ہی میں مرنے کی تمنا ہے۔

مگر میں نے ایک ترکیب نکالی۔ میرے رفیق سفر، بمبئی کے ممتاز طبیب حکیم اعظمی صاحب بھی تھے۔ وہ سنٹرل حج کمیٹی بمبئی کے ممبر تھے اور حضرت حاجی صاحب کسی زمانہ میں اس کمیٹی کے صدر رہ چکے تھے میں نے حکیم صاحب کو سب بات بتادی اور ایک صبح ان کو اپنے ساتھ لیکر حضرت حاجی صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔ حکیم صاحب نے ان سے ہندوستان کی حج کمیٹی کی باتیں شروع کردیں جو حاجی صاحب کے لیے بڑی دلچسپی کی تھیں۔ بعد میں جب حاجی صاحب کی طبیعت میں نشاط پیدا ہو گیا تو جناب حکیم صاحب نے فرمایا "ذرا مجھے اپنی نبض تو دکھائیے۔" اب حاجی صاحب نے پہلو بدلا فرمانے لگے۔ "نبض دیکھ کر کیا کیجیئے گا۔ یہاں یونانی دوائیں کہاں دستیاب ہوتی ہیں۔" حکیم صاحب بھی علاج کرنے پر تُل گئے تھے۔ فرمایا "حضرت میں وہی دوائیں لکھوں گا جو یہاں مل جاتی ہیں۔" آخر حاجی صاحب کو نبض دکھانی پڑی، حکیم صاحب نے نسخہ لکھا، اسے منگایا بھی گیا اب معلوم نہیں کہ اسے استعمال بھی کیا گیا یا نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ حضرت حاجی صاحب بادل ناخواستہ تندرست ہو گئے۔

حضرت حاجی صاحب نے کراچی میں "خان بہادر حاجی وجیہ الدین ٹرسٹ" کے نام سے ایک بہت بڑا خیراتی ادارہ قائم کر رکھا ہے اور اس کے لیے اسلحہ کی ایک شاندار دکان وقف کردی ہے

چند سال گزرے حضرت حاجی صاحب کا وصال ہو گیا مگر ان کے فرزند ارجمند اس کام کو چلا رہے ہیں۔ اس ادارہ کی طرف سے علمی و دینی کتابیں شائع ہو کر مفت تقسیم ہوتی ہیں۔ چنانچہ "ترجمان السنۃ" کی چوتھی جلد، بڑی تقطیع کے ۴۰۲ صفحات پر حسن طباعت وکتابت سے آراستہ ہو کر رنگا رنگ گرد پوش میں ملبوس، ہو کر اسی ادارہ کی طرف سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی اور بلا قیمت تقسیم کی گئی۔ چنانچہ ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا گیا۔

مولانا کی بعض تالیفات اس کے علاوہ حضرت مولانا بدر عالم کی دوسری کئی کتابیں بھی اس ادارہ سے شائع ہو کر ارباب نظر کو مفت نذر کی گئیں۔ ان کتابوں میں سے چند یہ ہیں:۔

خلاصۃ المناسک:۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مسائل حج پر مشہور کتاب زبدۃ المناسک کا خلاصہ۔

الحزب الاعظم:۔ قرآنی اور احادیثی دعاؤں کا مشہور مجموعہ مولانا کے ترجمہ کے ساتھ جس کے حاشیہ پر مولانا نے ان حدیثی دعاؤں کی تخریج بھی فرمائی ہے۔

اس ادارہ کے طفیل اور حضرت مولاناؒ کے لطف وکرم سے اس خاکسار کو بھی انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ چنانچہ حضرت مولانا کے ارشاد پر عازمان حج اور زائرین مدینہ طیبہ کے لیے دعاؤں کے مجموعہ کا اس خاکسار نے ترجمہ کیا اور اسی ادارہ سے وہ شائع کیا گیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب کا حضرت حاجی صاحب کے واسطہ سے مجھے ایک اور حکم ملا تھا جس کی تعمیل سے میں قاصر رہا۔ اور دونوں بزرگوں سے شرمندگی رہی۔ حکم یہ تھا کہ میں حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب زیارۃ الحرمین کی تلخیص کر دوں اور اس میں موجود حالات کے مطابق ضروری ترمیم بھی۔ کچھ تو زندگی کی الجھنیں اور مصروفیات اور زیادہ تر اس لیے کر میں حضرت مولانا میرٹھی کے ورثا سے اس کی اجازت حاصل نہ کر سکا، یہ خدمت میں انجام نہ دے سکا۔

شدت علالت اور وفات اب میں پھر اصل سلسلہ بیان کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔ ایک طرف حضرت مولانا کے اعضاء رئیسہ حادثہ کے سبب سخت متاثر ہو چکے تھے، دوسری طرف تصنیف و تالیف، وعظ و ارشاد، اور عبادت و ریاضت کی مشقتیں بدستور جاری تھیں۔ آخر حضرت مولانا کے امراض بڑھتے چلے گئے اور وہ مکمل طور پر صاحب فراش ہو گئے۔ سنا ہے کہ مولانا بستر پر چت لیٹے رہتے تھے۔ کروٹ لینا اور

سر اٹھانا ممکن نہ تھا مگر اسی حالت میں وظائف و اوراد کے علاوہ تصنیفات کا املاء اور ارشادات و افادات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مخلص محترم، حضرت مولانا علی میاں صاحب نے میرے، استفسار پر فرمایا کہ "مولانا بے حس و حرکت لیٹے رہتے ہیں مگر زبان سے علوم و معارف کا چشمہ ابلتا رہتا ہے۔ بس اللہ کی قدرت نظر آتی ہے"۔

آخر، معارف کتاب و سنت، اور حقائق معرفت و طریقت کا یہ چشمہ رواں ۵ رجب المرجب ۱۳۸۵ھ (۲۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء) کو شب جمعہ میں رُک گیا اور اس ترجمان السنۃ نے صاحب سنۃ علیہا لصلوٰۃ والسلام کے جوار میں جان جان آفریں کے سپرد کی، اور جنت البقیع میں امہات المومنین کے قدموں میں دفن ہو کر اپنی دلی مراد حاصل کر لی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ کاملہ۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، حضرت مولانا کے تین بھائی اور تھے مولانا شمس الحق مرحوم و مغفور، مولانا محمد حامد اور جناب محمد محمود۔ مولانا محمد حامد صاحب پشاور یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد کراچی میں مقیم ہیں۔ سال گزشتہ موصوف سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ محمد محمود صاحب پاکستان میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے اور وہیں مقیم ہیں۔

حضرت مولانا کی زوجہ محترمہ کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ پھر آپ نے اولاد کی دلداری کی خاطر دوسری شادی نہ کی۔ آپ کی اولاد میں دو صاحبزادیاں ہیں اور ایک فرزند ہیں۔ مولوی آفتاب احمد جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ مگر آپ کی اولاد معنوی جنھوں نے زیادہ تر زمانہ قیام مدینہ طیبہ آپ سے فیوض باطنی حاصل کیے، ہندوستان پاکستان اور افریقہ میں خاصی تعداد میں پھیلی ہوئی ہے اور آپ کے ذخیرہ حسنات میں اضافہ کر رہی ہے۔

ہندوستان میں علمِ حدیث

(۳)

(از مولانا تقی الدین ندوی مظاہری استاذ حدیث دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر)

ہندوستان کا سب سے پہلا علاقہ جو عربوں کی فتوحات میں داخل ہوا، وہ سندھ تھا، جس کا ۹۶ھ سے تقریباً ۲۵۰ھ تک براہ راست دمشق و بغداد کی خلافت سے تعلق رہا، اور پھر وہاں کے دو شہروں منصورہ و دیبل میں دو اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں، منصورہ کی اسلامی ریاست محمود غزنوی کے حملۂ سندھ ۴۱۶ھ تک قائم رہی، اور اس کے بعد دیبل کی اسلامی ریاست ۷۵۲ھ تک یعنی فیروز شاہ خلجی کے زمانہ تک باقی رہی، گو اس کے بعد بھی وہ ۹۲۷ھ تک قائم رہی مگر خود مختار نہ رہی[1]

محمود غزنوی کے حملہ سندھ تک علاقہ سندھ میں علم حدیث کی خوب نشر و اشاعت ہوئی، بصرہ و بغداد کی طرح سندھ و منصورہ و دیبل وغیرہ بھی اسلامی علوم کے مرکز تھے، اور جگہ جگہ علوم و فنون کی بساطیں بچھی ہوئی تھیں، گھر گھر دارالعلوم بنا ہوا تھا، اور ایک ایک شہر میں سیکڑوں علماء و محدثین رہتے تھے، ۳۷۵ھ یعنی سلطان محمود غزنوی کی فتوحات سے پچیس تیس برس پہلے یہاں بیت المقدس کا عرب سیاح ابو القاسم مقدسی آیا تھا، اس نے پورے اقلیم سندھ کا مذہبی و دینی حال یوں بیان کیا ہے،

---

[1] مقالات سلیمانی ج۱ ص ۲۶/۲۴

"مذاہبھم اکثرھم اصحاب حدیث ولا تخلوا القصبات من فقہاء علی مذھب ابی حنیفۃ رحمہ اللہ ولیس بہا مالکیۃ، ولا معتزلۃ، ولا عمل الحنابلۃ، انھم علی طریقۃ مستقیمۃ و مذاھب محمودۃ، وصلاح وعفۃ، قد اراحھم اللہ من الغلو والعصبیۃ والفتنۃ [۱]

سندھ کے مسلمانوں کے مذاہب، ان میں اکثر اصحاب حدیث ہیں، اور قصبات تک حنفی فقہا سے خالی نہیں ہیں، یہاں پر نہ مالکی ہیں، اور نہ ہی معتزلی اور نہ حنابلہ کے مسلک پر عمل ہے، یہاں کے لوگ صراط مستقیم پر، اور اچھے مسلک پر ہیں، اور دینداری و پرہیزگاری رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو غلو اور عصبیت اور فتنہ و فساد سے امان میں رکھا ہے،

مولانا عبد الحیٔ الحسنی تحریر فرماتے ہیں:۔

"اموی خلفاء اور عباسی خلفاء کی زیادتیوں سے پریشان ہو کر امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کے لئے تبع تابعین اور خاندان نبوت کے لوگ سندھ میں آکر آباد ہونے لگے، اہل علم نے برابر اسی علاقہ میں آکر سکونت اختیار کی، اور اسی علاقہ میں انھوں نے مستقل اقامت اختیار کرلی، اور ان کی نسلیں بڑھیں، یہ لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر فرماتے تھے، اور علماء سے حدیثیں سن کر ان کو یاد کرتے تھے، یہ سلسلہ تقریباً چار سو سال تک قائم رہا، اور فن حدیث کی کتابیں مختلف علاقوں میں پھیل گئیں، ۔۔۔۔ جب سندھ میں عربوں کی حکومت ختم ہوگئی، اور ان کے بجائے غزنوی اور غوری سلاطین سندھ پر قابض ہوئے، اور خراسان و ماوراء النہر سے سندھ میں علماء آئے، تب علم حدیث اس علاقہ میں کم ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ معدوم ہو گیا" [۲]

قاضی ابو سعید عبد الکریم سمعانی ۵۰۶ھ میں مرو (ترکستان) میں پیدا ہوئے اور وہیں ۵۶۲ھ میں وفات پائی [۳] انھوں نے علم حدیث کی طلب میں تمام دنیائے اسلام کا سفر کیا، اور ہر علاقہ کے

[۱] احسن التقاسیم ص۴۸۱ [۲] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند ص۱۳۵ [۳] الفوائد البھیۃ ص۱۲۲

اہل کمال سے اس فن کو حاصل کیا، انھوں نے اپنی کتاب "کتاب الانساب" میں شہروں و قبیلوں، اور پیشوں کی نسبتوں سے جو لوگ مشہور رہیں، ان کے حالات لکھے ہیں، اس طرح چھٹی صدی ہجری کے اکثر شہروں کے باکمال لوگوں کے تذکرے و حالات اس میں جمع کئے ہیں، نیز اس میں ہندوستان کے شہروں میں سندھ و منصورہ و دیبل اور لاہور کا ذکر بھی کیا ہے، —— علامہ موصوف فرماتے ہیں —— کہ

"ہندوستان کے اہل علم میں ایک جماعت ان علماء و محدثین کی ہے، جو موالی کی اولاد ہیں، جنھیں مسلمان ہندوستان سے بلاد عرب لے گئے، اور ایک جماعت ان مجاہدین اور مسلمانوں کی اولاد کی ہے، جو یہاں آکر آباد ہو گئے، ان دونوں جماعتوں میں علماء ہند کی ایک تعداد پیدا ہوئی" [۱]

اس طرح ہندوستان میں بلاد عرب کے علماء و محدثین کی آمد کا ایک طویل سلسلہ ہے، جو بعد کی صدیوں تک قائم رہا ہے،

سندھ کے محدثین سندی نسبت کے ساتھ تاریخ اور کتب رجال میں رواۃ حدیث اور محدثین کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے جن میں چند مشہور رُواۃ و محدثین کے حالات حسب ذیل ہیں،

عبدالرحمٰن سندی، امام بخاری نے ان کے بارے میں تحریر فرمایا ہے، کہ انھیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سماع حدیث حاصل تھا [۲] اس سے ان کا تابعی ہونا واضح ہے۔

ابو معشر سندھی —— ان لوگوں میں ہیں جو دوسری صدی ہجری میں حدیث و سیر کے امام تھے، ابو معشر نجیح سندھی مدنی بھی ہیں، چونکہ یہ مدینہ منورہ میں جا کر رہے، اس لئے مدنی کہلانے لگے، انھیں تبع تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے، کئی جلیل القدر تابعین کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور ان سے سماع حدیث کیا، خلیفہ مہدی عباسی ۱۶۱ھ میں انھیں مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغداد لایا تھا، اور ان کے ذمہ تدریس حدیث کی خدمت سپرد کی، وہ بغداد میں تاحیات اپنے چشمۂ علم سے لوگوں کو سیراب کرتے رہے، مغازی کے بہت بڑے عالم تھے [۳]

بلکہ ان کا نام مغازی و سیر کو قید تحریر میں سب سے پہلے لانے والوں کی فہرست میں

---

[۱] کتاب الانساب ص ۱۹۱ طبع جدید [۲] التاریخ الکبیر ص ۲۹۵ / ۵۵ [۳] تاریخ بغداد ص ۴۲۷ / ۱۳۷

شامل ہے[1]

ابن ندیم نے لکھا ہے، کہ واقعات وسیر سے خوب واقف تھے، اور جماعت محدثین کے ایک فرد تھے، ان کی تصانیف میں "کتاب المغازی" بھی ہے[2]

علامہ ذہبی نے "الفقیہ" و "صاحب المغازی" سے ان کا تعارف کرایا ہے، امام احمد بن حنبل بھی مغازی میں ان کی بصیرت کے معترف تھے،

ان کے اساتذہ میں محمد بن کعب قرظی، ہشام بن عروہ اور نافع مولی ابن عمرؓ وغیرہ مشہور ہیں، اور تلامذہ میں محمد بن ابی معشر، ابونعیم، وکیع، محمد بن عمرو بن واقدی، سفیان ثوری جیسے بلند پایہ اشخاص کا شمار ہے، ان کی روایت جامع ترمذی میں بھی موجود ہے، اخیر عمر میں حافظہ کمزور ہو گیا تھا، ان کی زبان سے سندھیت کا اثر اخیر زندگی تک نہیں گیا، بعض عربی حروف کے مخارج ٹھیک طریقہ سے نہیں ادا کر سکتے تھے، ان کا رنگ گندمی، اور جسم فربہ تھا، رمضان المبارک ۱۷۰ھ میں وفات پائی، اور بغداد کے مقبرہ کبیرہ میں مدفون ہوئے،

ان کے بعد ان کے لڑکے ابو عبد الملک محمد بن ابی معشر بھی علم حدیث میں بڑے پایہ کے عالم ہوئے ہیں، اپنے والد کی "کتاب المغازی" کے راوی ہیں، ابو یعلی موصلی نے ان سے روایت کی ہے، ۹۹ برس کی عمر پائی، اور ۲۴۴ھ میں وفات ہوئی[3]

ابو محمد رجاء بن السندی۔ یہ ایران ہو کر اسفرائنی کہلائے، فن حدیث میں یہ کمال پیدا کیا، کہ مشہور محدث حاکم ان کے حالات میں لکھتے ہیں "رکن من ارکان الحدیث" (یہ حدیث کے ارکان میں سے ایک رکن ہیں) یہ نہ صرف خود محدث تھے، بلکہ ان کے خاندان میں بہت سے حفاظ حدیث پیدا ہوئے، ۲۲۱ھ میں وفات پائی[4]

علامہ سمعانی فرماتے ہیں، کہ ان کے خاندان میں مدت تک علم کا چرچا رہا، ان کے صاحبزادے ابو عبد اللہ محمد بن رجاء اور پوتے ابو بکر محمد بن رجاء مشہور محدث گزرے ہیں، علامہ خطیب بغدادی نے ان تینوں کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ علامہ سمعانی نے ان کے علاوہ چند اور حضرات کے نام گنائے ہیں۔

---

[1] تذکرہ علماء ہند صد ۲۳ [2] کتاب الفہرست ص ۱۳۶ [3] تذکرۃ الحفاظ ص ۲۱۶ [4] تہذیب التہذیب ص ۲۶۷ ج ۱۷

ابو عبد اللہ نضر بن شمیل، یہ مکی بن ابراہیم بن علی اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ اور … ابراہیم بن محمد شافعی اسحاق بن راہویہ کے شاگرد تھے، بغداد و مکہ میں درس دیتے تھے۔

ابو النضر فتح بن عبد اللہ سندھی فقیہ، متکلم اور محدث تھے، حسن بن سفیان وغیرہ محدثین کے حلقۂ درس میں بیٹھے تھے، ہمدان و قزوین میں قاضی رہے ہیں۔

احمد بن سندی بن فروخ، یہ بغداد جاکر رہے، انھوں نے ابراہیم دورقی سے روایت کی ہے،

احمد بن سندھی بن حسن، یہ بھی بغداد ہی میں سکونت پذیر تھے، ثقہ، صدوق اور زاہد تھے۔[۱]

حافظ ابو محمد خلف بن سالم، حدیث کے مشہور حافظ تھے، غلاموں کے سلسلہ میں آل مہلب سندھ سے عراق (کوفہ) آئے، یہاں حدیث کی تعلیم پاکر نام آور ہوئے، پھر بغداد چلے گئے، اور "محلہ مخرم" میں مستقل اقامت اختیار کرلی، ان کے اساتذہ میں یحییٰ بن سعید قطان اور ابو نعیم مشہور ہیں، اور ان کے تلامذہ میں حاتم، ابو القاسم بغوی، احمد بن علی آبار اور عثمان دارمی جیسے باکمال لوگوں کا شمار ہے، امام نسائیؒ نے ان کی روایت اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ ۲۲ رمضان المبارک ۲۳۱ھ میں ۶۹ سال کی عمر پاکر بغداد میں وفات پائی۔[۲]

امام اوزاعی کی ولادت اگرچہ شام میں ہوئی، مگر ان کے بزرگ بھی سندھی تھے۔

منصورہ کے علماء و محدثین

سندھ کا یہ شہر عربوں کے زمانہ میں دوسری صدی کے شروع میں آباد ہوا، اہل ہند اس کو بھکر کہتے ہیں، اسی نام سے ہندوستان کی تاریخوں میں اس کی شہرت ہے، دوسری و تیسری اور چوتھی صدی کا زمانہ دینی علوم کی نشر و اشاعت اور حدیث و سنت کی ترویج و تبلیغ کے لئے دور بہار تھا، پوری دنیائے اسلام میں بڑے بڑے محدثین کی درسگاہیں قائم تھیں، چنانچہ سندھ کا مرکزی شہر منصورہ بھی علماء و محدثین کا مرکز رہا ہے، اور یہاں بھی علم حدیث اور دیگر علوم دینیہ کی تدریس کے لئے باقاعدہ درسگاہیں قائم تھیں، ابو القاسم مقدسی نے منصورہ کے قاضی ابو محمد کے تعلیمی و تدریسی مشاغل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے،

ولہٗ تدریس و تصانیف، وقد ... ان کی تدریس کی مجلس ہے، اور تصنیفات

---

[۱] کتاب الانساب سمعانی ص۳۱۴، [۲] تاریخ بغداد ج۸ ص۳۲۹/۱۸۵ و کتاب الانساب طبع قدیم ص۳۱۴

صنف کتباً عدیدۃ حسنۃ [1]

ہیں، وہ کئی عمدہ تصنیفات کے مصنف ہیں،

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کی وفات کب ہوئی تھی، مگر مقدسی نے ان سے ملاقات کی ہے، اس لحاظ سے ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری ہوگا،

اسی طرح منصورہ میں ایک دوسرے محدث قاضی ابوالعباس احمد بن محمد منصوری کا ذکر بھی سمعانی نے کیا ہے، یہ بھی داؤد ظاہری کے مذہب پر امام تھے۔ "کان اماما علی مذہب داؤد"۔ عراق و فارس میں رہے تھے، مشہور محدث امام اثرم کے حلقۂ درس میں بیٹھے تھے، اور حافظ ابو عبداللہ حاکم المتوفی ۴۰۵ھ کو بھی ان سے سماع حدیث حاصل تھا، اس لحاظ سے یہ چوتھی صدی ہجری کے آخر کے ہوں گے،

ابوالعباس احمد بن محمد صالح تمیمی، یہ بھی منصورہ کے قاضی رہے ہیں، ان کا شمار بھی فضلاء داؤدیہ میں تھا، انھیں فارس میں ابوالعباس بن اثرم اور بصرہ میں ابو روق ہزانی سے سماع حدیث حاصل تھا، ان کی کئی ضخیم اور اہم کتابیں ہیں، ان کی تصنیفات میں کتاب المصباح، کتاب الہادی اور کتاب النیر بہت اہم اور مشہور ہیں، ان کا تذکرہ ابن ندیم، ابو اسحٰق شیرازی اور سمعانی نے کیا ہے، ان کے بارے میں حافظ سمعانی لکھتے ہیں "کان اظرف من رأیت من العلماء"[2] (علماء میں ان سے زیادہ ظریف مزاج میں نے اور کسی کو نہیں دیکھا) اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ سمعانی کے معاصر ہیں، اس طرح یہ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تھے،

ابو محمد عبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری، یہ قرآن کے مستند قاری اور مقری ہیں، احادیث کا سماع حسن بن مکرم اور ان کے معاصرین سے کیا، اور ان سے بھی امام ابو عبداللہ حاکم نے روایت کی ہے، رنگ سیاہ تھا، سمعانی نے ان کا بھی تذکرہ کیا ہے،

ابو بکر احمد بن محمد منصوری بکر آبادی، انھوں نے حدیث کی روایت امام ابو بکر اسماعیل اور حافظ ابن عدی سے کی ہے، وطن منصورہ تھا، جرجان کے شہر بکر آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ۲۹ر جمادی الاولیٰ ۳۶۲ھ کو انتقال فرمایا، آپ کا تذکرہ حافظ ابو القاسم نے تاریخ جرجان میں کیا ہے، [3]

(باقی)

---

[1] احسن التقاسیم ص ۴۸۱، [2] کتاب الانساب ص ۵۴۳، [3] رجال السند والہند ص ۵

نبود کلیم ہر کس ز سخن دراز کردن

(مولانا کفیل احمد قاسمی بجنوری)

سزدت بدل ربائی ز ہزار ناز کردن — نسزد ترا بغمزہ ز من احتراز کردن

تو نہاں بجان جانم من و از جہاں گسستم — نہ ہے شیوۂ محبت تجھے پاسِ راز کردن

نخورد فریب دیدہ بجمالِ حور و غلماں — چہ بچشم حق شناساں درِ خلد باز کردن

تجھے شانِ جاں نوازی کہ ز تابشِ تجلی — لب و چشم و گوش بستن درِ دل فراز کردن

چہ مہ و چہ مہر و انجم ہمہ لطفِ دودِ آہم — بسپہرِ پایہ بخشم ز جگر گداز کردن

چہ صبا دمید افسوں کہ چمن برقص آمد — بضمیرِ غنچہ غنچہ سرِ اہتزاز کردن

نتواں گرفت نکہت بکفِ نسیم قسمت — بہ طیبِ گل چہ آمد ز چمن طراز کردن

نہ خجل ز انکسارم کہ غبارِ کوئے یارم — مرا مقتضائے فطرت ادبِ نیاز کردن

چو وجود مستعارم نہ متاعِ جاں دارم — چہ میانِ حسن و قبح رسد امتیاز کردن

سخن و لسانِ عاشق چہ ابوالہوس شناسد — نہ بود کلیم ہر کس ز سخن دراز کردن

چو کفیل عشق داری ز رسولِ ربِّ کعبہ
ترا باعثِ سعادت سفرِ حجاز کردن

ایک ۴۰ سالہ رفیق کی رحلت

مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم

الفرقان اب سے قریباً ۳۹ سال پہلے بریلی سے جاری ہوا تھا، اُس کے سال دو سال پہلے سے راقم سطور کی آمد و رفت، اُس وقت کے خاص مشغلہ اور خاص دلچسپی کی وجہ سے بریلی زیادہ رہتی تھی — وہاں کے قدیمی دینی مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا عبدالحق صاحب سنبھلی مرحوم صدر مدرس اور وہی مہتمم بھی تھے۔ میں نے اُن سے کچھ اسباق بھی پڑھے تھے اور قریبی عزیزداری بھی تھی اس وجہ سے جب بریلی جاتا تو اکثر مصباح العلوم بھی جانا ہوتا اور کبھی کبھی قیام وہیں رہتا۔

مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی اُس زمانہ میں وہاں مدرس دوم تھے، اپنے ہم مذاق ہونے کے علاوہ بڑے خوش مزاج بھی تھے۔ اسی وقت سے اُن سے خاص رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

پھر جب ۱۳۵۲ھ کے اواخر ۱۹۳۴ء کے اوائل میں بریلی ہی سے "الفرقان" کے اجرا کا فیصلہ کیا گیا تو راقم سطور کا مستقل قیام ہی بریلی ہو گیا۔ اور ۱۳ سال تک (یعنی الفرقان کے لکھنؤ منتقل ہونے تک) وہیں قیام رہا۔ اس پوری مدت میں مولانا عبدالحفیظ صاحب الفرقان کے کام میں، راقم سطور کے بریلی میں سب سے بڑے معاون رہے — مولانا کو دفتری کاموں کا بھی خاص سلیقہ تھا، بڑے خوش خط اور زود نویس تھے اور ساتھ ہی انتہائی بے نفس بھی، جب کبھی الفرقان کے ناظم دفتر چھٹی پر چلے جاتے تو اکثر مولانا موصوف کئی کئی ہفتے بلکہ کبھی کبھی کئی کئی مہینے تک کے لیے دفتری کام اپنے ذمہ لے لیتے اور اس کا بالکل خیال نہ کرتے کہ یہ کام اُن کے علمی مقام سے فروتر ہے۔

الفرقان کا دفتر جب تک بریلی رہا اس کے کاموں میں مولانا کی رفاقت اور یہ معاونت برابر حاصل رہی، اس کے بعد جب وہ لکھنؤ منتقل ہو گیا تو مولانا موصوف بھی پہلے کچھ مدت ندوۃ العلوم

دہرا ہے) اور پھر کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند رہنے کے بعد اس عاجز ہی کی تحریک پر لکھنؤ ہی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آ گئے ۔ یہاں عربی ادب کے اکثر اونچے اسباق مولانا کے سپرد ہوتے تھے اس کے علاوہ حسب ضرورت فقہ اور حدیث کے اسباق بھی پڑھاتے تھے ۔ یہاں دارالعلوم میں مولانا موصوف کی یہ خصوصیت تھی کہ نصاب تعلیم کی ہر کتاب اُن کو دی جا سکتی تھی۔

تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اُن متعدد کتابوں اور بعض کتابوں کے ترجموں کے علاوہ جن کی طباعت و اشاعت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا اُن کی دو معروف و مقبول کتابیں اُن کے علمی مقام اور کامیاب محنت کی یادگار ہیں۔

ایک "مصباح اللغات" جس میں پچاس ہزار سے زیادہ عربی الفاظ کی اردو میں تشریح کی گئی ہے، نہایت جامع اور ضخیم لغت ہے۔ اندازہ ہو کہ قریباً بیس ۲۰ اڈیشن اُس کے شائع ہو چکے ہیں۔ مرحوم نے اُس کے شروع میں جو مقدمہ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف لغت ہی پر نہیں بلکہ دوسرے علوم عربیہ پر بھی ان کی نظر کتنی وسیع اور عمیق تھی۔

دوسری کتاب "اردو عربی ڈکشنری" ہے جو اردو الفاظ کی عربی معلوم کرنے کے لیے بہترین اور مستند کتاب ہے، اسکے بھی متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں، اِن دونوں کتابوں پر حکومت ہند نے مولانا کو انعام بھی دیا تھا۔

ادھر کافی عرصے سے موصوف کی صحت خراب تھی، اب سے ۵۔ ۶ مہینے پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا اور حالت بظاہر مایوس کن ہو گئی تھی، فوراً ہی لکھنؤ میڈیکل کالج کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا اور اُسوقت اللہ تعالیٰ کا فضل ہو گیا، چند ہی روز میں حالت قابل اطمینان ہو گئی اور ہم لوگ بھی مطمئن ہو گئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کئی سال سے گرمی کی شدت کی وجہ سے ماہ جون کی چھٹی ہو جاتی ہے۔ اس چھٹی میں مولانا کا قیام اپنے وطن درسترا ضلع بلیا میں رہا، جون ختم ہونے پر مولانا نے کچھ مزید چھٹی دارالعلوم سے لے لی۔ جولائی کے آخری ہفتہ میں وہیں فالج کا دوسرا حملہ ہوا، وہی آخری مرض وفات بن گیا اور ۲۶ جولائی کو انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ۝ غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ۝

جب بھی دوستا قریب کے کسی تعلق والے کا انتقال ہوتا ہو تو اس ناچیز کو ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہو کہ اسکے حقوق ادا کرنے میں بڑی کوتاہیاں ہوئی ہیں، مولانا مرحوم کے بارے میں خصوصیت سے یہ احساس ہو، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ دعاء و ایصال ثواب کے ذریعہ اُسکی کچھ تلافی ہو سکے، الفرقان کے ناظرین کرام سے بھی عاجزانہ گزارش ہو کہ مولانا مرحوم کے لیے مغفرت و رحمت کی اور اُنکے پسماندگان کیلیے دینی و دنیوی صلاح و فلاح کی دعا فرمائیں، ناچیز راقم سطور پر بھی احسان ہوگا۔

قابل مطالعہ نئی مطبوعات

تفسیر ماجدی جلد دوم (سورۂ نساء تا سورۂ توبہ)

از مولانا عبدالماجد دریابادی

قرآن پاک کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بجید قابل قدر ہے عربی کی تمام مستند تفاسیر اور مفردات القرآن پر لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کامل اعتماد کیساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہے قیمت مجلد ... سترہ روپے

قرآن اینڈ یو (انگریزی)

مولانا محمد منظور نعمانی کی مشہور و مقبول کتاب "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے" جسمیں سیکڑوں عنوانات کے تحت قرآنی آیات کو نہایت موثر اور دل پر اثر تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے اور جو پڑھنے والے کو قرآن کی دعوت و تعلیم کیساتھ اس کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے قلم سے یہ کتاب بے شمار خصوصیتوں کی مالک ہے۔ بہترین گلیز کاغذ۔ اعلیٰ درجہ کی طباعت۔ ۲۴۰ صفحات۔ قرآنی آیات کی طباعت آفسٹ کے ذریعہ رنگین کی مضبوط جلد دیدہ زیب ٹائٹل۔ قیمت ... بارہ روپے

سیرت طیبہ

(از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

پیغمبر اعظم حضرت محمد صلعم کی نئی سیرت ... حدیث و تفسیر کی مستند کتابوں کی بنیاد پر جدید انداز تعبیر کے ساتھ مضامین روح پرور اور زبان دل آویز۔ صفحات ۴۵۰۔ اعلیٰ کاغذ

قیمت صرف ... ۶/-

شواہد تقدس

از مولانا سید محمد میاں صاحب

اس میں خلیفہ ثالث حضرت عثمان ذی النورین پر انگشت نمائی کرنے والوں اور بحیثیت خلیفہ کے ان کی خامیاں گنانے والوں کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔ اس کے مباحث کی روشنی میں حضرت عثمان مظلوم کی شخصیت اتنی ہی بے داغ نظر آنے لگتی ہے جتنا اسے نصوص کتاب و سنت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ۲۶۴ صفحات۔ اعلیٰ کتابت و طباعت قیمت مجلد ... ۶/-

آپ بیتی

حضرت شیخ الحدیث کی جیتی جاگتی تصویر۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے بہت تفصیل کیساتھ خود اپنی سوانح حیات مرتب کرائی ہے جسمیں بچپن، والد ماجد کی خاص تربیت، طالبعلمی اور سلوک کے منازل، تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف، اکابر کیساتھ تعلق، اپنے مرشد و مربی کیساتھ مدینہ طیبہ میں قیام اور زندگی کے اہم واقعات کا بڑے ہی بے تکلف اور سادہ انداز میں تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ پڑھنے والوں کو انشاء اللہ مجلس صحبت کا لطف آجائیگا۔ تین حصے یکجا مجلد ۵/۵۰

تذکرۃ الخلیل

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کے استاد و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی کی سوانح حیات۔ حضرت شیخ الحدیث کے قیمتی اضافوں اور اصلاحات کیساتھ۔ ضمن میں سلسلہ کے بہت سے اکابرین کا تذکرہ آگیا ہے۔ قیمت مجلد رنگین ۷/۲۵

حیات عبدالحئی

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کیفیتی مصنف کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی سوانح حیات جسمیں ممدوح کے علمی کمالات، دینی خدمات اور ان کی عربی تصنیفات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ آخر میں انکے فرزند اکبر مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی (سابق ناظم ندوہ) کے مختصر حالات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ قیمت غیر مجلد ۶/-

فریب تمدن

مغربی قوموں کی مادی ترقیوں نے دنیا کو مسحور کر دیا ہے کہ ہر معاملے میں انکی تقلید ترقی کا زینہ محسوس ہوتی ہے لیکن انسانی نقطۂ نظر سے انکی انتہائی گراوٹ کو کوئی نہیں دیکھتا۔ جنسی زندگی کے جتنے سب سے برے مظاہر ہو سکتے ہیں انہیں موجودہ مصنف نے انہی معاشرے پر انکے اثرات اور تباہ کن نتائج سے با تفصیل مرتب کیا ہے۔ قیمت مجلد دس روپے صرف

مذہب اور سائنس

از حضرت مولانا عبدالباری ندوی۔ اسمیں فلسفہ، کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور تجربات پر ایک نئے تحقیقی علمی نقطۂ نظر سے بحث اور فلسفہ و سائنس کی روشنی میں دینی حقائق کا اثبات کیا گیا ہے۔ صفحات ۲۹۲ قیمت مجلد ۹/-

ملنے کا پتہ

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

مکتوب گرامی بسلسلہ صفحہ

جہاں تک منامات یا کشوف کا تعلق ہے وہ کوئی شرعی حجت نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اگر خواب میں زیارت ہو تو اجماعاً وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زیارت ہے، اس کے باوجود علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ظاہر شریعت کے خلاف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں بلکہ اس کی تعبیر (تاویل) ضروری ہے۔ ایسی صورت میں منامات کی بنا پر ظاہر شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا، ایسے ہی کشوف کی بنا پر حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ کے متعلق جہاں تک منامات اور کشوف کا تعلق ہے وہ بھی متعارض اور مختلف ہیں۔ دوستوں سے یہ خبریں مخفی نہیں، حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کو اس سیہ کار کے ساتھ جو تعلق تھا اس کا طبعی تقاضا بھی تھا کہ میں انتقالِ تابوت کے مسئلہ میں پیش پیش ہوتا۔ اور یہ بھی اُن لوگوں سے مخفی نہیں جو تدفین کے موقع پر وہاں موجود تھے کہ حضرت قدس سرہ کو "ڈھڈیاں" دفن کرنے کے سلسلہ میں اس ناکارہ نے عزیز جلیل سلمہٗ کو کتنے سخت خطوط لکھے جو اس کے پاس محفوظ ہیں۔ اور اس نے اپنی سخت مجبوریاں اور معذوریاں جن کو میں نے بھی اس وقت قابل لحاظ سمجھ لیا تھا، لکھیں۔ مگر عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقالِ تابوت پر وہ سب غلط ثابت ہوئیں، چنانچہ اُس موقع پر پھر میں نے عزیز جلیل کو ڈانٹ کے خطوط لکھے تھے کہ تم نے جو اعذار بارد اُس وقت مجھے بتلائے تھے وہ سب عزیز مولانا محمد یوسف صاحب کے نقل تابوت نے ھباءً منثورا کر دیے۔

حضرت قدس سرہ کے رائے پور عدم تدفین میں خدام رائے پور، بہار، نیور کے جولاہوں میں موجود تھے، جناب الحاج حافظ عبدالعزیز صاحب مدفیوضہم کو چھوڑ کر کہ وہ اُس وقت وہاں موجود نہ تھے اور سرگودھا اپنا دیرہ اپنے تشریف لے گئے تھے) بقیہ سب قصور دار اور ذمہ دار ہیں کہ جو آج زور دکھلا رہے ہیں، اُس وقت اس زور اور اصرار سے کیوں نہیں کام لیا۔ بعض احباب نے حضرت قدس سرہ کے انتقال کے بعد اس مسئلہ میں عزیز جلیل سے گفتگو کرنی چاہی تو بعض ہندی خدام ہی نے روک دیا۔ تعجب ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تابوت کے منتقل کرنے میں ایک شخص حافظ صدیق نوح والے تو اڑ جاویں کہ تابوت دہلی جائے بغیر نہیں رہے گا۔ مگر ان معزز حضرات میں سے کسی نے بھی

ؔ نوح میوات کا ایک قصبہ ہے، حافظ صدیق وہاں کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں جب حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا لاہور میں انتقال ہوا تو حافظ صدیق بھی ساتھ تھے۔ مولانا انعام الحسن صاحب اس پر راضی ہو گئے تھے کہ مولانا کو وہیں دفن کر دیا جائے لیکن یہ حافظ صدیق اڑ گئے، اور اسی کے نتیجہ میں بالآخر حضرت مولانا مرحوم کو ہوائی جہاز سے دہلی لاکر دفن کیا گیا۔ ۱۲۔ نعمانی۔

اس وقت لب کشائی نہیں کی۔ یہ قصے تو بڑے طویل ہیں اور عام لوگوں سے کہنے کے ہیں بھی نہیں مگر خصوصی احباب ان واقعات سے خوب واقف ہیں۔

بہرحال اس ناکارہ کے نزدیک آٹھ نو برس گزر جانے کے بعد کسی طرح بھی اب بحث مناسب نہیں کہ عالم برزخ کا حال کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اس کے باوجود جو حضرات علماء کرام اس رائے میں بندہ کے موافق نہیں، اس ناکارہ کو اُن پر نہ کوئی اعتراض ہے نہ اُن سے کچھ خلاف ہے۔ اس لیے کہ بندہ کے یہاں ہمیشہ اختلاف علماء قابل اعتراض چیز نہیں رہی بلکہ مبارک رہی جس کو میں اب سے تیس سال پہلے جبکہ لیگ اور کانگریس کی حمایت کے بارہ میں میرے دو مقتدا حکیم الامۃ حضرت تھانوی اور شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما میں شدید اختلاف تھا۔ اور یہ ناکارہ دونوں کا نیاز مند تھا۔ اور ادھر دونوں حضرات کے خداموں میں نہایت بدتمیزیاں پیدا ہو رہی تھیں اُس وقت اس ناکارہ نے ایک رسالہ "الاعتدال" لکھا تھا جس کو دونوں اکابر اور ان کے مخصوص خدام نے بہت پسند کیا تھا اور کثرت سے لوگوں نے مجھے خطوط لکھے تھے کہ بہت ہی بروقت اور مفید ثابت ہوا۔ بعض احباب نے اُس وقت اس کو طبع کر کے مفت تقسیم بھی کرایا لیکن علماء کے شرعی اختلاف کو اُن کی طرف سے ہو یا ان کے خدام کی طرف سے ہو اُس کو منازعت باہمی کا ذریعہ بنانے کا بندہ بہت مخالف ہے۔ اور چونکہ کچھ عرصہ سے پاکستانی خطوط سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ وہاں یہ مسئلہ علماء کے حدود سے نکل کر عوام کی حد تک پہنچ گیا اور آپس میں منازعت کا ذریعہ بن گیا جس سے بہت رنج و قلق ہے نیز فریقین کی تحریرات میں بھی نامناسب الفاظ ایک دوسرے کی شان میں لکھے جا رہے ہیں جو اہل علم کی شان سے بہت بعید ہے۔ ان حضرات کی شان عالی میں یہ کہنا تو بالکل آفتاب کو چراغ دکھلانا ہے کہ احادیث پاک میں "فساد ذات البین" کو "حالقہ" قرار دیا گیا ہے اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے کہ کوئی ایسی چیز تحریر میں یا تقریر میں نہیں آنی چاہیے جس سے دوسرے فریق کے علماء کی اہانت ہو یا کسی جانب کے علماء کے متبعین کو دوسرے علماء کی شان میں بے ادبی یا اہانت کا موقع ملے۔ یہ ناکارہ ہر عالم کے لیے اپنی علمی تحقیق کے موافق اپنی رائے کے اظہار کا بالکل مخالف نہیں۔ یقیناً استفتاء کے موقع پر جو دیانۃً اُن کے نزدیک ترجیح صحیح ہو اُس کا اظہار ضروری ہے لیکن اس کو منازعت کا ذریعہ ہرگز نہ بنانا چاہیے۔ اس میں ہر فریق کے علماء کو اپنے زیر اثر لوگوں کی نگرانی کرنا بھی ضروری ہے کہ "کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ" تاکہ ان کے زیر اثر لوگوں سے دوسرے

کی شان میں گستاخی کا کوئی لفظ نہ نکلے۔

جماعت کے اکابر حضرت شیخ الہند، حضرت حکیم الامۃ، حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مراقدہم سیاسی مسائل و معاملات میں باوجود اپنے اختلافات کے ایک دوسرے کا کتنا ادب و احترام کرتے تھے اس کے دیکھنے والے ہزاروں ابھی موجود ہیں۔ اس کے متعلق بھی یہ ناکارہ اپنے رسالہ الاعتدال میں لکھ چکا ہے۔ بندہ کے خیال میں اس موقع پر احباب کو یہ رسالہ اہتمام سے اپنے مجامع میں سنانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں رسالہ "خدام الدین" کا مضمون بہت ہی معتدل ہے۔ الفرقان کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ انھوں نے فریقین کے اکابر کا احترام کرتے ہوئے اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ میں رسالہ الاعتدال میں لکھ چکا ہوں کہ اس سیہ کار کو اپنی کم علمی، بے مائگی کے باوجود اپنے مرشد اپنے شیخ حضرت سہارنپوری قدس سرہ سے بھی بعض مسائل میں اختلاف رہا لیکن اس پر میرے حضرت نے نہ تو دربار اقدس سے میرا اخراج کیا اور نہ نعوذ باللہ اس سیہ کار کے ناپاک دل میں حضرت قدس سرہ کی طرف سے کوئی ناپاک خیال آیا، بلکہ حضرت قدس سرہ کی عظمت اور زیادہ پیدا ہوئی۔

آپ کی تعمیل حکم میں یہ سطور لکھ دی ہیں۔ ورنہ نقار خانہ میں طوطی کی صدا کا بے اثر ہونا مجھے خود بھی معلوم ہے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ والسلام۔

مستند تفاسیر اور علوم قرآنی

- تفسیر ابن کثیر محشی کامل (اردو) ۷۵/-
- کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن و تسہیل القرآن ۳۰/-
- (اردو میں نہایت آسان تفسیر (از مولانا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم)
- تفسیر بیان القرآن مکمل عکسی (از حضرت تھانویؒ) ۴۰/-
- تفسیر حقانی مکمل ۴ جلدیں مجلد ۷۰/-
- تفسیر ماجدی جلد اول مجلد .. .. ۱۵/- جلد دوم مجلد ۱۸/-
- قصص القرآن مکمل غیر مجلد ۳۱/- مجلد ۳۹/-
- ارض القرآن مکمل ۲ جلد۔ غیر مجلد ۱۰/۵۰
- لغات القرآن مکمل غیر مجلد ۲۳/۵۰
- قرآن اور تصوف .. .. ۳/- .. تدوین قرآن ۲/-
- اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں (از مولانا دریابادی) ۲/۲۵
- جمالیات قرآنی .. .. ۲/- .. قصص و مسائل ۲/-
- بشریت انبیاء ۲/۲۵

تاریخ اسلام پر بہترین کتابیں

- تاریخ اسلام کامل (از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی .. ۳۳/-
- تاریخ صقلیہ .. .. ۹/- تاریخ اندلس ۸/۵۰
- تاریخ ملت کامل (۱۱ جلدیں) (شائع کردہ ندوۃ المصنفین) ۳۷/-
- تاریخ دولت عثمانیہ اول ۱۰/- دوم ۹/-
- تاریخ فقہ اسلامی ۱۰/-
- اسلام اور عربی تمدن ۸/۵۰
- ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۴/-
- ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک ۱۰/۲۵
- سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (مجلد) ۱۱/-
- تاریخ ردۃ .. .. ۴/- تاریخ گجراتؒ ۹/-
- سرکشی ضلع بجنور (از سرسید احمد خاں) ۶/-
- جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۸/-
- اشاعت اسلام غیر مجلد ۶/-

علم حدیث اور متعلقات علم حدیث

- مظاہر حق (مکمل ۴ جلد) ۶۵/-
- ایضاح البخاری ۱۲ حصے فی حصہ ۲/۲۵
- خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی ۶/-
- ترجمان السنہ (کامل ۴ جلد)
- غیر مجلد .. .. .. ۵۰/- .. .. مجلد .. ۵۶/-
- محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے ۴/-
- فن اسماء رجال ۱/۷۵
- نصرۃ الحدیث
- (از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی) ۲/۵۰
- کتابت حدیث ۱/۲۵

فقہ اور فتاویٰ

- فتاویٰ دار العلوم دیوبند
- ۶ جلدیں ۴۳/-
- فتاویٰ رشیدیہ کامل ۸/-
- فتاویٰ عبد الحئیؒ کامل ۱۶/-
- اختری بہشتی زیور عکسی غیر مجلد ۱۸/-
- امداد الفتاویٰ ۱۳/۵۰
- اشرف الجواب ۶/-
- علم الفقہ مکمل مجلد ۱۶/-
- تبلیغ دین
- (از امام غزالیؒ) اردو ترجمہ ۳/۵۰

ملنے کا پتہ

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

پاکستان کی چند مطبوعات

جن کے اب صرف ایک ایک، دو دو ہی نسخے کتب خانہ میں باقی ہیں

مسند امام اعظم مترجم اردو ۱۳/-
مؤطا امام محمد مترجم اردو ۳۳/-
احسن الکلام فی شرح بلوغ المرام (اردو) ۱۲/-
ابن ماجہ اور علم حدیث ۸/-
آئینۂ حقیقت نما (از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی) ۱۵/-
تاریخ اسلام کامل ۳ جلدیں (از مولانا اکبر شاہ خاں) ۲۵/-
تاریخ تمدن اسلام حصہ دوم ۹/۲۵
تاریخ غرناطہ کامل ۲ جلدیں ۲۴/-
تذکرۃ الشعراء یا گلشن بے خار ۹/-
حیاۃ وحید الزماں .... ۴/- مترجمہ شعب الایمان ۱/۵۰
البرامکہ .... ۱۵/- فلسفۂ عجم ۶/-
فتوح البلدان مکمل ۲ حصے یکجا ۱۸/-
عبقات (عربی) حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ ۷/-
انوار الہدیٰ سیرۃ المصطفیٰ اول مجلد ۸/-
تاریخ طبری سوم ۱۶/- چہارم ۱۵/-
درس قرآن اول ۱۱/- پنجم ۹/- ہفتم ۹/-
تزکیۂ نفس مجلد رنگین ۶/-
تحریک جماعت اسلامی ۵/-
راہی اور رہنما ۶/-
لمحات (عربی)
از شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۲/-

عہد نبوی کے میدان جنگ ۳/۵۰
فقہ الاسلام ۱۵/-
پیغام مسیح .... ۲/۵۰ .... شعر نامہ ۱۵/-
مولانا محمد احسن نانوتوی ۴/-
کامریڈ (انگریزی) .... ۳۰/- المعجم ۱۰/۵۰

حج کے لیے بہترین رہنما کتابیں

آپ حج کیسے کریں .... ۲/- آسان حج پاکٹ سائز -/۷۵
فضائل حج (از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا) ۳/-
رفیق حج (از مولانا احتشام الحسن کاندھلوی) ۱/۷۵
معلم الحجاج (مسائل حج کے بارہ میں جامع ترین کتاب) ۶/۷۵
حج کا مسنون طریقہ ۱/۷۵ .... حج کی باتیں ۲/-
حقیقت حج ۲/۵۰ طریقۂ حج ۲/-
حجۃ الوداع .... -/۷۵
اعیان الحجاج (مشاہیر امت کے حج کا تذکرہ۔ از
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی) ۳/۵۰
سب سے پہلا سفر نامۂ حجاز ۲/-
سفر حج ۱۹۶۸ء (از قاضی عدیل عباسی) ۶/-
حج اور اس کی دعائیں .... -/۲۵
تجلیات کعبہ (از حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی) ۳/-
تجلیات مدینہ (" " " ") ۲/۵۰

ملنے کا پتہ

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.
VOL 39 NO. 7
Regd. No. L-353

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

عتیق الرحمن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

اُردو زبان
عظیم الشان
اسلامی لٹریچر میں
دینی رُوح اور علمی افادات سے بھرپور ایک
یعنی اُردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ احادیثِ نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب
معارف الحدیث
زمانے کی نفسیات کا لحاظ — ہر سطح کے فہم و فکر کی رعایت — اور حدیث کی اصل مقصدیت پر زور
یہ اس کتاب کے ترجمہ و تشریح کی اہم خصوصیات ہیں
اور تشریحات کے علاوہ ہر باب کے شروع کے تمہیدی نوٹ، شریعت کے نظامِ حکمت پر
"ما قل و دل" کی ایک مثال کہے جا سکتے ہیں
تالیف
مولانا محمد منظور نعمانی
سائز ۲۰×۲۶ / ۸
عمدہ سفید کاغذ دیدہ زیب کتابت و طباعت
جلد اوّل — ایمان اور آخرت کے بیان کی حدیثیں — قیمت مجلد ۵/- غیر مجلد ۳/-
جلد دوم — تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق کی حدیثیں — قیمت مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/۵۰
جلد سوم — طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں — قیمت مجلد ۶/- غیر مجلد ۵/-
ہماری دیگر مطبوعات
کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

جلد ۳۹ | بابت ماہ شوال سنہ ۱۳۹۱ھ مطابق دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء | شمارہ (۱۰)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ر دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: ۔ براہ کرم خط و کتابت، و منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: ۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۲۰ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

حجاز مقدس اور ہندوستان میں رمضان مبارک اور عید میں اکثر ایک دن کا اور کبھی کبھی دو دن کا بھی فرق ہو جاتا ہے۔ اس سال بھی وہاں رمضان مبارک ہندوستان و پاکستان سے دو دن پہلے شروع ہوا تھا۔ اور عید الفطر بھی دو دن پہلے ہوئی — اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اس کی بنیاد سے واقف نہیں ہیں۔ وہ طرح طرح کی چہ میگوئیاں اس بارے میں کرتے ہیں — اور بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جن کا شمار علماء میں ہے کہ بلا علم و تحقیق بالکل عامیانہ تبصرے اس پر کرتے ہیں — بعض لوگوں سمجھتے ہیں کہ وہاں رمضان مبارک شروع اور ختم ہونے کا فیصلہ رؤیت ہلال یا اس کی شہادت کے بجائے ماہرین موسمیات و فلکیات کے حساب سے کیا جاتا ہے۔

اس سال بھی ایک صاحبِ علم نے اس بارے میں راقم سطور سے دریافت کیا۔ جب ان کو اس مسئلہ میں وہاں کے علماء کے فقہی مسلک اور طریق کار کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا، تو انھوں نے کہا کہ اس کو اسی تفصیل و وضاحت سے "الفرقان" میں لکھ دیا جائے۔ تو جو ناواقف ہیں وہ واقف ہو جائیں گے۔ اور پھر غلط فہمیوں، بدگمانیوں کی گنجائش نہ رہے گی — اسی مشورہ کی تعمیل میں یہ سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح مشرق و مغرب کے مقامات میں بُعدِ مسافت کے حساب سے آفتاب کے طلوع و غروب میں فرق ہوتا ہے (مثلاً ہمارے یہاں کے اور حجاز مقدس کے طلوع و غروب میں قریباً تین گھنٹے کا فرق ہے)، اسی طرح جن دو ملکوں کے درمیان بعدِ مسافت ہزاروں میل کا ہو ان کے مابین رؤیت ہلال میں بھی مسافت کی کمی و بیشی کے لحاظ سے ایک دن یا اس سے بھی زیادہ کا فرق ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہونا ضروری ہے۔

۲— یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ حجاز مقدس کی حکومت یعنی حکومت سعودیہ عربیہ

کے علماء جو مذہبی امور کے ذمہ دار ہیں، عموماً حنبلی المذہب ہیں۔ اور حنابلہ کا مشہور و معمول مذہب اختلاف مطالع کے بارے میں وہی ہے جس کو فقہ حنفی کی کتابوں میں بھی "ظاہر الروایۃ" اور "اصل مذہب" کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس باب میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں ہے، اس بناء پر اگر دنیا کے مغربی حصہ میں کہیں رؤیت ہو جائے تو سارے مشرقی ممالک میں بھی رویت تسلیم کرلی جائے گی اور اس کے ثابت و معلوم ہو جانے پر ساری دنیا میں اسی پر عمل ہوگا۔

فقہ حنفی کی قریب قریب ہر کتاب میں یہ مسئلہ اسی طرح لکھا ہے۔ علامہ شامی نے در مختار کے حاشیہ میں لکھا ہے "وهو المعتمد عندنا وعند المالكية والحنابلة" یعنی حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا مذہب معتمد یہی ہے۔

۳۔ حکومتِ سعودیہ کا دار السلطنت ریاض ہے۔ جو اس کے مشرقی حصہ میں ہے۔ اور اس کا مغربی کنارہ تقریباً دو ہزار کیلو میٹر کی مسافت پر ہے ــــ مملکت کے ہر شہر بلکہ چھوٹے قصبات میں بھی حکومت کی طرف سے قاضی مقرر ہیں۔ جو عموماً حنبلی علماء ہیں۔ اور ٹیلیفون کا سرکاری نظام پوری مملکت میں پھیلا ہوا ہے۔ اب اگر مملکت کے مغربی علاقے مثلاً تبوک میں چاند دیکھا گیا اور وہاں کے قاضی صاحب کے سامنے شہادت گزری تو وہ اسی وقت ٹیلیفون سے ریاض میں مفتی اکبر کو (جو منجانب حکومت مذہبی امور کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں) اطلاع دیں گے۔ مفتی اکبر اس اطلاع کی بناء پر رؤیت ہلال کا فیصلہ کردیں گے ــــ اور اسی وقت سرکاری اعلان ہو جائے گا، اگرچہ مملکت کے مشرقی اور وسطی منطقہ میں رؤیت نہ ہوئی ہو۔

اس کے علاوہ جو اسلامی ممالک حجاز مقدس سے ہزاروں میل دور مغرب میں ہیں، مثلاً مراکش تیونس اور مصر و ترکی وغیرہ، ان ممالک میں حجاز سے بھی ایک دن پہلے رؤیت ہو سکتی ہے اور جب عدم اعتبارِ اختلافِ مطالع کی بنیاد پر مسلک یہ ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی اگر رؤیت ہو جائے تو ثابت ہو جانے پر سارے مشرق و مغرب میں رؤیت تسلیم کرلی جائے گی۔ اور اس کے مطابق عمل واجب ہوگا۔ (اور سرکاری طور پر ٹیلیفون کی اطلاع ان علماء کے نزدیک اس کے لیے معتبر و کافی ہے) تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان مغربی ممالک اسلامیہ میں سے کسی ملک میں رؤیت ہو جائے تو اس کی اطلاع ملنے پر اور ثابت ہو جانے پر حجاز مقدس میں بھی رؤیت ہلال کا اعلان کر دیا جائے۔

لہ شامی صفحہ ۹۶ ج ۲

ان واقعی حقیقتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو ہر سمجھنے والا آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے۔ رمضان مبارک کے آغاز یا اختتام میں ہندوستان اور حجاز مقدس میں کبھی دو دن کا فرق کیوں ہو جاتا ہے؟

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کر کے کسی ایک جگہ کی رویت کو سارے مشرق و مغرب کے لیے تسلیم کیا جانا جس پر حنابلہ کا عمل ہے اسی کو ہماری فقہ حنفی کی کتابوں میں بھی "اصل مذہب" اور "ظاہر الروایہ" لکھا گیا ہے اور اسی کو مالکیہ کا مذہب بتلایا گیا ہے بلکہ میزان شعرانی میں تو صرف کچھ شوافع کو مستثنیٰ کر کے باقی سب کا متفقہ مسلک یہی بتایا گیا ہے ۔۔۔ امام شعرانیؒ نے لکھا ہے۔

واتفقوا علی أنه إذا رؤی الهلال فی بلدة قاصیة انه یجب الصوم علی سائر اهل الدنیا الا أن اصحاب الشافعی صححوا أنه یلزم حکمه البلد القریب دون البعید ؎	فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب کسی دور دراز شہر میں چاند دیکھ لیا جائے تو ساری دنیا کے مسلمانوں پر روزہ رکھنا واجب ہو جائے گا ہاں امام شافعی کے اصحاب نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ رویت کا حکم قریب کے شہر والوں پر لازم ہوگا۔ دور کے علاقہ والوں پر لازم نہ ہوگا۔

بلکہ بعض فقہاء شوافع نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام نووی شافعیؒ نے شرح مسلم میں اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے۔

قال بعض اصحابنا تعم الرؤیة فی موضع جمیع اهلِ الارض ؎	ہمارے بعض اصحاب (یعنی بعض فقہاء شافعیہ) بھی اس کے قائل ہیں کہ کسی ایک مقام کی رویت ساری دنیا کے لوگوں کے لیے مان لی جائیگی۔

اگرچہ خود اس عاجز کے نزدیک اس مسئلہ میں شیخ فخر الدین زیلعیؒ شارح کنز اور صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانیؒ وغیرہ اُن متاخرین فقہاء حنفیہ کا قول راجح ہے جنھوں نے کہا ہے کہ بلادِ قریبہ میں تو اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن بلادِ بعیدہ میں جن کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہو اور اسی کی وجہ سے مطلع مختلف ہے، اعتبار کیا جائے گا۔ اس کی ترجیح کے ہمارے پاس دلائل ہیں جن پر

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

كتابُ المعاشرة

مَعَارِفُ الحَدِيث

لباس کے احکام و آداب

اس باب کی تعلیمات کی اساس و بنیاد:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور کھانے پینے وغیرہ زندگی کے سارے معمولات کے بارے میں احکام و آداب کی تعلیم دی اور بتلایا کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، یہ صحیح ہے اور یہ غلط، یہ مناسب ہے اور یہ نامناسب، اسی طرح لباس اور کپڑے کے استعمال کے بارے میں بھی آپ نے واضح ہدایات دیں —— اس باب میں آپ کی تعلیمات و ہدایات کی اساس و بنیاد سورۂ اعراف کی یہ آیت ہے۔

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسٗا يُوَٰرِي سَوۡءَٰتِكُمۡ وَرِيشٗاۖ وَلِبَاسُ ٱلتَّقۡوَىٰ ذَٰلِكَ خَيۡرٞۚ (الاعراف ع ۳)

اے فرزندان آدم ہم نے تم کو پہننے کے کپڑے عطا کیے جن سے تمہاری ستر پوشی ہو اور تجمل و آرائش کا سامان، اور تقوے والا لباس تو سراسر خیر اور بھلائی ہے۔

اس آیت میں لباس کے دو خاص فائدے ذکر کیے گئے ہیں۔ ایک ستر پوشی یعنی انسانی جسم کے اُن حصوں کو چھپانا جن پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیئے۔ اور دوسرے زینت و آرائش یعنی یہ کہ دیکھنے میں آدمی بھلا اور آراستہ معلوم ہو جانوروں کی طرح ننگ دھڑنگ نہ پھرے

آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ" یعنی اللہ کے نزدیک اور فی الحقیقت وہ لباس اچھا ہے اور سراسر خیر ہے جو خدا ترسی اور پرہیزگاری کے اُصول سے مطابقت رکھتا ہو، اس میں اللہ کی ہدایت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کی گئی ہو، بلکہ اُس کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق ہو۔ ایسا ہر لباس بلاشبہ سراسر خیر و نعمت اور شکر کے ساتھ اس کا استعمال قرب الٰہی کا وسیلہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سلسلہ کے ارشادات اور ذاتی معمولات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کی آپ کی تعلیم و ہدایت کا بنیادی نقطہ یہی ہے کہ لباس ایسا ہو کہ جس سے ستر پوشی کا مقصد حاصل ہو اور دیکھنے میں آدمی باجمال و باوقار معلوم ہو ____ نہ تو ایسا ناقص ہو کہ ستر پوشی کا مقصد ہی پورا نہ ہو اور نہ ایسا گندہ یا بے تکا ہو کہ بجائے زیب و زینت کے آدمی کی صورت بگاڑ دے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں تنفر و توحش پیدا ہو ____ اسی طرح یہ کہ آرائش و تجمل کے لیے افراط اور بے جا اسراف بھی نہ ہو، علی ہذا شان و شوکت کی نمائش اور برتری کا اظہار و تفاخر بھی مقصود نہ ہو، جو مقام عبدیت کے بالکل ہی خلاف ہے، اسی طرح یہ کہ مرد ریشمی کپڑا استعمال نہ کریں، یہ سونے چاندی کے زیورات کی طرح عورتوں کے لیے مخصوص ہے، اور یہ کہ مرد خاص عورتوں والا لباس پہن کر نسوانی صورت نہ بنائیں اور عورتیں مردوں والے مخصوص کپڑے پہن کر اپنی نسوانی فطرت پر ظلم نہ کریں۔

اس سلسلہ میں آپ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ جن بندوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو انھیں چاہئے کہ اس طرح رہیں اور ایسا لباس پہنیں جس سے محسوس ہو کہ ان پر ان کے رب کا فضل ہے، یہ شکر کا ایک شعبہ ہے، لیکن بیجا تکلف و اسراف سے پرہیز کریں، اسی کے ساتھ اس کا بھی لحاظ رہے کہ غریب و نادار بندوں کی دلشکنی اور اُن کے مقابلہ میں تعوق و بالاتری کی نمائش نہ ہو ____ نیز یہ کہ ہر لباس کو اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ سمجھیں اور اُس کے شکر کے ساتھ استعمال کریں ____ بلاشبہ ان احکام و ہدایات کی تعمیل کے ساتھ ہر لباس کا استعمال ایک طرح کی عبادت اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ ہوگا۔

اس تمہید کے بعد اس سلسلہ کی حدیثیں ذیل میں پڑھیے!

لباس نعمت خداوندی اور اس کا مقصد:-

عَنْ اَبِیْ مَطَرٍ اَنَّ عَلِیًّا اشْتَرٰی ثَوْبًا بِثَلٰثَةِ دَرَاهِمَ فَلَمَّا

لبسه قال الحمد لله الذي رزقني من الرياش ما اتجمل به في الناس واواري به عورتي ـــ ثم قال هكذا سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ـــــــ رواه احمد

ابو مطر تابعی سے روایت ہو کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے تین درہم میں ایک کپڑا خریدا اور جب اُسے پہنا تو کہا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي رَزَقَنِي مِنَ الرِّيَاشِ مَا اَتَجَمَّلُ بِهِ فِي النَّاسِ وَاُوَارِي بِهِ عَوْرَتِي۔

حمد و شکر ہے اُس اللہ کے لیے جس نے مجھے یہ لباس زینت عطا فرمایا جس سے میں لوگوں میں آرائش حاصل کرتا ہوں اور اپنی ستر پوشی کرتا ہوں

پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا آپ (کپڑا پہن کر) اسی طرح انہی الفاظ میں اللہ کی حمد و شکر کرتے تھے۔ (مسند احمد)

تشریح جامع ترمذی میں قریب قریب اسی مضمون کی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، ان دونوں حدیثوں سے اور ان کے علاوہ بھی متعدد احادیث سے معلوم ہوا کہ لباس اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کا اصل مقصد ستر پوشی اور تجمل و آرائش ہے۔

بے پردہ اور بے ڈھنگے لباس کی ممانعت :۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّاكُلَ الرَّجُلُ بِشِمَالِهٖ اَوْ اَنْ يَّمْشِيَ فِي نَعْلٍ وَّاحِدَةٍ وَّاَنْ يَّشْتَمِلَ الصَّمَّاءَ اَوْ يَحْتَبِيَ فِي ثَوْبٍ وَّاحِدٍ كَاشِفًا عَنْ فَرْجِهٖ۔

ـــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اس سے کہ آدمی بائیں ہاتھ سے کھائے، یا صرف ایک پاؤں میں جوتی پہن کر چلے، اور اس سے بھی

منع فرمایا کہ آدمی صرف ایک چادر اپنے اوپر لپیٹ کر ہر طرف سے بند ہو جائے یا ایک کپڑے میں گوٹ مار کر بیٹھے اس طرح کہ اس کا ستر کھلا ہو۔ (صحیح مسلم)

تشریح) عربوں میں کپڑے کے استعمال کے بعض طریقے رائج تھے اور اُن کے لیے ان کی زبان میں مخصوص الفاظ تھے، مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ سارے جسم پر ایک چادر اس طرح لپیٹ لی کہ ہر طرف سے بند ہو گئے اور اس طرح بندھ گئے کہ ہاتھ بھی باہر نہیں نکل سکتا، اس کو "اشتمالِ صمّا" کہا جاتا تھا، اس حدیث میں اس سے ممانعت فرمائی گئی ہے، کیونکہ یہ ایک بے ڈھنگا طریقہ ہے اور آدمی اس میں ہر طرف سے بندھ جاتا ہے۔ اور مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ آدمی سرینیں زمین پر رکھ کے اور گھٹنے کھڑے کر کے بیٹھ جاتا اور بس ایک کپڑا اپنی کمر اور پنڈلیوں پر لپیٹ لیتا، اس میں ستر پوشی بھی نہ ہوتی (کیونکہ حصہ اسفل کھلا رہ جاتا) اس کو "احتباء" کہتے تھے، اس سے بھی اس حدیث میں ممانعت فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح صرف ایک پاؤں میں جوتی پہن کر چلنے سے بھی ممانعت فرمائی گئی ہے، کیونکہ یہ بھی وقار کے خلاف اور بے ڈھنگے پن کی علامت ہے۔ ہاں اگر کسی عذر کی وجہ سے ہو تو ظاہر ہے کہ وہ معذور ہوگا۔

عورتوں کے لیے زیادہ باریک لباس کی ممانعت :-

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ اَسْمَاءَ بِنْتَ اَبِيْ بَكْرٍ دَخَلَتْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهَا ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَقَالَ يَا اَسْمَاءُ اِنَّ الْمَرْاَةَ اِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيْضَ لَنْ يَصْلُحْ اَنْ يُرٰى مِنْهَا اِلَّا هٰذَا وَهٰذَا وَاَشَارَ اِلٰى وَجْهِهٖ وَكَفَّيْهِ — رواہ ابوداود

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (میری بہن) اسماء بنت ابی بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں تو آپ نے اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا کہ اے اسماء، عورت جب بلوغ کو پہونچ جائے تو درست نہیں کہ اُس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے۔ (سنن ابی داود)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو ایسا باریک کپڑا پہننا جائز نہیں جس سے جسم نظر آئے — ہاں چہرہ اور ہاتھوں کا کھلا رہنا جائز ہے، یعنی باقی جسم کی طرح ان کو کپڑے سے چھپانا ضروری نہیں — یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اس حدیث میں عورت کے لیے ستر کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ حجاب (پردہ) کا حکم اس سے الگ ہے، اور وہ یہ ہے کہ بے ضرورت باہر نہ گھومیں، اور اگر ضرورت اور کام سے باہر نکلیں تو پردہ میں نکلیں — ستر اور حجاب شریعت کے یہ دو حکم ہیں اور ان کے حدود الگ الگ ہیں، بعض حضرات کو ان میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ حضرت اسماء کے حضور کے سامنے آنے کے جس واقعہ کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے وہ حجاب (پردہ) کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد حضرت اسماء اس طرح آپ کے سامنے نہیں آسکتی تھیں۔ واللہ اعلم۔

امام مالکؒ نے موطا میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کی ایک بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر ان کے پاس آئیں اور وہ زیادہ باریک اوڑھنی (خمار) اوڑھے ہوئے تھیں، تو حضرت صدیقہ نے اس کو اتار کے پھاڑ دیا اور موٹے کپڑے کی خمار اڑھا دی۔ ظاہر ہے کہ حضرت صدیقہ کا یہ فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔

عورتوں کے لیے باریک کپڑا بھی جائز ہے بشرطیکہ ......:-

عَنْ دِحْيَةَ بْنِ خَلِيفَةَ قَالَ أُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبَاطِيَّ فَأَعْطَانِي مِنْهَا قُبْطِيَّةً فَقَالَ اِصْدَعْهَا صَدْعَيْنِ فَاقْطَعْ أَحَدَهُمَا قَمِيصًا وَأَعْطِ الْآخَرَ امْرَأَتَكَ تَخْتَمِرُ بِهِ فَلَمَّا أَدْبَرَ قَالَ وَأْمُرِ امْرَأَتَكَ أَنْ تَجْعَلَ تَحْتَهُ ثَوْبًا لَا يَصِفُهَا — (رواہ ابوداؤد)

حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قبطی چادریں آئیں تو آپ نے ان میں سے ایک مجھے عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس کے دو ٹکڑے کر لیجو ایک ٹکڑے کا تو اپنا کرتہ بنا لیجو اور دوسرا ٹکڑا اپنی بیوی کو دے دیجو وہ اس کو خمار (اوڑھنی) کے طور پر استعمال کرلے گی۔

پھر جب وحیہ اُٹھ کر جانے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اپنی بیوی سے کہہ دیجیو کہ وہ اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگالے تاکہ دکھائی نہ دیں اس کے بال اور جسم وغیرہ۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح) "قُبَاطی" سفید رنگ کی باریک بڑھیا قسم کی چادریں ہوتی تھیں جو عہد نبوی میں مصر سے آتی تھیں، ایک دفعہ کہیں سے وہ چادریں حضور کے پاس آئیں تو آپ نے اُن میں سے ایک حضرت وحیہ کلبی کو بھی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے تو اپنا پیراہن (کرتا) بنا لیجو اور دوسرا ٹکڑا بیوی کو دے دیجو وہ خمار کے طور پر استعمال کرلے گی، اور چونکہ وہ باریک تھا اس لیے آپ نے ہدایت فرمائی کہ بیوی سے کہہ دیجو کہ اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگالے تاکہ جسم اور بال وغیرہ نظر نہ آئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو باریک کپڑے پہننے کی بھی اجازت ہو بشرطیکہ اسکے نیچے دوسرا کپڑا ہو جس کے بعد جسم اور سر کے بال وغیرہ نظر نہ آئیں۔

لباس میں تفاخر اور نمائش کی ممانعت:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ فِی الدُّنْیَا اَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔

—— رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی دنیا میں نمائش اور شہرت کے کپڑے پہنے گا اُس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلت و رسوائی کے کپڑے پہنائے گا۔ (مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

تشریح) حدیث میں "ثوبِ شہرت" سے مراد وہ لباس ہے جو اپنی شان و شوکت کی نمائش کے لیے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بننے کے لیے پہنا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو لوگوں کی نظروں میں علامہ یا بڑا مقدس بزرگ بننے کے لیے اس طرح کا خاص لباسِ تقدس پہنیں یا اپنی فقیری و درویشی کی نمائش کے لیے ایسے کپڑے پہنیں جن سے لوگ ان کو پہونچا ہوا فقیر و درویش سمجھیں —— یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کا تعلق آدمی کے دل اور اُس کی نیت سے ہے۔ ایک ہی کپڑا اگر نمود و نمائش کے لیے اور اپنی بڑائی کے مظاہرہ کے لیے پہنا جائے تو گناہ اور اس حدیث کا مصداق ہوگا اور وہی کپڑا اگر اس نیت کے بغیر پہنا جائے تو جائز اور بعض صورتوں میں موجب

اجر و ثواب ہوگا ـــــ اور چونکہ ہم بندوں کو کسی کی نیت اور دل کا حال معلوم نہیں اس لیے ہمارے لیے جائز نہ ہوگا کہ کسی کے لباس کو نمود و نمائش اور ریاکاری کا لباس قرار دے کر اس پر اعتراض کریں، ہاں اپنے دل، اپنی نیت اور اپنے لباس کا محاسبہ کرتے رہیں ـــــ یہی اس حدیث کا خاص پیغام ہے۔

متکبرانہ لباس کی ممانعت اور سخت وعید :-

عہدِ نبوی میں عرب متکبرین کا یہ فیشن تھا کہ کپڑوں کے استعمال میں بہت اسراف سے کام لیتے تھے اور اس کو بڑائی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ازار یعنی تہبند اس طرح باندھتے کہ چلنے میں نیچے کا کنارہ زمین پر گھسٹتا، اسی طرح قمیص اور عمامہ اور دوسرے کپڑوں میں بھی اسی قسم کے اسراف کے ذریعے اپنی بڑائی اور چودھراہٹ کی نمائش کرتے، گویا اپنے دل کے استکبار اور احساسِ بالاتری کے اظہار اور تفاخر کا یہ ایک ذریعہ تھا۔ اور اس وجہ سے متکبرین کا یہ خاص فیشن بن گیا تھا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی اور نہایت سنگین وعیدیں اس کے بارے میں سنائیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا یَنْظُرُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَهٗ بَطَراً۔

ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس آدمی کی طرف نگاہ بھی نہ کرے گا جو اپنا ازار فخر و غرور کے طور پر گھسیٹ کر چلے گا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰهُ اِلَیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔

ـــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی اپنا کپڑا استکبار اور فخر کے طور پر زیادہ نیچا کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت

کے دن اُس کی طرف نظر بھی نہ اُٹھائے گا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِزْرَۃُ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَیْہِ لَاجُنَاحَ عَلَیْہِ فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْکَعْبَیْنِ وَمَا اَسْفَلَ مِنْ ذَالِکَ فَفِی النَّارِ قَالَ ذَالِکَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ وَلَایَنْظُرُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَہٗ بَطَرًا ——— رواہ ابوداؤد وابن ماجہ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا فرماتے تھے کہ مومن بندہ کے لیے ازار یعنی تہبند باندھنے کا طریقہ (یعنی بہتر اور اولیٰ صورت) یہ ہے کہ نصف ساق تک (یعنی پنڈلی کے درمیانی حصہ تک ہو) اور نصف ساق اور ٹخنوں کے درمیان تک ہو تو یہ بھی گناہ نہیں ہے یعنی جائز ہے۔ اور جو اس سے نیچے ہو تو وہ جہنم میں ہے (یعنی اس کا نتیجہ جہنم ہے) (راوی کہتے ہیں کہ) یہ بات آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائی (اس کے بعد فرمایا) اللہ اس آدمی کی طرف نگاہ اُٹھا کے بھی نہ دیکھے گا جو ازراہِ فخر و تکبر اپنی ازار گھسیٹ کے چلے گا۔

(سنن ابی داؤد وسنن ابن ماجہ)

(تشریح) ان حدیثوں میں فخر اور غرور والا لباس استعمال کرنے والوں کو یہ سخت وعید سنائی گئی ہو کہ وہ قیامت کے اُس دن میں جبکہ ہر بندہ اپنے رب کریم کی نگاہِ رحم وکرم کا سخت محتاج اور آرزومند ہوگا، وہ اس کی نگاہِ رحمت سے محروم رہیں گے، اللہ تعالیٰ اُس دن ان کو بالکل ہی نظر انداز فرما دے گا ان کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گا ——— کیا ٹھکانا ہے اس محرومی اور بدبختی کا۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا!

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن کے لیے اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ تہبند (اور اسی طرح پاجامہ) نصف ساق تک ہو، اور ٹخنوں کے اوپر تک ہو تو یہ بھی جائز ہے، لیکن اس سے نیچے جائز نہیں، بلکہ سخت گناہ ہے اور اس پر جہنم کی وعید ہے۔ لیکن یہ وعید اسی صورت میں ہے جبکہ اس کا محرک اور باعث اِستکبار اور فخر و غرور کا جذبہ ہو، آگے درج ہونے

والی حدیث میں یہ بات بہت صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ جَرَّ ثَوْبَہٗ خُیَلَاءَ لَمْ یَنْظُرِ اللّٰہُ اِلَیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِزَارِیْ یَسْتَرْخِیْ اِلَّا اَنْ اَتَعَاھَدَہٗ فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّکَ لَسْتَ مِمَّنْ یَّفْعَلُہٗ خُیَلَاءَ۔

(رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی فخر و تکبر کے طور پر اپنا کپڑا زیادہ نیچا کرے گا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کی طرف نظر بھی نہیں کرے گا (حضرت عبد اللہ بن عمر راوی کہتے ہیں کہ حضور کا یہ ارشاد سُن کر) حضرت ابوبکر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا تہبند اگر میں اس کا خیال نہ رکھوں تو نیچے لٹک جاتا ہے، حضور نے فرمایا تم اُن لوگوں میں سے نہیں ہو جو فخر و غرور کے جذبہ سے ایسا کرتے ہیں۔ (صحیح بخاری)

(تشریح) اس حدیث سے صراحت کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ اگر کسی کا تہبند یا پاجامہ بے خیالی کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ہو جائے تو یہ گناہ کی بات نہیں ہے علماء نے لکھا ہے کہ اگر ٹخنوں سے نیچا تہبند یا پاجامہ تفاخر و استکبار کے جذبہ سے ہو تو حرام ہے اور اسی پر جہنم کی وعید ہے، اور اگر صرف عادت اور فیشن کی بنا پر ہے تو مکروہ ہے، اور اگر نادانستہ بے خیالی اور بے توجہی کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہو، تو اس پر کوئی مواخذہ اور عتاب نہیں، معاف ہے۔

مردوں کے لیے ریشم اور سونے کی ممانعت اور عورتوں کو اجازت:۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اُحِلَّ الذَّھَبُ وَالْحَرِیْرُ لِلْاِنَاثِ مِنْ اُمَّتِیْ وَحُرِّمَ عَلٰی ذُکُوْرِھَا۔

(رواہ الترمذی والنسائی)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا کہ سونا اور ریشمی کپڑے کا استعمال میری اُمت کی عورتوں کے لیے حلال اور جائز ہو
اور مردوں کے لیے حرام ہے (جامع ترمذی)

تشریح) دوسری حدیثوں سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ مردوں کے لیے وہ کپڑا حرام و ناجائز ہے جو خالص ریشم سے بنایا گیا ہو یا اس میں ریشم غالب ہو، اگر ایسا نہ ہو تو جائز ہے، اسی طرح ایسا کپڑا بھی مردوں کے لیے جائز ہے جو ریشمی نہ ہو لیکن اس پر نقش و نگار ریشم سے بنائے گئے ہوں، یا دو چار انگل کا ریشمی حاشیہ ہو۔

مردوں کے لیے شوخ سرخ رنگ کی ممانعت:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَرَّ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ ثَوْبَانِ أَحْمَرَانِ فَسَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ۔

رواہ الترمذی وابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے) ایک آدمی گزرا اور وہ دونوں کپڑے سرخ رنگ کے پہنے ہوئے تھا اس نے حضور کو سلام کیا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

تشریح) شارحین نے لکھا ہے کہ ان صاحب کے یہ کپڑے شوخ سرخ رنگ کے تھے جو مردوں کے لیے زیبا نہیں، اور سلام کا جواب نہ دینا اس پر حضور کا عتاب تھا، اسی حدیث کی بنا پر مردوں کے لیے شوخ سرخ رنگ کے لباس کو بعض علماء نے حرام کہا ہے اور بعض نے مکروہ۔ بہرحال حضور کی طرف سے سلام کا جواب نہ دیا جانا آپ کی سخت ناراضی و ناگواری کی کھلی دلیل ہے۔ نعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسولہ۔

مردوں کو زنانہ اور عورتوں کو مردانہ لباس و ہیئت کی ممانعت:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اَلْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ۔

ـــــــــــ رواہ البخاری

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی اُن مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں (یعنی ان کی سی شکل و ہیئت، ان کا سا لباس اور اُن کا انداز اپنائیں) اور اُن عورتوں پر بھی جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں۔ (یعنی اُن کی سی شکل و ہیئت بنائیں، اُن کا سا لباس اور طرز و انداز اختیار کریں۔)

(صحیح بخاری)

تشریح) اس حدیث میں خصوصیت سے لباس کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مطلق تشبہ پر لعنت فرمائی گئی ہے، لیکن تشبہ کی بہت نمایاں صورت یہی ہے کہ مرد زنانہ لباس پہن کر اور عورتیں مردانہ لباس اپنا کر اپنی فطرت کے تقاضوں سے بغاوت کریں۔

مردوں کے لیے سفید رنگ کے کپڑے زیادہ پسندیدہ:۔

عَنْ سَمُرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِلْبَسُوا الثِّيَابَ الْبِيْضَ فَاِنَّهَا اَطْهَرُ وَاَطْيَبُ وَكَفِّنُوْا فِيْهَا مَوْتَاكُمْ۔

ـــــــــــ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سفید کپڑے پہنا کرو وہ زیادہ پاک صاف اور نفیس ہوتے ہیں اور سفید کپڑوں ہی میں اپنے مردوں کو کفنایا کرو۔　(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحْسَنَ مَا زُرْتُمُ اللّٰهَ فِیْ قُبُوْرِكُمْ وَمَسَاجِدِكُمُ الْبَيَاضُ۔

ـــــــــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے اچھا رنگ جس میں تم اپنی قبروں میں اور اپنی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات

کرہ خالص سفید رنگ ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

تشریح) یعنی بہتر یہ ہے کہ مرنے کے بعد قبروں میں اللہ کے حضور میں حاضری ہو تو سفید کفن میں ہو، اور مساجد میں (جو اس دُنیا میں اللہ کے دربار ہیں) حاضری ہو تو سفید کپڑوں میں ہو ـــــ لیکن دوسری بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات مختلف رنگ کے کپڑے بھی پہنتے تھے ـــــ چنانچہ آپ سے سبز یا ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہننا بھی ثابت ہے اسی طرح زرد رنگ کے بھی، نیز سُرخ دھاری دار چادر اوڑھنا اور سرخ رنگ کا عمامہ زیب بسر فرمانا بھی ثابت ہے ـــــ اس لیے مندرجہ بالا دونوں حدیثوں میں سفید رنگ کے کپڑوں کے استعمال کی جو ترغیب دی گئی ہے اُس کا درجہ بس ترغیب ہی کا ہے، اور اس کا تعلق صرف مردوں سے ہے، عورتوں کے لیے رنگین لباس ہی زیادہ پسند فرمایا گیا ہے، ازواجِ مطہرات کے طرزِ عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

اللہ نصیب فرمائے تو پھٹے حال رہنا ٹھیک نہیں :-

عَنْ اَبِي الْاَحْوَصِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيَّ ثَوْبٌ دُوْنٌ فَقَالَ لِي اَلَكَ مَالٌ؟ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ مِنْ اَيِّ الْمَالِ؟ قُلْتُ مِنْ كُلِّ الْمَالِ قَدْ اَعْطَانِيَ اللّٰهُ مِنَ الْاِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْغَنَمِ وَالْخَيْلِ وَالرَّقِيْقِ قَالَ فَاِذَا اٰتَاكَ اللّٰهُ مَالًا فَلْيُرَىٰ اَثَرُ نِعْمَةِ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَكَرَامَتِهٖ ـــــ رواہ احمد والنسائی

ابو الاحوص تابعی اپنے والد (مالک بن نضلہ) سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں بہت معمولی اور گھٹیا قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھا تو آپ نے مجھ سے فرمایا کیا تمہارے پاس کچھ مال و دولت ہے؟ تو میں نے عرض کیا ہاں (اللہ کا فضل ہے) آپ نے پوچھا کہ کس نوع کا مال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے اللہ نے ہر قسم کا مال دے رکھا ہے، اونٹ بھی ہیں، گائے بیل بھی ہیں، بھیڑ بکریاں بھی ہیں، گھوڑے بھی ہیں، غلام باندیاں بھی ہیں، ـــــ آپ نے ارشاد فرمایا جب اللہ نے تم کو مال و دولت سے نوازا ہے تو پھر اللہ کے انعام و احسان

اور اس کے فضل و کرم کا اثر تمہارے اوپر نظر آنا چاہیے۔ (مسند احمد، سنن نسائی)

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّرٰى اَثَرُ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ۔

——— رواہ الترمذی

عمرو بن شعیب اپنے والد شعیب سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات محبوب اور پسند ہے کہ کسی بندہ پر اس کی طرف سے جو انعام ہو تو اس پر اس کا اثر نظر آئے

——— (جامع ترمذی)

تشریح) جس طرح بعض لوگ اپنی بڑائی کے اظہار کے لیے یا فیشن کے طور پر بہت بڑھیا لباس پہنتے اور اس مد میں بیجا اسراف کرتے ہیں اسی طرح بعض کنجوس کنجوسی کی وجہ سے یا صرف طبیعت کے گنوار پن کی وجہ سے صاحب استطاعت ہونے کے باوجود بالکل پھٹے حال رہتے ہیں۔ ان دونوں حدیثوں میں ایسے ہی لوگوں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جب کسی بندہ پر اللہ کا فضل ہو تو اس کو اس طرح رہنا چاہیے کہ دیکھنے والوں کو بھی نظر آئے کہ اس پر اس کے رب کا فضل ہے، یہ شکر کے تقاضوں میں سے ہے۔

خوب کھاؤ، پہنو بشرطیکہ استکبار اور اسراف نہ ہو:۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَتَصَدَّقُوْا وَالْبَسُوْا مَا لَمْ يُخَالِطْ اِسْرَافٌ وَّلَا مَخِيْلَةٌ ——— رواہ احمد والنسائی وابن ماجہ

عمرو بن شعیب اپنے والد شعیب سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اجازت ہے خوب کھاؤ، پیو، دوسروں پر صدقہ کرو، اور کپڑے بنا کر پہنو، بشرطیکہ اسراف اور نیت میں فخر و استکبار نہ ہو۔ (مسند احمد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

تشریح کھانے اور لباس وغیرہ کے بارے میں اس حدیث میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ ایک واضح قانون ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی حلال غذاؤں میں سے اپنے حسب مرضی جو کچھ کھائے اور جو پیے اور جو من بھاتا حلال لباس پہنے جائز ہے بشرطیکہ اسراف کی حد تک نہ پہونچے اور دل میں تفاخر و استکبار نہ ہو۔

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول بھی صحیح بخاری میں نقل کیا ہے کہ

"کل ماشئت والبس ماشئت	جو جی چاہے کھاؤ اور جو جی چاہے پہنو،
ما اخطأتك اثنتان سرف	(جائز ہے) جب تک کہ دو باتیں نہ ہوں ایک
ومخيلة۔	اسراف اور دوسرے استکبار و تفاخر۔

اس باب میں یہی بنیادی اصول اور معیار ہے۔

اُدل جلول، پراگندہ حال اور میلے کچیلے رہنے کی ممانعت :-

عَنْ جَابِرٍ قَالَ اَتَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرًا فَرَاٰى رَجُلًا شَعِثًا قَدْ تَفَرَّقَ شَعْرُهٗ فَقَالَ مَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يُسَكِّنُ بِهٖ رَاْسَهٗ وَرَاٰى رَجُلًا عَلَيْهِ ثِيَابٌ وَسِخَةٌ فَقَالَ مَا كَانَ يَجِدُ هٰذَا مَا يَغْسِلُ بِهٖ ثَوْبَهٗ۔ ——— رواہ احمد والنسائی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کے لیے ہمارے ہاں تشریف لائے تو آپ کی نظر ایک پراگندہ حال آدمی پر پڑی جس کے سر کے بال بالکل منتشر تھے تو آپ نے فرمایا کیا یہ آدمی ایسی کوئی چیز نہیں پاسکتا تھا جس سے اپنے سر کے بال ٹھیک کر لیتا ——— (اور اسی مجلس میں) آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جو بہت میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا، تو ارشاد فرمایا کیا اس کو کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی جس سے یہ اپنے کپڑے دھو کر صاف کر لیتا۔ (مسند احمد، سنن نسائی)

ڈاڑھی اور سر کے بالوں کی خبر گیری اور درستی کی ہدایت :-

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فِی الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ ثَائِرُ الرَّاسِ وَاللِّحْیَةِ فَاَشَارَ اِلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِیَدِهٖ کَاَنَّهٗ یَاْمُرُهٗ بِاِصْلَاحِ شَعْرِهٖ وَلِحْیَتِهٖ فَفَعَلَ ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَیْسَ هٰذَا خَیْرًا مِنْ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدُکُمْ وَهُوَ ثَائِرُ الرَّاسِ کَاَنَّهٗ شَیْطَانٌ ——— رواہ مالک

عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک آدمی مسجد میں آیا، اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل بکھرے ہوئے (اور بے تکے) تھے حضور نے اپنے ہاتھ سے اس کو اشارہ فرمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو ٹھیک کرائے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور پھر لوٹ کر آگیا، تو آپ نے فرمایا کیا یہ (یعنی تمہارا سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو درست کر کے آنا) اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی سر کے بال بکھیرے ہوئے ایسی (وحشیانہ) صورت میں آئے کہ گویا وہ شیطان ہے۔ (موطا امام مالک)

(تشریح) ان حدیثوں سے اُن اہلِ تقشف کے خیال کی واضح تغلیط ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ خدا کے طالبوں اور آخرت کی فکر رکھنے والوں کو اپنی صورت و ہیئت اور لباس کے حسن و قبح سے بے پروا ہو کر میلا کچیلا، پراگندہ حال اور پراگندہ بال رہنا چاہیئے، اور صفائی ستھرائی، صورت و لباس کو سنوارنے کی فکر اور اس میں جمال پسندی اُن کے نزدیک گویا دنیاداری کی بات ہے ——— جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کے مزاج سے ناواقف ہیں، ——— ہاں صورت و لباس وغیرہ کے بناؤ سنوار کا حد سے زیادہ اہتمام اور اس کے لیے فضول و بے جا تکلفات بھی ناپسند اور مزاج شریعت کے خلاف ہیں جیسا کہ آگے آنے والی بعض احادیث سے معلوم ہو جائے گا ———

واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ سے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کا حاصل یہی ہے کہ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اعتدال کی راہ اپنائی جائے۔ اوپر جو حدیثیں مذکور ہوئیں جن میں اچھا اور صاف ستھرا لباس استعمال کرنے اور شکل و صورت

کی اصلاح اور سر اور ڈاڑھی کے بالوں وغیرہ کو درست رکھنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، جیسا کہ ان کے مضامین سے ظاہر ہے۔ ان سب کے مخاطب وہی لوگ تھے جو اس معاملہ میں تفریط میں مبتلا تھے اور جنھوں نے اپنے حلیے بگاڑ رکھے تھے ـــــ آج بھی جن کا یہ حال ہو اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ہدایت حاصل کرنا چاہیئے ـــــ اس کے برعکس جو لوگ اس بارہ میں افراط میں مبتلا ہوں اور لباس اور ظاہری شکل وصورت کے بناؤ سنوار کو حد سے زیادہ اہمیت دیں اور اسی کو برتری اور کمتری کا معیار سمجھنے لگیں اُن کو آگے درج ہونے والی احادیث سے ہدایت اور روشنی حاصل کرنی چاہئے۔ ان حدیثوں کے مخاطب دراصل ایسے ہی لوگ ہیں۔

سادگی اور خستہ حالی بھی ایک ایمانی رنگ ہے :-

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَیَاسِ بْنِ ثَعْلَبَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ اِنَّ الْبَذَاذَۃَ مِنَ الْاِیْمَانِ اِنَّ الْبَذَاذَۃَ مِنَ الْاِیْمَانِ ـــــ رواہ ابوداود

حضرت ابوامامہ ایاس بن ثعلبہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! کیا تم سنتے نہیں، کیا تم سنتے نہیں (یعنی سنو اور غور سے سنو اور یاد رکھو) کہ سادگی اور خستہ حالی بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ ظاہری سادگی وخستہ حالی، اور زینت و آرائش کی طرف سے بے فکری یا کم توجہی اندرونی ایمانی کیفیت سے بھی پیدا ہوتی ہے اور یہ ایمان ہی کا ایک شعبہ اور ایک رنگ ہے۔

لباس میں خاکساری اور تواضع پر انعام و اکرام :-

عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَکَ اللِّبَاسَ تَوَاضُعًا لِلّٰہِ وَھُوَ یَقْدِرُ عَلَیْہِ دَعَاہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عَلٰی رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ حَتّٰی یُخَیِّرَہٗ مِنْ اَیِّ حُلَلِ الْاِیْمَانِ

یلبسھا ــــــــــــــــــــ رواہ الترمذی

معاذ بن انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ بڑھیا لباس کی استطاعت کے باوجود ازراہِ تواضع وخاکساری اس کو استعمال نہ کرے (اور سادہ معمولی لباس ہی پہنے) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوقات کے سامنے بلاکر اختیار دے گا کہ وہ ایمان کے جوڑوں میں سے جو جوڑا بھی پسند کرے اُس کو زیب تن کرے۔

(جامع ترمذی)

تشریح) یہ بشارت اُن بندوں کے لیے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اتنی دولت دی ہے کہ وہ بہت بڑھیا اور بیش قیمت لباس بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن وہ اس مبارک جذبہ کے تحت بڑھیا لباس نہیں پہنتے کہ اس کی وجہ سے دوسرے بندوں پر میرا تفوق اور میری بڑائی ظاہر ہوگی اور شاید کسی غریب ونادار بندہ کا دل ٹوٹے ـــــ بلاشبہ بہت ہی مبارک اور پاکیزہ ہے یہ جذبہ ـــــ اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو بندے اس جذبہ کے تحت ایسا کریں گے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اہلِ محشر کے سامنے انھیں اس انعام واکرام سے نوازے گا کہ اہلِ ایمان جنتیوں کے لیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ جوڑے وہاں موجود ہوں گے فرمایا جائے گا کہ ان میں سے جو جوڑا چاہو لے لو اور استعمال کرو۔

ایک اشکال اور اس کا جواب :-

اگر کسی کے ذہن میں یہ خلجان پیدا ہو کہ ابھی اوپر ابو الاحوص اور عمر بن شعیب کی دو حدیثیں گزر چکی ہیں جن میں مال ودولت اور استطاعت کی صورت میں اچھا لباس پہننے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ـــ اور یہاں اس حدیث میں قدرت واستطاعت کے باوجود اچھا لباس نہ پہننے پر ایسے عظیم انعام واکرام کی بشارت سنائی گئی ہے، اور اس سے اوپر والی ابو امامہ کی حدیث میں بہت ہی اہتمام اور زور کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ "البذاذة من الایمان، البذاذة من الایمان" جس کا حاصل یہی ہے کہ اچھے لباس کا اہتمام نہ کرنا اور معمولی کپڑوں میں خستہ حالوں کی طرح رہنا ایمان کا ایک شعبہ ہے ـــــ دراصل ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ان کا محل الگ الگ ہے۔

—— ابوالاحوص اور عمرو بن شعیب والی حدیثوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مالی وسعت کے باوجود محض کنجوسی سے یا طبیعت کے لاابالی پن کی وجہ سے پھٹے حال رہیں جیسے کہ انھیں کپڑے نصیب ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے فرمایا گیا ہے کہ جب کسی بندہ پر اللہ کا فضل ہو تو اُس کے رہن سہن اور اس کے لباس میں اس کا اثر محسوس ہونا چاہیے —— اور ابوامامہ اور معاذ بن انس کی ان حدیثوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کے مخاطب دراصل وہ لوگ ہیں جو لباس کی بہتری کو زیادہ اہمیت دیتے اور اُس کے بارہ میں بہت زیادہ اہتمام اور تکلف سے کام لیتے ہیں۔ گویا آدمی کی قدر و قیمت کا وہی معیار اور پیمانہ ہے۔

اصلاح و تربیت کا طریقہ یہی ہے کہ جو لوگ افراط اور غلو کے مریض ہوں اُن سے اُن کے حال کے مطابق اور جو تفریط کی بیماری میں مبتلا ہوں اُن سے اُن کے حسب حال اصلاح کی بات کی جائے۔ اگر کوئی آدمی محل اور مخاطبین کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھے گا تو بسا اوقات اس کو مصلحین کی ہدایتوں اور نصیحتوں میں تضاد محسوس ہوگا۔

نگاہ اوّلیں (بقیہ صفحہ ۴)

ہم کو اطمینان ہے۔ لیکن یہ تو ہماری رائے اور تحقیق کی بات ہوئی مگر جو علماء (حنابلہ اور مالکیہ ہوں یا احناف) اپنے علم کی روشنی میں اُسی مسلک کو صحیح اور راجح سمجھتے ہیں جو حنابلہ و مالکیہ کا مشہور و معمول مسلک ہے۔ اور جس کو کتب حنفیہ میں اصل مذہب اور ظاہر الروایۃ کہا گیا ہے، ہماری طرح اُن کو بھی حق ہے کہ وہ اپنی تحقیق و صوابدید پر عمل کریں۔

رابطۂ عالم اسلامی۔ مکہ مکرمہ کی طرف سے رؤیت ہلال ہی سے متعلق بعض دوسرے سوالات کے ساتھ اختلافِ مطالع کے اعتبار و عدمِ اعتبار کے بارے میں بھی ایک سوال مختلف ممالک و مسالک کے علماء کو بھیجا گیا تھا۔ راقم سطور نے بھی اس کا جواب لکھا تھا جس میں اس مسئلہ کے بارے میں مذاہب کی تفصیل لکھ کر اُس مسلک کو ترجیح دی گئی تھی جس کو زیلعی اور کاسانی وغیرہ محققین احناف نے اختیار کیا ہے۔ ان شاء اللہ الفرقان کی آئندہ کسی قریبی اشاعت میں وہ جواب بھی شائع کر دیا جائیگا۔

جدید زمانہ میں امتِ مسلمہ کی ذمہ داری

عید کا ایک پیغام

از مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(یہ مقالہ عید الفطر کے موقع پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔)

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

حضرات! آج عید کا دن ہے۔ زمین والے جس دن کو عید کہتے ہیں، آسمان والے اس کا نام "یوم الجائزہ" رکھتے ہیں۔

عربی زبان میں "جائزہ" کے معنی انعام اور اس عطیہ کے ہیں جو اعزازی طور پر دیا جاتا ہے، نام کی مناسبت سے جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اپنی زبان میں "چند جائزے" پیش کیے جائیں۔

امت مسلمہ جو اپنی تاریخی روایتوں کے ساتھ نہایت باوقار طریقے پر آج عید منا رہی ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے "مریض" کی ہے کہ جس کے آثار صحت نمایاں ہیں لیکن ضعف و انحطاط ابھی کافی موجود ہے۔

جب کوئی مریض رو بصحت ہوتا ہے تو صرف دواؤں سے کام نہیں چلتا بلکہ موسم و حالت کے مطابق غذا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس کو مناسب غذا نہ پہونچائی گئی تو نقاہت کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جائے گا پھر اندیشہ ہے کہ مضر چیزیں استعمال کرنے لگے اور دوا پینے سے بھی انکار کر دے۔

امت مسلمہ روبصحت ہو کر جس زمانہ میں قدم رکھ رہی ہے وہ اس زمانہ سے یقیناً مختلف ہے جس کی باگ ڈور خود اس نے سنبھالی تھی۔

یہ سائنس و ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے جس کے خیالات و احساسات۔ تقاضے و مطالبے زندہ رہنے کے پیمانے، سازوسامان اور قوت و طاقت کے اوزان وغیرہ سب قدیم زمانے سے مختلف ہیں۔

انسان نے اس زمانے میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ مثلاً پہاڑوں کی چھاتیوں کو روندا، سمندر کی سطحوں کو پاٹا۔ ستاروں کی گزرگاہوں تک پہونچا، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا چاند کی دھرتی پر قدم رکھا، اور نہ معلوم کتنے ناممکن کو ممکن اور لاینحل کو حل کر دکھایا۔

انسان کی دیرینہ خواہش یہ رہی ہو کہ وہ قید و بند سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کے مسائل حل کرے لیکن خاندان، رسم و رواج اور مذہب کی مختلف بندشوں کی وجہ سے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

اس زمانہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انسان کی یہ دیرینہ خواہش پوری کی، اب وہ آزاد ہے ہر طرح آزاد ـ ا

لیکن حیرت کی بات ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل اس آزادی اور دیرینہ خواہش پوری ہونے کے بعد بھی نہ حل ہو سکے بلکہ مبصرین کا خیال ہے کہ اور زیادہ اُلجھ گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس آئینہ کے ذریعہ اس نے کائنات کا مشاہدہ کیا ہے اسمیں انسان کا صحیح عکس نہ نظر آیا ورنہ اس کے مسائل بھی بڑی حد تک حل ہو گئے ہوتے۔

اپنے مسائل کے بارے میں انسان کی بے بسی کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں ہے کہ جس کو نظر انداز کردیا جائے بلکہ نفسیات، اجتماعیات اور عمرانیات وغیرہ کے نہ معلوم کتنے گوشے ایسے ... ہیں جن تک اس کی رسائی نہیں ہو سکی اور حد تو یہ ہے کہ جس انسان نے اسٹیم کی طاقت سے ساری دنیا میں رسل و رسائل کا جال بچھا دیا وہ اپنے اندر کی اسٹیم (جذبات) پر قابو پانے کی تدبیر نہ کر سکا۔

جس انسان نے مشینی طاقت کے ذریعہ انسانی صلاحیتوں کو غلام بنالیا وہ جذبات کو عقل کا غلام بنانے کے لیے کوئی مشین نہ ایجاد کر سکا۔

جس انسان نے مثبت Positive ومنفی Negative تار کی دریافت سے ساری دنیا کو بقعۂ نور بنا دیا وہ اپنے اندر کے مثبت و منفی تار کو سمجھ کر اس میں روشنی نہ پیدا کر سکا۔

جس انسان نے اٹیمک Atomic اور نیوکلیر Nuclear طاقت کے ذریعہ چشم زدن میں ساری دنیا کی تباہی و بربادی کا سامان کر لیا وہ اپنے نیوکلیس Nucleus (روح) کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کے ذریعہ یہ بربادی کا سامان آبادکاری میں استعمال ہو سکتا۔

اپنے بارے میں انسان کی اس بے بسی سے ظاہر ہے کہ کائنات کی عکاسی کے لیے اس نے جو آئینہ تیار کیا ہے اس سے اس کا کام نہ چل سکے گا بلکہ اس کے لیے ایک اور آئینہ درکار ہے جس میں کائنات کا عکس نظر آئے نہ آئے لیکن انسان کا صحیح عکس اس میں ضرور ہو۔

اس آئینہ میں جب تک اس کو دیکھا نہ جائے گا اس کی اصلیت کا پتہ نہ چل سکے جس کے بغیر زندگی کے مسائل حل ہونے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا'

مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ "آئینہ" سب کو ملا تھا لیکن اس حقیقت سے غالباً کسی کو انکار نہیں کہ سب نے یا اس کو کھو دیا یا اس حد تک دھندلا کر دیا کہ اب صحیح عکس اس میں نہیں نظر آتا۔

امت مسلمہ جو اس وقت ہماری مخاطب ہے اس لحاظ سے بڑی خوش قسمت ہے کہ اس کے پاس اصلی شکل میں یہ "آئینہ" موجود ہے جس کے صلہ ہی میں جشن عید منایا جاتا ہے۔ اس آئینہ میں انسان کا جو عکس ہے اس میں اس کی اصلیت "نورانی" ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔[1]	اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ[2]	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔

فطرت سے مراد انسان کا وہ نیچرل کانسٹی ٹیوشن Natural Constitution ہے جس پر پیدائش کے ابتدائی مرحلہ میں وہ روحانی لحاظ سے بنایا جاتا ہے۔

یہ فطرت یا انسان کا روحانی نیچرل کانسٹی ٹیوشن مادہ کے عمل و ردعمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ ماورائے مادہ ہے۔

[1] سورہ روم رکوع ۴ [2] بخاری و مسلم، مشکوٰۃ کتاب القدر

قرآن حکیم میں ہے:

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ[1]	پھر جب میں انسان کو درست کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم (فرشتے) اس کے تئیں سجدہ میں گر پڑو۔

دوسری جگہ ہے:

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ[2]	پھر اللہ نے انسان کو درست کیا اور اسمیں اپنی روح پھونک دی اور تمہارے لیے کان، آنکھ اور دل بنایا۔

ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لا اجعل من خلقته بیدی ونفخت فیه من روحی کمن قلت له کن فکان۔[3]	جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اسکو ان مخلوقات کے برابر نہ کروں گا جن کے لیے میں نے لفظ "کن" کہا اور وہ وجود میں آگئیں۔

روح سے مراد ظاہر ہے کہ یہاں روح ہوائی نہیں ہے جس سے اطباء بحث کرتے ہیں، بلکہ روح قدسی ہے جس کے بارے میں شاہ ولی اللہ کہتے ہیں۔

هی کوة من عالم القدس[4]	وہ عالم قدس کی جانب ایک طاقچہ (کھڑکی) ہے۔

یہ روح تمام تر ماورائی (غیر مادی) ہے جس کا خزانہ کہیں ماوراء میں ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ	روحوں کی ایک مرتب فوج ہے انمیں جو باہمی مناسبت رکھتی ہیں وہ مل جاتی ہیں اور جن میں یہ مناسبت

[1] سورہ حجر رکوع ۱ [2] سورہ سجدہ رکوع ۱ [3] مشکوۃ باب بدء الخلق [4] حجۃ اللہ البالغۃ باب حقیقۃ الروح۔

مِنْهَا اخْتَلَفَ [1] — نہیں ہوتی، وہ الگ ہو جاتی ہیں۔

جس طرح بجلی کا اصل سرچشمہ "پاور ہاؤس" ہے اور اس سرچشمہ سے نکل کر سپلائی اسٹیشن، Transfarmer میں بجلی جمع ہوتی ہے اور پھر وہاں سے "تار" کے ذریعہ سپلائی ہوتی ہے۔ اسی طرح ماورائی حقیقت (روح قدسی) کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے (من روحہ کی نسبت میں اسی طرف اشارہ ہے) لیکن بے شمار روحیں اپنے سرچشمہ سے نکل کر درمیانی مخزن (سپلائی اسٹیشن) میں جمع ہوتی ہیں (الارواح جنود مجندۃ ..... میں اسی طرف اشارہ ہے) اور پھر "تار" (کنکشن) کے ذریعہ ہر انسان کو سپلائی ہوتی ہے۔

روح انسانی میں در اصل ہوائی و قدسی دونوں کی آمیزش ہے جس کی تائید روح سے متعلق سوال وجواب کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا [2]	لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ "روح" میرے رب کے امر سے ہے اور تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یعنی روح انسانی میں کچھ ماورائی حقیقت (روح قدس، جس کو امر رب سے تعبیر کیا گیا ہے) کی آمیزش ہے جس کے ادراک کے لیے ہمارا سرمایۂ علم ناکافی ہے۔

عربی قاعدہ کے مطابق اس صورت میں "من" تبعیضیہ (بعض کے معنی میں) ماننا پڑے گا لیکن اس سے معنی ومفہوم میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی جیسا کہ روح المعانی میں ہے۔

من امر ربي كلمة من تبعيضية وقيل بيانية [3]	"من امر ربی" میں کلمۂ من تبعیضیہ (بعض کے معنی میں) ہے اور بعضوں نے بیانیہ کہا ہے۔

ماورائی حقیقت کی آمیزش کے بعد روح انسانی کو یہ خصوصیات حاصل ہوتی ہیں۔

(۱) روح کی حیثیت ایک مدبّر و فرمانروا کی ہو جاتی ہے جبکہ عقل وقلب کی حیثیت وزیر کی ہوتی ہے۔

(۲) مادیت میں روح کے تصرفات ظاہری اسباب کے محتاج نہیں رہتے ہیں۔

(۳) بعض روحوں کی طاقت سے ایسے حیرت انگیز کارنامے انجام پاتے ہیں کہ مادی دنیا

---

[1] مسلم کتاب البر والصلۃ [2] سورہ بنی اسرائیل رکوع ۱۰ [3] روح المعانی ج ۱۵ بنی اسرائیل۔

اس کے سمجھنے سے عاجز رہتی ہے۔

(۴) ماورائے مادہ پرواز کے لیے کھڑکی کا کام دیتی ہے۔

(۵) ماورائے الوریٰ سے ربط و تعلق پیدا ہوتا ہے اور جس قدر اس ربط و تعلق میں اضافہ ہوتا ہے اسی نسبت سے روح کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی روحیں سب سے زیادہ قوی ہوتی ہیں پھر ان کی جن کو روحانی لحاظ سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔

تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ جب تک انسان کی "اصلیت" سامنے نہ ہوگی اس وقت تک سوچنے سمجھنے کے دائرے اخلاق و کردار کا معیار کرنے نہ کرنے کی باتوں، کھانے نہ کھانے کی چیزوں کا تعین نہ ہو سکے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کے تعین کے بغیر انسانی زندگی کے مسائل کیونکر حل ہو سکتے ہیں؟

سائنس و ٹیکنالوجی کے زمانہ میں انسان کی اس بے بسی کو دیکھتے ہوئے امت مسلمہ کی دہری ذمہ داری ہے۔

(۱) خود اپنی رہنمائی اور

(۲) جدید زمانہ کی رہنمائی

اپنی رہنمائی کے لیے دو باتوں کی شدید ضرورت ہے۔

(۱) نبض شناسی اور

(۲) زمانہ شناسی

نبض شناسی یہ ہے کہ بحیثیت امت مسلمہ کی نفسیاتی حالت اور مزاجی کیفیت سے واقفیت ہو نیز یہ معلوم ہو کہ اس وقت کن جذبات کو ابھارنے، کن کو دبانے اور کن سے نظر بچا کر نکل جانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس موقع کی رہنمائی کے لیے ماہر طبیب کی ضرورت ہے جو قومی و جماعتی زندگی کا رمز شناس ہو۔ صرف عطار سے کام نہ چلے گا جس کو دواؤں کے طریق استعمال اور محل استعمال سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

اگر ماہر طبیب نہ میسر آ سکے یا ان کو کام کا موقع نہ مل سکا تو عطاروں کی رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کو جب قیام کی ضرورت ہوگی تو وہ سجدہ میں جا گرے گی۔ سجدہ میں گرنا تو کوئی کمتر

درجہ کی بات نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ درجہ کی بات ہے لیکن اگر قیام و رکوع سے پہلے کوئی نمازی سجدہ میں چلا جائے تو کوئی مفتی نماز کے جواز کا فتویٰ نہ دے سکے گا۔

ہر شئی کی اہمیت اس کے محل میں ہوتی ہے۔ اگر محل بدلے گا تو نہ صرف یہ کہ اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے بلکہ غیر محل میں ہونے کی وجہ سے اس کی صحت کی ضمانت نہیں رہتی۔

اس امت کی جان میں جان روحانیت کے بغیر نہیں آسکتی اس لیے اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے نام پر کام سے جی چرانے اور جد و جہد سے گریز کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ نیز ہر اس طریقہ سے روکا جائے گا جس سے "اقدام" کے بجائے زندگی جمود و تعطل کا شکار ہو۔

زمانہ شناسی یہ ہے کہ زمانہ کی کرتوں اور اس کے بے رحم ہاتھوں سے واقفیت ہو اور یہ معلوم ہو کہ فطرت خود ہر گوشہ میں کاٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شئی کو فٹ کرتی رہتی ہے۔ جب ایک شے کسی جگہ فٹ کر دی گئی تو کمتر شے کے لیے وہ جگہ نہ چھوڑے گی۔

اس اصول کے مطابق اب نہ قرون وسطیٰ کا دور واپس آئے گا اور نہ تعلیمی و تنظیمی ترقیات میں زمانہ ہماری خاطر پیچھے کی طرف لوٹے گا اگر زندہ رہنا ہے تو اس زمانہ کی ترقیاتی چیزوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے البتہ ان کی وجہ سے جو اخلاقی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان سے بچنا لازمی ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ جب جدید ترقیاتی چیزوں کو قبول کیا جائے گا تو اس کے ساتھ اخلاقی تبدیلیوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے۔ آخر وہ کون سی اخلاقی برائی ہے جو قدیم ترقیاتی چیزوں کے ساتھ وابستہ نہ ہو گئی تھی یا اب وابستہ نہیں ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے الٰہی تعلیمات کے ذریعہ ان کو پاک و صاف کیا تھا وہ طریقہ جدید ترقیاتی چیزوں کو پاک صاف کرنے کیلئے بھی دلیل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پاس سے "نظام" نہیں لائے تھے (وہ انسانوں کے ہاتھوں وجود میں آتا ہے) بلکہ تعلیمات لائے تھے جن کو موجودہ نظام میں فٹ کر کے اس کو اسلامی نظام میں تبدیل کیا تھا اسی طرح جدید دنیا کے جس ترقی یافتہ نظام میں خلق خدا کا زیادہ فائدہ نظر آئے اس میں ان تعلیمات کو فٹ کر کے اس کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگوں کی کج فہمی ہے کہ

انھوں نے اسلام کو سرمایہ داری و جاگیر داری سے متعلق کر رکھا ہے. حالانکہ واقعہ میں اسلام اس سے بری ہے۔

اس زمانہ میں فیصلہ کن حیثیت تعلیم اور معاش کو حاصل ہے. اگر ان کی طرف سے ادنیٰ غفلت بھی کی گئی تو پھر زندہ رہنے کے لیے اجازت نامہ نہ مل سکے گا۔

(۲) جدید زمانہ کی رہنمائی کے لیے بھی دو چیزوں کی شدید ضرورت ہے۔

(۱) اس کی کمزوری سے واقفیت ہو۔

(۲) اپنی بات پیش کرنے کی صلاحیت ہو۔

کمزوری سے واقفیت کا مسئلہ نہایت نازک ہو کیونکہ یہ ہر شخص کو دکھائی نہیں دیتی. جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں وہ اس قدر "چکا چوند" کر دینے والی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کمزوری پر نظر ڈالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ایسی حالت میں جب تک اخلاق و کردار کا معیار، جائز و ناجائز کا پیمانہ اور حلال و حرام کی کسوٹی سامنے نہ ہو اور اس پر یقین و اذعان کی کیفیت نہ پیدا ہو اس وقت تک کمزوری نظر نہ آئیگی اس بنا پر سب سے پہلے مرحلہ میں "معیار و کسوٹی" پر یقین و اذعان کی کیفیت پیدا ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا بلکہ ذہنِ خام اور شعورِ ناپختہ کے ساتھ اس راہ میں قدم رکھا گیا تو قوی اندیشہ ہے کہ "نایافت" کے طعنہ سے بچنے کے لیے خود کو کھوئے جیسا کہ عام طور پر ہو رہا ہے. پھر ہر زمانہ کی طرح جدید زمانہ کی بھی خاص زبان، خاص اسلوب اور خاص طرز ادا ہے، اس کی رہنمائی کے لیے ان سب سے واقفیت ضروری ہے اگر ان کے بغیر کوئی رہنمائی کا مدعی ہے تو اس کو عام آبادی کے بجائے کسی "جزیرہ" میں اپنا مقام تلاش کرنا چاہیے۔

امت مسلمہ کی صلاحیت میں کمی کے باوجود صورت حال کچھ اس قسم کی ہے کہ اس کو رہنمائی کا فرض انجام دیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

چنانچہ جدید دنیا اس وقت اپنے موجودہ موقف سے اس قدر مضطرب و پریشان ہے کہ "ان کہی" کہنے پر مجبور ہے. لکھنؤ کے قرب و جوار میں "ان کہی" کا موقع استعمال یہ ہے کہ جب کوئی غیر مسلم جان کنی کے عالم میں موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے اور اس کی مصیبت

عزیز رشتہ داروں سے دیکھی نہیں جاتی تو وہ مرنے والوں سے کہتے ہیں کہ "ان کہی" کہہ دو یعنی مسلمانوں کا کلمہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ) پڑھ لو تاکہ جان جلد نکل جائے۔

جدید دنیا کی "ان کہی" انسان کے بارے میں اپنی جہالت و بے بسی کا اعتراف ہے چنانچہ DAVID C. MARSH نے کہا ہے

طبیعیات کے متعلق ہمارا علم بہت وسیع ہے اور ہم نے پہلے کے مقابلہ میں فطری طاقتوں کے ایک بڑے حصہ کو اپنے قابو میں کر لیا ہے لیکن اب بھی ہم انسانی معاملات کے بے شمار پہلوؤں سے افسوسناک حد تک لاعلم ہیں [۱]

جدید دنیا اس اضطراب و پریشانی کے عالم میں "سراب" کو پانی سمجھ کر نہ معلوم کس کس "ازم" کے پیچھے دوڑ رہی ہے اور ناکام ہو کر خودکشی کی سوچ رہی ہے اور اب تو سیرابی حاصل کرنے کے لیے مذہب کا چرچا بھی عام ہو رہا ہے اور بات یہاں تک بڑھ چکی ہے کہ مذہب کے اعتراف میں پرانا کافر بھی مسلمان ہو گیا ہے چنانچہ BURTRAND RUSSEL نے ازدواجی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مجھے اس میں شبہ ہے کہ اس کا قطعی علاج مذہب کے علاوہ بھی کوئی ہو جس کے بارے میں خلوص و پختگی کے ساتھ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ وہ ایک کیڑے کی زندگی پر بھی حاوی ہے [۲]

حالانکہ دنیا کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی سیرابی صرف اس "نشاط انگیز پانی" سے ہو سکتی ہے جو امت مسلمہ کے امانت خانہ میں محفوظ ہے۔

عید کا پیغام امت مسلمہ کے نام یہی ہے کہ اس پانی کے ذریعہ خود اپنی اور جدید دنیا کی روح کو پُر نشاط بنائے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

---

[۱] THE CHANGING SOCIAL STRUCTURE OF ENGLAND'S. WALES P 263

[۲] PRINCIPLES OF SOCIAL RECONSTRUCTION P 191

تازہ فرنگی تحقیق

مسیحؑ و مسیحیت سے متعلق

(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

"یسوع کی پیدائش فلسطین میں چلی ہوئی تقویم کے حساب سے ۸ سنہ و ۴ سنہ ق م کے درمیان کسی سال ہوئی اور ان کی مصلوبیت ۲۹ سنہ، ۳۰ء یا ۳۳ سنہ عیسوی میں ہوئی۔

ان کی زندگی کے ٹھیک معاصر تو ہمارے پاس کوئی بھی ماخذ نہیں البتہ سینٹ پال کا خط کورنتھیوں کے نام تقریباً ۵۵ سنہ ع کا لکھا ہے۔

اور اعمال کی تحریر کا زمانہ ۶۰ سنہ ع و ۶۲ سنہ ع کے درمیان ہے اور انجیل حسب روایت مرقس کا زمانہ تقریباً ۶۵ سنہ ع کا ہے۔

اور انجیل حسب روایت متی } کے زمانے تقریباً ۸۰ سنہ اور ۸۵ سنہ عیسوی کے درمیان کے ہیں۔
" حسب روایت لوقا } ہیں۔ اور انجیل یوحنا کا زمانہ تقریباً ۱۰۰ سنہ عیسوی کا ہے۔

ان کے متن پر نظر ثانی اسکندریہ میں دوسری صدی کے اخیر یا تیسری صدی کے شروع میں ہوئی تھی، نظر ثانی سے قبل کا کوئی معتبر مسیحی متن ہمارے علم میں نہیں۔

۶۰ سنہ ع سے قبل ایک مجموعہ اقوال مسیح کا آرامی زبان میں یعنی وہ زبان جو وہ بولتے تھے موجود تھا۔ اب وہ مفقود ہو گیا۔

اس کے علاوہ اور بہت سے متن موجود تھے جو مستند نہیں مانے گئے، انھیں میں قابلِ ذکر

ایک نام نہاد انجیل حسب روایت طامس ہے۔ اس کے اجزاء ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء میں مصر میں دریافت ہوئے۔ اس میں ۱۱۴ اقوال یسوع کی جانب منسوب درج ہیں اور اس کا زمانہ تالیف دوسری صدی کے شروع کا ہے۔

چونکہ کوئی متعین معاصر بیانات موجود نہیں اس لیے اس کا حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یسوع کی تعلیمات آپ کے زمانہ میں کیا کیا تھیں، تاہم آپ کے پیام کی عام نوعیت تو صاف ہے گو ان کی مخاطبت غریبوں اور ان پڑھوں سے مصیبت زدوں اور کمزوروں سے تھی۔ وہ نہ انقلابی تھی نہ احیائی اور نہ راہبانہ، انھوں نے اس دنیا کی لطیف چیزوں سے لطف اٹھانے کی تعلیم دی ایسا لطف جو نمائش سے فحاشی سے ابتذال سے خالی ہو۔ وہ نرم مزاج تھے لیکن با اصول تھے محض اچھی نیت کافی نہیں۔ جو شخص سنتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا اس کی مثال اس شخص کی ہے جو زمین پر مکان بغیر بنیاد کے بناتا ہے۔ سب سے بڑھ کر مسیح کی تعلیم نرمی اور محبت کی تھی اور انکسار، دیانتداری، رواداری اور فیاضی کی اور اس کی کہ پھاٹک وسیع ہو اور راستہ چوڑا ہے۔ اور یہ کہ انسان کو اپنا دوسرا رخسار بھی سامنے کر دینا چاہیے۔ لیکن انھوں نے ایک دوسرے موقع پر یہ بھی کہا کہ وہ امن لے کر نہیں بلکہ تلوار لے کر آئے ہیں۔"

یہ مضمون طبع زاد نہ مدیر صدق کا ہے نہ کسی اور مسلمان کے قلم سے ہے۔ بلکہ امریکا کے تین تین فاضل استادوں کرین برنٹن (Crane Brinton) اور ہارورڈ یونیورسٹی کے جان بی کرسٹوفر (John Bee Christopher) اور رابرٹ بی وولف (Robert Bee Woolf) ہارورڈ یونیورسٹی کی کتاب (Civilization in the West) (تمدن مغرب میں) کے صفحہ ۶۷، ۶۸ سے ماخوذ و منقول ہیں۔

(صدق جدید)

ملا عبدالقادر بدایونی

(از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن (دارالمصنفین اعظم گڑھ))

ملا عبدالقادر کی ولادت ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ٹونڈہ، بسادر ضلع بدایوں میں ہوئی، ان کے والد کا نام ملوک شاہ تھا، خود ملا صاحب ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ "بحر علم" "معدن احسان" اور "کان فضل" تھے (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۵۳) ملا صاحب کا بیان ہے کہ جب کہ ان کی عمر بارہ[۱۲] سال کی تھی تو وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل گئے، اور میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو بہت بڑے عالم اور صوری اور معنوی کمالات کے حامل تھے، شیخ عزیز اللہ طلبنی سے بیعت تھے، ان کی خانقاہ میں رہ کر ملا صاحب نے قصیدہ بردہ کا درس لیا، ان سے تبرکاً حنفی فقہ کی کتاب کنز کے چند سبق بھی پڑھے، جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میاں حاتم سنبھلی نے ان کو اپنے مریدوں میں داخل کر لیا، اور شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ بھی عطا کیا، تاکہ ان کو علوم ظاہری کا بھی فائدہ ہو (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳) ملا صاحب نے سنبھل ہی میں قرآن پاک کی قرأت میر سید محمد مکی سے سیکھی، جو سات قرأتوں کے قاری تھے (ج ۲ ص ۲۱) انھوں نے عربی علوم کی تحصیل اپنے نانا مخدوم اشرف سے بھی کی، (ج ۲ ص ۶۴) کافیہ، بیانہ کے ایک عالم شیخ سعد اللہ نحوی سے پڑھی، شرح شمسیہ مرزا سمرقندی سے اور وقایہ ابوالمعالی سے پڑھی، چند روز شیخ ابوالفتح تھانیسری کے حلقۂ درس میں بھی رہے، شیخ عبداللہ بدایونی، سے کلام، تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھیں (ج ۲ ص ۱۲۵، ۱۴۹، ۱۵۱)، اپنی فطری ذہانت

اور صلاحیت سے فارسی، عربی، سنسکرت، تفسیر، تاریخ، شعر و ادب، حساب، موسیقی اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت پیدا کی، اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر اہل علم ہوئے، جس کے معترف اس زمانہ کے ارباب کمال بھی ہیں، فیضی ان کے فضل و کمال کا بڑا قدردان تھا، اپنے خط میں لکھتا ہے۔

"با فضیلت علمی طبع نظم و سلیقۂ انشائی عربی و فارسی و چیزے از نجوم ہندی و حساب یاد داشت در ہمہ وادی و وقوف در نغمہ ولایت و ہندی و چیزے از شطرنج صغیر و کبیر دارد۔

(ج ۳ ص ۳۰۴)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی ان کو بہت عزیز رکھتے، وہ جب اُن سے ملتے تو ان کے شوق و اشتیاق کی پیاس نہ بجھتی بلکہ اور بڑھ جاتی، ان کی ملاقات میں روحانی اور ربانی لذت محسوس کرتے، اپنے ایک مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں کہ خدا کے لیے مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ بند نہ کیجیے، اور اگر یہ راستہ ان کی طرف بند ہوگا، تو پھر ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا۔

از برائے خدا بر من قافلۂ اسرار خود راہ نہ بندند، و اگر از اں طرف بند ند، ازیں طرف بستہ نخواہد شد (ج ۳ ص ۱۱۷)

ملا صاحب کے ایک اور معاصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری تھے، اکبر ان کے علمی فضائل اور روحانی کمالات کا بڑا قدردان تھا، وہ ملا صاحب کو دوانی سے افضل تر سمجھتے تھے، لکھتے ہیں ؎

از دوانی بداؤنی بے شک: در فنون فضیلت است فزدں (ج ۳ ص ۱۴۴)

بختاور خاں عالمگیری مراۃ العالم میں لکھتا ہے :-

"ملا عبد القادر بدایونی جامع معقول و منقول و با فضیلت علمی طبع نظم و سلیقۂ انشائے عربی و فارسی و نجوم و حساب و وقوف در نغمۂ ولایتی و ہندی بمرتبۂ کمال داشت و قادری تخلص بود"

جس علمی و ادبی مجلس میں پہونچ جاتے، اپنی لیاقت اور فضیلت کا سکہ جما دیتے، ان کے زمانے میں شیخ احمدی فیاض انبیٹھی وال بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، اکثر درسی کتابیں پڑھایا کرتے، ایک بار ملا صاحب ان سے ملنے گئے تو وہ شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے، ان کا ایک شاگرد ذیل کا ایک ہزلیہ قطعہ پڑھ رہا تھا:

ابو بکر الولد المنتجب ارادا لخروج لامر عجب

فقد قال انی عزمت الخروج لکفارۃ ہی لی ام اب
فقلت الم تسمعن یا بنی بنہی اتی عن تلقی الجلب

اس قطعہ میں یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ لفظ کفتارہ ہے یا کفارہ جو کافر کی تانیث میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ شیخ احمدی فیاض نے فرمایا، معنی کے لحاظ سے کفارہ ہوگا، کفتارہ کا لفظ تو فارسی ہے، ملا صاحب بیچ میں بول اٹھے کفتارہ کو کفارہ سے کہیں زیادہ ترجیح ہے (ج ۲ ص ۴۸)

اکبری دربار میں شمس الدین حکیم الملک حکمت وطب میں جالینوس زماں اور مسیح دوراں سمجھے جاتے تھے، اور طب کے علاوہ علوم نقلی کے بھی عالم تھے، اپنے مذہبی عقیدہ میں بڑے راسخ رہے، ہمیشہ طالبعلموں کو سبق پڑھاتے رہتے، ان کے اخراجات خود برداشت کرتے، ایک دن وہ شیخ سلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے علمی گفتگو کر رہے تھے، اثنائے گفتگو میں بوعلی سینا کی خوبیاں بیان کرنے لگے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علماء اور حکماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی خاطر مجادلہ و مناقشہ کیا کرتے تھے، ملا صاحب بھی یہاں پہنچ گئے، وہ کسی کو پہچانتے نہ تھے، بحث کے موضوع سے واقف ہوئے بغیر اس وقت انھوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ اشعار پڑھ دیے:۔

وکم قلت للقوم انتم علی شفا حفرۃ من کتاب الشفا
فلما استہانوا بتوبیخنا فرغنا الی اللہ جسبی کفا
فماتوا علی دین ارسطا طلیس وعشنا علی ملۃ المصطفیٰ

(ہم نے کتنا کہا کہ تم لوگ کتاب الشفاء کی وجہ سے ہلاکت کے گڑھے کے کنارے ہو، لیکن جب وہ لوگ ہماری سرزنش کو حقیر سمجھے تو ہم نے یہ کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، یہ لوگ تو ارسطو کے دین کی طرف مائل ہو گئے، اور ہم لوگوں نے ملت مصطفوی کی زندگی بسر کی)

مزید تائید کے لیے مولانا جامی کا یہ شعر پڑھ کر سنایا:۔

نور دل از سینہ سینا مجوی روشنی از چشم نہ بینا مجوی

یہ تمام اشعار سن کر حکیم الملک گیلانی بہت برہم ہوئے، شیخ سلیم نے ملا صاحب سے فرمایا۔ "ان لوگوں میں پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، تم نے آکر اور بھی بھڑکا دیا" (ج ۳ ص ۱۶۲-۱۶۱)

تعلیم کی فراغت کے بعد ملا صاحب نے کچھ دنوں اکبر کے ایک امیر محمد حسین خاں کے

یہاں ملازمت کی، جس کو کانت دگولہ (ضلع سہارنپور) کی جاگیر دی گئی تھی، یہاں اُن کے سپرد صدارت اور فقرا کی خدمت کی گئی، ایک زمانہ قنوج کے مضافات میں مکن پور حضرت شاہ مدار کی زیارت کے لیے گئے وہ وہاں کسی معشوق کے دام میں پھنس گئے اور بقول ان کے اس شہوت واز کو عشق سمجھ بیٹھے، اسی واقعہ کو یاد کر کے لکھتے ہیں کہ وہ بھی انسان تھے، انسان ہی کا کچا دودھ پیا تھا، غفلت جبلی سے بالاتر نہ ہو سکے، ان پر جہالت کا پردہ پڑ گیا، درگاہ میں جو بے ادبی ہوئی اس کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا، اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ بھی، ان کے معشوق کی قوم کے چند افراد نے اُن پر حملہ کیا، اور تلوار سے ان کے سر، ہاتھ، اور کندھے پر نو زخم لگائے، جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی، اس شکرانہ میں یہ اشعار لکھے ہیں:-

القصہ ہر آنچہ کرد گردون از جفا حق باید گفت بود و دن حق ما
شکرانہ نعمتش نمی کرد ہیچ تا لاجرم فگند در رنج و بلا

اس مصیبت میں منت مانی کہ اچھے ہو کر حج کریں گے، لیکن پوری نہ کر سکے جس کا افسوس ان کو زندگی بھر رہا، اس سلسلہ میں احسان شناسی کے جذبہ میں اپنے آقا حسین خاں کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے باپ اور بھائی کی طرح ان کی خدمت کی اور اس کے لیے برابر دعا گو رہے، اس کی مذہبیت، شجاعت، سخاوت، سادگی، انکسار اور بے نیازی کی بڑی تعریف اپنی تاریخ میں کی ہے (ج ۲ ص ۲۲۴، ۲۲۳، ۱۳۷، ۱۳۶) ملا صاحب نے اپنے عشق کو جو ان کے خیال میں محض شہوت واز تھا، جس بے تکلفی سے بیان کیا ہے، وہ ان کی صاف گوئی اور حق گوئی کی دلیل ہے، یہی ان کی سیرت کا لازمی جزبنا رہا۔ ملا صاحب حسین خاں کے یہاں تقریباً نو سال ملازم رہے، ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے، اس وابستگی کا حال اس طرح لکھتے ہیں:-

"ماہ ذی الحجہ کے آخر میں یہ فقیر اپنی تقدیر سے جو تدبیر کے پاؤں کی زنجیر ہے، حسین خاں کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر بداؤں سے آگرہ آیا، جہاں خاں قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلے سے شاہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان دنوں علم کی بڑی قدر دانی تھی، پہلی ہی دفعہ شہنشاہ سے تخاطب کا شرف حاصل ہوا، اور ہم نشینوں میں داخل کر لیا گیا، علماء اپنے تبحر کا ڈنکا بجاتے رہتے، کسی دوسرے کو نظر میں نہ لاتے، بحث و مباحثہ کر کے اپنے کو نمایاں دکھانے کی کوشش کرتے، خداوند تعالیٰ کی عنایت

(نوٹ: آگے دو صفحوں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے پہلے صفحہ ۳۹ اور بعد میں صفحہ ۳۸ پڑھیے)

بھی ہنگامہ برپا رہتا، ایک رات بڑا شور و غل ہوا تو اکبر نے ملا صاحب سے کہا، جو شخص بھی نامعقول بات کرے، اس کی اطلاع دو، اس کو اس مجلس سے اٹھا دیا جائے گا، یہ سن کر ملا صاحب نے کہا کہ اس طرح تو سب ہی کو اٹھوانا پڑے گا (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲)

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو ہمایوں نے شیخ الاسلام بنایا تھا، لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ وہ کنجوسی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیا داری کی وجہ سے ذلیل سمجھے جاتے، شیخ عبد النبی... صدر الصدور تھے لیکن ان کے غرور و تکبر کی وجہ سے ان کی کوئی عزت نہ تھی، ملا صاحب کا بیان ہے کہ ان ہی علماء کی حرکتوں کو دیکھ کر وہ اسلام سے برگشتہ ہوتا گیا۔

اکبر ملا صاحب کی فضیلت، مذہبیت اور خوش گلوئی سے متاثر ہوا تو اس نے امامت کی خدمت ان کے سپرد کی اور اسی کے ساتھ بیستی کا عہدہ دینا چاہا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:-

"بادشاہ نے مجھ کو امام بنایا، اور حکم دیا کہ داغ کی خدمت بھی انجام دوں، اور کچھ خرچ دے کر فرمایا کہ بیستی عہدہ کے مطابق میں بھی گھوڑوں کا داغ کراؤں، اسی زمانہ میں شیخ ابو الفضل بھی دربار میں پہنچ گیا تھا، شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں، یہی حال میرا اور ابو الفضل کا تھا، لیکن وہ ہوشیار اور زمانہ ساز تھا، اس کو بھی جب بیستی کا عہدہ دیا گیا تو اس نے داغ اور محلہ کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کرالی اور منصب دو ہزاری کے عہدہ اور وزارت تک پہونچ گیا، اس کے برعکس اس فقیر نے اپنی ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس نوکری کو قبول نہ کیا ...... اور اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مدد معاش کے لیے کوئی اراضی وغیرہ عنایت ہو جاتی تو گوشہ عافیت میں بیٹھ کر علمی خدمات میں مصروف رہے گا (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۶)

اکبر کے حکم سے ملا صاحب اتھربن کے ترجمے میں لگ گئے (ج ۲ ص ۲۱۲) سنہ ۹۸۴ھ (سنہ ۱۵۷۶ء) میں جہاد کے شوق میں رانا کیکا (رانا پرتاپ) کے خلاف لڑنے کے لیے شاہی لشکر میں شریک ہوئے (ج ۲ ص ۲۳۳) اور وہاں سے واپس ہوئے تو مان سنگھ کی طرف سے رانا کا نامور ہاتھی "رام پرشاد" لا کر اکبر کی خدمت میں پیش کیا، جس سے خوش ہو کر اکبر نے ان کو مٹھی بھر اشرفیاں انعام میں دیں، جو تعداد میں ۹۶ نکلیں (ج ۲ ص ۲۳۶) اسی سال انھوں نے دیالپور میں اکبر کو کلام پاک

سے میں اپنی قوت طبع، ذکاوت فہم اور دلیری سے جو کہ جوانی کے زمانے کی لازمی چیزیں ہیں، ان میں اکثر پر غالب آگیا جب میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو شہنشاہ نے میری تعریف کی تھی کہ بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی سرکوبی کرے گا، شہنشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے، اسلیے میں نے بھی ان پر طرح طرح کے الزامات رکھے جن کو شہنشاہ نے پسند کیا، شیخ عبد النبی صدر الصدور کے پاس میری رسائی نہ تھی، اس لیے وہ مجھ سے ناخوش رہے۔ مناظرہ کے وقت میرے فریق کی طرفداری کرتے اور یہ مثل صادق آئی کہ سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا، لیکن رفتہ رفتہ ان کی کلفت الفت میں بدل گئی ان ہی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابو الفضل بھی باریاب ہوا، اس کی دانش اور ہوشمندی کا ستارہ خوب چمک رہا تھا، اس لیے گوناگوں نوازشوں سے ممتاز ہوا۔" (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲،۲۰۲)

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) کے جمادی الآخر میں اکبر جب قنوج میں مقیم تھا، تو اس نے ملا صاحب سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ فارسی میں کرنے کی فرمائش کی، انھوں نے اس کا ترجمہ کیا تو اکبر کو پسند آیا، اور اس کا نام خرد افزا رکھا گیا (ص ۱۸۳) لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس ترجمہ کو اپنے شاہی طبیب حکیم الملک گیلانی کو پڑھنے کے لیے دیا، اور پھر پوچھا کہ اس کی تحریر و انشاء کیسی ہے، تو انھوں نے کہا کہ اس کی عبارت تو فصیح ہے، لیکن پڑھنے میں کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی (ص ۱۶۱ ج ۲) پرکھوتم نامی ایک برہمن نے اس کی ایک شرح بھی لکھی (ج ۲ ص ۳۲۰)

۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) شاہی عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی، ملا صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس وقت تک اکبر کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہو چکی تھیں، اس کی سلطنت کے حدود میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا، اس کی حکومت کا نظم و نسق اس کی مرضی کے مطابق ہوتا گیا اور جب ملک میں اس کا کوئی دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان عبادت و ریاضت کی طرف ہو گیا، اس کی صحبتیں اجمیر کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ رہنے لگیں۔ اس کا زیادہ تر وقت اللہ اور رسول کے تذکرہ میں گزرنے لگا، اس کی مجلسوں میں صوفیانہ یا فقہی اور علمی مباحث ہونے لگے، وہ رات کے وقت مراقبے میں بیٹھتا، "یا ہو" یا ہادی کا وظیفہ بھی پڑھتا، جب عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی، تو علماء و مشائخ اس میں آکر علمی اور مذہبی مذاکرے کرتے، لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ اس عبادت خانہ میں سادات، مشائخ اور علماء آپس میں جھگڑنے لگے، نشست کی تقدیم و تاخیر پر بھی لڑائی ہوئی۔ بالآخر بادشاہ نے سب کی جگہیں متعین کر دیں، پھر

کا ایک چھوٹا سا نسخہ اور وعظ و خطبہ کی ایک بیاض پیش کی (ج ۲ ص ۲۳۹)

۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں ملا صاحب.... دربار سے پانچ مہینے رخصت لے کر اپنے وطن بداؤں گئے، وہاں ایک سال رہ گئے، جس سے اکبر ان سے ایسا بدظن ہوا کہ ان کی طرف سے بے توجہ ہوتا چلا گیا، جس کی کھٹک ملا صاحب زندگی بھر محسوس کرتے رہے۔ (ج ۲ ص ۲۵۳)

اسی اثناء میں ملا صاحب کا بیان ہے کہ عبادت خانہ میں علماء کی زبانوں کی چھریاں ایسی بے باکی سے چلنے لگیں کہ اکبر اسلام سے دور ہوتا چلا گیا۔ انھوں نے اکبر کے انحراف کا بڑا اچھا تجزیہ یہ لکھ کر کیا ہے:۔

دربار ی علماء میں کچھ اس طرف اور کچھ اس طرف ہو گئے، ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بنانے لگے، ان اختلافات کی وجہ سے اہل بدعت کو اپنے فاسد اور باطل خیالات کے ساتھ اپنے کمین گاہوں سے نکلنے کا موقع مل گیا، انھوں نے غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ اخلاص کے ساتھ حق کا طالب تھا، لیکن ان پڑھ تھا، کافروں اور ادنی درجہ کے لوگوں سے محبت کرتا تھا اس لیے ان مباحث کی وجہ سے شک میں پڑ گیا، اس کی حیرت بڑھتی گئی، اپنے اصلی مقصد سے پھر گیا، پھر تو اس کے سامنے سے شرع مبین اور دین متین کی مضبوط دیوار ٹوٹ گئی، پانچ، چھ سال میں اسلام کا اثر باقی نہ رہا۔ سارا قضیہ الٹ کر رہ گیا (ج ۲ ص ۲۵۵)

ملا صاحب نے اکبر کی بے دینی کا سارا الزام علماء کے باہمی اختلافات پر ڈال دیا ہے، وہ اقرار کرتے ہیں کہ اکبر شروع میں طلب حق کا سچا جذبہ رکھتا تھا، اس کی طبیعت میں تحقیق و تجسس تھا، ہر دین اور مذہب کے اعتقادات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا، لیکن اس کے بدعقیدہ مصاحبوں اور بھگیالو علماء نے اس کا رخ پھیر دیا، علماء کا یہ فرض تھا کہ اس کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے، لیکن انھوں نے اپنے اعزاز و رتبہ کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنا شروع کیا، ایک ہی مسئلہ کو علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا، بادشاہ ان باتوں سے دل برداشتہ ہوتا چلا گیا، دربار میں مختلف مذاہب اور مسالک کے گمراہ کن عناصر موجود تھے۔ انھوں نے علماء کے ان اختلافات سے فائدہ اٹھایا، اور دین کے معتقدات کو خلاف عقل ثابت کرکے اکبر کے ذہن کو انکار اور انحراف کی طرف مائل کر دیا۔ (ج ۲ ص ۲۵۶)

اکبر نے پھر جو مذہبی وطیرہ اختیار کیا، اس کو ملا صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اور یہ صرف ان ہی کی تاریخ منتخب التواریخ میں ملتی ہے۔ اس کو مختصر طریقہ پر اس طرح درج کیا جا سکتا ہے۔

بادشاہ کا خیال ہو گیا تھا کہ حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے (ج ۲ ص ۲۵۶) وہ عقیدۂ تناسخ کا قائل ہو گیا (ج ۲ ص ۲۵۸) شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا نے وحدت الوجود کی روشنی میں اس کو انسان کامل کا درجہ دیدیا، جس کے بعد اس کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا، اور اس کا نام زمین بوس رکھا گیا، چہرۂ شاہی کو کعبۂ مرادات اور قبلۂ حاجات قرار دیا گیا (ج ۲ ص ۲۵۹) بیربر کے اثر سے دربار میں آفتاب پرستی کا بھی فروغ ہوا، اور آفتاب کو مظہر کامل، سرچشمۂ سعادت، نیر اعظم عطیہ بخش ہمہ عالم بتایا گیا (ج ۲ ص ۲۶۰) نوروز جلالی کی تعظیم اہتمام سے کی جانے لگی، گائے کا ذبیحہ بھی بند کر دیا گیا، اس کا گوبر پاک سمجھا جانے لگا، گائے کا گوشت کھانا حرام ہو گیا، گاؤکشی کی سزا قتل قرار دی گئی، محل کے اندر یہ سمجھ کر آتشکدہ بنایا گیا کہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔ اکبر آفتاب کے ساتھ آگ کو سجدہ کرنے لگا۔ وہ پیشانی پر قشقہ لگا کر دربار میں آنے لگا۔ راکھی بھی بندھوانی شروع کر دی، وغیرہ وغیرہ (ج ۲ ص ۲۶۱۔ ۲۶۲)

پھر اکبر کے حق اجتہاد کے لیے ایک محضر تیار کیا گیا، جس کے مطابق اس کو امام عادل قرار دے کر یہ حق دیا گیا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اس کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس محضر کو شیخ مبارک ناگوری نے مرتب کیا، ملا صاحب کے بیان کے مطابق اور علماء نے کراہت کے ساتھ اس پر دستخط کیے، اس کے بعد کسی کو اکبر کی مخالفت کی مجال نہیں رہی، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر کی جسارتیں بڑھ گئیں۔ اس نے قرآن کو مخلوق قرار دیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا، فرشتوں، معجزوں اور کرامتوں وغیرہ کا منکر ہو گیا، مرنے کے بعد بقائے ارواح اور عذاب و ثواب کو تناسخ پر منحصر کر دیا (ج ۲ ص ۲۷۰۔ ۲۷۱) ملا صاحب نے شاید خود ہی اس بے راہ روی کی تاریخ "فتنہ ہائے امت" سے نکالی لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس بے دین بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر ملازمت کر لی، جب وہ اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے پوچھا کہ کیا ضعف تھا کہ ملازمت ترک کر دی" ان کے بجائے ایک درباری امیر غازی خاں بدخشی نے برجستہ کہا "قسمت کا ضعف تھا" جب وہ شاہی

ملازمت سے دوبارہ وابستہ ہوگئے، تو ان کی جاگیر بھی بحال ہوگئی (ج ۲ ص ۶۷-۲۷۵) مگر دربار سے وابستگی کے بعد اکبر کی بے دینی سے ان کا دل کڑھتا رہا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دربار کے کمینے، ذلیل اور عالم نما جاہل علماء نے اکبر کو باور کرایا کہ وہ اس عہد کے صاحب زمان ہیں، اور بعض کتابوں سے یہ شہادت پیش کی کہ ۹۹۰ھ میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہوگا، اور صاحب دین حق کے کلمہ کے جمل کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں، اس کی مصداق صرف بادشاہ کی ذات ہے (ج ۲ ص ۲۸۷)

ملا صاحب کے بیان کے مطابق اکبر نے اپنے اٹھائیسویں سال جلوس میں یہ اعلان کیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی بعثت سے پورے ہزار سال ہو چکے تھے، آپ کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے وقت آگیا ہے کہ ایک نئے دین کا اعلان کیا جائے (ج ۲ ص ۳۰۱)

اس اعلان کے بعد ملا صاحب کے بیان کے مطابق جو احکام جاری کیے گئے ان میں کچھ یہ ہیں:۔
سکہ پر الفی تاریخ ثبت کیا جائے، اور یہ ہزار سنہ رسول اللہؐ کی رحلت سے شروع کیا جائے (ج ۲ ص ۳۰۱) بادشاہ کو سجدہ کرنا لازم ہے، شراب جسمانی صحت کی خاطر پی جاسکتی ہے خاص خاص شرائط کے ساتھ طوائفوں کے یہاں جانے کی اجازت دیدی گئی۔ (ج ۲ ص ۳۰۲) گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کردی گئی، داڑھی منڈوانے کا عام رواج ہوگیا، داڑھی کی مذمت کی گئی، دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی (ج ۲ ص ۳۰۴) جو کوئی اس دین کو قبول کرتا، اس کو اقرار کرنا پڑتا کہ اپنے باپ دادا کے مجازی اور تقلیدی اسلام سے انکار کرتا ہوں اور دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اخلاص کے چہارگانہ مراتب یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں (ج ۲ ص ۳۰۴) احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دیا گیا، غسل جنابت ضروری نہ سمجھا گیا (ج ۲ ص ۳۰۵) موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانا بے معنی قرار دیا گیا، اس کے بجائے ولادت کے روز کھانا پکوا کر دعوت کرنے کی ہدایت دی گئی، اور اس کا نام آش حیات رکھا گیا (ج ۲ ص ۵-۳۰۴) شیر اور جنگلی سور کا گوشت حلال کردیا گیا، چچا، ماموں، اور قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کردیا گیا، سونا اور ریشمی کپڑے جائز قرار دیے گئے۔ یہاں تک لکھتے لکھتے ملا صاحب کو غصہ آگیا ہے اور لکھتے ہیں کہ بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے نماز، روزہ اور حج کی مذمت اور تمسخر میں کئی رسالے لکھے، جو بادشاہ کی نظر میں مقبول ہوئے۔

نماز، روزہ و حج خود پیش ازاں ساقط شدہ بود بعضی اولاد الزنا رچوں پسر ملا مبارک شاگرد رشید شیخ ابوالفضل رسائل در باب قدح و تمسخر ایں عبادات بدلائل نوشتہ و مقبول افتادہ باعث ترقیت گشت

(ج ۲ ص ۳۰۶)

عربی کا سنہ ہجری موقوف کردیا گیا، اس کی جگہ بادشاہ کے سنہ جلوس کی تاریخ لکھی جانے لگی، عربی پڑھنا عیب ہوگیا، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون ہونے لگے، وغیرہ وغیرہ (ج ۲ ص ۳۰۶، ۳۰۷)

شاہی دربار کا جب یہ رنگ ہوگیا تو ملا صاحب اس سے بددل ہوئے، اپنی بددلی اور آزردگی کا حال اس طرح قلمبند کرتے ہیں:۔

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو فقیر گوشۂ عزلت میں بیٹھ گیا

اذعظم المطلوب قل المتاعب

یعنی جب خواہشات بڑی ہوجاتی ہیں تو مشکلات بڑھ جاتی ہیں[1]

میں فرار کی آیت کو پڑھتا، بادشاہ کی نظر سے گر گیا، ان کی آشنائی بیگانگی میں تبدیل ہوگئی لیکن الحمد للہ کہ میں اس حال میں خوش ہوں۔

دل در رنگ و بو نشد نیکو شد کہ نشد   جز در تو فرد نشد نیکو شد کہ نشد

گفتی کہ بر نجم از نیکو شد کار ست   دیدی کہ نیکو نشد نیکو شد کہ نشد

اپنے کو نہ بادشاہ کی رعایت کے قابل اور نہ ان کی خدمت کے لائق سمجھتا تھا،

با ما تکلف بہ یک سو نہیم   نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی کبھی صف نعال سے کورنش بجالاتا، اور اہل محفل کا تماشا دیکھ لیتا

کہ صحبت بر نیاید "نا موافق نیست مشربہا

اور اس کے بعد یہ حال تھا

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است   صحبت گذاشتم ز تماشائیاں شدم

پھر اوپر دین الٰہی کی جو تصویر کھینچی ہے، اس کے بارہ میں اسی سلسلے میں لکھ گئے ہیں کہ

حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ان حالات کو نہ لکھتا، لیکن خدائے عز و جل گواہ ہے، اور اس کا گواہ ہونا کافی ہے کہ میرے ان باتوں کے لکھنے کا مقصد صرف اس دین کے ساتھ درد اور

[1] الفرقان: ترجمہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جب مقصد بلند ہو تو مصائب ہیچ ہوجاتے ہیں" ترجمہ ہونا چاہیے۔

ملت مرحوم اسلام کے ساتھ دل سوزی کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے جو عنقا کی طرح کوہ قاف میں اجنبی بن گیا ہے، اور اس کے بازو کا سایہ اس دنیا کے خاک نشینوں پر سے جاتا رہا ہے، میں تو خدا کی قسم ملامت، نفرت، حسد اور تعصب سے پناہ مانگتا ہوں (ج ۲ ص ۶۲-۲۶۳)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ (ج ۲ ص ۲۷۹)

میں نے ہر چند چاہا کہ میں صرف تاریخی واقعات کو قلمبند کروں، لیکن میرا قلم بے اختیار ہو کر دوسری طرف بہک جاتا ہے، اور اس نئے مذہب اور نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے .... کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا ......

خطابی با فلک کردم کہ از تیغ جفا کشتی — شہان مجلس آرائی و جوان مردان برمک را

زمام حل و عقد خود نہادی در کف قومی — کہ از روی کرم برایشاں شرف سگ را

ہماں در گوش جانم گفت فارغ باش خوش بنشین — کہ سبلت بر کند ایام ہر دہ روز یکیک را

(باقی)

ہندوستان میں اقامتِ دین

(از ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی)

[جماعت اسلامی نے دین کے جس روحانی تصور کی دعوت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا تھا یہ اسی روحانیت کی طاقت ہے جو اب تک جماعت کو اچھی خاصی فعالیت اور مضبوط تنظیم کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ اس تصور کے مطابق جو نصب العین جماعت نے اپنا قرار دیا تھا، اور جو لائحہ عمل اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے پوری قطعیت کے ساتھ طے کر دیا گیا تھا، وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ نہ صرف غیر عملی ثابت ہو چکا ہے بلکہ ہندوستان کی حد تک تو یہ بھی ظاہر ہو چکا ہے کہ اس میں غیر مسلموں کو اسلام کی طرف کھینچنے کی طاقت کم اور دور کر دینے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ جماعت کے حلقے میں بھی اب لائحہ عمل کی حد تک، اس چیز کو اچھی طرح محسوس کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں اور اس معاملے میں جماعت کے فکر و عمل کی اصلاح چاہتے ہیں۔
ذیل میں اسی نوعیت کے ایک مضمون کا ایک طویل اقتباس "ماہنامہ" زندگی رام پور" سے درج کیا جا رہا ہے۔ اس خاص نوعیت سے قطع نظر بھی یہ مضمون ایک عام افادیت رکھتا ہے۔ الفرقان]

آج سیکڑوں برس سے انسان کے ذہن و فکر میں ایک کجی پیدا ہو رہی ہے جو اب بہت دور جا پہنچی ہے اس کج فکری نے مذہب اور مذہبی تعلیمات کو "ہدایت الٰہی" اور خود تصور الٰہ کو انسانوں کے نزدیک امر غیر متعلق (Irrelevant) بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں دین قائم کرنا ہے اور دین انسانوں کے برضا و رغبت قبول کرنے کی چیز ہے تو سب سے پہلے اس کجی کو درست کرنا ہوگا اور انسانوں میں اس حقیقت کا شعور پیدا کرنا ہوگا کہ خدا ہے اور انسان اس کی ہدایت کا محتاج ہے۔ یہ ہدایت اسے پوری زندگی میں درکار ہے اور اسے قبول کیے بغیر وہ فلاح نہیں پا سکتا۔

بعض لوگ غلطی سے یہ سوچ سکتے ہیں کہ انسان کے اس بنیادی مرض کا علاج کیے بغیر اسلامی نظام زندگی کو مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ جدید ہندوستان اور ہندوستان کے انسان کو جس کا مرکز توجہ عدل کے ساتھ ترقی آزادی کے ساتھ موثر معاشی تنظیم مستحکم سیاسی ادارے اور امن عالم کی ضمانت دینے والا بین الاقوامی نظام بن چکا ہے۔ تقریروں اور تحریروں کے ذریعے یہ باور کرا دیا جائے کہ ان مقاصد کا حصول اسلامی نظام زندگی کو اختیار کر لینے سے بتمام و کمال ممکن ہوگا۔ جبکہ انسان کے تراشے ہوئے سارے نظام ان مقاصد کو حاصل کرنے میں مسلسل ناکامیوں سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اس خام خیالی کا مناسب رد عمل تو وہی مسکراہٹ ہے جس کے ذریعے دور جدید کا دانشور اس دعوے کو دفع کرتا ہے لیکن اگر غور کرنا ضروری ہو تو یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ آپ اسلام کی طرف سے معاشی عدل، جمہوریت اور امن عالم کے جتنے نقشے بھی تجویز کر سکتے ہیں، انھیں انسان شکریے کے ساتھ ایمان و اسلام کے بغیر بھی قبول کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ پہلے سے اس کے پاس موجود نہ ہوں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کاغذ پر ترقی اور سماجی عدل، آزادی و مساوات اور جمہوریت اور امن کے بے شمار نقشے بنائے جا چکے اور مزید بنتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ ان اسلامی نقشوں کی لازمی بنیادوں کے طور پر ان بنیادی عقائد، ان اخلاقی قدروں اور ان اصول زندگانی کو بھی پیش کیا جائے گا۔ جن کے مجموعہ کا نام دین ہے تو واضح رہے کہ ان قدروں اور اصولوں کے تعارف کو زمان و مکان کے پابند تفصیلی نقشوں کا ضمیمہ بنا کر پیش کرنا دوہری غلطی کا ارتکاب ہوگا۔ ایک طرف تو اجتماعی نظام کی ان تفصیلات سے بے اطمینانی یا ان کی غیر موزونیت کا احساس انسان کو اس ضمیمہ سے بھی بے نیاز کر دیگا۔ دوسری طرف ان قدروں اور اصولوں کو یہ حقیقی نوعیت نظروں سے اوجھل رہے گی کہ وہ بدلتے ہوئے نقشوں کی بنیاد اور پشت پناہ بن سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اگر ان قدروں اور اصولوں کی تعلیم اجتماعی نظام کے کسی تفصیلی نقشہ کے ساتھ دی گئی تو اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ اس دعوت کو قبول کرنے والے اصل اہمیت اس تفصیلی نقشہ کو دینے لگیں جس کی موزونیت زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ زائل ہو کر رہے گی اور یہ بات ان کی ان اصولوں سے وابستگی اور خود ایمان کے لیے خطرہ بن جائے

دین کی دعوت اور اس کے تعارف کا صحیح طریقہ وہی ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام نے اختیار کیا۔ اس طریقہ کی روشنی میں ہمارا کام یہ ہے کہ انسان کو یہ یاد دلائیں کہ ہر بُرے بھلے اور

حسین اور قبیح کی ایسی پہچان جو عمل کو بھی ہم آہنگ بنالے۔ سائنس اور عقل کے ذریعے ممکن نہیں ہوسکتی اسے یاد دلایا جائے کہ انسانی زندگی کی اہم ترین حقیقت موت ہے اور یہ واقعہ کہ انسان پہلے نہ تھا پھر اس نے وجود پایا۔ انفرادی اعتبار سے بھی اور نوعی اعتبار سے بھی۔ یہ حقیقتیں ماورائے انسان اور ماورائے محسوس و مشہود کچھ غیبی حقیقتوں کی نشاندہی کرتی ہیں جن سے آگاہی تاریخ انسانی میں انبیاء کے ذریعے عمل میں آتی رہی ہے۔ اس آگاہی کی قدر نہ کرنا مہلک ہے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ انبیائی استدلال خدا پر ایمان کے لیے جہاں مطالعہ کائنات اور کیفیت موت و حیات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے وہاں انسانی زندگی میں خدا سے روگردانی کے نتیجہ میں جو عدم توازن، ظلم و جور، استحصال و استبداد رونما ہوتا ہے اس کی طرف بھی توجہ مبذول کراتا ہے۔ اس لیے تہذیب حاضر اور نظام وقت کی بے اعتدالیاں سامنے لانا اور ان کی خامیوں سے آگاہ کرتے ہوئے انسان کو یہ سمجھانا کہ خرابیوں کا حل خدائے واحد کی بندگی اور اس کی مرضیات کے مخلصانہ تتبع میں مضمر ہے از حد ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ پر ایمان کی دعوت، اللہ کی ان ہدایات کی تبلیغ و تفہیم کو بھی مستلزم ہے جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ ہم اللہ کو اس کی صفات سے جانتے ہیں۔ مرضیات الٰہی صفات الٰہی کا پرتو ہیں اور اجتماعی زندگی کے دینی اصول بھی مرضیات الٰہی کی فہرست میں داخل ہیں...
ایمان کی دعوت بے مغز ہوگی۔ اگر وہ اس حقیقت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یہاں نہ ان باتوں کا انکار مقصود ہے نہ کسی بھی ایسے استدلال کی تحقیر جو بالآخر انسان کو اس کے خدا کی پہچان عطا کرکے اس کو خدا کی مرضیات کے تتبع پر کمربستہ کردے۔ مگر بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدل جانے والی باتوں کے ذیل میں اسلام کی جانب سے کسی متعین تفصیلی خاکہ کو بنائے دعوت بناکر جدید انسان کو اس منزل تک پہنچانا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ یقین صرف استدلال سے نہیں خود یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا یقین جو اپنے ساتھ عمل کی سند رکھتا ہے۔ خدا ہے، اس نے اپنی مرضیات کا اظہار کیا ہے۔ اجتماعی زندگی کی نسبت سے یہ مرضیات ہی وہ قدریں ہیں جو انسانی زندگی کو فلاح و سعادت سے روشناس کراسکتی ہے۔ پس مومنوں کی جماعت کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس یقین سے سرشار، اس عمل صالح کے علمبردار ہوں۔ جو ان قدروں سے تشکیل پایا ہو۔ آزادی و مساوات، عدل و انصاف،

ہمدردی و مواسات، تعاون و بہی خواہی، عفت و پاکیزگی برتنے کی چیزیں ہیں۔ ان کا تعلق عملی رویے سے ہے، ان کی تبلیغ اور دوسرے انسانوں کو ان اوصاف سے آراستہ کر کے دنیا کو ان کے مطابق سنوار دینا ان کو کر کے دکھانے ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

دین کے اس عملی مظاہرہ یا شہادت حق میں مزاج عصر اور تاریخ دعوت اسلامی کی روشنی میں سب سے زیادہ اہمیت آج اس بات کو حاصل ہے کہ داعی غریب و محتاج، مجبور و مقہور، کمزور و مظلوم کا کفیل و غمخوار، مددگار و معاون اور حامی و ناصر بن کر سامنے آئے اور حق کی خاطر ظلم اور استحصال کرنے والوں اور اپنے مفادات کی خاطر انسانوں پر اپنی خدائی چلانے والوں سے نبرد آزما ہو تاکہ انسانی آزادی بحال ہو اور ہر انسان کو پروردگار عالم کی عطا کردہ نعمتوں سے آزادانہ استفادہ کرتے ہوئے اپنا طرز زندگی ہر طرح کے جبر و قہر، خوف و طمع اور جہل و فریب سے آزاد رہ کر خود متعین کرنے کا موقع ملے۔

ایمان کے بعد جدید انسان کو جس بات ضرورت سب سے زیادہ ہے وہ دین اور ہدایت الٰہی کے بارے میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جو مغرب میں چرچ اور سائنس کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی ہیں اور بڑی حد تک جدید سیکولرزم کی بنیاد ہیں۔ یہ خیال عام ہے کہ مذہب انسانی عقل و تجربے کے لیے کوئی میدان نہیں چھوڑتا۔ وہ مشاہدہ اور تجربہ میں آنے والی باتوں سے بھی انکار کرتا ہے اور انھیں پہلے سے مقررہ نتائج کے استخراج کا پابند بناتا ہے۔ وہ استقرائی استنباط سے بھی چڑاتے اور منطقی استدلال کو ہمہ گیر سمجھنے کی بناء پر حقائق کا دائرہ تنگ کرتا ہے۔ وہ بدلتے ہوئے حالات کا کوئی نوٹس نہیں لیتا اور دور جدید کے انسان کو زمانہ قدیم سے مقررہ و منضبط نظاموں کا پابند بناتا ہے اور ایسے معاشی سیاسی اور معاشرتی ضابطے نافذ کرنا چاہتا ہے جو عصر حاضر کے حالات و ضروریات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔

اقامت دین کے لیے ناگزیر ہے کہ دین کی دعوت کو قبول عام حاصل ہو اور اجتماعی زندگی سے ہدایت الٰہی کی بے دخلی کے رجحان کی اصلاح کی جائے۔ یہ اصلاح اب اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم یہ واضح کر دیں کہ جس دین کے ہم داعی ہیں وہ معاشی اور سیاسی نظام کے بارے میں صرف اصولی اور بنیادی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ تفصیلی ضابطہ بندی نہیں کرتا بلکہ انسانوں

کو آزاد چھوڑتا ہے کہ حالات وضروریات کے مطابق ان بنیادی قدروں کی تشکیل عمل میں لانے کے لیے تفصیلی ڈھانچے خود تعمیر کریں۔ واضح کیا جائے کہ اللہ نے خود اپنے اوپر ایمان کی دعوت کا مخاطب انسان کی عقل کو بنایا ہے۔ اسے انفس وآفاق کے مطالعہ پر اکسایا ہے اور اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں الوہیت اور آخرت جیسے غیبی حقائق پر اطمینان حاصل کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ دین نے خالص امور دنیا میں، سائنس اور ٹکنالوجی میں، پیداوار ودولت کے فنی اہتمام میں انسانی عقل و تجربہ کی مکمل آزادی تسلیم کی ہے۔ دین کی رہنمائی کائنات کے ان بنیادی حقائق کی تعلیم ہے جن تک رسائی میں عقل وتجربہ اور سائنس صرف تائیدی کردار ادا کر سکتے ہیں، قطعیت نہیں عطا کر سکتے۔ یہ رہنمائی تہذیب نفس اور تزکیہ باطن سے متعلق ہے جو انسانی شخصیت کی تعمیر میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا تعلق خاندان کی تنظیم سے ہے جس کے بغیر انسانی سماج کی بنیادی اینٹ ٹیڑھی رہ جائے گی۔ اس رہنمائی کا دائرہ معاملات اور انسان اور انسان کے درمیان رشتوں کے پائدار وصفی پہلو ہیں جو زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ نہیں بدلتے کہ ان کا مدار انسان ہے نہ کہ احوال وظروف۔ مثلاً دیانت داری راستبازی ایفائے عہد، عدل واحسان، اخوت ومساوات، تعاون وایثار، عصمت وعفت، شفقت ورحمت اور ان قدروں کے بنیادی تقاضے پورے کرانے والے ایسے ضوابط جو اپنی تشکیل میں ایسی لچک رکھتے ہیں کہ انسانی حالات میں تبدیلی کے ساتھ ان کی تعبیر وتشریح نئے امکانات پیدا کر سکتی ہو انفرادی سیرت کی تعمیر اور پاکیزہ معاشرت کی تشکیل سے بڑھ کر ریاست کی تنظیم اور بین الاقوامی تعلقات کے باب میں بھی ہدایت الٰہی کی رہنمائی حاصل ہے مگر یہ رہنمائی مقاصد کی تعین کرنے والی ہے نہ کہ ذرائع اور طریقوں کی پابند کرنے والی۔

یہ خیال بھی عام ہے کہ مذہب سماج کے غالب وحاکم طبقات کا، سرمایہ داروں وجاگیرداروں کا اور اہل اقتدار و استبداد کا کاسہ لیس رہا ہے اور رہے گا۔ وہ استحصال کے ازالہ، عدل کے قیام اور گزشتہ مظالم کی تلافی کے لیے کی جانے والی انقلابی کوششوں کا حریف رہا ہے اور رہے گا جہاں تک اسلام اور اس کی تاریخ کے معتبر ادوار کا سوال ہے۔ یہ ایک بے جا اتہام ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ غلط فہمی دور کس طرح ہو۔ اسلام کے صحیح تعارف اور اس کی تاریخ کے مستند ادوار کی گواہی سامنے لانے کے ساتھ ہی اس کا ازالہ داعی کے اس کردار پر موقوف ہے جو محروم ومظلوم

اور کمزور مقہور کی نسبت سے لے اداکرنا چاہیے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ انسانی آزادی، اخوت ومساوات اور عدل وقسط پر مبنی دعوت اسلامی ہمیشہ مترفین ومتکبرین مکذبین اولی النعمہ سے ٹکراتی رہی ہے۔ وہ اول روز سے مستضعفین اور اراذلنا بادی الرای کا ماوی وملجا رہی ہے، مگر یہ بات جتانے کی نہیں آج کر کے دکھانے کی ہے۔

اسی طرح یہ خیال بھی عام ہے کہ احیاء اسلام کی تحریک رجعت پسندی اور جمود کی دعوت ہے جو ہر قدیم سے محبت اور ہر جدید سے نفرت پیدا کر کے انسانی قافلہ کا آگے کی طرف اقدام روک دینا چاہتی ہے۔ اسلام کی دعوت کو رہن سہن، وضع قطع، مخصوص آداب معاشرتی اور تمدنی اطوار کی طرف دعوت سمجھا جاتا ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ اس دعوت کے علمبرداروں نے عملاً عورت کو تمدن سے بے دخل کر رکھا ہے اور سماجی زندگی میں اسے ایک حقیر کردار کا پابند بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دائمی دعوت کا جدید وقدیم کے درمیان تفریق و امتیاز ناقابل تصور ہے۔ تسخیر کائنات اور تعمیر عالم کے حوصلہ مندوں کے بارے میں ٹھیراؤ اور جمود کی بدگمانی مضحکہ خیز ہے اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جس خدا نے انسانوں کے ذوق میں تنوع اور آب وہوا میں فرق رکھا اور جو سفر وحضر کے حالات بدلتا رہتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے انھیں کسی متعین وضع قطع کا پابند بنا دے گا۔ اس عالمی اور دائمی دعوت کے لیے کسی زمانے میں کسی مقام کے انسانی عادات کو ہر زمانہ اور ہر ملک کے لوگوں پر تھوپنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جو دین عورت اور مرد دونوں کو یکساں مکلف اور جواب دہ قرار دیتا ہے اور دونوں پر مرضیات الٰہی کے مطابق تعمیر حیات کی ذمہ داری بھی عائد کرتا ہے۔ وہ تمدن کی تعمیر اور سماج کی تشکیل صرف مردوں کا حصہ کیونکر قرار دے سکتا ہے۔ مگر یہ اصول کی باتیں ہیں عرصے سے صورت حال یہ ہے کہ اسلام کا کام مسلمانوں میں کیا گیا، مسلمانوں کی اصلاح میں اصول پر فروع اور دین پر کلچر کو ترجیح حاصل رہی، مقاصد اصلاح محدود رہے اور عام بندگان خدا کو دین کی دعوت دینے اور دنیا میں دین کو قائم کرنے کے سیاق میں اصول وفروع، اول اور ثانوی زیادہ اہم اور کم اہم کے درمیان کی تمیز کی توفیق کم ہوئی۔ کچھ اس وجہ سے کچھ جدید انسان کی بے اعتدالی کے سبب، جو کسی حد کسی پابندی یا کسی "ادب" کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں نظر آتی، اب ایک زبردست گرہ پڑ چکی ہے جب تک

یہ گرہ نہیں کھلتی آپ جدید انسان کی عقل کو قائل بھی کر دیں تو اس کے نفس کو قابو میں لانا دشوار نظر آتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس گرہ کو دونوں سروں سے کھولنے کی کوشش کی جائے۔ عصر حاضر کی تجدید پرستی، بے اعتدالی، اباحیت پسندی اور حدود و آداب کی ناقدر شناسی کے مہلک اثرات کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ مگر دین کی دعوت دینے والے بھی اپنا احتساب کریں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ مرضیاتِ الٰہی کی فہرست میں اپنے یا اپنے بزرگوں کے ایسے عادات و اطوار کو بھی داخل کر بیٹھے ہیں جنھیں اللہ کی طرف سے کوئی سند ترجیح نہیں حاصل ہے۔ وہ اپنے عمل سے اس بات کا مظاہرہ تو نہیں کر رہے ہیں کہ دینی زندگی میں مرکز توجہ اور دینی اصلاح کا نقطہ نظر چند ایسے امور ہیں جن کا مرتبہ بہر حال ثانوی ہو سکتا ہے۔ کیا مسلم خواتین اقامت دین اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اسی جہالت، ہمہ گیر بے خبری، مسائل سے لاتعلقی اور حرکت و عمل سے کنارہ کشی کے عالم میں رہتے ہوئے انجام دے سکتی ہیں جس میں آج ہمارے سماج نے انھیں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر نہیں تو وہ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ اس معاملہ میں اور ہر معاملہ میں ان کے طرز عمل سے روایت پسندی، ماضی پرستی اور تقلید کی جگہ تخلیقی صلاحیت، آج نئی راہوں کی تلاش، حرکت اور اقدام کا تاثر قائم ہو۔ تاکہ یہ بدلتی ہوئی دنیا اپنی تمام جائز امنگوں کے ساتھ دین کی قیادت میں واپس آسکے۔

اب میں ایک دوسری رکاوٹ کا ذکر کروں گا جو ہندوستان کے باشندوں کو اسلام کی دعوت پر کان نہ دھرنے، بلکہ اس سے بیزاری کا رویہ اختیار کرنے یا کم سے کم اسے شبہہ کی نظر سے دیکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس رکاوٹ کا تعلق ہندوستان کی حالیہ تاریخ سے ہے جو مذہب کی بنیاد پر قومیت اور اس بنا پر تقسیم ملک سے دوچار ہوئی ہے۔ اس پس منظر میں عام اہل ملک بالخصوص اکثریتی فرقہ مسلمانوں کے مذہبی رجحان اور ان کی طرف سے اٹھنے والی ہر دینی دعوت کی جانب سے اندیشہ ناک ہیں۔ جب تک یہ اندیشہ ناک فضا قائم ہے۔ یہاں دین کا قیام تو بڑی بات ہے یہ بات بھی مشکوک ہے کہ دین کو اپنے واجبی تعارف کا موقع ملتا رہے گا اور اس کا وجود باقی رہے گا۔ پس جو لوگ اس ملک میں نہ صرف یہ کہ دین کا بقا اور اس کا حتی از بیش تعارف چاہتے ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ حوصلہ رکھتے ہوں کہ خدا کے اس پیغام کو یہاں کے تمام باشندوں تک پہنچائیں گے۔

انھیں یہ امید کرنے سے پہلے کہ لوگ اس پیغام کو قبول کر لیں گے اور اس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو بدل لیں گے اپنی قوتیں اس زبردست رکاوٹ کو دور کرنے پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جماعت اسلامی ہند اس تاریخی عمل سے کنارہ کش رہی ہے اور اس سے اعلان براءت کرتی رہی ہے جس کے نتیجے میں بیزاری اور شک و شبہہ کی یہ فضا بنی ہے۔ مگر ہمیں حالات کی اس ستم ظریفی کا بھی حقیقت پسندانہ نوٹس لینا چاہیے کہ آج اس بیزاری اور شک و شبہہ کا سب سے بڑا ہدف ہماری ہی جماعت ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ اس پر از سر نو غور کیا جائے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مذکورہ بالا تاریخی عمل کی مذمت اور اس سے اظہار براءت کافی ہے نہ یہ بات کہ ہم "قومی کش مکش" سے علیحدہ رہیں ـــ بالخصوص ایسے حالات میں جب ہم اقامت دین ہی کی خاطر تحفظ ملت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہوں۔ اس صورت حال سے موثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے طاقتور ایجابی عمل کی ضرورت ہے۔ یعنی اس ملک کی فلاح و بہبود سے ہر سطح پر گہری حقیقی عملی دلچسپی لی جائے اور اس طرح لی جائے کہ عام ہندوستانی تحریک اسلامی کے کارکنوں کو بالخصوص اور عامۃ المسلمین کو بالعموم ملک کے بہی خواہ معماروں اور خادموں کی حیثیت سے جاننے اور پہچاننے لگے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ملکی مسائل اور تعمیر و ترقی سے متعلق سرگرمیوں کے بارے میں ایجابی اور فعال رویہ اختیار کیا جائے اور ان امور کے بارے میں ہمارا اظہار رائے بھی اسی مزاج کا حامل ہو۔ یہ بات کہ اسلام جیسا دین انسانیت نہ علیحدگی پسندی سکھاتا ہے نہ قومی کشمکش، بلکہ وہ انسان دوستی، خدمت خلق اور حق پسندی کی تعلیم دیتا ہے۔ زبان سے کہہ کر نہیں سمجھائی جا سکتی۔ اس کے لیے محض قومی کش مکش سے دور رہنے کا منفی عمل بھی کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا تقاضا ہے کہ داعی گروہ کی جانب سے خدمت خلق، انسان دوستی اور حق پسندی کا ایسا عملی مظاہرہ ہو جو ماضی کی مبینہ غلطیوں اور مستقبل سے وابستہ اندیشوں کا سد باب کر سکے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اہل ملک کے ان شکوک و شبہات کو اس رویے سے تقویت حاصل ہوئی ہے جو عامۃ المسلمین نے ملکی مسائل اور تعمیر و ترقی کے سلسلے میں عملاً اختیار کر رکھا ہے۔ یوں تو آج مسلمانوں کو کسی بھی مسئلے سے دل چسپی نہیں مگر وہ کچھ متوجہ ہوتے ہیں تو اپنے ملی مسائل کی طرف، ملکی مسائل سے ان کی دل چسپی برائے نام ہے۔ ملکی اور ترقیاتی محاذ پر

ان کی جانب سے فعّال فکری عملی اور اخلاقی جدو جہد کا سامنے نہ آنا ان پر علیحدگی پسندی اور منفی طرزِ عمل کے الزام کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔

جدید ہندوستان میں اعلان وعمل کے درمیان زبردست فرق اور اخلاص جفاکشی کی بے حد کمی کے باوجود ملک کی ترقی کے لیے کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے۔ کسی خیر پسند گروہ کے لیے اشتراک عمل کے لیے بنیادیں تلاش کرنا دشوار نہیں۔ تعمیر و ترقی کے ضمن میں جو غور و فکر اور بحث و مباحثہ مسلسل جاری ہے اس میں بھی اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے حصّہ لینے کی گنجائش ہے۔ اور اس بات کی بھی کہ تعمیر کے جن اہم پہلوؤں کو ہدایت الٰہی سے محروم نگاہیں نظر انداز کر رہی ہوں انھیں ہم اپنا میدان کار بنا کر ان کی طرف ملک کی توجہات مبذول کرائیں۔ کنارے کھڑے ہو کر وعظ و ارشاد کی بجائے تعمیر و ترقی کی جدو جہد میں خیالات اور عمل کے ذریعے عام ہندوستانیوں کے ساتھ شریک ہو کر اور انھیں شریک بنا کر ان کو مخاطب دعوت بنانا زیادہ مؤثر ہوگا۔

مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر ہمارے ملک کے تعلقات پاکستان سے کشیدہ ہیں اور بظاہر حالات عرصہ تک اس کشیدگی کے دور ہونے کی امید کم ہے۔ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا اور اس ملک میں بار بار اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی تعلیمات پر عمل کا نعرہ بلند کیا جاتا رہا ہے۔ اس نعرے کے پیچھے اسلام کی حقیقی تعلیمات پر مخلصانہ عمل کا ارادہ کس حد تک موجود ہے۔ اس پر تو یہاں بحث ممکن نہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ جب یہی نعرہ ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی بلند کرتی ہے تو اس سے وہ اہل ملک جو اس کشیدگی میں شدت جذبات کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں غلطی سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام اور اسلامی نظام کا نام لینے والے پاکستان کے ساتھ کوئی خصوصی تعلق اور اس کے مفادات و مصالح سے ایسی ہمدردی رکھتے ہیں جو کسی وقت انھیں اپنے ملک کے مفادات و مصالح کو قربان کرنے پر بھی آمادہ کر سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کی اس غلط رائے کے بدلنے اور ان کے دلوں میں دعوت اسلامی کے لیے جگہ بنانے کے لیے کیا کیا جائے۔ کیونکہ مسئلہ کی جذباتی نوعیت کے پیش نظر صرف ان کی رائے کو غلط ثابت کر دینے سے

یہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا۔ بڑا اچھا ہوتا اگر پڑوسی ملک سے ہمارے ملک کے تعلقات اچھے ہوتے کشیدگی دور ہو جاتی اور کوئی اصولِ حیات صرف اس لیے نہ مبغوض قرار پاتا کہ اس کا نام اس ملک میں بھی لیا جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ کشیدگی کے اسباب دور کر دینا ہمارے بس میں نہیں۔ بلکہ شاید خود یہ دونوں ملک بھی دنیا کی بڑی طاقتوں کی باہمی آویزش میں ایسے مہروں کی حیثیت رکھتے ہیں جو اپنی چال آپ نہیں متعین کر سکتے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اچھے تعلقات کے بارے میں اپنی نیک تمناؤں اور ان کے اظہار کے باوجود ہمیں اپنے ..... اسلوب دعوت میں مخاطب کی اس کمزوری کی پوری رعایت ملحوظ رکھنی ہو گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسلام کا نام لینا چھوڑ دیں یا اس بات پر زور نہ دیں کہ "یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے حل کے لیے ایک موزوں نظامِ زندگی بھی ہے۔" رعایت کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہماری دعوت پاکستان یا کسی بھی مسلم ملک کے نعروں اور عمل سے آزاد خود اپنی ترجمانی اور تشریح کے ساتھ اس طرح سامنے آئے کہ بجائے اس کے کہ ان کے عمل، بے عملی یا انحراف کو اس کے فہم اور اس کے بارے میں مخاطب کے موقف کی تعیین کی بنیاد بننے کا موقع ملے، مخاطب اس دعوت کی روشنی میں اسلام کا نام لینے والے ممالک، جماعتوں اور افراد کے عمل کو جانچنے اور پرکھنے کا عادی بنے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم آگے بڑھ کر خود یہی طریقہ اختیار کریں اور اپنی ذمہ داری سمجھیں کہ جو ملک، جماعت یا فرد اسلام کے نام پر غلط کام کر رہا ہو یا غلط بات کہہ رہا ہو اس پر اسلامی معیاروں کے مطابق حکم لگائیں اور تنقید کریں تاکہ اسلام کی حقیقی تعلیمات نکھر کر سامنے آ سکیں۔ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں کوئی عصبیت، تاریخی لگاؤ، یا جذباتی وابستگی اسلامی معیاروں کو برتنے میں جھجک نہ پیدا کرے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس معاملے میں خاموشی غلط ترجمانی کے ہم معنی ہو گی اور کلام مصلحت آمیز ہمارے معیاروں کے بارے میں شک و شبہہ پیدا کر دے گا۔

اوپر کے دو نکات یعنی ماضی قریب میں برصغیر کی تاریخ اور زمانہ حال میں ہندوستان و پاکستان کے مابین کشیدگی سے پیدا ہونے والی جذباتی فضا کے پیش نظر مناسب ہو گا کہ اس مرحلے میں دعوت کے ان ہی پہلوؤں پر زور دیا جائے جن کی مخاطب کو ابتداءً ضرورت ہے اور جن کے فہم و قبول پر

بہی دعوت کے اگلے نکات اور بقیہ پہلوؤں کے فہم و قبول کا انحصار ہے۔ یہ دانشمندی نہ ہوگی کہ جن عوام میں توحید، رسالت اور آخرت کے بنیادی حقائق کی نہ آگہی پائی جاتی ہو نہ ان کے قبول کے لیے ذہن تیار کیے جاسکے ہوں اور جن کے مزاج نے ابھی یہ اصول بھی نہ قبول کیا ہو کہ خدا کی رہنمائی اجتماعی زندگی میں بھی درکار ہے، ان کو اسلام کے مطابق ریاست کی تشکیل کی دعوت دی جائے۔ یہ اس حکمت و تدریج کے خلاف ہوگا جس کا اہتمام انبیاء کرام کے اسوہ میں ملتا ہے اور جس مخصوص ذہنی اور جذباتی فضا کا ذکر ہے اس میں اندیشہ ہے کہ اس سے مخاطب کا توحش اس قدر بڑھ جائے کہ وہ سرے سے ہماری بات سننے سے انکار کردے بلکہ خود ہمارا وجود اس کے لیے ناقابل برداشت ہوجائے۔ جو لوگ اپنا اصل کام یہ سمجھتے ہوں کہ دین کی دعوت اس طرح دی جائے کہ اس کو قبولیت حاصل ہو تاکہ اقامت دین کی راہ ہموار ہو، نہ کہ اس طرح کہ مخاطب کی عصبیتیں بیدار ہوں، اس کی بیزاری بڑھے اور فتنے کھڑے ہوں ان کے لیے حکیمانہ طریقہ یہی ہو کہ وہ عوام کے سامنے قبول دعوت کے خواستگار بن کر آئیں نہ کہ تبدیلی حکومت کے دعویدار بن کر۔

قابلِ مطالعہ نئی مطبوعات

تفسیر ماجدی جلد دوم (سورۂ نساء تا سورۂ توبہ)

از مولانا عبدالماجد دریابادی

قرآن پاک کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بیحد قابل قدر ہے، عربی کی تمام مستند تفاسیر اور مفردات القرآن پر لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہے ایک عام آدمی کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ قیمت مجلد .... سترہ روپے

قرآن اینڈ یو (انگریزی)

مولانا محمد منظور نعمانی کی مشہور و مقبول کتاب قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت قرآنی آیات کو نہایت موثر اور روح پرور تشریح کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اور جو پڑھنے والے کو قرآن کی دعوت و تعلیم کے ساتھ اسکے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے، کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے قلم سے یہ کتاب بیشمار خصوصیتوں کی مالک ہے۔ بہترین گلیز کاغذ اعلیٰ طباعت ۴۰۰ صفحات، قرآنی آیات کی طباعت آفسیٹ کے ذریعہ رنگین کی مضبوط جلد دیدہ زیب ٹائیٹل قیمت ...... بارہ روپے

سیرت طیبہ

(از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی)

پیغمبر اعظم حضرت محمد صلعم کی نئی سیرت۔ حدیث و تفسیر کی مستند کتابوں کی بنیاد پر جدید انداز تعبیر کے ساتھ مضامین روح پرور اور زبان دلآویز۔ صفحات ۲۵۰۔ اعلیٰ کاغذ قیمت ... ۵/-

شواہد تقدس

از مولانا سید محمد میاں صاحب

اس میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذی النورین پر انگشت نمائی کرنے والوں اور بحیثیت خلیفہ کے ان کی خامیاں گنانے والوں کا مدلل جواب دیا گیا ہے اسکے مباحث کی روشنی میں حضرت عثمانؓ مظلوم کی شخصیت اتنی ہی بے داغ نظر آنے لگتی ہے جتنا اسے بخلوص کتاب و سنت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ۲۶۴ صفحات، اعلیٰ کتابت و طباعت، قیمت مجلد ۶/-

آپ بیتی

حضرت شیخ الحدیث کی جیتی جاگتی تصویر، حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے بہت تفصیل کے ساتھ خود اپنی سوانح حیات مرتب کرائی ہے جس میں بچپن، والد ماجد کی خاص تربیت، طالبعلمی و سلوک کے منازل، تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف، اکابر کے ساتھ تعلق، اپنے مرشد و مربی کے ساتھ مدینہ طیبہ میں قیام اور زندگی کے اہم واقعات کا بڑے ہی بے تکلف اور سادہ انداز میں تذکرہ فرمایا گیا ہے، پڑھنے والوں کو انشاء اللہ مجلسی صحبت کا لطف آجائے گا۔ تین حصے یکجا۔ قیمت مجلد ۵/۵۰

تذکرۃ الخلیل

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کے استاد و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی کی سوانح حیات، حضرت شیخ الحدیث کے قیمتی اضافوں اور اصلاحات کے ساتھ۔ ضمن میں سلسلہ کے بہت سے اکابرین کا تذکرہ آگیا ہے۔ قیمت مجلد رنگین ۹/۵۰

حیات عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی یعنی مصنف کے والد ماجد حکیم سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی سوانح حیات جس میں عمودِ جنگ علمی کمالات، دینی خدمات اور ان کی عربی تصنیفات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، آخر میں ان کے فرزند اکبر مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی (سابق ناظم ندوہ) کے مختصر حالات بھی شامل کر دیے گئے ہیں

قیمت غیر مجلد -/۱۰

تہذیب و تمدن

مغربی قوموں کی مادی ترقی نے وہ سحر کر دیا ہے کہ ہر معاملے میں انکی تقلید ترقی کا ذریعہ محسوس ہوتی ہے لیکن انسانی نقطۂ نظر سے ان کی انتہائی گراوٹ کو کوئی نہیں دیکھتا جبکہ زندگی کے جتنے برے سے برے مظاہر ہو سکتے ہیں ان میں موجود ہیں۔ مصنف نے ہمیں معاشرے پر اسکے اندوہناک اور تباہ کن نتائج سے بالتفصیل متنبہ کیا ہے۔

قیمت مجلد دس روپے

مذہب اور سائنس ۔ از حضرت مولانا عبدالباری ندوی۔ اس میں فلسفہ کلام اور سائنس کے باہمی تعلق و اثرات پر ایک نئے عمیق علمی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے اور فلسفہ و سائنس کی روشنی میں دینی حقائق کا اثبات کیا گیا ہے۔ صفحات ۹۲ قیمت مجلد [illegible]

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

اسلام کا نظام عقائد و اعمال؟
اسلام کی بنیاد کن چیزوں پر ہے؟ — اور — ان کی حقیقت کیا ہے؟
اسلامی زندگی کن امور سے عبارت ہے؟ — اور — انکی صورت و حقیقت کیا ہے؟
ان مجمل سوالات کا مفصل جواب
آپ کو
مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان کی تازہ کتاب
دین و شریعت
میں ملے گا
جس میں ضروری تفصیل کے ساتھ توحید، آخرت اور رسالت — نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق و معاملات، دین کی خدمت و نصرت، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے عنوانات پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ شکوک و شبہات کی ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ غلط فہمیوں کا پردہ چاک ہو کر اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے اور دل و دماغ، عقل و وجدان اطمینان و سکون سے معمور ہو جاتے ہیں۔
جن عقائد میں غور و خوض بہت سوں کے لئے الحاد و تشکیک کا موجب ہو جاتا ہے ان کو ایسے سادہ انداز میں سمجھایا گیا ہے کہ متوسط درجہ کے ذہن کا آدمی بھی پڑھ کر پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔
یہ کتاب ان مسائل میں سلف صالحین کے مسلک پر پورا اطمینان بخشتی ہے، بشرطیکہ سلامتی فکر بالکل رخصت نہ ہو چکی ہو۔
مولانا نعمانی کی دوسری کتابوں کی طرح اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ذہنی اطمینان اور قلبی انشراح کے علاوہ یہ حلاوت ایمان اور ذوق عمل بھی پیدا کرتی ہے، جس کے بغیر دینی مباحث اور دین کی باتیں محض فلسفہ اور نرا ذہنی تعیش ہیں، جس کی اللہ کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔
اوپر جو موٹے موٹے عنوانات درج کئے گئے ہیں انکے علاوہ ذیلی عنوانات کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔
۴۰۰ کے قریب صفحات — بہترین سفید کاغذ — عمدہ جلد اور خوشنما گرد پوش — قیمت تین روپے
کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

ALFURQAN, (Regd N. L.353) LUCKNOW.

Cover Printed at A.O. Press Aminabad Park, Lucknow.

الفرقان
لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ...... -/۸
پاکستان سے ۸/۵۰
ضخامت ۵۰ صفحات
قیمت
فی کاپی ...... ۷۵ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۹ | بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۱ھ مطابق جنوری ۱۹۷۲ء | شمارہ ۱۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جنوری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ سال دسمبر کی ۷ تاریخ کو پاکستان میں مکمل ہونے والے عام انتخابات کے آئینی تقاضوں سے پاکستان کی سالمیت کے نام پر روگردانی کا راستہ اختیار کر کے پاکستان کے فوجی حکمرانوں اور اُن کے مشیر کاروں نے خطرات کے جس جہنم میں پاکستان کو جھونکا تھا اُس نے بالآخر اس سال کے دسمبر کی ۷ ار ہونے سے چند گھنٹے پیشتر ہی، پاکستان کی اس سالمیت کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ اور اب "مشرقی پاکستان" کے کسی ایک انچ پر بھی نہ حکومت پاکستان کا عملاً اقتدار ہے اور نہ اس کے لیے مشرق و مغرب میں کہیں جنگ۔

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

لوگ پاکستان کی جوانمرگی پر ماتم کر رہے ہوں گے، لیکن ہمارا رونا اُس بے عقلی پہ ہے جو عالم اسلام میں ہر تھوڑے دن بعد ایسے دن دکھاتی ہے۔ الکشن کے فوراً بعد، دستور ساز اسمبلی بلائے جانے کے مسئلے پر، اکثریتی پارٹی (عوامی لیگ) کے حقوق کی پامالی سے لے کر سیکورٹی کونسل میں اختیار کیے گئے رویئے تک، یعنی پورے سال بھر میں، کوئی ایک بات ایسی نہیں ملتی جس کے لیے کہا جا سکے کہ اس میں پاکستان کے ارباب حل و عقد نے کسی دانشمندی اور معاملہ فہمی سے کام لیا۔

مشرقی پاکستان کی بے اطمینانی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی۔ جنرل یحییٰ خاں نے جب زمامِ صدارت سنبھالی تھی وہ وہ وقت تھا جب کہ اُن کے پیشرو ایوب خاں اس بے اطمینانی کی خوفناکیاں سمجھ کر شیخ مجیب الرحمٰن کو جیل سے نکال کر گفتگو کی میز پر بلانے کے لیے مجبور ہو چکے تھے اور اُن کی ہر ہر شرط اس

گفتگو میں شریک ہونے کے لیے منظور کی گئی تھی، ایسے عالم میں جنرل یحییٰ خاں ملک کی صدارت سنبھالتے ہیں اور ملک میں جمہوریت کی بحالی کا جو وعدہ انھوں نے اختیارات سنبھال کر کیا تھا اُس کے مطابق مناسب وقت آنے پر عام انتخابات کے پروگرام کا اعلان کرتے ہیں۔ جس میں منتخب ہونے والے مرکزی نمائندے پہلے دستور ساز اسمبلی کی حیثیت سے کام کریں گے اور پھر یہ اسمبلی پارلیمنٹ میں تبدیل ہو جائے گی۔ شیخ مجیب الرحمن کی پارٹی اس الکشن کے لیے ایک منشور اپنی پالیسی اور پروگرام کی واقفیت کے لیے ووٹروں کے سامنے رکھتی ہے۔ یہ منشور اُن چھ آئینی نکات پر مبنی ہے جنھیں عوامی لیگ نے چار سال پہلے، یعنی ۱۹۶۶ء سے ملک کے سامنے پیش کر رکھا تھا۔ ان نکات پر مغربی پاکستان کے لیڈروں سے ان لوگوں کے ایک سے زائد بار مذاکرات ہو چکے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جب صدر ایوب خاں نے تمام پارٹی لیڈروں کی گول میز کانفرنس بلائی جس کے لیے شیخ مجیب الرحمن رہا کیے گئے۔ اس میں بھی یہ نکات اچھی طرح زیر بحث آئے اور ناقابلِ قبول قرار دیے گئے۔ الغرض عوامی لیگ کے منشور کے بنیادی نکات نہ پاکستان کے حکمرانوں پر مخفی تھے نہ مغربی بازو کے سیاسی رہنماؤں پر، لیکن اُس وقت کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ منشور قابلِ اعتراض ہے۔ عوامی لیگ نے اسی منشور پر الکشن لڑا اور قومی اسمبلی کی اکثریت حاصل کر لی۔

قاعدے کی رو سے نہ صرف عوامی لیگ پابند تھی کہ اپنے اسی منشور کے مطابق دستور سازی کرے بلکہ ملک کے اربابِ اقتدار بھی پابند تھے کہ اسے ایسا کرنے دیں۔ مگر مغربی پاکستان کے بعض لیڈر جو خواب دیکھ رہے تھے کہ اس الکشن کے نتیجے میں وزارت عظمیٰ کا تاج انھیں کے سر کی زینت بنے گا، وہ ان آداب و قواعد کی پابندی پر خود کو راضی نہیں کر سکے جن کے بغیر الکشن کی معرکہ آرائی کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ انھیں جو بات الکشن سے پہلے کہنا تھی وہ اب الکشن کے خلافِ توقع نتیجہ سے دوچار ہو کر ان کی زبان پر آئی، کہ عوامی لیگ کے آئینی پروگرام کے چھ نکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی اور جن کو مغربی پاکستان کے لیڈر کی حیثیت سے وہ قبول نہیں کر سکتے۔ یہ تھے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، جن کی پارٹی نے عوامی لیگ کے بعد دوسری پوزیشن اس الکشن میں حاصل کی تھی اور مغربی پاکستان کی سیٹوں میں سے بھاری اکثریت ان کے حصے میں آئی تھی، مسٹر بھٹو کا مطالبہ یہ تھا کہ دستور سازی کی کارروائی اس وقت تک شروع نہیں ہونی چاہیے جب تک مشرقی اور مغربی بازوؤں کے

لیڈروں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ان نکات پر نہ ہو جائے۔

یہ قطعاً ایک غلط مطالبہ اور "مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید" کا مصداق تھا، مغربی پاکستان کی دوسری پارٹیوں میں سے بھی اکثر کی یہی رائے تھی کہ اب یہ سوال بعد از وقت ہے۔ پاکستان کے مختارِ کل صدر کا بھی ابتداءً یہی موقف نظر آرہا تھا کہ وہ اس لایعنی مطالبے کے حامی نہیں ہیں اور مسٹر بھٹو کو ایک بے جا بحران کھڑا کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مگر مسٹر بھٹو کے داؤں پیچ تے صدرِ مملکت کو بھی بالآخر اپنے قابو میں کر لیا اور دستور ساز اسمبلی کے لیے مقرر کی ہوئی تاریخ اسی بنیاد پر غیر معینہ مدت کے لیے ٹال دی گئی کہ مغرب و مشرق کے نمائندے پہلے متنازعہ مسائل پر تصفیہ کرلیں۔

مسٹر بھٹو اپنے نامعقول رویہ سے جو چڑھ مشرقی پاکستان کے لوگوں میں پیدا کر رہے تھے یہ اُس کو آخری حد تک پہونچا دینے والا قدم تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ الکشن کوئی چیز نہیں ہے۔ الکشن میں جیتی ہوئی اکثریت بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز مشرق و مغرب ہے۔ مشرق کا نمائندہ اکثریت بھی لے آئے تب بھی مغرب کے آگے اس کی چلنے نہیں دی جائے گی۔ اس تلخ تجربے نے بالکل قدرتی طور پر اہلِ بنگال کو آتش زیرپا کر دیا۔ ان کے لیے اب یحییٰ خاں پر اعتماد ممکن نہیں تھا اور اسمبلی میں جانے سے پہلے اس بات کی ضمانت درکار تھی کہ وہ وہاں کی کارروائیوں میں اپنا پورا پورا حق برت سکیں گے۔ چنانچہ چند مطالبات کے ساتھ وہاں حکومت سے عدم تعاون کی ایک طوفانی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اب بھی وقت تھا کہ یحییٰ خاں اور اُن کے مشیر معاملے کی نزاکت کو سمجھتے اور غلط قدم پیچھے ہٹا لیتے۔ مگر انھوں نے خود پیچھے ہٹنے کے بجائے غالباً طے کیا کہ اس احتجاجی تحریک کو طاقت کے ذریعہ پیچھے ہٹائیں گے۔ ۶ مارچ کو انھوں نے غیظ و غضب سے بھری ہوئی ایک تقریر ریڈیو پر کی، جس میں طاقت سے کام لینے کے منصوبے کا اعلان تھا اور ساتھ ہی اسمبلی کے جلسے کے لیے ایک نئی تاریخ کا اعلان بھی۔ اس قسم کے آتشیں ماحول میں اپنی طرف سے اسمبلی کی تاریخ کا اعلان! کیا جواب اس بے عقلی کا دُنیا میں ہو سکتا ہے؟ جہاں لوگ بات سننے اور بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں وہاں اس اعلان پر عملدرآمد کی صورت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ لوگ پکڑ پکڑ کے اسمبلی میں لائے جاتے

خیر یہ بات تو ضمناً نکل آئی، اصل بحث اس تقریر کے اُس حصے سے تھی جس میں طاقت کی زبان سے مشرقی پاکستان کے لیڈروں کو خطاب کیا گیا تھا۔ طاقت کے استعمال کی یہ آگاہی بیشک اس بات پر نہیں تھی کہ اسمبلی کے التوا کے سلسلے میں یہ لوگ چراغ پا کیوں ہو رہے ہیں، بلکہ اسکی بنیاد اس بات پر رکھی گئی تھی کہ اس احتجاجی تحریک نے پر امن شہری زندگی میں خلل ڈال دیا ہے، اور محض گورنمنٹ کے خلاف ہونے سے آگے نکل کر یہ اُن لوگوں کے جان و مال کے نقصان کا باعث بن رہی ہے جو غیر بنگالی ہیں۔ یا جو اس تحریک سے ہمدردی نہیں رکھتے، ہمارے خیال میں یہ صورت حال ذرا بھی بعید نہیں بلکہ عین ممکن تھی۔ ایسے ہیجانی وقت میں ضرور ایسا ہو رہا ہوگا۔ ایسا ہونے کے تمام اسباب وہاں موجود تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جہاں ساڑھے سات کروڑ کی آبادی میں سے اسّی نوے فی صدی لوگ اس تحریک کے ہمنوا ہوں وہاں طاقت کے استعمال کی دھمکی اس صورت کو درست کرے گی یا اور بگاڑے گی؟ یقیناً تحریک کے ہمنوا کوشش کریں گے کہ قبل اس کے کہ طاقت سے ان کا سامنا ہو وہ اپنے درمیان میں رہنے والے مخالفین کو کچل کر اپنے دائیں بائیں اور پشت کو محفوظ کرلیں۔ جس غیر معمولی نوعیت کی احتجاجی تحریک مشرقی پاکستان میں اس وقت کھڑی ہوئی تھی وہ تو اگر بے جا بھی ہوتی تب بھی آخری حد تک، طاقت کے بجائے حکمت اور سیاست ہی سے اس سے عہدہ برآ ہونا دانشمندی کا تقاضہ تھا۔ مگر یہ تو بیجا بھی نہیں تھی، ایک انصاف پسند آدمی کی نظر میں بالکل معقول اور بالکل بجا تھی۔ اور اس لیے ایک ذمہ دار گورنمنٹ کو لازم تھا کہ بجا طور پر غصہ ہونے والوں کے ساتھ کوئی زیادتی اُس کے ہاتھوں نہ ہونے پائے۔ مشرقی پاکستان کی یہ تحریک جس قدر پُر ہیجان اور ہمہ گیر تھی ـــــ اور الکشن کے نتیجہ کو دیکھتے ہوئے کہ مشکل سے مشرقی پاکستان کی دو ایک سیٹیں عوامی لیگ کے ہاتھ سے بچ سکی تھیں، اسے ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے تھا ـــــ اُسے طاقت کے ذریعہ کچلنے کی کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ ایک طرف تو تحریک کے کم سے کم ہزاروں آدمی اس طاقت کے ہاتھ سے مارے جائیں اور دوسری طرف اس تحریک کے حامی اور زیادہ غصے میں اپنے مخالفوں کا کام تمام کر دینے پہ تُل جائیں۔ اور پھر اسمبلی وغیرہ کا قصہ ہی ختم ہو کر ملک ان حالات سے بدتر حالات میں پہونچ جائے جن سے اسے نکالنے کے لیے الکشن کرائے گئے تھے۔

ان باتوں کو سمجھ لینے کے لیے کسی بہت بڑی عقل کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر یہ دیکھنے کے

باوجود بھی کہ ان کی تقریر سے تحریک میں اور گرمی آئی ہے ٹھنڈک نہیں، صدر پاکستان نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے اقدامات شروع ہی کر دیے ــــ لیکن ابھی دوران میں یہ دیکھ کر کچھ اس بن بھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن سے گفتگو کے لیے ایک نئی سلسلہ جنبانی صدر پاکستان نے شروع کی ہے، محسوس ہوا کہ عقل نے بالآخر بے عقلی پر غلبہ پالیا۔ گفتگو ڈھاکہ میں شروع بھی ہوگئی۔ اور پھر خبریں بھی اچھی آنے لگیں۔ لیکن گفتگو کا خاتمہ ہوا شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری پر۔ اس دس روزہ گفتگو کے دوران میں فوج اور فوجی ساز و سامان مشرقی پاکستان کی بندرگاہوں میں اترتا رہا۔ ڈھاکہ سے شیخ مجیب الرحمٰن کو لیے ہوئے راولپنڈی پہونچنے پر یحییٰ خاں نے جو تقریر نشر کی اُس میں اس بات کی کوئی اطمینان بخش وضاحت وہ نہیں کر سکے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو باغی کہہ کر جیل میں ڈال دینے اور فوج کو یزن کا حکم دے دینے کا کیا جواز اس گفتگو کے دنوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے یہ سمجھنا کچھ بے جا نہیں ہو سکتا کہ گفتگو کا سلسلہ محض ایک دھوکا تھا، مقصد صرف یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں متعین فوج کی مدد کے لیے مزید فوج اور اس کا ساز و سامان پہونچا دینے کا وقت اس گفتگو کے بہانے لے لیا جائے اور جونہی یہ مقصد پورا ہو گیا گفتگو کو طاقت کی کارروائی میں بدل دیا گیا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ بندرگاہوں پر مزید فوج اور گولہ بارود کے اُترنے سے تناؤ بڑھا ہو، تحریک میں حصہ لینے والوں کے تیور سخت ہوئے ہوں، مگر گرفتاری کے وقت شیخ مجیب الرحمٰن کا اپنے گھر ہی پر ملنا اس بات کا ایک قطعی قسم کا ثبوت ہے کہ وہ کسی انتہا پسندانہ ردعمل کا شکار اُس وقت تک بھی نہیں ہوئے تھے۔ ۲۶ تاریخ کو اعلانِ آزادی جس کو کرنا ہوگا وہ ۲۵ کی رات میں اپنے گھر آرام کرتا ہوا نہیں ملے گا۔

بغاوت کا الزام لگا کر شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ فوجی کارروائی کے بعد بھی اگر بات چیت کی کوئی گنجائش نکل سکتی تھی تو اس کا راستہ بھی اپنے ہاتھوں ہی سے اپنے اوپر بند کر لیا جائے۔ مسئلہ تو جب بھی حل ہوتا مشرقی پاکستان کے لیڈروں کی رضامندی ہی سے حل ہو سکتا تھا، اگر بغاوت کے بجائے غدار کی نظر بندی جیسے کسی قانون کے تحت یہ گرفتاری ہوتی تو یہ مضحکہ خیز صورت شاید نہ پیدا ہوئی ہوتی کہ لیڈر تو مغربی پاکستان ہی کی کسی جیل میں موجود ہے لیکن صلح سمجھوتے کے لیے پیغام اُس کے پیرووں کو ریڈیو پر دیے جا رہے ہیں۔ کتنی کوشش اس بات

کی کی گئی کہ مشرقی پاکستان کے منتخب ممبر شیخ مجیب الرحمن اور عوامی لیگ سے بے تعلقی ظاہر کر کے اسمبلی میں آنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ لیکن ایسی لایعنی کوششیں کہیں نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔ ضرورت تھی شیخ مجیب الرحمن سے بات کرنے اور فوجی کارروائی کے بعد کے نئے حالات میں اُن سے کم از کم ایک عارضی سمجھوتہ ایسا کر لینے کی جس میں اپنے غلط قدم پیچھے ہٹا لینے اور مستقل سمجھوتہ کے لیے راہ ہموار کر دینے کا موقع پاکستانی حکمرانوں کو مل جائے۔ مگر شیخ مجیب الرحمن کو تو باغی قرار دے کر ان سے بات چیت ان حکمرانوں نے اپنے اوپر خود ہی حرام کر لی تھی۔

اس بند دروازے کو اگر کوئی کھول سکتا تھا تو یہ حکمراں ہی کھول سکتے تھے۔ مگر انھوں نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ ان کی کسی غلطی کے نتائج چاہے کتنے ہی بُرے نکلیں مگر یہ اُس سے پیچھے ہٹ کر اپنی مونچھ نیچی نہیں کریں گے۔ حد یہ ہے کہ جب ہندوستان میں آ جانے والے لاکھوں پناہ گزینوں کا مسئلہ ہندوستان سے جنگ کے خوفناک امکانات پیدا کرنے لگا۔ اور ان امکانات کے واقعہ بننے کی شکل میں یہ بات بالکل کھلی ہوئی تھی کہ پاکستان اپنی طاقت کے بل پر مشرقی پاکستان کا ہرگز دفاع نہیں کر سکتا، تب بھی شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں اپنی ہٹ سے ہٹنا ان لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہو سکا، ایک خبر، واللہ اعلم کہاں تک سچ ہے، ابھی جنگ کے بعد آئی ہے کہ جنگ چھڑ جانے پر شیخ نے خود فرطِ اضطراب میں چاہا کہ انھیں صدر یحییٰ خاں سے بات کرنے کا موقع مل جائے، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اگر یہ خبر سچ ہے تو انتہا ہے بدعقلی کی۔ گویا اندرا گاندھی کو مشرقی پاکستان دے دینا گوارا ہو مگر مجیب الرحمن کو منھ لگانا نہیں۔

حقائق اور اُن کے تقاضوں سے روگردانی کی اس کتاب کا آخری باب وہ ہے جو سیکورٹی کونسل میں ان لوگوں کی دانائیوں نے تحریر کیا۔ جنرل اسمبلی میں پاس ہونے والی جنگ بندی قرارداد کی بے اثری کے بعد جب دوسری بار سیکورٹی کونسل کا اجلاس امریکا کی درخواست پر شروع ہوا ہے اس وقت مشرقی پاکستان عالمِ نزع میں تھا اور پاکستانی فوج کے لیے لڑتے لڑتے مر جانے یا ہتھیار رکھ کر جان بچانے کے سوا کوئی تیسرا امکان نہیں رہ گیا تھا۔ اور جیسا کہ بعد کے واقعات نے ظاہر کیا پاکستانی حکومت یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اگر جنگ بند نہیں ہوتی تو اس کی فوجیں ہتھیار ڈال دیں — ایسے حالات

میں عقل کا تقاضہ شاید یہی تھا کہ روس جس شرط پر جنگ بندی کی تائید کرنے کے لیے تیار تھا اسے مان لیا جاتا۔ یہ شرط کیا تھی؟ مشرقی پاکستان کے عوام اور حکومت پاکستان کے درمیان جمہوری اُصولوں پر مبنی سیاسی سمجھوتے کی ضمانت بھی دی جائے۔ اس شرط پر جنگ بندی کے بعد مشرقی پاکستان بچتا یا نہ بچتا، پاکستان اس دوہری ذلت سے ضرور بچ جاتا کہ ہندوستانی فوج کے سپرد مشرقی پاکستان بھی کیا اور ایک لاکھ فوج نے ہتھیار ڈالنے کا ننگ بھی اُٹھایا۔ لیکن مسٹر بھٹو (جنھیں، اللہ رحم کرے، اب پاکستان کا سیاہ وسفید سپرد ہو گیا ہے) اسی پر اڑے رہے کہ سیاسی سمجھوتے کی بات وہ کسی کے کہنے سے تو نہیں مانیں گے۔ کیونکہ یہ ان کا داخلی معاملہ ہے۔ البتہ خود سے وہ اس کے لیے بالکل تیار ہیں۔

کیا عقل دشمنی میں عاقبت دشمنی کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی مثال سوچی جا سکتی ہے جس کا ثبوت پاکستان کے خود ساختہ حاکموں اور اُن کے خاص مشیروں نے دیا؟

اب سُنا ہے مسٹر بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن سے بات چیت کر رہے ہیں۔

(۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء)

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے چودھری غلام رسول مہر صاحب نے وفات پائی۔ مشاہیر اہل قلم میں سے تھے۔ ایک مدت صحافت کے میدان میں رہے۔ پھر یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا گوشہ اپنایا۔ اور اسی میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ حضرت سید احمد شہید اور اُن کی تحریک جہاد پر مہر صاحب کی تصنیف، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، ان کے اس دور کا خاص کارنامہ ہے۔ اور انشاء اللہ اُن کے اعمال حسنہ میں شمار ہوگی۔ مسلکاً اہلحدیث تھے مگر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے۔ ایک بار ملاقات میں ایسا اندازہ ہوا تھا جیسے اُن پر کچھ لکھنے کا بڑا تقاضہ اُن کے دل میں ہو۔ مگر اُسکے بعد کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ الفرقان پر بڑے مہربان تھے اور جیسے خیالات کا اظہار اسکے بارے میں کرتے تھے اُس سے قدرتی طور پر ایک گہرے تعلق کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اس لیے انکی وفات کی خبر سے ایک ذاتی صدمے جیسا اثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔

کتابُ المعاشرۃ

معارِفُ الحدیث

(مُسلسل)

لباس کے احکام و آداب (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لباس کے بارہ میں اُن حدود و احکام کی پابندی کے ساتھ جو مذکورۂ بالا احادیث سے معلوم ہو چکے ہیں اسی طرح کے کپڑے پہنتے تھے جس طرح اور جس وضع کے کپڑوں کا اُس زمانہ میں آپ کے علاقہ اور آپ کی قوم میں رواج تھا، آپ تہبند باندھتے تھے، چادر اوڑھتے تھے، کرتا پہنتے تھے، عمامہ اور ٹوپی بھی زیبِ سر فرماتے تھے، اور یہ کپڑے اکثر و بیشتر معمولی سوتی قسم کے ہوتے تھے، کبھی کبھی دوسرے ملکوں اور دوسرے علاقوں کے بنے ہوئے ایسے بڑھیا قیمتی جبے بھی پہن لیتے تھے جن پر ریشمی حاشیہ یا نقش و نگار بنے ہوتے تھے، اسی طرح کبھی کبھی بہت خوشنما یمنی چادریں بھی زیبِ تن فرماتے تھے جو اُس زمانہ کے خوش پوشوں کا لباس تھا — اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ زبانی ارشادات و ہدایات کے علاوہ آپ نے اُمت کو اپنے طرزِ عمل سے بھی یہی تعلیم دی کہ کھانے پینے کی طرح لباس کے بارہ میں بھی وسعت ہے، اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کی پابندی کے ساتھ ہر طرح کا معمولی یا قیمتی لباس پہنا جا سکتا ہے اور یہ کہ ہر علاقہ اور ہر زمانہ کے لوگوں کو

اجازت ہے کہ وہ شرعی حدود و احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا علاقائی قومی پسندیدہ لباس استعمال کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت کے اُن اصحاب صلاح و تقویٰ نے بھی جن کی زندگی میں اتباع سنت کا حد درجہ اہتمام تھا یہ ضروری نہیں سمجھا کہ بس وہی لباس استعمال کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعمال فرماتے تھے ۔۔۔۔ دراصل لباس ایسی چیز ہے کہ تمدن کے ارتقاء کے ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی، اسی طرح علاقوں کی جغرافیائی خصوصیات اور بعض دوسری چیزیں بھی لباس کی وضع قطع اور نوعیت پر اثر انداز ہوتی ہیں اسلیے یہ ممکن نہیں ہو کہ ساری دنیا کے لوگوں کا لباس یکساں ہو یا کسی قوم یا کسی علاقہ کا لباس ہمیشہ ایک ہی رہے اسلیے شریعت نے کسی خاص قسم اور خاص وضع کے لباس کا پابند نہیں کیا ہے، ہاں ایسے اصولی احکام دے دیئے گئے ہیں جن کی ہر زمانہ میں اور ہر جگہ بسہولت پابندی کی جاسکتی ہے۔

ان تمہیدی سطروں کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس سے متعلق چند احادیث ذیل میں پڑھیے۔!

عَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ قَالَ اَخْرَجَتْ اِلَیْنَا عَائِشَةُ کِسَاءً مُلَبَّدًا وَّ اِزَارًا غَلِیْظًا فَقَالَتْ قُبِضَ رُوْحُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ ھٰذَیْنِ ۔۔۔۔۔۔ رواہ البخاری و مسلم

ابو بردہ سے روایت ہے انھوں نے بیان کیا کہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ہم کو نکال کے دکھائی ایک دبیز دوہری چادر اور ایک موٹے کپڑے کا تہبند اور ہمیں بتایا کہ انہی دونوں کپڑوں میں حضور کا وصال ہوا تھا (یعنی آخری وقت میں حضور کے جسم اطہر پر یہی دو کپڑے تھے۔) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ کَانَ اَحَبُّ الثِّیَابِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْقَمِیْصُ ۔۔۔۔۔۔ رواہ الترمذی و ابو داؤد

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں میں کرتا زیادہ پسند تھا۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) کرتے کو حضور غالباً اس لیے زیادہ پسند فرماتے تھے کہ وہ جبے اور چادر کی بہ نسبت

ہلکا ہوتا ہے اور لباس کا مقصد اس سے اچھی طرح پورا ہوتا ہے ۔۔۔۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے کرتے کی آستینیں ہاتھ کے پہنچوں تک ہوتی تھیں اور نیچے کی جانب ٹخنوں سے اوپر تک ہوتا تھا۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَحَبَّ الثِّيَابِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّلْبَسَهَا الْحِبَرَةُ ۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں میں سے حِبَرہ (چادر) کا پہننا بہت پسند تھا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) حِبَرہ یمن کی بنی ہوئی ایک خاص سوتی چادر ہوتی تھی جس میں سُرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں، یہ اوسط درجہ کی اچھی چادروں میں سمجھی جاتی تھی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چادروں میں سے حِبَرہ قسم کی چادر کا استعمال زیادہ پسند فرماتے تھے۔

عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَبِسَ جُبَّةً رُوْمِيَّةً ضَيِّقَةَ الْكُمَّيْنِ ۔۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک (دفعہ) رومی جبہ پہنا جس کی آستینیں تنگ تھیں۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) حضرت مغیرہ کی اسی حدیث کی اکثر دوسری روایتوں میں اس کو "شامی جبہ" کہا گیا ہے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ شام اُس زمانہ میں چونکہ رومی حکومت کے زیرِ اقتدار تھا اس لیے وہاں کی چیزوں کو رومی بھی کہہ دیا جاتا تھا اور شامی بھی! بہر حال اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ دوسری قوموں کے بنائے ہوئے اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے کپڑے استعمال کیے جا سکتے ہیں اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمائے ہیں۔

عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِيْ بَكْرٍ اَنَّهَا اَخْرَجَتْ جُبَّةَ طَيَالِسَةٍ كِسْرَوَانِيَّةً لَهَا لِبْنَةُ دِيْبَاجٍ وَّفَرْجَيْهَا مَكْفُوْفَيْنِ بِالدِّيْبَاجِ وَ قَالَتْ هٰذِهٖ جُبَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ

عِنْدَ عَائِشَةَ فَلَمَّا قُبِضَتْ قَبَضْتُهَا وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُهَا وَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضٰى نَسْتَشْفِي بِهَا۔ رواہ مسلم

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انھوں نے طیلسان کا بنا ہوا ایک کسروانی جبہ نکال کر دکھایا اُس کا گریبان ریشمی دیباج سے بنایا گیا تھا اور دونوں چاکوں کے کناروں پر بھی دیباج لگا ہوا تھا (یعنی گریبان اور جبہ کے آگے پیچھے کے چاکوں پر دیباج کا حاشیہ تھا) اور حضرت اسماء نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبۂ مبارک ہے۔ یہ (میری بہن) عائشہ صدیقہ (اُم المومنین) کے پاس تھا جب اُن کا انتقال ہوگیا تو میں نے لے لیا (یعنی میراث کے حساب میں مجھے مل گیا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو زیب تن فرمایا کرتے تھے اور اب ہم اس کو مریضوں کے لیے دھوتے ہیں اور اس کے ذریعہ شفا حاصل کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح رومی جبہ استعمال فرمایا (جس کا ذکر اوپر والی حدیث میں گزر چکا ہے) اسی طرح آپ نے کسروانی جبہ بھی استعمال فرمایا (جس کی نسبت کسی وجہ سے شاہ فارس کسریٰ کی طرف کی جاتی تھی) اور یہ کہ اس کے گریبان اور چاکوں پر دیبا کا حاشیہ بھی تھا، جس کا اس زمانہ میں رواج تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ دوسری بعض احادیث میں تصریح ہے کہ ریشم کا حاشیہ دو چار اُنگل کا تو مردوں کے لیے جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے یقین ہے کہ اس کسروانی جبہ کا حاشیہ اس حد کے اندر ہی ہوگا۔

دوسری خاص بات اس حدیث سے یہ معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام ہی کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استعمالی کپڑوں سے یہ برکت بھی حاصل کی جاتی تھی کہ ان کا غسالہ (دھوون کا پانی) شفایابی کی اُمید پر مریضوں کو پلایا جاتا یا اُن پر چھڑکا جاتا تھا۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ وَقَدْ أَرْخٰى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ ——— رواہ مسلم

حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا اس وقت آپ سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرمائے ہوئے تھے اور اس کا کنارہ (شملہ) آپ نے پشت پر دونوں مونڈھوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَلْبَسُ قَلَنْسُوَۃً بَیْضَاءَ۔ ——— رواہ الطبرانی فی الکبیر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفید ٹوپی (بھی) زیب سر فرماتے تھے۔ (معجم کبیر طبرانی)

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا خَرَجَتِ الْحَرُوْرِیَّۃُ اَتَیْتُ عَلِیًّا فَقَالَ اِئْتِ ھٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ فَلَبِسْتُ اَحْسَنَ مَا یَکُوْنُ مِنْ حُلَلِ الْیَمَنِ ——— قَالَ اَبُوْ زُمَیْلٍ وَکَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَجُلًا جَمِیْلًا جَھِیْرًا ——— قَالَ فَاَتَیْتُھُمْ، قَالُوْا مَرْحَبًا بِکَ یَا ابْنَ عَبَّاسٍ! مَا ھٰذِہِ الْحُلَّۃُ؟ قُلْتُ مَا تَعِیْبُوْنَ عَلَیَّ لَقَدْ رَاَیْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحْسَنَ مَا یَکُوْنُ مِنَ الْحُلَلِ ——— رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خوارج کا ظہور ہوا تو میں حضرت علی کے پاس آیا انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم ان لوگوں کے (یعنی گروہِ خوارج کے) پاس جاؤ (اور ان کو سمجھانے اور ان پر حجت قائم کرنے کی کوشش کرو) ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے حسین و نفیس قسم کا ایک یمنی جوڑا پہنا ——— واقعہ کے راوی ابوزمیل کہتے ہیں کہ ابن عباس خود بہت حسین و جمیل تھے اور آواز بھی زوردار تھی ——— آگے ابن عباس بیان فرماتے ہیں کہ جب میں خوارج کی جماعت کے پاس پہونچا تو انھوں نے مرحبا کہہ کے میرا استقبال کیا اور ساتھ ہی (طنز و اعتراض کے طور پر) کہا کہ یہ بڑھیا جوڑا (جو آپ پہنے ہوئے ہیں) کیا ہے (مطلب یہ تھا کہ یہ بڑھیا قسم کا حسین و جمیل لباس اسوۂ نبوی اور مقام تقویٰ کے خلاف ہے) (حضرت ابن عباس فرماتے ہیں) میں نے کہا کہ تم میرے اس اچھے

لباس پر کیا اعتراض کرتے ہو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حسین سے حسین جوڑا پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح حضرت عبداللہ ابن عباس کے اس بیان سے بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی اچھا نفیس لباس بھی استعمال فرمایا ہے، اس لیے ان خوارج کا یہ سمجھنا کہ اچھا اور عمدہ لباس پہننا طریقۂ نبوی یا مقام تقویٰ کے خلاف ہے، ان کی جہالت تھی، ہاں اگر پہننے والے کا مقصد تفاخر و استکبار اور اپنی بڑائی کی نمائش ہو، تو جیسا کہ احادیث سے معلوم ہو چکا ہے سخت درجہ کی معصیت اور موجبِ غضبِ خداوندی ہے۔ لیکن اگر اظہارِ نعمت کی نیت سے یا کسی دوسری دینی مصلحت سے پہنا جائے تو نہ صرف جائز بلکہ باعثِ اجر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہننا اظہارِ نعمت کے لیے بھی تھا اور لانے والوں کی تطییبِ خاطر کے لیے بھی، اور بیانِ جواز کے لیے بھی۔

لباس میں داہنی طرف سے ابتدا حضورؐ کا معمول تھا:-

بائیں اعضا کے مقابلہ میں داہنے اعضاء کو جو فضیلت حاصل ہے اور اس کی جو حکمت ہے اُس کا ذکر "آدابِ طعام" کے ذیل میں کیا جا چکا ہے، اسی فضیلت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ لباس میں داہنی طرف سے ابتدا فرماتے تھے، یعنی جو کپڑا پہنتے داہنی جانب سے پہننا شروع فرماتے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا لَبِسَ قَمِيصًا بَدَأَ بِمَيَامِنِهِ ـــــــ رواه الترمذی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کرتا پہنتے تو داہنی جانب سے شروع فرماتے (جامع ترمذی)

تشریح اس حدیث میں کرتے کا ذکر بطور مثال کے سمجھنا چاہیے۔ حضرت ابوہریرہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ حضور نے ہدایت فرمائی کہ "جب کپڑا پہنا جائے یا وضو کیا جائے تو داہنے اعضاء سے شروع کیا جائے۔"

کپڑا پہننے کے وقت کی حضور کی دعا۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَجَدَّ ثَوْبًا سَمَّاہُ بِاسْمِہٖ عِمَامَۃً اَوْ قَمِیْصًا اَوْ رِدَاءً ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا کَسَوْتَنِیْہِ اَسْاَلُکَ خَیْرَہٗ وَخَیْرَ مَا صُنِعَ لَہٗ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّہٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَہٗ ___ رواہ الترمذی

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نیا کپڑا پہنتے عمامہ یا کرتا یا چادر تو اُس کا نام لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں کہتے کہ "اے اللہ تیرا شکر اور تیری حمد جیسا کہ تو نے مجھے پہننے کو دیا یہ (عمامہ یا کرتا یا چادر) خداوندا میں تجھ سے مانگتا ہوں اُس کا خیر اور جو اس کے وجود کا مقصد ہے اُس کا خیر (یعنی یہ کپڑا میرے لیے باعث خیر ہو اور اس کا جو اچھا مقصد ہو وہ مجھے نصیب ہو مثلاً اس کو پہن کر تیری عبادت کروں اور تیرا شکر ادا کروں) اور میں مانگتا ہوں اُس کے شر سے اور اس کے مقصد یعنی استعمال کے شر سے تیری پناہ (یعنی اس کپڑے میں اور اس کے استعمال میں جو شر ہو سکتا ہے اُس سے میری حفاظت فرما)

(جامع ترمذی)

تشریح کپڑا پہننے کے وقت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور مختصر دعا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے "آداب لباس" کے بالکل شروع میں بھی درج کی جا چکی ہے ___ اور اسی سلسلۂ معارف الحدیث جلد پنجم میں سنن ابی داؤد کے حوالے سے یہ حدیث درج ہو چکی ہے کہ جو شخص کپڑا پہنتے وقت اللہ تعالیٰ کے شکر و حمد کا یہ کلمہ دل و زبان سے کہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ ھٰذَا وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ"[1] تو اس کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے ___ اللہ تعالیٰ عمل کی اور ہر نعمت پر حمد و شکر کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1] اس دعا کا ترجمہ یہ ہے۔ "اُس اللہ کے لیے حمد و شکر جس نے مجھے یہ کپڑا پہنایا اور بغیر میری سعی و محنت کے محض فضل سے مجھے عطا فرمایا۔"

جوتے پہننے کے بارے میں ہدایات:۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزْوَةٍ غَزَاهَا يَقُوْلُ اِسْتَكْثِرُوْا مِنَ النِّعَالِ فَاِنَّ الرَّجُلَ لَا يَزَالُ رَاكِبًا مَا انْتَعَلَ ——— رواه مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے ایک سفر پر روانہ ہو رہے تھے، میں نے آپ کو سنا آپ ہدایت دے رہے تھے کہ لوگو جوتیاں زیادہ لے لو، کیونکہ آدمی جب تک پاؤں میں جوتا پہنے رہتا ہو تو وہ سوار کی طرح رہتا ہو۔

——— (صحیح مسلم)

تشریح) یہ واقعہ اور تجربہ ہے کہ جو آدمی جوتا پہن کے چلتا ہے وہ بہ نسبت اس شخص کے جو بغیر جوتا پہنے چلے تیز بھی چلتا ہے اور کم تھکتا ہے۔ اس کا پاؤں محفوظ بھی رہتا ہے، یہی مطلب ہے اس کا کہ "وہ سوار کی طرح رہتا ہے" — اور ہمارے اس زمانے میں تو فوجیوں کے لیے ان کا خاص جوتا ان کی وردی کا جزء ہے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْتَعَلَ اَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَءْ بِالْيُمْنٰى وَاِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَءْ بِالشِّمَالِ لِتَكُنِ الْيُمْنٰى اَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ ——— رواه البخاری ومسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو پہلے داہنے پاؤں میں پہنے اور جب نکالنے لگے تو پہلے بائیں پاؤں سے نکالے، (الغرض) داہنا پاؤں جوتا پہننے میں مقدم اور نکالنے میں موخر ہو۔

(صحیح بخاری ومسلم)

تشریح) ظاہر ہے کہ جوتا پہننے میں پاؤں کا اکرام واعزاز ہے اور داہنے اعضا کو بائیں اعضاء کے مقابلہ میں جو فضیلت اور ترجیح حاصل ہے (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) اس کا حق اور تقاضا ہے کہ جوتا داہنے پاؤں میں پہنا پہلے جائے اور نکالا بعد میں جائے۔

انگشتری اور مُہر کے بارے میں حضور کا طرزِ عمل اور ہدایات :-

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرَادَ اَنْ یَّکْتُبَ اِلٰی کِسْرٰی وَقَیْصَرَ وَالنَّجَاشِیِّ فَقِیْلَ اِنَّھُمْ لَا یَقْبَلُوْنَ کِتَابًا اِلَّا بِخَاتَمٍ فَصَاغَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَاتَمًا حَلْقَۃً فِضَّۃٍ نُقِشَ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ ———— (رواہ مسلم۔) (وفی روایۃٍ للبخاری کَانَ نَقْشُ الْخَاتَمِ ثَلٰثَۃَ اَسْطُرٍ مُحَمَّدٌ سَطْرٌ وَرَسُوْلٌ سَطْرٌ وَاللّٰہُ سَطْرٌ۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ شاہ فارس کسریٰ اور شاہ روم قیصر اور شاہ حبشہ نجاشی کو خطوط لکھائیں (اور اُن کو اسلام کی دعوت دیں) تو آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ حکمراں لوگ مُہر کے بغیر خطوط کو تسلیم نہیں کرتے تو حضور نے مہر بنوائی جو چاندی کی انگوٹھی تھی اس میں نقش تھا "محمد رسول اللہ"۔

(صحیح مسلم)

[اور اسی حدیث کی صحیح بخاری کی روایت میں یہ تفصیل بھی ہے کہ مہر میں تین سطریں تھیں ایک سطر میں "محمد" دوسری سطر میں "رسول" اور تیسری سطر میں "اللہ"]

تشریح) صحیح روایات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۶ھ کے آخر میں سفر حدیبیہ سے واپسی کے بعد اس وقت کی دُنیا کے بہت سے مشہور بادشاہوں اور حکمرانوں کو دعوتی خطوط لکھائے تھے — اسی وقت یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپ نے ان خطوط کے لکھانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو بعض صحابہ نے جو ان حکومتوں کے طور طریقوں سے کچھ باخبر تھے عرض کیا کہ ان خطوط پر حضور کی مہر ہونا ضروری ہے، یہ حکمراں لوگ مہر کے بغیر کسی خط کو کوئی اہمیت نہیں دیتے (گویا ایسے خطوط اُن کے پاس ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتے ہیں) — حضور نے یہ مشورہ قبول فرما لیا اور چاندی کی ایک انگوٹھی بنوا لی جس کے نگینہ میں "محمد رسول اللہ" کندہ تھا — صحیح بخاری کی روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ تینوں لفظ تین سطروں میں نیچے اوپر لکھے گئے تھے — اس طرح (اللہ / رسول / محمد) یہی آپ کی مُہر اور یہی آپ کی انگوٹھی تھی، روایات میں بائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی میں پہننے کا بھی ذکر آتا ہے

اور داہنے ہاتھ میں بھی، گویا کبھی آپ داہنے ہاتھ میں پہن لیتے تھے اور کبھی بائیں ہاتھ میں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰی خَاتَمًا مِنْ ذَھَبٍ فِیْ یَدِ رَجُلٍ فَنَزَعَہٗ فَطَرَحَہٗ، فَقَالَ یَعْمِدُ اَحَدُکُمْ اِلٰی جَمْرَۃٍ مِنْ نَارٍ فَیَجْعَلُھَا فِیْ یَدِہٖ فَقِیْلَ لِلرَّجُلِ بَعْدَ مَا ذَھَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خُذْ خَاتَمَکَ اِنْتَفِعْ بِہٖ قَالَ لَا وَاللّٰہِ لَا اٰخُذُہٗ اَبَدًا وَقَدْ طَرَحَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ ـــــــــــــ رواہ مسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ نے اس کے ہاتھ سے نکال کر پھینک دی اور ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کسی کسی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی خواہش سے دوزخ کا انگارہ لے کر اپنے ہاتھ میں پہن لیتا ہے (یعنی مرد کے لیے سونے کی انگوٹھی گویا دوزخ کی آگ ہے جو اُس نے شوق سے ہاتھ میں لے رکھی ہے)۔۔۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے تشریف لے گئے تو کسی نے اُن صاحب سے کہا (جن کے ہاتھ سے سونے کی انگوٹھی نکال کر حضور نے پھینک دی تھی) کہ اپنی انگوٹھی اٹھالو اور (کسی طرح) اپنے کام میں لے آؤ (مثلاً فروخت کر دو یا گھر کی خواتین میں سے کسی کو دے دو) اُن صاحب نے کہا خدا کی قسم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پھینک دیا ہے تو اب کبھی میں اس کو نہیں اٹھاؤں گا۔ (صحیح مسلم)

تشریح اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سونے کے دوسرے زیورات کی طرح اس کی انگوٹھی کا استعمال بھی مردوں کے لیے حرام و ناجائز ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مناسب اور مفید سمجھا جائے تو اپنے خاص لوگوں کے ساتھ اصلاح کا یہ طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس جو چیز شریعت کے خلاف ہو اُس کو چھین کر پھینک دیا جائے یا توڑ پھوڑ دیا جائے۔

اُن صحابی نے لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنی سونے کی انگوٹھی نہیں اٹھائی اور وہ جواب دیا جو حدیث میں مذکور ہوا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام کا ایمانی مقام کیا تھا۔۔۔

اللہ تعالیٰ اس کا کوئی حصہ ہم کو بھی نصیب فرمائے۔

ڈاڑھی مونچھ کے بالوں اور ظاہری ہیئت سے متعلق ہدایات:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور طرز عمل سے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ظاہری ہیئت اور شکل وصورت کے بارے میں بھی امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔ اس سلسلہ کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے!۔

عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْفِطْرَةُ خَمْسٌ اَلْخِتَانُ وَالْاِسْتِحْدَادُ وَقَصُّ الشَّارِبِ وَتَقْلِيْمُ الْاَظْفَارِ وَنَتْفُ الْاِبِطِ۔ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ پانچ چیزیں انسان کی فطرت سلیمہ کے تقاضے اور دین فطرت کے خاص احکام ہیں۔ ختنہ، اور زیر ناف بالوں کی صفائی، اور مونچھیں تراشنا اور ناخن لینا اور بغل کے بال لینا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) بعض دوسری حدیثوں میں ان چیزوں کو انبیاء ومرسلین کی سنت اور ان کا طریقہ بتایا گیا ہے اور چونکہ یہ انسانی فطرت کے تقاضے ہیں اس لیے ہونا بھی یہی چاہیے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی طریقہ اور یہی ان کی تعلیم ہو۔ ان سب میں جو چیز مشترک ہے وہ طہارت وصفائی اور پاکیزگی ہے جو بلاشبہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔

عَنْ اَنَسٍ قَالَ وُقِّتَ لَنَا فِیْ قَصِّ الشَّوَارِبِ وَتَقْلِيْمِ الْاَظْفَارِ وَنَتْفِ الْاِبِطِ وَحَلْقِ الْعَانَةِ اَنْ لَا نَتْرُكَ اَكْثَرَ مِنْ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً۔ ——— رواہ مسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مونچھیں ترشوانے اور ناخن لینے اور بغل اور زیر ناف کی صفائی کے سلسلہ میں ہمارے واسطے حد مقرر کر دی گئی ہے کہ ۴۰ دن سے زیادہ نہ چھوڑیں۔ (صحیح مسلم)

تشریح کنز العمال میں بیہقی کی شعب الایمان کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ کو نماز جمعہ کو نکلنے سے پہلے اپنے ناخن تراشتے اور لبیں لیتے تھے۔"[1] اس لیے مسنون یہی ہے کہ ہر ہفتے یہ جسمانی اصلاح وصفائی کا کام کیا جائے، اور آخری حد ۴۰ دن تک کی ہے، جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا۔ اگر اس سے زیادہ تغافل برتا تو ایک درجہ کی نافرمانی ہوگی، اور علماء نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے نماز بھی مکروہ ہوگی

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْهِكُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللِّحٰى ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مونچھوں کو خوب باریک کرو اور ڈاڑھیاں چھوڑو (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

تشریح دوسری بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلے انبیاء ومرسلین کا طریقہ بھی یہی تھا کہ وہ ڈاڑھیاں رکھتے اور مونچھیں باریک کراتے تھے۔

جیسا کہ ظاہر ہے، ڈاڑھی رجولیت کی علامت اور وقار کی نشانی ہے۔ خود مغربی اقوام میں بھی (جہاں ڈاڑھی نہ رکھنے کا عام رواج ہے) ڈاڑھی کو قابل احترام اور عظمت کی علامت سمجھا جاتا ہے کاش ہم مسلمان محسوس کریں کہ ڈاڑھی رکھنا ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم اور سارے نبیوں، رسولوں کی سنت اور ان کے طریقہ سے وابستگی کی علامت ہے۔ اور ڈاڑھی نہ رکھنا ان کے منکروں کا طریقہ ہے۔

اس حدیث میں صرف ڈاڑھی چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ ڈاڑھی کس حد تک چھوڑی جائے، بلکہ اس کے الفاظ سے شبہ ہو سکتا ہے کہ کسی صورت میں بھی اس کو قینچی نہ لگائی جائے اور کم نہ کرایا جائے، لیکن آگے متصلاً امام ترمذی کی روایت سے حضرت عبد اللہ ابن عمرو بن العاص کی جو حدیث درج کی جا رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک (برابر اور ہموار کرنے کے لیے) اس کے عرض میں سے بھی اور طول میں سے بھی کچھ ترشوا دیتے تھے ——— اور مندرجہ بالا حدیث "اَنْهِكُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللِّحٰى" کے

---

[1] کنز العمال ص ۲۵ ج ۴۔

راوی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی روایت میں ہے کہ ان کی ڈاڑھی کے جو بال ایک مشت سے زیادہ ہوتے وہ ان کو ترشوا دیتے تھے، بعض دوسرے صحابہ کا طرزِ عمل بھی یہی روایت کیا گیا ہے، ان سب روایات کی روشنی میں زیرِ تشریح حدیث "اِنْهَكُوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰى" کا مطلب اور مدعا یہ ہوگا کہ ڈاڑھی رکھی جائے نہ منڈائی جائے نہ زیادہ کم کرائی جائے۔

ہمارے فقہاء نے ایک مشت سے کم کرانے کو نادرست کہا ہے۔ ایک مشت کی مقدار کی یہ تحدید کسی حدیث میں نہیں ہے۔ غالباً اس کی بنیاد یہی ہے کہ صحابہ کرام سے ایک مُشت تک رکھنا تو ثابت ہے اس سے کم کرانا ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهٖ مِنْ عَرْضِهَا وَطُوْلِهَا۔

رواہ الترمذی

عمرو بن شعیب اپنے والد شعیب سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریشِ مبارک کے عرض سے بھی اور طول سے بھی کچھ ترشوا دیتے تھے۔ (جامع ترمذی)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ لَهٗ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ ۔ رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے بال ہوں اس کو چاہیے وہ ان بالوں کا اکرام کرے۔

(سنن ابوداؤد)

(تشریح) بالوں کا اکرام یہ ہے کہ اُن کو دھویا جائے، حسبِ ضرورت تیل لگایا جائے، اُن میں کنگھی بھی کی جائے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل بھی یہی تھا، آپ ہمیشہ سر پر بال رکھتے تھے جو کبھی کانوں تک اور کبھی کانوں کے نیچے تک رہتے تھے، آپ ان کو اہتمام سے دھوتے بھی تھے ان میں تیل بھی لگاتے تھے، کنگھی بھی فرماتے تھے، علماء نے لکھا ہے کہ حج اور عمرہ کے سوا کبھی سر کے بالوں کا منڈوانا آپ سے ثابت نہیں۔

عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَىٰ عَنِ الْقَزَعِ ــ قِيلَ لِنَافِعٍ مَا الْقَزَعُ؟ قَالَ يُحْلَقُ بَعْضُ رَأْسِ الصَّبِيِّ وَيُتْرَكُ الْبَعْضُ ــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے خادم) نافعؒ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ منع فرماتے تھے قَزَع سے ــــ نافع سے پوچھا گیا کہ قزع کا کیا مطلب؟ انھوں نے کہا کہ قزع یہ ہے کہ بچے کے سر کے کچھ حصے کے بال مونڈ دیئے جائیں اور کچھ حصہ کے چھوڑ دیے جائیں۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے صحیح مسلم میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچہ کو دیکھا جس کے سر کے کچھ بال مونڈ دیے گئے اور کچھ چھوڑ دیے گئے تھے تو آپ نے لوگوں کو اس سے منع فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ یا تو پورا سر مونڈا جائے یا پورے سر پر بال چھوڑ دیئے جائیں ــــ اس حکم کی وجہ ظاہر ہے، سر کے کچھ حصے کے بال مونڈ دینا اور کچھ چھوڑ دینا انتہائی بے ڈھنگے پن کی بات ہے اور اس سے بچے کی شکل بگڑ جاتی ہے۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ممانعت فرمائی ہے۔ اس حکم پر اس سے ملتی جلتی دوسری صورتوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

عورتوں کو مہندی لگانے کا حکم :-

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ هِنْدًا بِنْتَ عُتْبَةَ قَالَتْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ بَايِعْنِي فَقَالَ لَا أُبَايِعُكِ حَتّٰى تُغَيِّرِي كَفَّيْكِ فَكَأَنَّمَا كَفَّا سَبُعٍ۔

ــــــــــ رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ ہند بنت عتبہ نے حضور سے عرض کیا کہ مجھے بیعت کر لیجیے! آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اُس وقت تک بیعت نہیں کروں گا جب تک کہ تم (مہندی لگا کر) اپنے ہاتھوں کی صورت نہ بدلو گی (تمہارے ہاتھ اس وقت) کسی درندے

کے سے ہاتھ معلوم ہوتے ہیں۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) یہ ہند بنت عتبہ ابو سفیان کی بیوی تھیں، فتح مکہ کے دن اسلام لائیں اور اسی دن قریش کی دوسری بہت سی عورتوں کے ساتھ پہلی بیعت کی۔۔۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں ہندہ کی طرف سے جس بیعت کی درخواست کا ذکر ہے بظاہر یہ انھوں نے بعد میں کسی وقت کی ہے اور اسی موقع پر حضور نے ان کو ہاتھوں میں مہندی لگانے کی یہ ہدایت فرمائی ۔۔۔ دوسری بعض روایات میں اور بھی بعض عورتوں کا ذکر ہے جن کو آپ نے مہندی استعمال کرنے کی اسی طرح تاکید فرمائی ۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت و تعلیم سے اسلامی شریعت کا یہ نقطۂ نظر معلوم ہو گیا کہ عورتوں کو جائز حد تک زینت اور سنگھار کے اسباب استعمال کرنے چاہئیں، ظاہر ہے کہ یہ چیز اُن کے اور اُن کے شوہروں کے درمیان محبت اور قلبی تعلق میں اضافہ کا باعث ہوگی۔

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ، اپنے مکتوبات کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ۔ از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

(اب سے بیس۲۰ سال پہلے حضرت شاہ غلام علیؒ دہلوی کے ملفوظات (دُرّ المعارف) کی تلخیص الفرقان (از ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ تا محرم الحرام ۱۳۷۲ھ) میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر حضرت مولانا نعمانی مدظلہٗ نے عرصہ ہوا مکاتیب شاہ غلام علیؒ کے تلخیص و ترجمہ کی طرف احقر کی توجہ دلائی تھی۔ اپنے تساہل کے باعث اس کام میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی، اب ایسے وقت میں فرمائش کی تعمیل کر رہا ہوں جبکہ نظر کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے ناظرین اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ چند اقساط میں یہ کام بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔ اِن مکتوبات کے جامع شاہ رؤف احمد رافتؔ مجددی رامپوریؒ ہیں۔ دُرّ المعارف کے مرتب و مدون بھی وہی ہیں۔ سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علیؒ کے مختصر حالات و سوانح نزہۃ الخواطر جلد ہفتم (مولفہ حکیم عبد الحی حسنی رائے بریلویؒ) سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں)

مختصر حالات | الشیخ الامام العالم الزاہد غلام علی بن عبد اللطیف العلوی النقشبندی البٹالوی الدہلوی

آپ ۱۱۵۶ھ میں بٹالہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اپنے علاقے میں تحصیلِ علومِ دینیہ کرنے کے بعد دہلی آئے۔ یہاں حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلویؒ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل

ہو کر صحیح بخاری کا درس لیا اور سند حدیث حاصل کی۔

بائیس سال کی عمر میں شیخ کبیر حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ سے بیعت ہو کر طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی تکمیل کی اور خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے شیخ کی خدمت میں اُن کی شہادت کے وقت تک رہے۔ شیخ کے بعد مسند ارشاد پر فائز ہو کر جانشینی کا حق ادا کر دیا ـــــ منجانب اللہ آپ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، عرب و عجم کے علماء و مشائخ اور عوام جوق در جوق آپ کی مجلس ارشاد میں حاضر ہو کر "یقین محکم" کی دولت حاصل کرتے تھے ـــــ خود قرآن مجید کے دس پاروں کی روزانہ تلاوت، ذکر "نفی و اثبات" و "اسم ذات" اور استغفار و درود کی کثرت نیز پوری طرح پابندیٔ اوقات اور اعمال و اخلاق میں اتباع شریعت مطہرہ کا اہتمام کرتے ہوئے اپنے مُریدین و مسترشدین کے اعمال و اخلاق اور اوراد و اذکار کی بھی کڑی نگرانی فرماتے تھے۔

سرسید احمد خاں مرحوم "آثار الصنادید" میں آپ کی خصوصیات و معمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ زہد و قناعت، تسلیم و رضا، توکل و ایثار اور ترک و تجرید میں یگانہ دہر تھے۔ آپ نے سادہ زندگی بسر کی، قیمتی لباس اور لذیذ کھانوں سے پرہیز کیا۔ جو کچھ فتوحات ہوتی تھیں وہ درویشوں اور مستحقین کے صرف میں آتی تھیں۔ اوّل وقت، نمازِ فجر پڑھکر اور تلاوتِ قرآن مجید کر کے اپنے اصحاب کو توجہ دیتے تھے۔ یہ سلسلہ اشراق تک رہتا تھا، نمازِ اشراق پڑھکر حدیث و تفسیر کا درس دیتے تھے، دوپہر کو تھوڑا سا کھانا تناول فرما کر قیلولہ فرماتے۔ اوّل وقت نمازِ ظہر پڑھکر فقہ، حدیث اور تصوف کا درس دیتے.... عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا، پھر بعد نمازِ عصر اپنے اصحاب کو توجہ دیتے۔ رات کا اکثر حصہ عبادت میں صرف فرماتے، بہت کم سوتے تھے۔ آپ کا سونا مصلّے پر ہی ہوتا تھا۔ آپکی خانقاہ میں سیکڑوں طالبین اور درویش رہتے تھے جن کو آپ کے مطبخ سے کھانا ملتا تھا۔

شیخ مُراد ابن عبد اللہ نے "ذیل الرشحات" میں آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ آپ قلیل المنام اور قلیل الطعام تھے۔ جب کسی مُرید کو تہجد کے وقت غفلت کی نیند سوتا دیکھتے خود اس کو جگاتے تھے۔ اغنیاء آپ کی خدمت میں پُر تکلف کھانے پکوا کر بھیجتے۔ آپ نہ خود اُن کھانوں کو کھاتے نہ طالبین کو کھلاتے، بلکہ پڑوس کے مستحقین کو تقسیم فرما دیتے تھے۔ رات کا اکثر حصہ ذکر و مُراقبہ میں گزرتا تھا۔ رات کو آپ کا سونا زیادہ تر بیٹھے بیٹھے ہوتا۔ آپ کی وفات بھی بحالتِ احتباء بیٹھے بیٹھے

ہوئی۔ کوئی حاجت مند آپ کی کوئی چیز بغیر اجازت لیتا تو آپ چشم پوشی فرماتے تھے۔ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ کوئی شخص آپ سے ایک کتاب لے گیا اور کچھ عرصے کے بعد اُس کو فروخت کرنے کے لیے آپ ہی کے پاس خانقاہ میں لایا۔ آپ نے خرید لی، کسی خادم نے کہا بھی کہ حضرت یہ کتاب آپ ہی کی تھی اس پر علامت موجود ہے تو اس کو دخل دینے سے سختی سے منع فرماتے اور یوں فرماتے کہ ایک کتاب متعدد کتابیں لکھتا ہو ہوسکتا ہو کہ اس جیسی کتاب ہو بعینہٖ وہ نہ ہو۔

آپ موٹا لباس پہنتے تھے، اگر کوئی شخص آپ کو نفیس کپڑا یا کوئی قیمتی چیز ہدیے میں بھیجتا تو اس کو فروخت کر دیتے تھے اور اُس کی قیمت سے اسی جنس کی سستی قسم کی بہت سی ضروری اشیاء خرید لیتے تھے اور اُن کو صدقہ کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ کئی آدمیوں کا نفع اٹھانا ایک آدمی کے نفع اُٹھانے سے بہتر ہے۔

دنیا کے ذکر کی آپ کی مجلس میں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ آپ کی مجلس، حضرت سفیان ثوریؒ کی مجلس کی مانند ہوتی تھی۔ اگر کوئی کسی کی غیبت کرتا تھا تو یوں فرما دیا کرتے اگر کسی کو برائی سے یاد کرنا ہی ہے تو میں اس کا سب سے زیادہ مستحق ہوں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر آپ کی عادتِ ثانیہ تھی۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت آپکو حق بات سے نہیں روکتی تھی۔

سید اسمٰعیل مدنی، شیخ احمد، شیخ خالد کردی، شیخ جان محمد باجوری، شیخ ابوسعید مجددی دہلوی، شیخ احمد سعید، شیخ رؤف احمد رامپوری، شیخ بشارت اللہ بہرائچی، سید ابوالقاسم ابن مہدی حسینی الواسطی (شیخ عبدالغفور غوجوی، قاری امام الدین بخشی امروہی، حافظ عبدالحیٔ امروہی) اور بہت سے علماء و مشائخ نے آپ سے طریقۂ مجددیہ نقشبندیہ کو اخذ کیا اور خلافت حاصل کی۔

آپ کی تصنیفات میں بہت سے رسائل ہیں جن میں مقاماتِ مظہریہ اور ایضاح الطریقہ کو اہمیت حاصل ہے۔ ۲۲ صفر المظفر ۱۲۴۰ھ کو آپ نے دہلی میں وصال فرمایا۔ خانقاہ میں آپ کا مزار ہے۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"منعمِ حقیقی جل شانہٗ کی نعمتہائے کثیرہ کا شکر ادا کرنا طاقتِ بیان سے باہر ہے کہ اس نے ہم کو اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا کر کے عقائدِ اہلِ سنت و جماعت سے سرفراز فرمایا۔ اور تمام اُمت پر شیخین (حضرت ابو بکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروقؓ) کی تفضیل کے عقیدے اور ہر دو داماد رسولؐ (یعنی حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ) کی محبت نیز تعظیم اہلِ بیت عظامؓ اور احترام اصحابِ کرامؓ کی دولت سے ممتاز کیا۔ یہ محبت و تعظیم ایمان و نجات کے دو رکن ہیں۔

حضرت شاہ احمد سعید مجددی فاروقیؒ کو ارقام فرماتے ہیں "مقبولِ بارگاہِ الٰہی حافظ احمد سعید سلمہ اللہ تعالےٰ از جانبِ فقیر غلام علی عفی عنہٗ بعد سلام و دعا مطالعہ کریں۔ تمہارا خط پہونچا مسرور کیا۔ خط کے اندر القاب و آداب میں تکلف نہ کیا کرو (سیدھے سادے طریقے پر بغیر لمبے چوڑے القاب کے خط لکھا کرو)۔ وظائفِ اعمالِ حسنہ میں اوقات لگانے، نیز نگہداشت نسبت باطن، تحصیل علم، اپنے بزرگوں کے مکتوباتِ شریفہ اور کتبِ قدمائے صوفیہ مثلاً عوارف، تعرف، آداب المریدین کے مطالعے، رضائے الٰہی کی طلب اور شوقِ لقائے الٰہی میں اپنے اوقات صرف کرو۔ مجھے بھی دعائے خیر میں یاد رکھنا۔ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے آبائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کے کمالات سے بہرۂ وافر عطا فرمائے۔ اپنے والد ماجد (شاہ ابو سعید مجددی) کی صحبت کو لازم سمجھو......."

جامع مکاتیب شاہ رؤف احمد رافت مجددی فاروقی رامپوریؒ کو تحریر فرماتے ہیں۔

لہ آپ حضرت شاہ ابو سعید مجددیؒ کے صاحبزادے ہیں۔ حضرت شاہ غلام علیؒ سے فیوض حاصل کر کے اپنے والد ماجد کے خلیفۂ مجاز ہوئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ہجرت کر گئے۔ ۱۲۷۷ھ میں انتقال ہوا جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں دفن ہوئے۔ لہ شاہ رؤف احمد ابن شاہ شعور احمد مجددیؒ۔ آپ کی ولادت رامپور میں ۱۲۰۱ھ میں ہوئی۔ تعلیم مفتی شرف الدین اور دیگر اساتذہ رامپور سے پائی۔ حدیث، حضرت شاہ عبد العزیزؒ اور اپنے ماموں حضرت شاہ سراج احمدؒ سے پڑھی۔ آپ حضرت شاہ غلام علیؒ کے اُن مایۂ ناز خلفاء میں سے ہیں جن پر پیر و مرشد کو بڑا اعتماد اور محبت آمیز فخر تھا۔ ۱۲۳۱ھ میں اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲۵۲ھ کے آغاز میں آپ کو سفرِ حرمین شریفین کا شوق دامنگیر ہوا۔ بھوپال سے احرام باندھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ——— ایک مدت ہوگئی کہ تم نے ارسال خط سے سرور نہیں کیا۔ اس کی وجہ معلوم نہیں کیا ہے؟ جو طریقہ تم کو تلقین کیا گیا ہے اس پر قائم رہو اور اپنے نیز اپنے متوسلین کے احوالِ باطن لکھو۔ ترکِ آرزو اور ترکِ ماسوا کے ساتھ ساتھ یکسو ہو کر اپنے آبائے کرام کے طریقے کی مشق کرو۔ کچھ عرصے کے لیے دہلی کا قصد کرلو۔ ورنہ اسی قدر کافی ہے جو تم کو پہونچ گیا ہے۔ بس اسی پر ثابت قدم رہو۔ اور ہاں مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے میرے مُزخرفات (یعنی ملفوظات) کو جمع کیا ہے یہ بہت بیجا کیا اور اس سے زیادہ بیجا بات یہ ہے کہ اُن کا ذکر کرتے رہتے ہو۔ اُن کو دھو ڈالو اور پارہ پارہ کردو۔ نفحات، رشحات، مکتوبات حضرت مجددؒ اور کلام قدمائے صوفیہ مثلاً عوارف تعرف، احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، تہذیب وعبرت اور عمل کے لیے کافی ہیں۔ مذاکرہ کرو تو حدیث وتفسیر کا کرو۔ یہ بہت ضروری عمل ہے۔ اگر بالفرض تم یہاں آؤ تو پیرزادگی کو چھوڑ کر اور خاکساری وفروتنی کو اختیار کر کے آنا اور میری تیری (باتوں) کو نیز فعلتُ کذا (میں نے ایسا کیا) اور افعل کذا (میں ایسا کروں گا) ان سب باتوں کو ترک کر کے آنا۔ والسلام۔

مکتوب بنام شیخ قمر الدین پشاوری میں یوں رقم طراز ہیں۔

میاں قمر الدین صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مدت ہوگئی کہ تم نے اپنے وطن پہونچکر وہاں کے حالات سے مسرور نہیں کیا۔ دل نگراں ہے اُمید کہ اپنی صحت وسلامتی کے متعلق اور کیفیاتِ ذکر ومراقبات کو (حسب تعلیم وتلقین ذکر ومراقبات کرکے) اور ہر مراقبے کے حالات اور اُن لوگوں کے حالات جو تمہارے پاس برائے طلب توجہ آتے ہیں، تحریر کروگے۔ فقیر کو بہت انتظار ہے۔ اپنے اوقات اس طرح گزارو کہ کبھی اسم ذات

دگزشتے ہو سنہ) ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۵۲ھ کو آپ کا بادبانی جہاز بندر لیث پہونچا۔ وہیں بحالت احرام آپ کا انتقال ہوا وہیں مدفون ہوئے۔ آپ ریختہ کے ایک زبردست ادیب وشاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ومؤلف تھے جن میں تفسیر رؤفی، جواہر علویہ، مراتب الوصول اور درّ المعارف مشہور ومعروف ہیں۔ مکتوبات کے بھی آپ ہی جامع ہیں۔ اپنے ملفوظات کے بارے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریر فرمایا وہ ازراہِ انکسار ہے ——— ان ملفوظات کا شائع ہونا بہتر ہوا۔ ان ملفوظات نے صالح لٹریچر میں بہترین اضافہ کیا ہے۔

کا ذکر کبھی ذکر تہلیل معنی کا دھیان رکھتے ہوئے۔ کبھی تلاوت قرآن بکمالِ توجہ الی المقصود۔ کبھی درود شریف اور کبھی کلماتِ طیبات کا وِرد۔ یہ اشغال، اسباب قربِ الٰہی ہیں۔ بندے کو دُعائے خیر میں یاد رکھنا۔ میرا حال یہ ہے کہ میں دو ڈھائی ماہ سے ایسا سخت بیمار تھا کہ لوگ میری زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ اب دو دن سے کچھ تخفیف ہے۔ مرضِ بواسیر نے بھی شدت اختیار کر لی تھی۔ اب بحمد اللہ افاقہ ہے۔ البتہ ضعف بہت زیادہ ہے۔ میں نے لکھنؤ سے حافظ ابو سعید کو (جانشینی کے لیے) بلا یا ہے۔ راہِ سلوک میں جو کچھ چاہیے وہ سب اللہ تعالیٰ نے اُن کو مرحمت فرمایا ہے

میاں مولوی بشارت اللہ، میاں رؤف احمد، مولوی محمد عظیم، مولوی محمد جان، مولوی شیر محمد ان سے بھی لوگوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے مگر حافظ ابو سعید کو ان سب میں شاید امتیاز حاصل ہو۔ والعلم عند اللہ سبحانہٗ۔

صحبت ابو سعید و مولوی بشارت اللہ انشاء اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے نافع ہوگی۔ جو مجھ کو چاہتا ہے وہ ان دونوں کی طرف نگاہ کرے۔ پیر محمد اور گل محمد کی صحبت بھی مفید ہے۔

بُنیادِی عَقِیدَہ

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ

(زیر ترتیب کتاب کا ایک باب)

پچھلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کے سامنے جو اصلاحی پروگرام پیش کیا اس میں آپ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا اور ساری کائنات میں کسی چیز کو اس قابل نہیں سمجھا کہ انسان اس کے سامنے سر جھکائے اور اسے اپنا مالک سمجھے۔ خود انسانی جماعت میں بھی کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ فرمانروائے مطلق اور مالک حقیقی ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ فرمانروائے مطلق اور مالک حقیقی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مجبور اور محتاج نہ ہو بلکہ اس کی قوت حد سے زیادہ ہو اور اس کے وسائل لامحدود ہوں۔ اس کا علم بے پایاں ہو۔ اس اعتبار سے غور کیجئے تو اس وسیع کائنات میں کوئی بھی اس حیثیت کا نہیں ہے۔ سورج، چاند، تارے، دریا، پہاڑ سب مجبور اور بے بس نظر آتے ہیں۔ ایک مقررہ نظام میں سب جکڑے ہوئے ہیں اور ایک متعین اصول کی بے چون چرا پابندی کر رہے ہیں۔ انسان اپنی عقل و تدبیر کی بنا پر ان سب سے افضل نظر آتا ہے۔ لیکن وہ بھی نظامِ حیات کے ضابطوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسے نہ زندگی پر اختیار ہے نہ موت پر، قدم قدم پر اس کی مجبوری ظاہر ہوتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بیمار پڑے لیکن اپنی تمنا کے برخلاف وہ وقتاً فوقتاً بیمار پڑ رہتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ کبھی کسی مقصد میں ناکام ہو لیکن آئے دن اسے ناکامیوں کا منھ دیکھنا پڑتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ اسے کبھی کوئی صدمہ پہونچے لیکن اسے صدمے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ اپنے اہل و عیال اور اعزہ و احباب سے جدا ہو لیکن اسے جدا ہونا پڑتا ہے وہ موت کے پنجے میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا لیکن اسے کوئی جائے پناہ نہیں ملتی اور ایک دن موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

تمناؤں اور آرزوؤں سے ہٹ کر غور کیجئے تو بھی انسان کی محتاجی قدم قدم پر ظاہر ہوتی ہے وہ ہوا کا محتاج ہے، وہ پانی کا محتاج ہے، وہ غذا کا محتاج ہے، وہ لباس کا محتاج ہے۔ الغرض وہ سراپا احتیاج ہے۔

بھلا جس کی مجبوری و محتاجی کا یہ عالم ہو کہ خود اپنا وجود بھی قائم نہ رکھ سکتا ہو، وہ دوسروں کو کیا سہارا دے سکتا ہے اور کہاں سے اس لائق ہو سکتا ہے کہ ساری کائنات کا مالک حقیقی اور فرمانروائے مطلق بن سکے۔ جس کا علم ناقص، جس کی نظر محدود اور جس کی عقل خام ہے۔ وہ اہل عالم کی صحیح رہنمائی کیسے کر سکتا ہے۔ جسے خود ہی راہ کا علم نہ ہو وہ دوسروں کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے۔

آں کہ خود گم است کرا رہبری کند

بندہ نواز:۔ جب حالت یہ ہو تو حاجت مندوں کی حاجت روائی کون کرے، بندہ نوازی کی آس کس سے لگائی جائے۔ گمراہوں کی رہبری کہاں سے ہو۔ سائلوں کا سوال کون پورا کرے، شکستہ حالوں کو کون سہارا دے۔ بیمار کس سے شفا کی درخواست کریں۔ پریشان روزگار کس کے آسرے زندگی کی کٹھن ساعتیں گزاریں۔ اور مشکلات و مصائب میں کس کے دامنِ رحمت میں پناہ لی جائے۔ کائنات پر آپ نظر ڈال چکے، ذرہ سے لے کر آفتاب تک سب کی مجبوری سے آپ واقف ہیں۔ انسان کی بساط بھی آپ کی نظر میں ہے۔ اس کی محتاجی و بے بضاعتی آپ دیکھ رہے ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جس کا علم بے پایاں ہو جس کی طاقت بے حد و حساب ہو اور جس کے وسائل لامحدود ہوں لیکن آنکھیں چاہے نہ دیکھیں مگر دل کہتا ہے کہ ایسی ہستی ہے ضرور۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ غلام ہوں اور آقا نہ ہو، بندے ہوں اور بندہ نواز نہ ہو۔ حاجت مند ہوں اور حاجت روا نہ ہو۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ غلاموں کا وجود آقا کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ بندوں کی موجودگی بندہ نوازی کی خبر دیتی ہے۔ اور حاجت مندوں کا پایا جانا حاجت روا کا متقاضی ہے۔ انسان زبان سے کہے یا نہ کہے لیکن اس کا دل اس یقین پر مجبور ہے کہ مجبوروں کا یہ عالم کسی مختار کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

مشاہدۂ کائنات کا نتیجہ:۔ ایک اور پہلو سے دیکھیے کائنات نظر کے سامنے ہے۔ ذرہ سے لیکر آفتاب تک اور زمین سے آسمان تک بے شمار چیزیں موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کہاں سے آگئیں۔ کیا یہ آپ ہی آپ بن گئیں یا انھیں کوئی وجود میں لایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے

کہ یہ خود بخود بن گئی ہیں تو یہ خیال انسانی مشاہدہ و تجربہ کے خلاف ہے۔ دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بنی ہے۔ یہ صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کا مسلسل تجربہ ہے کہ ہر وجود کے لیے کوئی موجد ضروری ہے۔ پھر جب صورت حال یہ ہے تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ زمین و آسمان، سورج، چاند، ستارے وغیرہ بغیر کسی بنانے والے کے از خود بن گئے ہیں۔ ایسا خیال صدیوں کے تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے اور پوری تاریخ عالم میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کوئی چیز بغیر کسی موجد کے وجود میں آگئی ہو۔ انسانی فطرت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہے اور عقل انسانی مجبور ہے کہ اس عالم کا کوئی نہ کوئی موجد تسلیم کرے۔

صحیفۂ ربانی نے اسی حقیقت کی جانب ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَل لَّا يُوْقِنُوْنَ۔ (طور ۲)	کیا وہ بغیر کسی شئے کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا وہ خود اپنی ذات کے لیے آپ ہی خالق ہیں۔ یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ یقین نہیں رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کائنات اپنے تمام لوازم اور مشتملات کے ساتھ اس طرح موجود ہے کہ کوئی اس کے وجود میں شک نہیں کر سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں خود بخود بن گئی ہیں یا کسی نے انھیں بنایا ہے۔ یہی سوال خود انسان کے متعلق ہے کہ آپ ہی آپ پیدا ہو گیا ہے یا کسی نے اسے بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی چیز آپ ہی آپ نہیں بن سکتی ہے۔ ضروری ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہو۔ اب اس موقع پر دو صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں یا تو لوگوں نے خود اپنے آپ کو بنایا ہو۔ آسمان و زمین کے بھی وہی خالق ہوں۔ یہ خیال بھی مشاہدہ کے خلاف ہے۔ کسی شخص نے نہ اپنے آپ کو بنایا ہے اور نہ ہی آسمان و زمین کو وجود میں لایا ہے۔ پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو وجود میں لانے والی انسان سے برتر کوئی ہستی ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ انسان ساری کائنات کی بہترین ہستی اور اشرف المخلوقات ہے۔ اس لیے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کا اور ساری کائنات کا بنانے والا سب سے بلند مرتبہ ہے۔ تعالیٰ شانہٗ۔

پھر جب ہم اس عالم پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہاں مسلسل حرکت محسوس ہوتی ہے اور ہر چیز گردش میں نظر آتی ہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ہمیں کسی ایسی ہستی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو اس عالم کو حرکت دے رہی ہے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ حرکت ہو اور محرک نہ ہو۔ انسانی علم و تجربہ بتاتا ہے کہ ہر حرکت کے لیے محرک کا وجود ضروری ہے۔

کائنات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس کی ہر چیز میں اعلیٰ درجہ کی کاریگری نظر آتی ہے۔ اس کی تیاری میں غیر معمولی باریک بینی اور دقت نظری سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ اس کے بنانے اور نشو و نما دینے میں ایک اٹل اصول اور مستحکم ضابطہ کام کر رہا ہے پھر غور کرنے میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح افراد کی ضرورتیں پیش نظر ہیں اسی طرح انواع و اجناس کی ضرورتیں بھی پیش نظر ہیں اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق زندگی کے ہر مرحلہ میں سامانِ نشو و ارتقا فراہم کیا جاتا ہے لیکن ہر جگہ مستحکم اصول اور پختہ ضوابط کام کر رہے ہیں اور فنا و بقا، انحطاط و ارتقاء اور تضعیف و تقویت کا ایک ہمہ گیر قاعدہ ہر موقع پر عمل کر رہا ہے۔ اس طرح عالم کی رنگا رنگی میں یکرنگی اور کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اشیاء عالم پر جس شخص کی نظر جتنی گہری ہوگی اسی قدر وہ اس اعتراف پر مجبور ہوگا کہ اس عالم کا بنانے والا بے انتہا طاقت و قوت علم و اختیار اور فکر و شعور کا مالک ہے اسے تخلیق و تحسین اور تعمیر و اصلاح کی غیر معمولی قدرت ہے اور اس نے اس کارخانۂ عالم کو بڑی نفاست اور باریک بینی کے ساتھ بنایا ہے اور انتہائی خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ اسے چلا رہا ہے۔ ہر ضابطہ مستحکم اور ہر اصول اٹل ہے۔

الغرض کائنات کا مشاہدہ انسان کو خالق کائنات اور مدبر عالم کے اعتراف پر مجبور کرتا ہے اور اس کا ذرہ ذرہ اس کی عظمت و برتری قدرت و حکمت اور علم و بصیرت پر گواہ ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

علت العلل: انسانی علم و تحقیق اور اختراع و ایجاد کی تاریخ بتاتی ہے کہ قدم ہمیشہ مشاہد سے غیر مشاہد، معلوم سے نامعلوم اور محسوس سے غیر محسوس کی طرف اٹھے ہیں۔ کسی چیز کی قریبی علت پر نظر تحقیق رک نہیں گئی بلکہ ہمیشہ اس سے آگے پہونچنے کی کوشش کی گئی ہے اور حجابات کو ہٹا کر

نادیدہ حقائق کے مشاہدہ کی جد وجہد کی گئی ہے۔ توجیہ و تعلیل کی عادت انسان کی فطرت میں داخل ہے یہی خصوصیت اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ کم نظر قریبی علت تک پہونچکر رک جاتے ہیں گہرے نتائج دور رسی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ جو شخص جس قدر دور کی علت تک پہونچے گا۔ اسی قدر اس کے نتائج دور رس ہوں گے۔ ایسا موجد زیادہ اہم ایجاد کر سکے گا۔ ایسا صناع صنعت و حرفت کا زیادہ ہمہ گیر نمونہ پیش کر سکے گا۔ اور ایسا حکیم زیادہ پر اثر اور ہمہ گیر نسخہ تجویز کر سکے گا۔ درمیان میں اٹک کر رہ جانا باعثِ نقص ہو، مثلاً بدن کو گرم پاکر سطح بیں دفع حرارت کا نسخہ تجویز کریگا۔ لیکن دقیق النظر اس کا سبب معلوم کر کے اسے دور کرنیکی کوشش کریگا جو اس سے زیادہ مبصر ہوگا اس کی نظر سالہا سال پرانی علت تک پہنچے گی اور وہ ایسا نسخہ تجویز کریگا جو مرض کی بنیاد اکھاڑ کر پھینک دیگا اور مریض کو شفا کامل حاصل ہو جائیگی۔

اوپر کی سطور میں مریض و طبیب کی جو مثال دی گئی ہے وہ انسانی تحقیق و تفتیش اور اختراع و ایجاد کی ہر کوشش پر چسپاں ہوتی ہے علت العلل تک پہونچے بغیر انسان کی تجسس طبیعت اور توجیہ پسند فطرت کو چین نہیں آسکتا۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ قوانین فطرت واقعات عالم کی علت نہیں ہیں بلکہ نشان علت ہیں۔ قانون مقنن کا پتہ دیتا ہے۔ آئین سازی کے لیے آئین ساز اور اس کے نفاذ کرنے کے لیے کوئی نفاذ کرنے والا ضروری ہے۔ بے جان اور بے ارادہ اور بے اختیار اشیاء کو اصل سبب تسلیم کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے جس طرح کاغذ کے دو ٹکڑے خود حرکت کر کے ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ہوا کی تحریک ان کے حرکت میں لانے اور ملانے کا باعث ہے۔ ہوا کی تحریک کے لیے بھی کسی محرک کا وجود ضروری ہو۔ کیونکہ کسی واقعے کی اصلی علت کسی ذی عقل و ذی شعور کی قوت ارادی ہی ہو سکتی ہے۔

سلسلۂ اسباب کا آخری سبب یا علت العلل کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات کا حقیقی سبب ہے اور مذہب کی زبان میں اسی کا نام خدا ہے۔ ممکن ہے کوئی اس جگہ یہ کہے کہ سلسلۂ اسباب کے کسی نقطہ پر رکنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک سبب کا باعث دوسرا سبب اور ایک علت کی وجہ دوسری علت برابر قرار دی جاتی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں اور کوئی ذی عقل آدمی اس تسلسل کو تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ اس صورت میں ہر واقعے کے ظہور میں آنے اور ہر چیز کے وجود میں آنے کے لیے غیر متناہی علل کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا اور جو چیز غیر متناہی ہو وہ نہ کہیں سے شروع کی جا سکتی ہو

اور نہ کہیں پر ختم کی جا سکتی ہے اس کا سلسلہ ہمیشہ سے ہمیشہ تک جاری رہے گا اور کسی شے کے وجود میں آنے کے لیے معلول سے پہلے علت کا وجود ضروری ہے اور سلسلہ غیر متناہی کو تسلیم کرنے کے بعد ہر علت معلول بن جاتی ہے اور کہیں ایسا نقطہ نہیں آتا جہاں یہ کہا جا سکے کہ یہ معلول نہیں صرف علت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کہیں سے پیدائش کا آغاز نہ مانا جا سکے گا۔ اور نہ کوئی شے وجود میں آسکے گی۔ انسانی فطرت ایسے لامتناہی سلسلے کو تسلیم نہیں کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ کہیں یہ سلسلہ ختم ہو جسے واقعے کی ظہور کی آخری علت قرار دیا جا سکے۔ سلسلۂ اسباب کی یہی آخری کڑی اور تمام علتوں کی یہی آخری علت کائنات کا موجد اور عالم کا خالق ہے۔

دلنشین دلائل: ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف، واضح اور دل نشین انداز میں نوعِ انسانی کو بتایا کہ خالقِ کائنات کے وجود میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ مادی آنکھیں تو اس کے دیدار کی طاقت نہیں رکھتی ہیں لیکن اگر انسان عقل سے کام لے تو آسمان سے زمین تک ہر چیز اس کے وجود کا اعلان کر رہی ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ (آل عمران ۲۰) قرآن مجید	آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور روز و شب کے الٹ پھیر میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

جانوروں پر غور کرے تو بھی ان کے حالات خالقِ کائنات اور مدبر عالم کا پتہ دیتے ہیں۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهَا مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۔ (نحل ۹)	اور تمہارے لیے جانوروں کے اندر سامانِ عبرت ہے۔ ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے خون اور گوبر کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہوتا ہے۔

آسمان کی طرف کوئی نگاہ اٹھائے اور چمکتے ہوئے سورج اور منور چاند پر نظر ڈالے تو وہ اسے قدرتِ الٰہی کا جلوہ نظر آئے گا۔ اور وہ پکار اٹھے گا کہ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاءِ	بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں

بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا

(فرقان ۶)

برج بنائے اور ان کے اندر چراغ (سورج) اور روشن چاند بنایا۔

وہ زمین کی حالت پر غور کرے کہ اس کے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ہیں اور قدرت کے کیسے خزانے اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں تو اسے قدرتِ الٰہی کا تماشہ نظر آئے گا وہ خود اپنی ذات پر غور کرے اور اپنے نفس کی قوتوں اور صلاحیتوں کا جائزہ لے تو خالقِ عالم کی بے مثال قدرت کا یقین ہو جائے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

(ذاریٰت ۱)

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین کے اندر نشانیاں اور تمہارے نفوس کے اندر بھی قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

کارخانہ عالم پر نظر ڈالنے سے نہ کہیں کوئی نقص پایا جاتا ہے نہ کہیں بے قاعدگی محسوس ہوتی ہے۔

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۔

(ملک ۱)

تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی فرق نہیں دیکھتے ہو پھر لوٹا کر نگاہ ڈالو کیا تم کوئی فطور دیکھتے ہو پھر پلٹ کر دوبارہ نگاہ ڈالو۔ نگاہ تمہارے پاس تھک کر پلٹ آئے گی (لیکن وہ کوئی نقص نہ پا سکے گی)

بجلی کی چمک، بارش کا نزول، زمین کی روئیدگی ہر چیز غور کرنے والوں کے لیے معرفت کردگار کا درس ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِيْ بِهِ الْاَرْضَ

اور اس (خدا) کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے جو تمہارے لیے سبب خوف بھی ہے اور باعث امید بھی کہ

بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

(روم-۳)

اور آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے۔ پھر اسکے ذریعے زمین کو اس کے مرچکنے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

دیکھو آسمان کس طرح بغیر کسی سہارے کے قائم ہے۔ زمین پر کس طرح دریاؤں اور پہاڑوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ سورج اور چاند کس طرح مسخر ہیں کہ بندھے ہوئے اصول کے مطابق نکلتے اور غروب ہوتے ہیں۔ کس طرح نر مادہ کا سلسلہ قائم ہے اور نباتات تک کس طرح جوڑے رکھتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۝ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝

(رعد-۱)

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند کیا کہ جنھیں تم دیکھتے ہو پھر وہ عرش پر متمکن ہوا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک مقررہ مدت کے لیے چلتا رہتا ہے وہ معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔ آیتوں کی تفصیل کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین کرو۔ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

زمین ایک ہی بیج تخم ایک ہی ہے ایک ہی پانی سے آراضی سیراب بھی کی جاتی ہے لیکن اتنی یکسانی کے باوجود جب پھل تیار ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے شکل میں ذائقہ میں جسامت میں کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں آخر کون ہے جو یہ فرق پیدا کرتا ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ

اور زمین میں پاس پاس ملے ہوئے قطعات ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں، کھیت ہیں اور کھجور کے درخت ہیں۔ ایک تنے والے

وَاحِدٍ، وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی
بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝
(الرعد ۱)

کبھی اور دو تنے والے بھی وہ ایک ہی پانی سے
سینچے جاتے ہیں (پر اس یکسانی کے باوجود)
کھانے میں ہم بعض کو بعض پر فضیلت
بخشتے ہیں بے شک اسمیں ان لوگوں کے
لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

سطور بالا میں صحیفۂ ربّانی سے چند آیات نقل کی گئیں۔ اس قسم کی صدہا آیتیں ہیں جن میں کارخانہ عالم کی مختلف اشیاء کا ذکر کر کے عقل و شعور رکھنے والوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور اس نیتجہ تک پہونچایا گیا ہے کہ کائنات اور اس کے نظام کو دیکھ کر خالق کائنات اور مدبر ارض و سما کا وجود تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ان حقائق کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ ان مشاہدات کے بعد بھی۔

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ط

کیا خدا کے بارے میں کوئی شک ہے جو
آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔

(باقی)

ملا عبد القادر بدایونی

(جناب سید صباح الدین عبد الرحمن)

(۳)

ملا صاحب کی اصلی خواہش یہ رہی کہ ان کو مدد معاش کے طور پر کوئی جاگیر مل جاتی تو وہ نوکری نہ کرتے بلکہ توکل و قناعت کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علمی کاموں میں لگے رہتے (ج ۲ ص ۲۷۵ و ۲۷۶) لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، مجبوراً ملازمت کر لیتے پھر جس کے بدلے میں انکو جاگیر ملتی رہتی (ج ۲ ص ۳۴۲) میر سید محمد میر عدلی امروہی کے ذکر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ موروثی تعلقات اور قدیم شفقت کی بنا پر وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے، میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں برابر کہا کرتے تھے مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو۔ صدور کی خوشامد کی ذلت نہ اٹھاؤ، بادشاہی ملازمت میں داخل ہو کر داغ کراؤ، کیونکہ شاہی ملازمین میں بڑی انانیت اور فرعونیت ہوتی ہے میں نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی، اس لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا نہ کرے کسی اور کو دیکھنا نصیب ہو (ج ۲ ص ۷۶۔ ۷۵) مدد معاش کے نہ ملنے کی وجہ سے گوشہ نشین نہ ہو سکے لیکن ملازمت کر کے کڑھتے بھی رہے، ان کو ایک موقع پر اجمیر کی تولیت ملنے والی تھی، لیکن نہ ملی اسی سلسلہ میں وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سلسلہ کی ایک اولاد شیخ حسین کی ریاضت، عبادت، مجاہدہ، توکل و قناعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی بزرگی کے طفیل میں ان کو شاہی ملازمت سے رہائی مل جاتی، تو شاید (دربار کی) لایعنی گفتاری، پریشان گوئی، بیہودگی، اور دروغ نویسی سے نجات پا جاتے، اور وطن جا کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ اور بقیہ عمر مفید کاموں میں صرف کرتے (ج ۲ ص ۹۰۔ ۸۹) لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، اور وہ شاہی ملازمت سے وابستہ رہے۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ ملا صاحب ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں پانچ مہینے کی رخصت پر گئے تو ایک سال تک واپس نہیں ہوئے، ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں دربار میں حاضر ہوئے، تو اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جب بادشاہ اجمیر کی حاضری کے بعد فتح پور واپس ہو رہے تھے، تو انھوں نے تودہ کے مقام پر حاضر ہو کر اپنی ایک کتاب چہل حدیث پیش کی، جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں تھیں، اس کا نام بھی تاریخی تھا، بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانہ میں داخل کر لی، اور رخصت میں وعدہ خلافی کی تقصیر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ (ج ۲ ص ۵۵-۲۵۴)

انھوں نے ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں اکبر کے حکم سے تاریخ الفی کی تدوین میں شرکت کی (ج ۲ ص ۱۹-۳۱۸) ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں مہابھارت کے فارسی ترجمہ کرنے میں بھی شریک ہوئے (ج ۳ ص ۱۱۸) ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) میں اکبر ہی کے حکم سے رامائن کا ترجمہ کرنا شروع کیا، جو ۹۹۶ھ (۱۵۸۷ء) میں ختم ہوا (ج ۲ ص ۳۳۷-۳۴۶) ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں اکبر ہی کی فرمائش پر تاریخ کشمیر مترجمہ مولانا شاہ محمد شاد آبادی کی زبان کو سلیس کر کے اس کا ایک انتخاب تیار کیا (ج ۲ ص ۳۷۴) ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں شاہی حکم کے مطابق معجم البلدان کے دس جزو کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا (ج ۲ ص ۳۷۵)، ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو دربار سے پانچ مہینے کی رخصت لی، اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو پانچ مہینے کی رخصت لی، مرزا نظام الدین احمد نے بادشاہ کی خدمت میں میری طرف سے عرض کیا کہ میری والدہ دنیا سے کوچ کر گئی ہیں، میں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو تسلی دلاسا دینے کے لیے رخصت چاہتا ہوں، بادشاہ نے خفگی کے ساتھ یہ رخصت دی، اس موقع پر صدر جہاں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو، لیکن میں نے نہیں کیا، بادشاہ نے صرف اتنا کہا کہ بگذار یعنی جانے دو، لیکن رنجیدہ ہو کر مجھ کو سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا، میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا، اور وہاں جا کر بیمار پڑ گیا۔" (ج ۲ ص ۳۷۶)

ملا صاحب کے اسی انا سے ان کی سیرت کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے، وہ اپنی خودداری، اپنے علم اور اپنی عالمانہ شان کو شاہی دربار میں گروی رکھ دیتے تو ان کو بھی وہی درباری عزت اور دنیاوی جاہ و ثروت مل سکتی تھی، جو ان کے معاصر درباری علماء کو ملی، لیکن ان چیزوں کے لیے اپنے انا کو کبھی

قربان کرنا پسند نہیں کیا۔

وہ وطن گئے تو وقت پر واپس نہ آسکے، اسی اثنا میں شاہی کتب خانہ سے سنگھاسن بتیسی کے ان کے فارسی ترجمہ کا نسخہ خرد افزا گم ہوگیا، اس سلسلہ میں ان کو بار بار دربار میں طلب کیا گیا، پھر بھی حاضر نہ ہو سکے، لکھتے ہیں:۔

"شاہی کتب خانہ سے نامہ خرد افزا کا نسخہ گم ہوگیا، سلیمہ سلطان بیگم نے چند بار بدایوں قاصد بھیجکر طلب کیا، لیکن کچھ ایسے موانع تھے کہ نہ جاسکا، آخر حکم ہوا کہ میری مدد معاش موقوف کردی جائے اور میری مرضی کے خلاف مجھ کو طلب کر لیا جائے۔ اس موقع پر مرزا نظام احمد (خدا ان کو غریق رحمت کرے) نے دوستی کا پورا حق ادا کیا، شیخ ابوالفضل نے بھی بار بار بادشاہ سے کہا کہ کوئی نہ کوئی موانع ضرور پیش ہیں جن سے میں نہیں آسکا ہوں اور وہاں رہ گیا ہوں"

(ج ۲ ص ۳۷۷)

اس موقع پر فیضی نے بھی دکن سے بادشاہ کو ملا صاحب کی تائید میں پرزور خط لکھا، جس کا اثر اکبر پر بھی ہوا، ان سفارشات کے بعد ملا صاحب پھر دربار سے وابستہ ہوگئے اور سنہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں جامع رشیدی کے ترجمے میں شریک ہوئے، اور سنہ ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں بحر الاسمار کا ترجمہ مکمل کیا، جس کے صلہ میں اکبر نے ان کو دس ہزار تنکے اور ایک گھوڑا انعام میں دیا (ج ۲ ص ۴۰۱) وہ برابر اپنی علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ ان کی ایک اور تصنیف نجات الرشید ہے جس میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی تفصیل ہے (ج ۲ ص ۲۰۸) یہ کتاب انھوں نے مرزا نظام الدین احمد بخشی مؤلف طبقات اکبری کی فرمائش پر لکھی، اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ

"این تالیف سبب نجات براشید و رشد بر طالب مزید گردد"

ملا صاحب کے تراجم تو زیادہ تر اکبر کے شاہی کتب خانہ کے لیے زینت بن کر رہ گئے، لیکن ان کی جو تصنیف سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ ان کی منتخب التواریخ ہے، یہ انھوں نے گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اپنی مرضی کے مطابق لکھی، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے میں اکبر سے قبل کے سلاطین ہند کی تاریخ ہے، دوسرے میں اکبری عہد کے سارے واقعات ہیں، تیسرے میں اس عہد کے علماء، مشائخ، اطبا اور شعرا کا ذکر ہے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ملا صاحب نے خدا کی قسم کھا کر اعلان کیا ہے کہ انھوں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ملامت، نفرت، حسد اور تعصب کا جذبہ نہیں ہے، وہ اس کتاب کے خاتمہ پر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کے سودائی قلم نے ان کے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے، ان کا یہ جنون شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی حمایت میں ظاہر ہوا ہے ان کو دکھ تھا کہ اسلام کے احکام میں ایسے تغیرات کیے گئے جس کی مثال گزشتہ ہزار سال میں نہیں ملتی، پھر اس زمانہ کے تمام کفریات اور حشویات کو مستحسنات قرار دے کر خوشامد یا دین کی ناواقفیت یا حق پوشی کی بناء پر املا اور انشاء کر دیے گئے ہیں، یہ غالباً ابو الفضل کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے ملا صاحب نے اپنے مشاہدات قلمبند کرنے شروع کر دیے تاکہ آئندہ لوگ خرافات باطل اور تطویلات لاطائل پڑھ کر تذبذب میں مبتلا نہ ہو جائیں، لکھتے ہیں کہ اور ارباب تصنیف و تالیف تقرب ملوک، استجلاب منافع اور تحصیل مقاصد کی خاطر قلم چلاتے ہیں۔ یہ بھی شاید ابو الفضل ہی پر چوٹ ہے، اس کے بعد کہتے ہیں کہ وہ طمع اور توقع سے بالاتر ہو کر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ''یہ'' چھوڑنا چاہتے ہیں تاکہ جو لوگ اس زمانہ کے حالات و حقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں۔

اگر شراب خوری جرعہ فشاں بر خاک از آں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

اس کتاب کو لکھتے وقت ان کو ڈر تھا کہ ان کے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو انھوں نے دوسرے کے ساتھ کیا (ج ۳ ص ۹۴-۳۹۳)۔ ان کا یہ ڈر صحیح ثابت ہوا، موجودہ دور میں ان پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔

ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انھوں نے اکبر کی بہت بری تصویر پیش کر کے اس کی سطوت شکنی کی ہے، اور ان کو خود اس کا احساس رہا، اسی لیے اپنی زندگی میں اس کی اشاعت نہ کرا سکے۔ جہانگیر نے بھی اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی تھی، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اسی کتاب میں جب وہ اکبر کی سیاسی اور حربی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی شاہانہ سطوت کو برقرار رکھتے ہیں، کہیں اس کی عظمت میں فرق نہیں آنے دیتے، جب جب وہ اس کے یہاں باریاب ہوئے، اس کے ذکر میں بھی شاہانہ آداب کا لحاظ رکھا ہے۔ البتہ اس کے مذہبی عقائد میں ان کا قلم شمشیر برہنہ ہو گیا ہے، اور پھر اکبر ہی پر کیا منحصر وہ تو علماء میں بھی نقص دیکھتے تو ان کے لیے بھی سخت سے سخت

الفاظ استعمال کرتے رہے، مثلاً شیخ الاسلام عبداللہ سلطانپوری کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتے کہ ہر سال کے خاتمہ پر اپنا سارا مال بیوی کے نام کر دیتے، اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام واپس لے لیتے، وہ تو ایسے ایسے فریب کرتے کہ بنی موسیٰ یعنی بنی اسرائیل بھی سُن کر شرمندہ ہو جاتے، ان کی خست، رذالت، خباثت، مکاری، دنیاداری اور ستمگاری کے بہت سے قصے مشہور ہیں، جو زیادہ تر انھوں نے پنجاب کے علماء، فقراء اور الٰہ کے ساتھ دکھائیں، یہ سب ایک ایک کر کے ظاہر ہونے لگیں، کیونکہ ایک دن راز ظاہر ہی ہو جاتا ہے، پھر تو زبانیں کھل گئیں ان کی اہانت، استخفاف اور مذمت میں ایک سے ایک قصے سنائے جانے لگے۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

لیکن اسی کے ساتھ وہ عبداللہ سلطانپوری کے فضائل کے بھی معترف تھے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں علماء کے تذکرے میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے منفرد اور یگانۂ روزگار عالم تھے، عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور علوم نقلی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی بڑی اچھی اچھی اچھی تصانیف ہیں جن میں عصمۃ انبیاء اور شرح شمائل النبی بہت مشہور ہیں...... شریعت کے پھیلانے میں ہمیشہ کوشاں رہے (ج ۲ ص ۷)۔ اسی طرح صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی تصویر تو ایک طرف اس طرح کھینچتے ہیں کہ جس وقت وہ اپنی مسند جاہ و جلال پر بیٹھ جاتے تو بڑے بڑے امراء اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے ان کے پاس آتے وہ ان کی بہت کم تعظیم کرتے، اور جب وہ حد سے زیادہ الحاح و عاجزی کرتے تو ان مدرسوں کو جو ہدایہ اور دوسری منتہی کتابیں پڑھا سکتے تھے، تقریباً سو بیگھے کی اراضی منظور کرتے، باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض ہوتے، قلمزد کر دیتے، اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ ہندوؤں کو اچھی اچھی زمینیں عطا کر دیتے تھے، اس طرح ان کی بدولت علم اور علماء دونوں کی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی، وہ اپنے دفتر میں دوپہر کے بعد نہایت غرور سے بیٹھ کر وضو کرتے تو مستعمل پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور مقربوں کے سروں اور کپڑوں پر گرتے رہتے، مگر ان کو ذرہ برابر اس کی پرواہ نہ ہوتی (ج ۲ ص ۲۰۵) دوسری طرف ان کے بارہ میں یہ بھی لکھ کر ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے تھے، چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ جا کر حدیث کا علم پڑھا، وہاں سے واپس آئے تو اپنے آباد و اجداد کی روش کے مطابق سماع اور غناء کے منکر

رہے، اور محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے" تقوی، طہارت، پاکبازی اور عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ جب منصب صدارت کو پہنچے تو ہر جگہ مدد معاش میں زمین دی، وظائف مقرر کیے، اوقاف قائم کیے کسی اور بادشاہ کے زمانہ میں ایسا صدر نہ ہوا ہوگا، انھوں نے جتنے اوقاف قائم کیے، کسی اور صدر نے اس کا دسواں حصہ بھی نہ کیا ہوگا (ج ۲ ص ۸۰-۷۹) لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعد میں ان کا طرز عمل بدل گیا۔

شریف آملی کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مردود مطرود پاؤں جلے کتے کی طرح ایک دیار سے دوسرے دیار میں مارا پھرتا، ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا، سب سے جھگڑتا، یہاں تک کہ اس نے الحاد کا راستہ اختیار کیا، کچھ عرصہ صوفیوں کے بھیس میں بلخ جا کر مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں جو کہ شیخ حسین خوارزمی قدس اللہ سرہ کے پوتے تھے، درویشوں کے ساتھ رہا، درویشی سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا اس لیے وہ درویشوں کے ساتھ ہرزہ سرائی اور بیکار قسم کی نوک جھونک کرتا رہتا، پریشان ہو کر لوگوں نے اس کو خانقاہ سے نکال دیا، اس کے لیے یہ شعر کہا گیا،

ہست یک ملحدے شریف بنام ناتمامی بطور خویش تمام

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ گھومتا پھرتا مالوہ پہونچا، اور اپنے کو دسویں صدی کا مجدد اعلان کر دیا، اکبر کے دربار میں حاضر ہوا تو اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، اکبر اس سے خلوت میں باتیں کرتا، اس نے اپنے مہملات کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا، اور اس کا نام ترشح ظہور رکھا تھا، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ایسی اس مکاری کے باوجود اپنی فضیلت کا سکہ جما رکھا تھا اور ہزاری منصب تک پہنچ گیا، اور بنگالہ میں مذہب حق کا داعی مقرر ہوا، بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے بادشاہ کی نیابت بھی کرتا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۴۸)

بعض حلقوں میں ان کی راسخ العقیدگی کو ان کے مذہبی تعصب اور غلو پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی تصانیف میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ انھوں نے شیعوں اور ہندوؤں کی تعریف دل کھول کر کی ہو، خانخاناں بیرم خاں کی فیاضی علم پروری اور عبادت گزاری کی تعریف میں ان کا قلم خوب چلا ہے، اور جب اس کو ہلاک کیا گیا تو ملا صاحب اس کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ عازم حج تھا، کسی نے اس کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکالی تھی:

گفتا کہ شہید شد بیرام

ملا صاحب نے یہ تاریخ قلمبند کر کے لکھا ہے کہ انھوں نے خود یہ تاریخ نکالی

گفت گل گلشن خوبی نماند (ج ۲ ص ۴۶)

ملا صاحب اکبر کے معزز امیر فتح اللہ شیرازی کی دنیاداری اور امرا پسندی کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن ان کو اعلم العلمای زماں تسلیم کرتے ہیں (ج ۳ ص ۱۵۴) ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھاتے رہتے ہیں، دیوان خانہ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک کے مطابق نماز پڑھا کرتے تھے بادشاہ ان کو تقلید پرست سمجھتا، لیکن ان کے علم و حکمت کا خیال کر کے چشم پوشی سے کام لیتا، پھر لکھتے ہیں کہ جب وہ وزارت کے عہدہ پر راجہ ٹوڈرمل کے شریک کار بنا دیے گئے تو نہایت دلیری کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کر کے وزارت کے فرائض بجا لاتے تھے، ملا صاحب ان فضائل سے متاثر ہو کر یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ جب وہ دربار میں آئے تو ان کی آمد کی تاریخ "شاہ فتح اللہ امام اولیاء" سے نکالی گئی (ج ۲ ص ۳۱۶) اپنی تیسری جلد میں قاضی نور اللہ شستری کی مدح تو ایسی کی ہے جس سے زیادہ ان کا انتہائی درجہ کا عقیدت مند بھی نہیں کر سکتا ہے، لکھتے ہیں کہ وہ مذہباً شیعہ تھے بہت ہی منصف مزاج، عادل، نیک نفس، حیادار، متقی اور عفیف تھے، ان میں شرفاء کی تمام خوبیاں تھیں، علم، حلم، جودت فہم، جدت طبع، صفائی قلب اور ذکاوت وغیرہ کے لیے مشہور ہیں، ان کی اچھی اچھی تصانیف بھی ہیں، شیخ فیضی کی مہمل غیر منقوط تفسیر پر انھوں نے جو توقیع یعنی سرنامہ لکھا وہ تعریف سے باہر ہے، شعر گوئی کا بھی ذوق تھا اور دلنشین اشعار کہتے، حکیم ابوالفتح کے وسیلے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے ...... انھوں نے اپنی قضاوت کے زمانے میں لاہور کے شرارت پسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو علم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے درست کر دیا، رشوت کی ساری راہیں بند کرا دیں، اس سے بڑھ کر اور انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، ان کے متعلق یہ شعر صادق آتا ہے (ج ۳ ص ۳۸-۱۳۷)

تو آں کس کہ نہ کردی ہمہ عمر قبول   در قضا ہیچ ز کس بجز کہ شہادت ز گواہ

ہندوؤں میں ملا صاحب راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بیربر سے خوش نہیں تھے، راجہ بیربر کے لیے تو وہ بہت ہی سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اچھے ہندوؤں کی تعریف میں ان کی تحریر شگفتہ ہو گئی ہے جو راگڑھ کے راجہ رام چندر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہمت اور اخلاق میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا، اس کی بخششوں کا یہ حال تھا کہ ایک کروڑ روپے ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا، ابراہیم سور کو تو بہت کچھ شاہانہ ساز و سامان دیا، تان سین اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن جلال خاں قورچی وعدے وعید کر کے اس کو شاہی دربار میں اپنے ساتھ لے آیا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب رام چندر شاہی دربار میں آیا تو اس نے ایک سو بیس قیمتی لعل و جواہر نذرانے میں دیے، ان کی قیمت پچاس ہزار روپے ہوتی تھی۔ (ج ۲ ص ۲۲۵)

وہ راجہ مان سنگھ کی خوبیوں کے بھی معترف رہے، اس کے کارناموں کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے، جب وہ رانا پرتاپ کے خلاف شاہی لشکر لے کر گیا تو جس بہادری سے وہ لڑا اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے ایسی ثابت قدمی دکھائی کہ جو تصور میں نہیں آسکتی ہے (ج ۲ ص ۲۳۲) اس کی حق گوئی اور سیرت کی بلندی کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ ایک رات بادشاہ نے اس کو اپنے خلوت میں بلا کر اپنے دین کی ترغیب دلائی، لیکن اس نے بڑی بے باکی سے یہ جواب دیا کہ اگر مریدی کا مراد جاں نثاری ہے تو ہم اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہر وقت حاضر رہتے ہیں، آزمانے کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ کچھ اور منشا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہے، میں اعتقاداً ہندو ہوں، اگر حکم ہو تو مسلمان ہو جاؤں، ان دو کے علاوہ کوئی اور میں راستہ نہیں جانتا۔ (ج ۲ ص ۳۶۴)

وہ راجہ مان سنگھ کے باپ راجہ بھگونت سنگھ کی حق گوئی کے بھی معترف تھے، اکبر جب اپنے نئے دین کے اجرا کی فکر میں تھا تو ایک روز راجہ بھگونت سنگھ نے چڑھ کر اس سے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں کہ ہندو بھی برے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن یہ فرمائیے کہ کون سا گروہ بہتر ہے جس کو ہم سب لوگ قبول کر لیں۔ ملا صاحب کا بیان ہے کہ بھگونت سنگھ کی اس بات کو سن کر اکبر کی شدت کچھ دنوں کے لیے کم ہو گئی، لیکن پھر اسلام کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور اس کی تاریخ "احداث بدعت" سے نکالی گئی (ج ۲ ص ۲۱۳)　　(باقی)

مُسندِ حُمَیدی

(جناب حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی)
(رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ)

سلسلۂ تدوینِ حدیث میں جوامع و سنن کو بحیثیت عظمت یقیناً بلند مقام حاصل ہے۔ لیکن تقدم و اوّلیت کے اعتبار سے مسانید ان سے بلند تر ہیں۔ جب حفاظ و محدثین جوامع مرتب کرنے کا خیال ہی کر رہے تھے کہ امام ابو داؤد الطیالسی اپنا مجموعۂ حدیث "مسند طیالسی" مرتب کر کے تدوینِ حدیث میں اولیت کا تاج زیب سر کر چکے تھے۔ اس کے بعد مسانید کے بکثرت مجموعے مرتب کیے گئے۔ جن میں سب سے بلند مرتبہ امام احمد بن حنبل کی مسند کو نصیب ہوا۔ بلکہ کثرتِ شیوع سے اب عام طور پر مطلقاً لفظ مسند کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے۔ اس کے قبولِ عام اور شہرتِ دوام میں کتاب سے زیادہ امام صاحب کی جلالتِ شان اور علوئے مرتبت کا حصہ ہے۔ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں متعدد ائمہ و علماء نے مسند کے طرز پر احادیث جمع کیں۔ مگر انھیں مسند ابن حنبل کی سی مقبولیت و شہرت حاصل نہ ہو سکنے کا بڑا سبب یہی ہے کہ ان کے مرتبین نہ تو کسی خاص مکتب فقہ کے بانی تھے اور نہ انھیں امام احمد جیسے مخصوص حالات میسر آئے۔

شیخ محمد بن جعفر الکتانی (المتوفی ۱۳۴۵ھ) نے اپنی کتاب میں ۸۲ مسانید کا نام ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

فهذه اثنتان وثمانون مسنداً بمسند أحمد..... والمسانيد كثيرة سوى ما ذكرناه ۱	یہ مسند احمد بن حنبل کو لے کر بیاسی مسندیں ہوئیں..... ہم نے جو مسانید درج ذکر کیں، ان کے علاوہ بھی مسندوں کی کافی تعداد ہے۔

دراصل مسند کا مفہوم اتنا وسیع و محیط ہے کہ اس کے دائرہ میں بہت سی جوامع مصنّف اور سنن بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ محدثین کی اصطلاح میں مسند اس مجموعہ حدیث کو کہتے ہیں جو اسمائے صحابہ پر باعتبار حروف ہجاء مرتب کیا گیا ہو۔ لیکن مسند کا اطلاق کبھی ان کتابوں پر بھی ہوتا ہے جو صحابہ کے ناموں پر مرتب نہیں ہوتیں بلکہ صحاح و سنن کے نہج یعنی ابواب فقہیہ پر مرتب ہوتی ہیں۔ یا انکی ترتیب حروف و کلمات پر ہوتی ہو اور اسمیں ہر حدیث کی سند حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مذکور ہوتی ہے۔ چونکہ وہ مسند اور مرفوع حدیثوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو مسند کہدیتے ہیں۔ امام بخاری نے غالباً اسی لیے اپنی کتاب کا نام "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" رکھا ہے۔ بقول مکی بن عبدان امام مسلم نے بھی خود اپنی "صحیح" کو مسند ہی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح سنن دارمی میں اگرچہ تمام حدیثیں مرفوع نہیں ہیں بلکہ مرسل، منقطع اور معضل بھی ہیں۔ لیکن چونکہ مرفوعات کی تعداد زیادہ ہے اسلیے اس کتاب کو بھی مسند دارمی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غرض ابواب فقہیہ پر مرتب کتب حدیث کو بیک وقت جامع، مصنّف، سنن اور مسند سب کہا جاتا ہے[۱]

اس تفصیل کا مقصود یہ ذکر کرنا ہے کہ مسند کے دائرہ اطلاق کی اسی وسعت کے باعث مسانید کی تعداد دوسرے خالص مجموعہ ہائے حدیث سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ مسانید جو اپنے اصطلاحی معنی و معیار پر پوری اترتی ہیں ان میں مسند حمیدی کو اولیت کی حیثیت حاصل ہے جس طرح کوفہ میں یحییٰ بن عبد الحمید الحمانی (المتوفی ۲۲۲ھ) بصرہ میں مسدد بن مسرھد (المتوفی ۲۲۸ھ) مصر میں اسد بن موسیٰ (المتوفی ۲۱۲ھ) مجموعہ مسانید مرتب کرنے میں تقدم و اولیت رکھتے ہیں اسی طرح امام حمیدی کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ سرزمین مکہ زادہا اللہ تشریفاً میں ان ہی نے سب سے پہلے مسند مرتب کی۔

یہاں ایک حقیقت کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ وہ یہ کہ علماء و محققین نے مسانید کے تقدم اور تقدیم کے باوصف ان کے ساتھ ابھی تک وہ اعتنا نہیں کیا ہے جو احادیث کے دوسرے مجموعوں مثلاً جوامع اور سنن کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ممکن ہو یہ خدمت لازوال اس لیے بھی بے توجہی کا شکار ہوئی ہو کہ وہ

---

[۱] فوائد جامعہ ص ۱۵

بہت زیادہ جانکاہی اور دیدہ ریزی کی طالب ہے۔ دنیا بھر کے کتب خانوں کو کھنگال کر مسانیدی مخطوطات کو یکجا کرنا جس کی اس میں ضرورت ہے اور پھر ان کی روشنی میں ایک صحیح نسخہ کی ترتیب کیا شبہ ہے کہ بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ لیکن اس علمی غفلت اور سہل انگاری ہی کا نتیجہ ہے کہ اب شاید ہی کوئی سنن یا جامع صحیح پردہ گمنامی میں مستور ہو، مگر مسانید کے بیشتر مجموعے گوشہ خمول میں غائب ہیں سخت مقام حیرت ہے کہ اصطلاحی مسانید کی جو طویل فہرست صاحب "الرسالۃ المستطرفہ" نے نقل کی ہے اس میں ابھی تک صرف مسند ابوداؤد الطیالسی ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو سکی تھی[1] لیکن ایک زمانہ کے بعد شناور بحر تحقیق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے مسند حمیدی کے مخطوطات کا سراغ لگا کر اس کو اڈٹ کیا۔ اور اب وہ اہل ذوق کی تشنگی علم فرد کرنے کے لیے ہر کتب خانہ میں موجود ہے۔ مذکورہ بالا دو مسندوں کے علاوہ دوسری تمام مسانید کا ذکر صرف کتب طبقات و تراجم کے سینوں میں محفوظ ہے۔ نگاہ شوق منتظر ہے کہ تحقیق کے سمندر بے کنار سے کوئی اور موتی کب اچھل کر سامنے آتا ہے۔

بہرحال مسند حمیدی کے متعلق راقم سطور کو جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں وہ آئندہ صفحات میں پیش ہیں۔ اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام حمیدی کے فضل و کمال پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس کے آئینہ میں "مسند حمیدی" کی قدر و قیمت کا تعین آسان ہو جائے۔

نام و نسب عبداللہ نام، ابوبکر کنیت، اور پورا سلسلہ نسب یہ ہے۔ عبداللہ بن الزبیر بن عیسیٰ بن عبیداللہ بن اسامہ بن عبداللہ بن حمید بن زہیر بن الحارث بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی[2]

خاندان اور وطن امام حمیدی نسلاً خالص عرب تھے۔ مکہ معظمہ کی خاک پاک سے اٹھے اور آخر میں اسی کا

---

[1] واضح رہے کہ مسند ابوعوانہ، مسند دارمی، مسند امام شافعی اور مسانید امام اعظم مطبوعہ شکل میں ضرور ملتی ہیں۔ لیکن وہ مسند کی اصطلاحی تعریف میں داخل نہیں ہیں۔ اول الذکر دو مجموعے اسماء صحابہ کے بجائے ابواب فقہیہ پر مرتب کیے گئے ہیں اور ثانی الذکر دونوں کتابیں درحقیقت امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے تلامذہ کا انتخاب احادیث ہیں۔

[2] توالی التاسیس لابن حجر ص ۳۷

پیوند ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا مفصل نسب نامہ سے ظاہر ہے۔ قریش کے مشہور خاندان اسد بن عبد العزیٰ کی ایک معزز شاخ "بنو حمید" سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ اسی باعث اسدی، مکی، قرشی اور حمیدی نسبتوں سے مشہور ہوئے۔ ان میں آخر الذکر نسبت کی توجیہ کے بارے میں بعض علماء کا اختلاف ہے۔ لیکن اصح و مرجح یہی ہے کہ بنو حمید کے خاندان والے حمیدی کہلاتے ہیں۔ حافظ ابن اثیر نے اسی کو اختیار کیا[1] اور علامہ سمعانی نے ارجح قرار دیا۔ اصمعی کے اس قول سے بھی اس کی مزید تائید ہوتی ہے:

حمیدیون کلهم من بنی اسد بن قریش[2]	تمام حُمیدی بنو اسد بن قریش کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

فضل و کمال امام حمیدی ان نامور اہل علم میں سے تھے جنھوں نے نہ صرف علم و عمل کے چراغ روشن کیے بلکہ قرطاس و قلم کے ذریعہ لعل و گہر کے انبار لگا دیے۔ ان کی شہرۂ آفاق مسند کا ذکر آچکا ہے۔ امام بخاری جیسے محتاط محدث ان کی روایت کو اپنی جامع صحیح کا سر آغاز بناتے ہیں۔ حدیث میں خصوصی مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ فقہ و افتاء پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ اپنے گوناگوں علمی کمالات کی وجہ سے "عالم اہل مکہ" ان کا لقب ہی پڑ گیا۔

حافظ ذہبی انھیں "الامام العلم الحافظ الفقیہ" لکھتے ہیں[3]۔ ابن عماد الحنبلی "کان اماماً حجۃ" علامہ زرکلی "احد الائمۃ فی الحدیث" اور سبکی "محدث مکہ و فقیہھا" تحریر کرتے ہیں[4]۔ حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں "احد الائمۃ صاحب المسند[5]"۔

شیوخ امام حمیدی کی جلالت مرتبت، اور تبحر علمی کا مزید ثبوت ان کے شیوخ و اساتذہ کی طویل فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے مل جاتا ہے۔ جس میں امام شافعی، مسلم بن خالد، فضیل بن عیاض جیسے فخر زمانہ ائمہ کے نام ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سفیان بن عیینہ کے چشمۂ فیض سے

---

[1] اللباب فی تہذیب الانساب ج ۱ ص ۳۲۱ [2] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۱۷۷ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲ [4] شذرات الذہب ج ۲ ص ۴۵، الاعلام ج ۲ ص ۵۵، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۲ [5] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۶ ۔

کامل بیس سال تک مستفید ہوتے رہے۔[1] حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں۔

صحب ابن عیینہ فاکثر عنہ وھو من اصح الناس عنہ حدیثاً۔ (الانساب للسمعانی ورق ۱۷۷)	انھوں نے حضرت سفیان عینیہ کی بڑی صحبت اٹھائی اور اسی باعث ان سے بکثرت روایتوں کے ناقل ہوگئے اور ابن عینیہ سے روایت کرنے والے ان لوگوں میں سے ہیں جن کی روایات زیادہ صحیح مانی جاتی ہیں۔

ان کے علاوہ حمیدی نے جن علماء سے اکتساب علم کیا ہے ان میں کچھ نام یہ ہیں۔ ابراہیم بن سعد، ولید بن مسلم، وکیع بن الجراح الرواسی، مروان بن معاویہ، عبد العزیز بن ابی حازم، دراوردی، بشر بن بکر التنیسی۔[2]

تلامذہ خود ان کے چراغ علم سے روشنی حاصل کرنے والے تلامذہ میں بھی بلند پایہ ماہرین فن شامل تھے۔ چند ممتاز نام یہ ہیں۔ امام بخاری، محمد بن یحییٰ الذھلی، ابو زرعہ، ابو حاتم، بشر بن موسیٰ، سلمہ بن شبیب، یعقوب بن سفیان، محمد بن یوسف الشائی، عبد اللہ بن فضالہ، محمد بن احمد القرشی، احمد بن ازہر نیشاپوری، یعقوب بن شیبہ، محمد بن لیث، یوسف بن موسی القطان، اسماعیل بن سمویہ، محمد بن یونس الکدیمی، ہارون الحمال۔

امام بخاری ان کے خصوصی فیض یافتہ تھے، اور وہ اپنے شیخ سے اس درجہ متاثر تھے کہ جامع صحیح میں ۷۵ حدیثیں ان کے واسطہ سے روایت کی ہیں۔ مزید برآں امام مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی بواسطہ حمیدی روایت کی ہے۔[3]

حفظ و ضبط حافظہ کی قوت بلا کی پائی تھی۔ جس کی بدولت حدیث کا ایک وسیع سرمایہ ان کے دماغ میں محفوظ تھا۔ چنانچہ اہل نظر محققین نے مستند ذرائع سے لکھا ہے کہ "امام حمیدی کو اپنے شیخ سفیان بن عیینہ کی مرویات سے دس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔[4]" اسی باعث علامہ ابن سعد

---

[1] توالی التاسیس ص ۲۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص 215 [3] ایضاً
[4] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۴

ان کو کثیر الروایۃ لکھتے ہیں۔

ثقاہت و عدالت: ماہرین فن متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ حمیدی کی مرویات اسناد کے اعتبار سے جس اعلیٰ پایہ کی ہیں اس کے بعد کسی بلندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حد انتہا یہ ہے کہ امام بخاری نے ان ہی کی روایت سے اپنی جامع کا آغاز کیا ہے۔ اور وہ بقول ابن حجر امام حمیدی پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ ان کی روایت ملنے کے بعد وہ کسی دوسرے کی مرویات کو خاطر میں نہ لاتے تھے[۱] ابو حاتم کا بیان ہے کہ

ھو اثبت الناس فی ابن عیینہ وھو رئیس أصحابہ وھو ثقۃ امام[۲]	وہ سفیان بن عیینہ کی مرویات کے بارے میں سب سے زیادہ معتمد تھے اور وہ ان کے تلامذہ کے سرخیل تھے۔ وہ ثقہ اور امام تھے۔

علاوہ ازیں ابن حبان، ابو حاتم، ابن سعد اور حاکم نے بھی ان کی توثیق کی ہے[۳]

فقہ و افتا: حدیث کی طرح فقہ میں بھی انھیں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ امام شافعی سے اس فن میں خصوصی مہارت حاصل کی اور جب وہ مصر تشریف لے گئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ تھے اس طرح وہ امام صاحب کے بکثرت اجتہادات کے امین تھے۔ مصر میں اپنے شیخ کی وفات کے بعد پھر مکہ واپس آگئے۔ اور وہاں مفتی و فقیہ کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔ حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ وہ مکہ میں افتا کا مرکز بن گئے تھے[۴] امام بخاری نے حدیث کی طرح ان سے فقہ کی بھی

---

[۱] توالی التاسیس ص ۷۰ [۲] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۱۵، حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۶

[۳] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳

[۴] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۶

تحصیل کی تھی جیسا کہ حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے۔

جزم کل من ترجم البخاری بأن الحمیدی من شیوخه فی الفقه والحدیث[1]

امام بخاری کے تذکرہ نویسوں نے بوثوق لکھا ہے کہ وہ فقہ وحدیث میں امام حمیدی کے شاگرد تھے

حاکم کا بیان ہے کہ حمیدی مکہ کے مشہور مفتی، فقیہ اور محدث تھے[2]

اعتراف علماء امام حمیدی کے فضل و تقدم اور بلندیٔ شان کا اعتراف بکثرت علماء نے کیا ہے۔ جن میں نہ صرف ان کے تلامذہ اور ہم عصر اہل علم بلکہ ان کے بعض شیوخ کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں چنانچہ ربیع بن سلیمان المرادی سے مروی ہے کہ امام شافعیؒ اکثر فرمایا کرتے۔

ما رأیت صاحب بلغم احفظ من الحمیدی[3]

میں نے حمیدی سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔

امام احمد فرماتے ہیں "حمیدی، شافعی اور ابن راھویہ میں سے ہر ایک امام تھا[4]"۔ ابن عدی کا بیان ہے کہ "کان من خیار الناس[5]"۔ حاکم کہتے ہیں:

ھو لاھل الحجاز فی السنة کاحمد بن حنبل لاھل العراق[6]

وہ حدیث میں اہل حجاز کے لیے وہی مقام رکھتے تھے جو عراق میں امام احمد کو حاصل تھا۔

امام بخاری شہادت دیتے ہیں کہ حمیدی حدیث میں امام تھے[7]۔ یعقوب بن سفیان کا ارشاد ہے:

حدثنا الحمیدی وما لقیت انصح للاسلام واھله منه[8]

حمیدی نے ہم سے حدیث بیان کی ہے۔ اور ہم نے ان سے بڑھ کر کسی کو اسلام اور مسلمانوں کا خیرخواہ نہیں دیکھا۔

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۱۱ [2] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۴ [3] ایضاً ص ۲۶۳

[4] شذرات الذھب ج ۲ ص ۴۵ [5] توالی التاسیس ص ۲۷

[6] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۳ [7] ایضاً [8] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۱۵

شمائل ومناقب | زہد وورع اور پاکبازی ونیک طینتی ان کی سیرت کے روشن پہلو ہیں۔ وہ سنت نبوی کے مبالغہ کی حد تک متبع تھے۔ اور غالباً اسی باعث اہل رائے کو ناپسند فرماتے تھے۔

عقائد ونظریات | اصول السنۃ کے نام سے امام حمیدی کا ایک مختصر رسالہ ملتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے بعض عقائد اور مسلک پر بڑی وضاحت سے روشنی پڑتی ہے۔ یہ رسالہ مخدومنا مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنی مصححہ مسند کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔ ذیل میں ہم اسی سے امام حمیدی کے مذہبی خیالات اخذ کر کے درج کرتے ہیں۔

عقیدہ قدر کے بارے میں فرماتے ہیں "ہمارے نزدیک سنت ثابتہ یہ ہے کہ انسان خیر وشر اور تلخ وشیریں کے بارے میں تقدیر پر کامل ایمان رکھے۔ اور یقین رکھے کہ ہر راحت ومصیبت اللہ جل شانہ کے فیصلہ کے مطابق ہوتی ہے۔

ایمان کے متعلق کہتے ہیں۔ "وہ قول وعمل دونوں کا نام ہے جس میں کمی وبیشی ہوتی ہے۔ قول بغیر عمل کے بیکار ہے۔ اور قول وعمل بغیر نیت کے غیر مفید ہیں۔ اسی طرح اگر قول وعمل اور نیت سب ہو لیکن اتباع سنت نہ ہو تو اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ سفیان بن عیینہ فرمایا کرتے تھے "الایمان قول و عمل یزید وینقص"۔ ان کے بھائی ابراہیم بن عیینہ نے کہا۔ اے ابو محمد! یہ نہ کہیے کہ ایمان میں کمی ہوتی ہے۔ یہ سن کر حضرت سفیان غضبناک ہو گئے اور فرمایا۔ او لڑکے! تم خاموش رہو۔ ایمان یقیناً کم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔"

فرمایا "قرآن پاک خدا کا کلام ہے۔ جو شخص اسے مخلوق کہتا ہے۔ وہ بدعتی ہے۔"

فرمایا "صحابہ کرام کا احترام نہایت ضروری ہے۔ ہر مومن کو ان کے لیے استغفار و دعا کرتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ خدا وند قدوس نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ	اور جو مہاجرین وانصار کے بعد اسلام میں
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ	آئے۔ دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے
لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا	ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے

بالایمان۔　　ان بھائیوں کے گناہ معاف کر جو ہم سے پہلے

(الحشر - رکوع ۲)　　ایمان لاچکے ہیں۔

اس میں مسلمانوں کو صحابہ کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ پس جو کوئی ان کو برا بھلا کہے وہ سنت سے منحرف ہے۔

وفات | ربیع الاول ۲۱۹ھ میں اپنے وطن مالوف مکہ ہی میں رحلت فرمائی۔ سال وفات ۲۲۰ھ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اکثر نے اول الذکر ہی اختیار کیا ہے[۱]۔

تصنیفات | مذکورہ بالا رسالہ اصول السنۃ کے علاوہ امام حمیدی کی کئی اور تصانیف کے نام بھی ملتے ہیں۔ جو یہ ہیں۔

۱ ــــــ کتاب الرد علی النعمان

۲ ــــــ کتاب التفسیر

۳ ــــــ مسند[۲]

مسند حمیدی | جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں آچکا ہے کہ یہ امام حمیدی کی وہ مشہور کتاب ہے جس نے تاریخ علم و فن میں انھیں حیات جاوید عطا کی ہے۔ یہ گیارہ اجزاء پر مشتمل ہے۔ اور اس میں ۱۲۹۲ حدیثیں ہیں۔ اکثر روایتیں مرفوعاً مروی ہیں۔ صحابہ و تابعین کے کچھ آثار بھی اس میں شامل ہیں۔

مسند حمیدی کے نسخے ایک زمانہ تک نایاب رہے۔ پھر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اس کے کئی مخطوطات کو ڈھونڈھ نکالا ــــ یہ قلمی نسخے کتب خانہ دار العلوم دیوبند[۳]، المکتبۃ السعیدیہ

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۱۶ و العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۷۷ [۲] مقدمہ مسند حمیدی ج ۱ ص ۸ بحوالہ الجرح والتعدیل ج ۲ ق ۱ ص ۵۷ [۳] کتب خانہ دار العلوم دیوبند کے ذخیرہ مخطوطات کے تعارف میں مولانا ظفیر الدین مفتاحی نے حال میں جو کتاب مرتب کی ہے اس میں مسند حمیدی کے نسخۂ دیوبند کے بارے میں یہ معلومات درج ہیں۔ "یہ قلمی نسخہ بڑے سائز پر ہے۔ اس کے ۱۳۷ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ پر ۲۵ سطریں ہیں ہر دو ورق کے درمیان ایک سادہ ورق لگا ہے۔ شروع میں فہرست بھی لگی ہوئی ہے...... سنہ کتابت ۱۳۲۴ھ، کاتب کا نام درج نہیں۔"

حیدر آباد، جامعہ عثمانیہ اور دار الکتب الظاہریہ دمشق میں محفوظ تھے۔

ان ہی قلمی نسخوں کی مدد سے مولانا اعظمی نے ۱۹۶۳ء میں پہلی بار مسند حمیدی کو دو جلدوں میں اڈٹ کیا، اور مجلس العلمی کراچی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ دوسری جلد کے آخر میں رسالہ اصول السنۃ بھی شامل ہے۔

مسند کے رواۃ اس مسند کو امام حمیدی سے بکثرت علماء نے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ابو اسماعیل السلمی (المتوفی ۲۸۰ھ) اور بشر بن موسی الاسدی کا نام ذکر کرنے کے بعد "رواہ غیر واحد" لکھ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مسند کے اور بھی بہت سے رواۃ ہیں۔

لیکن آج جو نسخۂ مسند ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ امام بشر بن موسی الاسدی سے مروی ہو، اس کے علاوہ کسی دوسرے کی روایت کردہ مسند کا اب تک سراغ نہیں لگ سکا ہے۔ ذیل میں بشر کا اجمالی تعارف درج ہے۔

بشر نام، ابو علی کنیت اور نسب نامہ یہ ہے۔ بشر بن موسی بن صالح بن شیخ بن عمیرہ بن حیان بن سراقہ بن مرثد بن حمیری۔[1] ۱۹۰ھ میں پیدا ہوئے وطن مالوف بغداد تھا۔ بنو اسد کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو فضل و تقدم، امارت و ریاست اور شرافت میں بہت مشہور اور نامور خاندان تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ امام بشر تمام خاندانی خصوصیات کے امین تھے۔[2]

امام بشر نے ابو نعیم فضل بن دکین، روح بن عبادہ، خلاد بن یحیی، ہوذہ بن خلیفہ، عبداللہ بن الزبیر الحمیدی، حسن بن موسی الاشیب، علی بن الجعد، اصمعی، سعید بن منصور، خلف بن الولید، اور عمر بن حکام وغیرہ مشاہیر اہل علم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور ان کے جملہ کمالات کو اپنے سینہ میں منتقل کیا۔ یہاں تک کہ ان کے جلالت مرتبت کی بنا پر امام احمد حنبل بھی باہمہ تجر و فضل ان کی توقیر و تکریم کرتے تھے۔[3] دارقطنی کا بیان ہے۔

بشر بن موسی الاسدی ثقۃ نبیل[4] — بشر بن موسی الاسدی ثقہ اور شریف انسان تھے۔

علامہ ابن الجوزی رقمطراز ہیں۔

کان ھو فی نفسہ ثقۃ امیناً عاقلاً رکیناً[5] — وہ بذات خود نہایت ثقہ، امین اور بہت عاقل ذی وقار تھے۔

۲۶ ربیع الاول ۲۸۸ھ بروز شنبہ ان کی شمع حیات بغداد میں گل ہو گئی۔ مقبرہ باب التبن میں تدفین ہوئی۔ جنازہ میں ایک جم غفیر نے شرکت کی۔[6]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۷، ص ۸۶ [2] المنتظم ج ۶ ص ۲۸ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۷ [4] تاریخ بغداد ج ۷، ص ۸۷

Monthly 'ALFURQAN' Lucknow.

VOL 39 NO. 11 JANUARY 1972 Regd. No. L-353

الفرقان

لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے .... -/8
پاکستان سے 8/50
ضخامت ۵۶ صفحات
قیمت
فی کاپی .... ۵۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۵ شلنگ
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ

جلد ۳۹ | بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق فروری ۱۹۷۲ء | شمارہ (۱۲)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ فروری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت و منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہو۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، انکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از — محمد منظور نعمانی

گزشتہ مارچ سے جب سے کہ مشرقی بنگال میں اُن خونیں واقعات کا سلسلہ شروع ہوا تھا جو بالآخر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ کا باعث بنے اور پھر جس کے نتیجہ میں مشرقی بنگال کا تعلق پاکستان سے ختم ہو گیا۔ راقم سطور کو تحریکِ پاکستان کے اُس طوفانی دور کے، جو اُس وقت کے وائسرائے ہند ویول کی بلائی ہوئی شملہ کانفرنس (۴۵ء) کے بعد سے شروع ہوا تھا، بعض تکلیف دہ واقعات اور مناظر اس طرح یاد آتے رہے گویا کہ وہ اب آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں۔

اُس وقت جداگانہ انتخاب رائج تھا، عام مسلمان جن کی غالب اکثریت سیاسی فہم و شعور سے بالکل خالی تھی (اور دین کے علم و عمل کے لحاظ سے بھی جن کا حال ایسا ہی تھا مگر اسلام کے نام سے ایک گہرا جذباتی تعلق رکھتے تھے)، اُن کی حمایت اور اُن کے ووٹ تحریکِ پاکستان کے حق میں حاصل کرنے کے لیے پاکستان کی جدوجہد کو ایک "مقدس جہاد" بنا دیا گیا تھا، اور عوام کے دلوں میں صرف نعروں اور جلوسوں کے ذریعہ ایسا جوش بھر دیا گیا تھا، کہ وہ اُس کے نتائج و ثمرات اور منافع و مضرات کو سمجھنے کے لیے کسی بات کے سننے اور اُس پر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو سکتے تھے ـــــ انھیں باور کرایا گیا تھا کہ پاکستان کی حکومت لا الٰہ الا اللہ کی عملی تفسیر اور اس بیسویں صدی کی دنیا کے لیے "اسلامی حکومت" اور "خلافت اسلامیہ" کا نمونہ ہوگی اور وہاں قرآن کی حکمرانی ہوگی، اور تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے شہری و ملی حقوق کی بھی وہ محافظ ہوگی۔

یہ لوگ اُس وقت اتنی موٹی بات سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ آج کی دنیا میں کوئی

ملک دوسرے ملک کے شہریوں کا محافظ نہیں بن سکتا، اور کسی ملک کے شہری دوسرے کسی ملک سے ایسا رابطہ نہیں رکھ سکتے، اور اگر ایسا کریں گے تو اپنے لیے مزید سنگین مشکلات پیدا کریں گے۔

اور اس سے بھی موٹی اور کھلی آنکھوں نظر آنے والی اس حقیقت پر غور کرنے کے لیے بھی یہ بیچارے اُس وقت تیار نہیں تھے کہ جو لوگ تحریک پاکستان اور اس کی علمبردار مسلم لیگ کے صف اوّل کے قائدین تھے اُن میں سے بہت سوں کا دین سے تعلق بظاہر برائے نام سا ہی تھا، انھوں نے اپنی ذات اور اپنے گھرانہ پر بھی حکومت کرنے کی اجازت کبھی اسلام اور اس کی شریعت کو نہیں دی تھی،[1] اُن سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسلامی نصب العین کے مطابق حکومت قائم کریں گے اور وہاں شریعت کی حکمرانی ہوگی، زانیوں اور شرابیوں کو درے مارے جائیں گے وغیرہ وغیرہ ببول کے درخت سے آم اور املی کے درخت سے امرود حاصل کرنے کی امید سے کم عجیب بات نہیں تھی۔ لیکن بیچارے عام مسلمانوں اور خاصکر نوجوانوں کو ایسا ہی دیوانہ بنا دیا گیا تھا کہ وہ اس پر پورا یقین رکھتے تھے۔

---

[1] اس موقع پر بے اختیار ایک واقعہ ذکر کرنے کا جی چاہتا ہے جو اُسی زمانہ میں (یعنی اب سے ۲۷-۲۸ سال پہلے) عبرت آموزی کے لیے "الفرقان" میں شائع کر دیا گیا تھا، یہاں اُسی سے نقل کیا جا رہا ہے۔

"پنجاب کے میرے ایک دوست جو ہر طرح ثقہ اور قابل اعتماد ہیں اور دینوی جاہ و منصب کے لحاظ سے بھی بہت بلند مقام ہیں اور سیاسی مسلک کے لحاظ سے مسلم لیگی یا مسلم لیگ سے قریب تر ہیں، خود انھوں نے راقم سطور سے اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ مسلم لیگ کے ایک لیڈر اعظم سے انھوں نے ایک ملاقات میں نماز کے لیے کہا اور نماز کی دینی اہمیت ان پر واضح کی، سب کچھ سننے کے بعد اُن لیڈر اعظم صاحب نے کسی قدر برافروختہ ہو کر انگریزی میں فرمایا۔ "کیا وقت کا تقاضا ان باتوں کے لیے ہے"۔ اس جواب کے بعد بھی ہمارے ان مبلغ دوست نے بطرز حسن اپنی تبلیغ جاری رکھی اور ان کو بتلایا کہ اسلام میں نماز کی اہمیت دوسری تمام چیزوں سے زیادہ ہے، اور آپ چونکہ قوم کے سب سے بڑے لیڈر ہیں اس لیے قوم بھی یہ چاہتی ہے کہ آپ نماز پڑھیں۔ ــــــ ان لیڈر اعظم نے یہ سب سننے کے بعد ایک خاص انداز میں فرمایا۔ "کیا مصطفےٰ کمال نماز پڑھتا تھا۔" (الفرقان محرم ۶۵ھ صفحہ ۶)

پھر یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ملک کی تقسیم کو غلط اور بحیثیت مجموعی مسلمانانِ ہند کے لیے نقصان رساں یقین کرتے ہوئے اُس کی سخت مخالفت کرنے والے مسلمانوں میں سے اُن کے اکثر وہ علمائے دین تھے جو دین سے علمی اور عملی تعلق میں امتیاز رکھنے کے علاوہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے قربانیوں کے لحاظ سے بھی اپنی ایک خاص تاریخ رکھتے تھے اور مسلمانوں میں سیاسی حرکت و بیداری کے آغاز ہی سے وہ سیاست کے میدان میں تھے، اُن کی زندگیوں کا خاصہ حصہ انگریزی اقتدار کے خلاف لڑتے ہوئے جیلوں میں گزرا تھا، اور کم سے کم ملک کے پڑھے لکھے مسلمان اس کو جانتے تھے۔ لیکن اُس وقت فضا ایسی بنادی گئی تھی کہ اسی کی بناء پر مسلمانوں کا بڑا طبقہ اُن کو بھی دشمنِ اسلام سمجھتا اور ان کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

خود راقم سطور اُس وقت بلکہ کئی سال پہلے سے سیاسی اور خاصکر الکشنی ہنگاموں سے عملاً بے تعلق رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا، لیکن مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ نے خاصکر اُن کے "تعلیمیافتہ" طبقہ نے اس الکشنی جنگ میں اسلامی تہذیب و شرافت، شرعی احکام، اخلاقی اقدار اور معقولیت و سنجیدگی کے تقاضوں کو مسترد کر کے صرف جوش و جذبات کی رو میں بہنے اور پھر سب کچھ کر گزرنے کا جو رویہ اپنا لیا تھا اُس سے سخت روحانی کوفت بھی تھی اور یہ فکر بھی تھی کہ اس نسل کا کیا انجام ہوگا جس کو ملک و ملت کے بڑے بڑے مسائل کے بارہ میں بھی عقل و ہوش اور غور و فکر سے کام لینے کے بجائے اندھے جوش و خروش اور غنڈہ گردی کا عادی بنایا جا رہا ہے اس لیے اس صورتِ حال پر اپنے اضطراب اور فکرمندی کا اظہار کبھی کبھی الفرقان کے صفحات پر بھی ہو جاتا تھا اور شدتِ احساس سے اس کا انداز کبھی بہت تلخ بھی ہو جاتا تھا۔

نومبر ۱۹۴۵ء میں جبکہ چند روز کے بعد مرکزی اسمبلی کا الکشن ہونے والا تھا حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح الکشنی مہم ہی کے سلسلہ میں بریلی تشریف لائے، اُن کی اور اُن کے رفقا کی رائے پورے وثوق اور یقین کے ساتھ یہ تھی کہ ملک کی تقسیم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مفید نہیں بلکہ سخت مضر ہوگی، (جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں جیسے یوپی بہار وغیرہ جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے مراکز ہیں اور اصل مسائل انھیں کے ہیں) تقسیم کے بعد اُن کی مشکلات اور زیادہ بڑھ جائیں گی، اور جن صوبوں میں وہ اکثریت میں ہیں وہاں تو وفاقی نظامِ حکومت

میں اختیار و اقتدار بہر حال ان ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ اپنی اس دیانتدارانہ رائے کی بنا پر وہ مسلم لیگ کے مطالبہ تقسیم کے مخالف تھے اور چونکہ فیصلہ کا دار ومدار مسلم سیٹوں کے الکشن کے نتائج پر تھا اس لیے مسلمانوں کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے اور اپنا ہم خیال بنانے کے لیے وہ پوری طرح سرگرم تھے اور اس کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور اپنا فرض سمجھتے تھے۔۔۔ اسی مہم کے سلسلہ میں وہ ۲۰ر نومبر ۴۵ء کو بریلی بھی تشریف لائے، راقم سطور کا قیام اُس زمانہ میں بریلی ہی تھا، الفرقان وہیں سے نکلتا تھا، شہر کے مرکزی مقام کتب خانہ کے پارک میں جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا، بعد عشا کا وقت تھا، اس عاجز نے بھی جانے اور سننے دیکھنے کا فیصلہ کیا اور جلسہ گاہ کے قریب ایک ذرا بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دیکھنا سننا اپنے لیے زیادہ مناسب سمجھا، پھر جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ ایسا تھا کہ اگر میں خود نہ دیکھتا اور کوئی دوسرا بیان کرتا تو ہرگز یقین نہ آتا۔ جیسے ہی حضرت مولانا اور اُن کے رفقار جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی، مخالفین کے اُن گروہوں اور ٹولیوں کی طرف سے جو پہلے سے جلسہ گاہ کے اردگرد کھڑے تھے، مخالفانہ نعروں اور غنڈہ گردی کا ایک طوفان اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اپنا یہ مشاہدہ اور اس کے بارہ میں اپنا کچھ تاثر بھی اُس وقت الفرقان میں لکھا گیا تھا، اس کی چند سطریں یہ تھیں۔

> بدتمیزی اور حیوانیت کا ایک عبرتناک طوفان اور ہنگامہ تھا، کوئی دور سے جوتا دکھا رہا ہے کوئی ہاکی اٹھا رہا ہے، کوئی پیپا بجا رہا ہے، کوئی کسی دوکان کے سائبان کا ٹین یا سائن بورڈ پیٹ رہا ہے، کبھی سب ملکر تالیاں بجا رہے ہیں، کبھی جانوروں کی بولیاں بولی جارہی ہیں۔
>
> پھر اس ساری غزل کا مقطع یہ تھا کہ جلسہ گاہ کے اردگرد سڑک کی کٹائی کے لیے پتھروں کے جو ڈھیر لگے ہوئے تھے، پہلے تو جلسہ پر اکا دکا پتھر پھینکے گئے، اور پتھروں ہی سے گیس کے ہنڈے توڑ کر اندھیرا کر دیا گیا اور آخر میں چند ٹولیوں نے پتھر کے ان ڈھیروں پر کھڑے ہو کر اس قدر بے دردی کے ساتھ بے تحاشا پتھر برسائے کہ اگر یہ سب پتھر جلسہ ہی پر گرتے تو حاضرین میں سے شاید کوئی ایک بھی صحیح سالم نہ رہتا۔۔۔۔۔۔۔
>
> بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہذب اور تعلیم یافتہ فیشنبل صاحبزادوں کے لباس میں لایعقل حیوانوں کا ایک انبوہ ہے۔۔۔۔ جو اپنی انسانی حیثیت کو بالکل فراموش کر کے حیوانیت درندگی کا یہ مظاہرہ کر رہا ہے۔

پھر اس تحریر کے آخر میں اُس وقت کے قائدین مسلم لیگ کو مخاطب کر کے عرض کیا گیا تھا۔

ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات ہے کہ جن بیچارے جاہلوں، ان پڑھوں یا اسکولوں کالجوں میں تعلیم پانے والے جن نوخیز ناتجربہ کار جذباتی نوجوانوں کے ذہن کو غلط تربیت دیکر آپ آج مولانا حسین احمد جیسے بزرگوں کی بے عزتی کراتے ہیں (دین وملت کے لیے جن کی قربانیوں کی شاندار تاریخ بھی ہے) کل ایسا دن بھی آسکتا ہے کہ یہ بگڑی ہوئی ذہنیت کسی اختلاف کے موقع پر خود آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی یا اس سے بھی بدتر برتاؤ کرے۔"

(الفرقان بابت ذیقعدہ ۶۴ھ)

بریلی کا یہ واقعہ تو خود اپنی آنکھوں نے دیکھا تھا، اس کے علاوہ اس دور میں یوپی، بہار اور پنجاب کے بہت سے مقامات پر خاصکر حضرت مولانا مدنیؒ کے ساتھ انتہائی بدتمیزی کے اس طرح کے واقعات بار بار ہوئے تھے —— اسی طرح اُسی زمانہ میں مولانا آزاد کے ساتھ جبکہ وہ کلکتہ سے دہلی کے لیے سفر کر رہے تھے، علی گڑھ اسٹیشن پر جو کچھ کیا گیا تھا، اس کی شرمناک اور تکلیف دہ تفصیلات اخبارات میں آئی تھیں، بہت سوں کو اب تک یاد بھی ہوں گی۔

اسی طرح مولانا مودودی جو اُس وقت کانگرس اور کانگرسی مسلمانوں کے سیاسی مسلک و موقف سے بھی اختلاف رکھتے اور اس پر سخت تنقیدیں کرتے تھے (اور اس کی وجہ سے مسلم لیگی حلقوں میں بھی انکو خاص مقبولیت حاصل تھی) لیکن وہ مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے دینی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مخالف تھے اور اس کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت نقصان رساں سمجھتے تھے، جب انھوں نے اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں تحریک پاکستان کے خلاف مضامین لکھے اور مسلسل لکھے تو اُن کے ساتھ بھی یہ ہوا کہ ان ہی دنوں میں جب اُن کے زیر امارت وقیادت جماعت اسلامی کا اجتماع مدراس میں ہوا تو مسلم لیگ کے حامی اُن پرجوش نوجوانوں نے جو اگرچہ دین کی الف ب بھی نہیں جانتے تھے لیکن تحریک پاکستان کی مخالفت کو اسلام دشمنی اور اس سے اختلاف کرنے والوں کو گردن زدنی سمجھتے تھے، حملہ کر دیا اور وہ کھانا تک لوٹ لیا جو ہندوستان بھر سے آئے ہوئے شرکاء اجتماع کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ مولانا مودودی نے اس واقعہ کی پوری تفصیل بڑے دردمندانہ احتجاج کے ساتھ ترجمان القرآن میں لکھی تھی۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تحریک جس طرح چلائی گئی تھی اُس نے مسلمانوں اور خاصکر نوجوانوں کی تفکر اور عاقبت اندیشی کی صلاحیت اور سنجیدگی و متانت کو کتنا برباد کیا، اخلاقی معیار کو کتنا گرایا اور کس قدر غلط تربیت کی۔ اور پھر کبھی اس بگاڑ کی اصلاح کی فکر نہیں کی گئی۔

جو شخص بھی پاکستان کے قیام خاصکر لیاقت علی خاں مرحوم کے سیاسی قتل سے لے کر اس وقت تک کے وہاں کے افسوسناک اور المناک واقعات و حوادث پر گہری نظر ڈالے گا وہ محسوس کرے گا کہ قوم کا جو ذہن پاکستان کی جد و جہد میں بگاڑا گیا تھا اور تفکر و مفاہمت اور تعمیری نقطۂ نظر کے بجائے تخریب و تصادم، غنڈہ گردی اور زور دستی کا جو مزاج بنایا گیا تھا وہ جوں کا توں باقی رہا بلکہ بعد میں آنے والی نسل کو بھی میراث میں ملا، اور اُس کے تلخ نتائج مختلف شکلوں میں وہاں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور اب سب سے آخر میں مرحوم مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں نے اپنے غیر بنگالی مسلمان بھائیوں کے ساتھ اور پھر غیر بنگالی مسلمانوں نے اپنے مسلمان بنگالی بھائیوں کے ساتھ جو کچھ کیا اور اب اس کے جواب میں جو کچھ ہو رہا ہے اور زیادہ تر اسکولوں، کالجوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں ہی کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ وہ اصولی اور بنیادی طور پر وہی ہے جس کا عادی اُن کو تحریک پاکستان کی جد و جہد میں بنایا گیا تھا۔ وہ اس کی ابتدا تھی اور یہ اُس کی انتہا ہے۔ دوسرے اقتصادی، معاشی اور سیاسی عوامل و محرکات سے انکار نہیں لیکن اگر ذہنیتوں میں وہ فساد نہ ہوتا تو اختلافات کا انجام ہرگز یہ نہ ہوتا۔

اس موقع پر دلی دکھ کے ساتھ اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اگرچہ قیام پاکستان کے پہلے دن سے سورج کی روشنی کی طرح یہ بات برابر ظاہر ہوتی رہی ہے کہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں اسلام کا نام لے کر جو کچھ باور کرایا گیا تھا اور نادانی و سادہ لوحی سے جس پر یقین کر لیا گیا تھا وہ صرف دھوکہ تھا، وہاں ایک دن کے لیے بھی اللہ کے دین اسلام کی حکومت نہیں ہوئی بلکہ وہ بے چارہ محکوم اور مظلوم ہی رہا اور ہے۔ اسی طرح وہاں کے ارباب اقتدار نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ وہی رویہ رکھا ہے جو عموماً حکومتیں غیر ملکیوں کے ساتھ کرتی ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے ہمیشہ ہماری مشکلات میں کچھ اضافہ ہی کیا ہے، جسے ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جس کو اللہ نے ان باتوں کی کچھ سمجھ بوجھ دی ہو —— لیکن افسوس ہے کہ یہاں

بھی مسلمانوں میں ایک اچھا خاصا طبقہ موجود ہے جس کا ذہن ۲۵ سال کے اس تجربہ کے بعد بھی نہیں بدلا ہے اور اس کی خوش فہمی و خوش اعتقادی اور جذباتیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ــــ اس کا سب سے بڑا ضرر یہ ہے کہ یہ بے چارے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو کبھی صحیح روشنی میں نہیں دیکھ سکتے اور اُن کے حل کرنے کے لیے کبھی صحیح راستہ نہیں اپنا سکتے، بلکہ اس کی راہ میں مشکلات ہی کا سبب بن رہے ہیں۔

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مرحوم

الفرقان کے اکثر ناظرین کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی کے حادثۂ انتقال کی اطلاع ہو چکی ہوگی، مولانا موصوف حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے کئی رشتوں سے قریبی عزیز اور برادر نسبتی تھے۔ــ اب سے ۳۲-۳۳ سال پہلے جب حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں اس عاجز کی آمد و رفت شروع ہوئی تو یہ تبلیغی کام جو انہی کی طرف سے منسوب ہے (اور اب عالمی کام بن چکا ہے) اس وقت بہت محدود پیمانہ پر تھا، میوات اور دہلی شہر کے ایک مخصوص طبقہ کے علاوہ بس چند قریبی اضلاع کے کچھ مخلصین کا اس سے تعلق تھا۔ اور در حقیقت اسکی کل کائنات بس یہ تھی کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اپنی مضطرب روح، اپنے بے چین قلب، اپنے نحیف جسم، اپنے حال اور اپنی زبان سے اسکے داعی تھے، اُن کے تربیت یافتہ چند میواتی اس کے ہاتھ پاؤں اور یہ مولانا احتشام الحسن صاحب اس کا انتظامی دماغ تھے ــــ ذی استعداد عالم اور صاحب قلم بھی تھے، اُن کا ایک چھوٹا سا رسالہ "پستی کا واحد علاج"[لے] اس ابتدائی زمانہ میں بلا شرکت غیرے اس دعوتِ تبلیغ کا گویا تعارفی اور توضیحی لٹریچر تھا۔ــ اس زمانہ میں تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بعد انہی سے زیادہ واقف تھے۔ــ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کا تعلق اس کام سے اُس وقت بس اتنا ہی تھا کہ اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں کچھ حصہ لے لیتے اور مہمانوں کی خبر گیری میں شرکت کر لیتے تھے۔ــ لیکن حضرت کے وصال کے بعد دفعۃً اُن کا حال ایسا بدلا کہ گویا حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی روح اپنی پوری جذبی اور بے چینی کی کیفیت کے ساتھ اُن کے اندر آگئی۔ــ اور حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب کی صحت توانائی نے اچانک جواب دیدیا اور گویا وہ حضرتؒ کے مرض کے وارث بن گئے۔ــ چند ہی روز کے بعد صحت کی اس خرابی نے مجبور ہو کر اپنے وطن کاندھلہ آجانا پڑا کم و بیش اسی وقت سے امراض کا تسلسل رہا، لیکن قلم کے ذریعہ برابر کام کرتے رہے۔ــ ادھر کئی سال سے غیر مسلموں میں دعوتِ اسلام کا اُن کے دل میں خاص داعیہ پیدا ہو گیا تھا اور یہی اُن کا مشن اور موضوعِ فکر بن گیا تھا، اس سلسلہ کے اُن کے متعدد رسالے اور مقالے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اسکے علاوہ تعلق رکھنے والوں سے وہ اسکے لیے خط و کتابت بھی کرتے تھے۔ــ گزشتہ سال جبکہ برسوں کی مسلسل بیماری کی وجہ سے وہ سفر کے بالکل لائق نہ تھے، لکھنؤ اور رائے بریلی تک کا سفر بھی فرمایا۔ اگرچہ ہم دونوں اپنے کچھ تجربات اور اپنی خاص رائے کی بنا پر انکی رفاقت و ہمسفری کا فیصلہ نہیں کر سکے لیکن اُن کے جذبۂ صادق سے بہت متاثر ہوئے ــــ ادھر کئی مہینے سے تکالیف میں بہت اضافہ ہو گیا تھا، بالآخر علاج کیلئے دہلی لیجانا طے کیا گیا، وہاں ڈاکٹروں نے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ــ آپریشن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ آنتوں میں کینسر ہے جس پر طویل مدت گزر چکی ہے اور آخری حد تک پہنچ چکا ہے، بچانے کی ڈاکٹروں نے اپنی سی کوشش کی لیکن وقت موعود آچکا تھا، جبتک ہوش اور زبان نے ساتھ دیا ذکر و دعا کا سلسلہ جاری رہا، وسط شوال میں اسپتال ہی میں انتقال فرمایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تلمذ اور بیعت کا تعلق حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہ سے تھا، بعد میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے تعلق قائم کر لیا تھا، حضرت نے وصال سے چند ساعت پہلے جن چھ حضرات کو اجازت دی تھی اُن میں مولانا مرحوم بھی تھے ــــ اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے۔

لے دارالاشاعت محلہ مولویان کاندھلہ ضلع مظفر نگر سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۲

کتابُ المعاشرۃ والمعاملات

معارفُ الحدیث

(مُسلسل)

ستر اور پردہ کے بارے میں ہدایات

انسان کی معاشرتی زندگی میں ستر اور پردہ کے مسئلہ کو بھی خاص اہمیت ہے اور یہ ان خصائص میں سے ہے جن میں انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے ــــ خالق کائنات نے دوسرے حیوانات میں حیا اور شرم کا وہ مادہ نہیں رکھا جو انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے، اس لیے حیوانات اپنے جسم کے کسی حصہ کو اور اپنے کسی فعل کو چھپانے کی وہ کوشش نہیں کرتے جو انسان کرتا ہے۔ اور جس کے لیے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے ــــ بہرحال ستر اور پردہ اصولی درجہ میں انسانی فطرت کا تقاضا ہے اسی لیے تمام اقوام و ملل اپنے عقائد و نظریات اور رسوم و عادات کے بہت سے اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس پر متفق ہیں کہ آدمی کو دوسرے حیوانات کی طرح ننگ دھڑنگ نہیں رہنا چاہیے ــــ اسی طرح یہ بات بھی تمام انسانی گروہوں کے مسلمات بلکہ معمولات میں سے ہے کہ اس بارہ میں عورت کا درجہ مرد سے بھی بلند ہے، گویا جس طرح ستر اور پردہ کے باب میں انسانوں کو عام حیوانات کے مقابلہ میں امتیاز و تفوق حاصل ہے اسی طرح اس معاملہ میں عورت کو مرد کے مقابلہ میں فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی جسمانی ساخت ایسی ہے کہ اس میں جنسی کشش جو بہت سے فتنوں کا ذریعہ بن سکتی ہے مردوں سے کہیں زیادہ ہے اسی لیے اُن کے پیدا کرنے والے نے ان میں حیا کا جذبہ بھی مردوں سے زیادہ رکھا ہے ــــ بہرحال

اولادِ آدم کے لیے ستر اور پردہ بنیادی طور پر اُن کی فطرت کا تقاضا اور پوری انسانی دُنیا کے مسلّمات میں سے ہے۔

پھر جس طرح انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں ہدایت کی تکمیل اللہ کے آخری نبی سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی اسی طرح اس شعبہ میں بھی جو ہدایات آپ نے دیں وہ بلاشبہ اس شعبہ کی تکمیلی ہدایات ہیں۔

اس باب میں اُصولی اور بنیادی احکام تو آپ کی لائی ہوئی کتاب ہدایت قرآن مجید ہی میں دے دیئے گئے ہیں، سورۂ اعراف کے شروع ہی میں جہاں آدم علیہ السلام کی تخلیق اور انسانی دنیا کے آغاز کا ذکر ہے، فرمایا گیا ہے کہ نسلِ آدم کو ستر چھپانے کی ہدایت اسی ابتدائی دور میں دیدی گئی تھی اور آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس بارے میں تم شیطان کے اغوا کا شکار نہ ہو جانا وہ تمھیں انسانیت کی بلند سطح سے گرا کر جانوروں کی طرح ننگا اور بے پردہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

پھر سورۂ نور اور سورۂ احزاب میں خاصکر عورتوں کے پردہ کے بارے میں احکام دیے گئے، مثلاً یہ کہ اُن کی اصل جگہ اپنا گھر ہے، لہذا بے ضرورت سیر سپاٹے یا اپنی نمائش کے لیے گھروں سے باہر نہ گھومیں ـــــ اور اگر ضرورت سے نکلیں (جس کی اجازت ہے) تو پورے پردہ والا لباس پہن اوڑھ کر نکلیں ـــــ اور گھروں میں شوہروں کے علاوہ گھر کے دوسرے لوگوں، یا آنے جانے والے عزیزوں، قریبوں کے سامنے لباس اور پردہ کے بارے میں ان مقررہ حدود کی پابندی کریں ـــــ اور مردوں کو چاہیئے کہ اپنے اہلِ قرابت یا دیگر اہلِ تعلق کے گھروں میں اچانک بلا اطلاع اور اجازت کے نہ جائیں ـــــ نیز مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو دیکھنے تاکنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ سامنا ہو جائے تو نگاہیں نیچی کرلیں۔

اللہ نے جن کو عقلِ سلیم دی ہے اور اُن کی فطرت مسخ نہیں ہوئی ہے وہ اگر غور کریں گے تو انشاء اللہ انھیں اس میں شبہ نہ ہوگا کہ یہ احکام انسان کے جذبۂ حیا کے فطری تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور ان سے اُن شیطانی اور شہوانی فتنوں کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے جو زندگی کو گندہ اور اخلاق کو برباد کرتے ہیں، اور کبھی کبھی بڑے شرمناک اور گھنونے نتائج کا باعث بن جاتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اور اسی کی روشنی میں اس باب سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

مندرجہ ذیل ارشادات پڑھیے!

ضروری ستر:-

عَنْ جَرْهَدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ ـــــــــ رواہ الترمذی وابوداود

حضرت جرہد ابن خویلد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ران (بھی) ستر میں شامل ہے (یعنی اس کا کھولنا جائز نہیں)۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داود)

(تشریح) انسانی جسم کے جو حصے عرف میں شرمگاہ کہلاتے ہیں ان کے بارے میں تو ہر آدمی حتیٰ کہ خدا کے اور کسی دین و مذہب کے نہ ماننے والے بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا ستر یعنی چھپانا ضروری ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ انسانی جسم میں صرف شرمگاہ اور اس کے قریبی حصے ہی نہیں بلکہ ران تک ستر میں شامل ہے جس کا چھپانا ضروری ہے، یہ گویا ستر کے بارہ میں تکمیلی تعلیم اور ہدایت ہے۔

اس حدیث میں فَخِذ (ران) کو عورۃ فرمایا گیا ہے عورۃ کے لفظی معنی ہیں، چھپانے کی چیز، جس کا کھلنا شرم و حیا کے خلاف ہو۔

عَنْ عَلِيٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ يَا عَلِيُّ لَا تُبْرِزْ فَخِذَكَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰى فَخِذِ حَيٍّ وَلَا مَيِّتٍ۔

ـــــــــ رواہ ابوداود وابن ماجہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت فرمائی کہ اے علی اپنی ران نہ کھولو اور کسی زندہ یا مردہ آدمی کی ران کی طرف نظر نہ کرو (سنن ابی داود، سنن ابن ماجہ)

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْظُرُ الرَّجُلُ اِلٰى عَوْرَةِ الرَّجُلِ وَلَا الْمَرْاَةُ اِلٰى عَوْرَةِ الْمَرْاَةِ۔

ـــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مرد دوسرے مرد کے ستر کی طرف۔ اور عورت دوسری عورت کے ستر کی طرف نظر نہ کرے۔

(صحیح مسلم)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ جسم کے وہ مخصوص حصے جن کو چھپانا ضروری قرار دیا گیا ہے (یعنی ناف کے نیچے سے رانوں تک) اُن کی طرف نظر کرنا ہم جنسوں کے لیے بھی جائز نہیں۔ اور بلاشبہ حیا اور شرم کا تقاضا یہی ہے، ہاں ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہوں گے۔

تنہائی میں بھی ستر کا چھپانا ضروری:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ اگر آدمی کسی وقت اور کسی جگہ بالکل تنہا ہو کوئی دوسرا شخص دیکھنے والا نہ ہو تب بھی بلا ضرورت برہنہ نہ ہو اور ستر کی حفاظت کرے، اللہ سے اور اُس کے فرشتوں سے شرم کرے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاكُمْ وَالتَّعَرِّيْ فَاِنَّ مَعَكُمْ مَنْ لَا يُفَارِقُكُمْ اِلَّا عِنْدَ الْغَائِطِ وَحِيْنَ يُفْضِي الرَّجُلُ اِلٰى اَهْلِهٖ فَاسْتَحْيُوْهُمْ وَاَكْرِمُوْهُمْ ——— رواہ الترمذی

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو (تنہائی کی حالت میں بھی) برہنگی سے پرہیز کرو (یعنی بے ضرورت تنہائی میں بھی ستر نہ کھولو) کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے برابر رہتے ہیں، کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتے، سوائے قضائے حاجت اور میاں بیوی کی صحبت کے وقت کے، لہٰذا اُن کی شرم کرو اور اُن کا احترام کرو۔

(جامع ترمذی)

تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کراماً کاتبین وغیرہ جو فرشتے انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں وہ اُن اوقات میں الگ ہو جاتے ہیں جب آدمی اپنی فطری ضرورت سے بے پردہ ہوتا ہے۔

عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْفَظْ عَوْرَتَكَ اِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ اَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَرَأَيْتَ اِذَا كَانَ الرَّجُلُ خَالِيًا. قَالَ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُسْتَحْيٰى مِنْهُ ـــ رواہ الترمذی وابوداؤد وابن ماجہ

بہز بن حکیم نے اپنے والد حکیم سے اور انھوں نے بہز کے دادا (یعنی اپنے والد) معاویہ بن حیدہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی شرمگاہ محفوظ رکھو (کسی کے سامنے نہ کھولو) سوائے اپنی بیوی اور (شرعی) باندی کے (معاویہ بن حیدہ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا فرماتے ہیں اُس حالت کے بارہ میں جب آدمی بالکل تنہائی میں ہو؟ (کوئی دوسرا آدمی دیکھنے والا نہ ہو) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ سزاوار ہے اور اس کا زیادہ حق ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

عورتوں کو پردہ ضروری، باہر نکلنا موجبِ فتنہ:-

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ فَاِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ ـــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عورت گویا ستر ہے (یعنی جس طرح ستر کو چھپا رہنا چاہیئے اسی طرح عورت کو گھر میں پردہ میں رہنا چاہیئے) جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیاطین اُس کو تاکتے اور اپنی نظروں کا نشانہ بناتے ہیں۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) عربی زبان میں "عورت" اُس چیز یا اُس حصۂ جسم کو کہتے ہیں جس کا چھپانا اور پردہ میں رکھنا ضروری اور کھولنا معیوب سمجھا جائے، اس حدیث میں فرمایا گیا ہے "اَلْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ" یعنی صنفِ خواتین کی نوعیت یہی ہے، اُن کو پردہ میں رہنا چاہیئے ـــ آگے فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی خاتون باہر نکلتی ہے تو شیطان تاک جھانک کرتے ہیں۔ حضور کے اس ارشاد کا مدعا اور مقصد یہ ہے کہ عورتوں کو حتی الوسع باہر نکلنا ہی نہ چاہیئے تاکہ شیطانوں

اور اُن کے چیلے چانٹوں کو شیطنت اور شرارت کا موقع ہی نہ ملے۔ اور اگر ضرورت سے نکلنا ہو تو اس طرح باپردہ نکلیں کہ زینت و آرائش کا اظہار نہ ہو۔ قرآن مجید کی آیت "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ" میں بھی یہی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ البتہ ضرورت سے باہر نکلنے کے بارے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضور کا صریح ارشاد ہے "إِنَّهُ قَدْ أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِكُنَّ" یعنی بہ ضرورت باہر نکلنے کی اجازت ہے۔

نظربازی موجبِ لعنت :-

عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُورَ إِلَيْهِ ——— رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خدا کی لعنت ہے دیکھنے والے پر اور اُس پر جس کو دیکھا جائے۔

(شعب الایمان للبیہقی)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو کوئی کسی نامحرم عورت کو یا کسی کے ستر کو (جس کا دیکھنا حرام ہے) دیکھے تو اس پر خدا کی طرف سے لعنت ہے، یعنی رحمت سے محرومی کا فیصلہ ہے، اور اسی طرح وہ بھی رحمتِ خداوندی سے محروم ہے جس نے قصداً دیکھنے والے کو دیکھنے کا موقع دیا اور دکھایا۔

کسی اجنبی عورت پر اچانک نگاہ پڑجانے کا حکم :-

عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نَظَرِ الْفُجَاءَةِ فَأَمَرَنِي أَنْ أَصْرِفَ بَصَرِي ——— رواہ مسلم

حضرت جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اچانک نظر پڑ جانے کے بارے میں دریافت کیا (یعنی یہ کہ اگر اچانک کسی نامحرم عورت پر یا کسی کے ستر پر نظر پڑ جائے تو مجھے کیا کرنا چاہیئے؟) تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اُدھر سے اپنی نگاہ

پھیرلوں۔　　(صحیح مسلم)

عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ يَا عَلِيُّ لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَإِنَّ لَكَ الْأُوْلٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الْآخِرَةُ

——— رواہ احمد والترمذی وابوداؤد

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک دفعہ فرمایا "اے علی (اگر کسی نامحرم پر تمھاری نظر پڑ جائے) تو دوبارہ نظر نہ کرو، تمھارے لیے پہلی نظر (جو بلا ارادہ اور اچانک پڑ گئی وہ) تو جائز ہے (یعنی اس پر مواخذہ اور گناہ نہ ہوگا) اور دوسری جائز نہیں۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَنْظُرُ إِلٰى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ أَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ يَغُضُّ بَصَرَهُ إِلَّا أَحْدَثَ اللّٰهُ عِبَادَةً يَجِدُ حَلَاوَتَهَا ——— رواہ احمد

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس مرد مومن کی کسی عورت کے حسن و جمال پر پہلی دفعہ نظر پڑ جائے پھر وہ اپنی نگاہ نیچی کرلے اور (اس کی طرف نہ دیکھے) تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسی عبادت نصیب فرمائے گا جس کی وہ لذت و حلاوت محسوس کرے گا۔　(مسند احمد)

تشریح) یعنی ایک ناجائز نفسانی لذت کی قربانی کے صلہ میں اللہ تعالیٰ آخرت کے بے حساب اجر و ثواب سے پہلے اپنے اس مومن بندہ کو حلاوت عبادت کی نہایت اعلیٰ روحانی لذت اسی دنیا میں عطا فرمائے گا۔

غیر عورت پر نظر پڑ جانے سے دل میں گندہ جذبہ پیدا ہو تو ....:-

انسان کی یہ فطرت ہے کہ کوئی کھانے پینے کی مرغوب چیز دیکھے یا خوشبو ہی آجائے تو اس کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، گرمی اور تپش کی حالت میں ٹھنڈی سایہ دار اور خوش منظر جگہ دیکھ کر دل

ٹھہرنے اور آرام کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے، اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی غیر عورت پر اچانک نگاہ پڑ جانے سے بسا اوقات شہوانی تقاضا پیدا ہو جاتا ہے، جو اغوا شیطانی سے بہت برے نتائج تک بھی پہونچا سکتا ہے اور کم از کم آدمی ایک قسم کی بےچینی میں تو مبتلا ہو ہی جاتا ہے۔ نفس اور روح کے معالج اعظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بھی علاج بتلایا۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَرْأَةَ تُقْبِلُ فِىْ صُوْرَةِ شَيْطَانٍ وَتُدْبِرُ فِىْ صُوْرَةِ شَيْطَانٍ اِذَا اَحَدُكُمْ اَعْجَبَتْهُ الْمَرْأَةُ فَوَقَعَتْ فِىْ قَلْبِهٖ فَلْيَعْمِدْ اِلٰى امْرَأَتِهٖ فَلْيُوَاقِعْهَا فَاِنَّ ذَالِكَ يَرُدُّ مَا فِىْ نَفْسِهٖ ــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (ایسا ہوتا ہے کہ) کوئی عورت شیطان کی طرح آتی یا جاتی ہے، (یعنی اس کا ڈھنگ اور اس کی چال آدمی کے لیے شیطانی فتنہ کا سامان بن سکتی ہے) تو اگر کسی کو ایسا واقعہ پیش آئے کہ کوئی ایسی عورت اچھی لگے اور اس کے ساتھ دلچسپی اور دل میں اس کی خواہش پیدا ہو جائے تو اس آدمی کو چاہیے کہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور اپنی نفسانی خواہش پوری کرے۔ اس سے اس کی اس گندی خواہش نفس کا علاج ہو جائے گا۔

(صحیح مسلم)

نامحرم عورتوں سے تنہائی میں ملنے کی ممانعت :-

معاشرہ کو فواحش اور گندے اعمال و اخلاق سے محفوظ رکھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات فرمائی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی نامحرم عورت سے تنہائی میں نہ ملے، ایسی صورت میں اس شیطان کو اپنا کھیل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے جو ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔

عَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ ــــــ رواہ الترمذی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا

ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی (نامحرم) آدمی کسی عورت سے تنہائی میں ملے اور وہاں تیسرا شیطان موجود نہ ہو۔ (جامع ترمذی)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ جب کوئی نامحرم شخص تنہائی میں کسی عورت سے ملے گا تو شیطان ان کو معصیت میں مبتلا کرنے کی ضرور کوشش کرے گا۔ اس لعین دشمنِ ایمان کو اس کا موقع ہی نہ دیا جائے۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاكُمْ وَالدُّخُوْلَ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ الْحَمْوَ؟ قَالَ الْحَمْوُ الْمَوْتُ ______ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم (نامحرم) عورتوں کے پاس جانے سے بچو (اور اس معاملہ میں بہت احتیاط کرو) ایک شخص نے دریافت کیا کہ شوہر کے قریبی رشتہ داروں (دیور وغیرہ) کے بارہ میں حضور کا کیا ارشاد ہے؟ (کیا ان کے لیے بھی یہی حکم ہے؟) آپ نے ارشاد فرمایا وہ تو بالکل موت اور ہلاکت ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

تشریح) شوہر کے قریبی رشتہ داروں میں اُس کے باپ اور اُس کی اولاد تو بیوی کے لیے محرم ہیں، اُن کے علاوہ سارے رشتہ دار یہاں تک کہ حقیقی بھائی بھی نامحرم ہیں، اُن کا آزادانہ طور پر گھر میں آنا اور خلوت وجلوت میں بے تکلف اور بے پردہ ملنا اور باتیں کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق انتہائی خطرناک اور عفت و دیانت کے لیے گویا زہر قاتل ہے۔

عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَلِجُوْا عَلَى الْمُغِيْبَاتِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنْ أَحَدِكُمْ مَجْرَى الدَّمِ، قُلْنَا وَمِنْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ وَمِنِّيْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَأَسْلَمُ ______ رواہ الترمذی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ (خاصکر) اُن خواتین کے گھروں میں نہ جایا کرو جن کے شوہر کہیں باہر (سفر وغیرہ) میں گئے ہوئے ہوں، کیونکہ شیطان (یعنی اُس کے اثرات و وساوس) سب میں اس طرح (غیر مرئی طور پر) جاری ساری رہتے ہیں جس طرح رگوں میں خون رواں دواں رہتا ہے، ــــ ہم نے عرض کیا اور کیا آپ میں بھی؟ ــــ آپ نے ارشاد فرمایا، اور مجھ میں بھی ــــ لیکن اللہ تعالیٰ نے میری (اس معاملہ میں) خاص مدد فرمائی ہے اس لیے میں محفوظ رہتا ہوں۔ (جامع ترمذی)

تشریح شادی شدہ عورتیں جن کے شوہر کہیں سفر وغیرہ میں گئے ہوئے ہوں اُن سے نامحرم مردوں کے ملنے میں ظاہر ہے کہ فتنہ کا خطرہ زیادہ ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں یہ خاص ہدایت فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ شیطان ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے اور اس کے وساوس و اثرات آدمی میں اس طرح دوڑ جاتے ہیں جس طرح رگوں میں خون دوڑتا ہے ــــ اس موقع پر کسی نے حضور سے سوال کیا کہ حضرت اس بارہ میں (یعنی شیطانی وساوس و تصرفات کے بارہ میں) حضور کا کیا حال ہے؟ ــــ آپ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان تو میرے ساتھ بھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں میری خاص مدد فرمائی ہے جس کی وجہ سے میں اُس کے وساوس اور اثرات سے محفوظ رہتا ہوں، مجھ پر اس کا داؤ نہیں چلتا اور وہ مجھے کسی غلطی یا فتنہ میں مبتلا نہیں کر سکتا، ــــ یہ دراصل صفتِ عصمت کا لازمی تقاضا ہے ــــ

یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطانی اثرات و وساوس سے محفوظ رہنے کو اپنا ذاتی کمال نہیں بتلایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد و اعانت کا نتیجہ قرار دیا۔ یہ عبدیت کا خاص الخاص مقام ہے۔

بوئے گل در برگِ گل

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی اپنے مکتوبات کے آئینہ میں

تلخیص و ترجمہ :- از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

شاہ گل محمد غزنوی کو مخاطب کر کے یوں گوہر فشانی فرماتے ہیں :-

فروغِ دیدۂ آگاہی ملا گل محمد ــــ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ الحمد للہ کہ یہاں خیریت ہے اور تمہاری خیر و عافیت درکار ہے۔ میں تین ماہ سے بیمار تھا۔ الحمد للہ اب صحت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جو عمر باقی رہ گئی ہے اُس کو اپنی یاد میں اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں استعمال کرا دے۔ تمہارے خطوط برابر پہونچتے رہتے ہیں اور تمہارے حالات معلوم کر کے دل بہت خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن کے اندر محبت و معرفت اور اتباعِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں ترقیاتِ کثیرہ نصیب فرمائے اور انجام خیر کرے۔ جس کام کے لیے تم سے کہا گیا ہے اس میں سرگرم رہو۔ بخارا شریف سے وہاں کے لوگوں کی طرف سے تم کو بلایا جائے تو وہاں ضرور جانا۔ اور یہ بھی اختیار ہے کہ جب دل گواہی دے اور استخارہ کر لو اور وہاں کے لوگوں کا اشتیاق اور ان کی طلب صادق معلوم و محسوس ہو جائے تب جاؤ۔ وہاں پہونچ کر وہاں کے لوگوں کو میرا سلام پہونچانا ــــ مجھے جن لوگوں نے (تمہاری معرفت) خطوط بھیجے ہیں اُن کا جواب یہ ہے کہ باخدا رہیں اور ذکر و مراقبہ میں مداومت کریں تاکہ دل میں ملکۂ حضوری پیدا ہو ــــ کام یہی ہے اور بس ..... یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ حضرت سید احمد جو کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں اور حضرت سید اسمٰعیل مدنی جو کہ ساداتِ مدینہ منورہ سے ہیں

اور جن کے اوصاف بیان نہیں کیے جاسکتے۔ یہ دونوں بزرگوار مولانا خالد کردی سے کچھ استفادہ کرکے نقش کسب نسبت مجددیہ کے لیے (ہماری) خانقاہ میں آئے ہیں۔ خاص طور پر سید مدنی کے اندر میری دانست میں زیادہ اوصاف موجود ہیں۔ والعلم عند اللہ۔ اس وقت پیرزادوں میں سے میاں رؤف احمد صاحب، میاں عبدالرحمن صاحب اور میاں احمد سعید صاحب نے نسبت عالیہ حاصل کرلی ہے، تم بھی اپنے احباب کے حالات لکھو کہ وہ کہاں تک پہونچ گئے ہیں۔

حضرت شاہ ابوسعید مجددی فاروقیؒ کو اپنے ایک مکتوب گرامی میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

حضرت سلامت! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔۔۔۔ آج بارہویں رات مرض میں تخفیف حاصل ہوئی ہے۔ لیکن ابھی نشست وبرخاست دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر فرمائے۔ میرے لیے جناب کبریا میں بواسطہ پیران عظام حسن خاتمہ کی التجا دعا کرتے رہیں اور ختم کلام اللہ نیز کلمۂ طیبہ کے ذریعے ثواب بخشیں۔۔۔۔ خانقاہ کے لوگ آپ کے فیوض وبرکات سے استفادے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اندر انوار طریقہ اور زیادہ ودیعت فرمائے۔۔۔۔ اور احمد سعید کو بھی ترقی نصیب فرمائے۔ آپ کا رہنا ہر جگہ اچھا ہے لیکن عیادت کا بہت بڑا اجر ہے (لہٰذا میرے پاس دہلی آنا بہتر ہے) اس وقت خانقاہ میں سو سے زیادہ درویش مقیم ہیں۔ جگہ بالکل پر ہوچکی ہے۔ احوال تقدیر کا کچھ پتہ نہیں معلوم نہیں کہ ارادۂ الٰہی کیا ہے؟۔۔۔۔ یہاں کے لوگ ظاہر پر نظر کرکے یہ کہتے ہیں کہ آپ اس قابل ہیں کہ خانقاہ میں رہیں اور طریقہ بزرگان کو رواج دیں۔ طریقہ دوستان خدا حسب ذیل ہے۔

امور دین و دنیا کو اور ظاہر و باطن کو بواسطہ پیران کرام، اللہ تعالےٰ کے سپرد کرنا، اور تمام احوال کو اس کریم کارساز کی تقدیر و مشیت سے سمجھنا۔ وقائع پر لب چوں وچرا نہ کھولنا۔ لوگوں سے جھگڑا نہ کرنا، دوسروں کی لغزشوں سے اعراض کرنا،۔۔۔۔ جو کچھ میسر ہو، فقراء کو پہونچانا۔ اپنے عیال کا حصہ فقراء کے برابر مقرر کرنا۔ اپنی ذات سے اور مخلوقات وماسوی سے ناامید ہوجانا۔ اللہ تعالےٰ کے سچے وعدوں پر یقین رکھنا۔ وساوس کی وجہ سے اپنی جگہ سے نہ جانا۔ صبر وقناعت

۱؎ آپ حضرت شاہ غلام علیؒ کے خلیفہ وجانشین تھے عید الفطر کے دن ۱۲۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ پیر ومرشد کے قریب دہلی میں مزار ہے۔

توکل و رضا، تسلیم و افتقار، انکساری و خاکساری اور تواضع اختیار کرنا۔

کتب صوفیہ اور مکتوباتِ امام ربانیؒ کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس راستے میں خود کو اور آپ کو اور سب کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس ناچیز اور تمام احباب کے ساتھ فضل و کرم کا معاملہ فرمائے۔ حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔

مغل شاہزادہ مرزا جہانگیر کو تحریر فرماتے ہیں:۔

فقیر غلام علی عُفِیَ عنہٗ، بعد سلام مسنون و دعائے کامیابی لکھتا ہے کہ آپ کا ایک رقعۂ خاص جس میں ایک خواب کی تعبیر دریافت کی گئی ہے، صادر ہوا، خدا کرے آپ اُن مکارم اخلاق کے ساتھ جو اپنے اندر رکھتے ہیں، سلامت رہیں۔ عالم خواب ایک عجیب عالم ہے۔ اس میں وہم و خیال کو بہت دخل ہے۔ اس عالم خواب میں احوال گزشتہ و آئندہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی اپنے غیر کے حالات دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ میرے حالات ہیں۔ یہ سب وہم کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ خواب میں کبھی محض القاء و تصرفِ شیطان ہوتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اُس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرا سر کاٹ دیا گیا ——— ارشاد فرمایا کہ شیطان نے تیرے ساتھ کھیل کھیلا ہے ——— کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نماز و ذکر کے لیے بیدار کرنے کی غرض سے کوئی وحشتناک خواب دکھائی دیتا ہے (شیطانی دخل کچھ نہیں ہوتا) چنانچہ براء بن عاذب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے خواب میں دیکھا کہ ایک گائے اُن پر اپنے سینگوں سے حملہ کر رہی ہے۔ بات یہ تھی کہ انھوں نے اُس رات تہجد میں سورہ بقرہ پڑھنے میں (جس کی تلاوت کا معمول تھا) تاخیر کر دی تھی، اُس خواب کی وجہ سے فوراً بیدار ہو کر تہجد میں سورہ بقرہ پڑھنی شروع کر دی ——— کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اخلاطِ اربعہ (یعنی سودا، صفرا، بلغم، خون) میں سے جس خلط کا غلبہ ہوتا ہے اُس کے موافق خوابیں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ غلبۂ صفرا میں زردی اور غلبۂ خون میں خون اور سُرخ رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح غلبۂ گرم و سرد بھی اپنی تاثیر دکھاتی ہے۔

خوابہائے پریشاں اضغاثِ احلام کہلاتے ہیں اُن کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اپنے آپ کو موتی محل میں دیکھا ہے۔ بہت مبارک بات ہے۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق اور مجیب الدعوات

ہے دہلی کامیابی کے ساتھ شاہجہان آباد پہنچاکر موتی محل میں داخل فرمائے گا (اُس کے اختیار میں سب کچھ ہے، مجموعی حیثیت سے) بظاہر کوئی تشویش کی بات نہیں ہے البتہ خواب کا مقدمہ دیگر (دوسرا جزء جو ظاہری طور پر باعث وحشت ہے) غذا ہائے گرم اور غلبہ بعض اخلاط کے اثرات سے ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ خواب جس کے بعض اجزاء وحشت ناک ہیں ایسا ہی ہے جیسا کہ نماز کے لیے بیدار کرنے والا خواب۔ عنایت الٰہی سے اس خواب میں نیک اعمال کرنے کی تنبیہ و آگاہی ہے۔ خاطر جمع رکھیں کوئی اندیشہ نہ کریں۔ دفع بلا کی نیت سے صدقہ خیرات کریں اور اللہ تعالیٰ سے یوں التجا کریں۔ الٰہی حدیث شریف میں ہے کہ صدقہ بلا کو روک دیتا ہے تو پیغمبر صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی حدیث کے طفیل میں میرا یہ صدقہ قبول فرما اور ہر بلا کو دفع کر —— یہ سردی کا زمانہ ہے اس موسم میں چادریں اور کمبل جو بھی میسر ہوں فقراء کو تقسیم کریں اس نیت سے کہ بلائیں دور ہوں —— اللہ تعالیٰ تمہیں ترقی دے اور سلامت رکھے۔ صبح کو اور بوقت خواب ایک ایک مرتبہ آیۃ الکرسی اور آخری تینوں قل تین تین مرتبہ پڑھ لیا کریں محفوظ و محظوظ رہیں گے۔ والسلام ——

ایک طویل مکتوب میں ایک مقام پر یوں تحریر فرماتے ہیں:

باخدا ہونا، ایک طرف دیکھنا، یکساں زندگی صبر کرنا، نعمتہائے الٰہی کو پیش نظر رکھ کر زبان سے شکر ادا کرنا اور حاجات میں رجوع بجناب الٰہی بواسطہ پیران کبار کرنا راہ محبت میں ضروری امور ہیں —— غیبت، سخن چینی، عیب بینی، دروغ گوئی اور تحقیر مردم، حرام ہے —— سب سے اکرام کے ساتھ پیش آنا، خود کو خاک و ناچیز دیکھنا، حضرت حق سبحانہ کو حاضر و ناظر تصور کرنا، عذاب خدا سے ڈرنا، اپنے گناہوں کو اپنے سر پر پہاڑ کی مانند سمجھنا، ترساں و لرزاں رہنا کہ نہ معلوم کل کو کیا پیش آئے، خلق خدا کے ساتھ تواضع کا معاملہ کرنا، اپنے حقوق معاف کردینا اور دوسروں کے حقوق ادا کردینا —— یہ ہے طریق دوستان خدا، ایک دم غافل نہ ہونا، انکسار و خاکساری، محبت کے درد و غم کے ساتھ جینا اور توکل و رضا و تسلیم کا شیوہ اختیار کرنا بھی لازم ہے۔

دلِ مردانِ دیں پُر درد باید ز حسرت رنگِ شاں پُر زرد باید

(دین سے تعلق رکھنے والوں کا دل پُر درد اور غم آخرت سے چہرہ زرد ہونا چاہیے)

.... اللہ تعالیٰ اس پیر ضعیف کو اور تمام عزیزوں کو اس نوشتے پر عمل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

حضرت شاہ سیف الرحمٰن مجددیؒ اور حضرت شاہ عبدالرحمٰن (جالندھری) مجددی عہ کو تحریر فرماتے ہیں:

صاحبزدگانِ والانسب، ولایت حسب حضرت سیف الرحمٰن و حضرت عبدالرحمٰن ——
یادِ خدا میں مشغول اور ماسوئی سے اعراض کرنے والے رہیں۔ بعد از سلام تحریر ہے کہ مدت سے آپ کے احوال کی اطلاع نہیں ہوئی۔ بغیر تاخیر اپنے حالات لکھ کر انتظار کو رفع کریں۔ میاں عبدالرحمان یہاں آجائیں۔ جس کسی کو دوامِ حضور اور آگاہی حاصل نہیں ہوتی وہ طریقے سے باہر ہو جاتا ہے۔ پس ترساں رہنا چاہیے کہ طریقہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ والسلام

خواجہ حسن عہ مودودی لکھنویؒ کو ارقام فرماتے ہیں:

بعد سلام نیاز، گزارش ہے کہ الحمد للہ مجھے صحت و شفا حاصل ہے۔ آنجناب کی سلامتی کا طالب ہوں۔

آدابُ المریدین کے مصنف نے وہ تمام باتیں اس کتاب میں بوجہ احسن بیان فرما دی ہیں جو

عہ آپ کا نسب بواسطۂ شیخ سیف الدینؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ملحق ہوتا ہے۔ آپ حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ کے مرید تھے (ماخوذ از ضمیمہ مقامات مظہری مؤلفہ مولانا شاہ عبدالغنی مجددی فاروقی محدث مہاجر مدنیؒ" مطبوعہ مجتبائی دہلی)۔ عہ شاہ عبدالرحمٰن مجددی جالندھری حضرت شاہ سیف الرحمٰن مجددیؒ کے صاحبزادے اور حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ تہذیب اخلاق میں بے نظیر تھے، مردانِ پنجاب آپ کے اخلاق پر شیفتہ تھے۔ آپ کے مریدین بڑی تعداد میں تھے۔ ایک مرتبہ حج کر کے اپنے وطن جالندھر واپس آگئے تھے بعد ازاں پھر حرمین شریفین کا اشتیاق غالب آیا دوسرا حج کیا واپسی میں ۱۲۵۰ھ میں ملک سندھ کے کسی مقام پر انتقال ہوا (ضمیمہ) عہ خواجہ حسن بن ابراہیم لکھنویؒ حضرت شیخ مودود چشتیؒ کی اولاد میں چشتی سلسلے کے ایک بڑے شیخ تھے۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی بعدہٗ لکھنؤ میں اقامت اختیار کی۔ اپنے چچا شیخ علی اکبرؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ فلسفۂ توحید وجودی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کا درس دیتے تھے۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں ان میں ایک لطائف اکبری بھی ہے جس میں اپنے شیخ کے ملفوظات قلمبند کیے ہیں۔ بلدہ لکھنؤ میں ۱۲۴۱ھ میں انتقال فرمایا۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۷)

صوفیہ کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ضعیف کو (بھی) توفیقِ عمل عطا فرمائے ـــ اس وقت جبکہ ہمتوں میں کوتاہی داخل ہوگئی ہے اور بدعت و خلافِ شرع اُمور رواج پذیر ہیں۔ ایسے مُرشد سے وابستہ ہونا ضروری ہے جس میں حسبِ ذیل باتیں موجود ہوں۔

بقدرِ ضرورت عقائد کا علم رکھتا ہو، علم فقہ اور علمِ اخلاقِ صوفیہ سے واقف ہو۔ اُس کے (نیک) اعمال تعمیرِ اوقات کرتے ہوں۔ ترک و عزلت نشینی اُس کی عادت ہو۔ اُس کی صحبت میں خاص تاثیر ہو۔ اگر چشتی ہے تو ذوق و شوق اور گرمی و حرارت سے دلوں کو گرمائے۔ قادری ہے تو نسبتِ محبوبیت کا پرتو دلوں پر ڈالے۔ نقشبندی ہے تو حضور و جمعیت اور جذبات و واردات سے جانوں کو منوّر کرے۔ اگر مجدّدی ہے تو بعد القائے نسبتِ قلبی، عالمِ امر اور عالمِ خلق کی نسبتوں کا راستہ طے کرا سکے ...... مُرید کو توفیقات درکار ہیں اور ترکِ چوں و چرا مطلوب ہے ـــ مُرید کو ایمانیات و عملیات کے ضروری علم کے بعد اپنے شیخ کی مُتابعت بھی ضروری ہے بشرطیکہ شیخ ضروری علم و عمل اور صحیح احوال اور ترکِ دنیا کا جذبہ رکھتا ہو۔ ورنہ ہر بوڑھا آدمی شیخ کہلایا جا سکتا ہے۔ اُمورِ طریقت و باطن اور اعمالِ ظاہر میں جو عمل موافقِ شرع ہو اس کی اتباع اُس میں فرض ہے۔ اہلِ غفلت سے کنارہ کشی اور اعمالِ نیک پر تقسیمِ اوقات نیز دوامِ توجہ و ذکر، شب خیزی، سحر خیزی اور دیدۂ محبت سے اشک ریزی بھی لازم ہے۔ کم گفتن، کم خفتن، کم خوردن، در خلق کم بودن، صبر و قناعت، توکل و تسلیم اور رضا طالبانِ خدا کے لیے لازمی اُمور ہیں ـــ ....

افسوس صد افسوس اُس پر کہ جس کی عمر ختم ہو چلی اور جو کرنا چاہیے تھا وہ اُس نے نہیں کیا اور اپنی عمر کو بطالت و بیکاری میں صرف کیا۔ فواحسرتاہ ؏

وائے گر گریہ نیاید بمدد گاریٔ دل

اے میرے رب میں الم رسیدہ ہوں بس تو ہی اعلیٰ درجے کا رحم و کرم کرنے والا ہے ؏

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم

"فکرِ ایماں" اندوہ افزا اور "اندیشہ اگن ہان" "شکستگیٔ دل" کے لیے نقدِ وقت ہے۔ بزرگوں سے اُمید ہے کہ میرے حق میں دُعاء و استغفار کرکے میرے غم کو سرور و راحت سے بدل دیں گے جزاکم اللہ خیر الجزاء ـــ

ایک اور مکتوب گرامی میں خواجہ حسن مودودیؒ کو ارقام فرماتے ہیں:

منجانب اللہ کسی کو ادراک کشف اور کسی کو ادراک حالات عنایت ہوتا ہے۔ میں بسبب تیرگی استعداد، کشف نہیں رکھتا۔ ہاں وجدان اور شوق و ذوق سے نوازا گیا ہوں ——— منعمِ حقیقی کی نعمتہائے متواترہ و متکاثرہ، شکر و حمد اور مدح و ثنا سے بالاتر ہیں ع

شکرِ نعمتہائے حق چندانکہ نعمتہائے حق

اُمیدوار ہوں کہ دوامِ عافیت اور حُسنِ خاتمہ کی دُعا سے نصرت فرمائیں گے۔

جناب عالی کے صاحبزادگان کو بعد سلام تحریر کرتا ہوں کہ وہ اپنے احوال کی نگہداشت رکھیں۔ کسب علوم میں مشغول رہیں اور اپنے آبائے کرام کے طریقے پر اذکار کا اہتمام کر کے تعمیر اوقات کریں۔ مجھے بھی "بدعائے یادِ حق" مسرور و شاد کام کریں۔ اِن صاحبزادوں کو کسب علوم اور وظائف اعمال و اذکار کے ذریعے تعمیر اوقات کی تاکید بلیغ فرمائیں۔ اس مُعاملے میں کوئی چھوٹ دینا جائز نہ سمجھیں۔ قطب الاقطاب حضرت مودود چشتیؒ نے سات سال میں قرآن مجید یاد کر لیا تھا اور اُس کے ترجمے کی بھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ اتباعِ آبائے عظام ضروری ہے والسلام۔

جامع مکتوبات حضرت شاہ رؤف احمد مجددیؒ کو تحریر فرماتے ہیں:

.... بعد سلام مسنون تحریر ہے کہ دو عنایت نامے مع رسالہ شریفہ (مراتب الوصول[ع]) پہونچے۔ مسرتیں بخشیں۔

جزاکم اللہ خیر الجزاء ——— مندرجات رسالہ سے دل کو بہت سرور حاصل ہوا۔ حق تعالیٰ (اس کے ذریعے) زیادہ سے زیادہ برکت اور اشاعت طریقہ مجددیہ عنایت فرمائے۔

پوری پوری استقامت اختیار کر کے، سب سے بیگانہ اور خدا سے یگانہ اور محبت حق میں دیوانہ رہو ——— میں تم سے بہت خوش ہوں، اللہ تعالیٰ تم کو دونوں جہان میں خوش رکھے اور مشائخ کرام کی ارواح بھی تم سے خوش ہوں ——— .... طالبانِ حق کے لیے دُعا ہے کہ اللہ

ع مراتب الوصول، تصوف اور نقشبندی سلوک میں ایک معرکتہ الآرا رسالہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پہلی مرتبہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں سرسری طور پر دیکھا تھا معلوم نہیں کہ یہ رسالہ طبع ہوا یا نہیں؟

تعالیٰ اُن کو تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس نصیب کرے۔ فقیر کو دعا سے فراموش نہ کرنا۔ "فتوحات" سے جو کچھ ملے اُس میں حصۂ فقراء بھی مقرر کر لیا جائے۔ فقراء جو کہ "جلساء اللہ" (ہمنشینانِ خدا) ہیں تمہارے ہمراہ ہیں تفسیر و حدیث، مکتوبات شریفہ، عوارف، تعرف، نفحات اور فقہ کا درس تمہارے حلقہ میں ضرور ہوتا ہوگا۔ بعض اوقات میں سجداتِ محبت و نیازمندی کی ادائیگی اور تضرعات و گریۂ و زاری بجناب حضرت باری کرتے ہوں گے۔ خلوتِ خاص میں اس فقیر، حقیر، لاشئ کو بھی دعا میں یاد رکھنا (مکرر لکھتا ہوں کہ) رسالۂ شریفہ (مراتب الوصول) کے مطالعے سے بہت خوشی ہوئی۔ حق تعالیٰ تمہارے اندر اور تمہارے مریدوں کے اندر مضامینِ رسالۂ شریفہ کا ظہور کرے اور طالبین کو اس سے بہرہ یاب فرمائے۔ اور حق تعالیٰ تم کو بھی وہ سب کچھ عنایت فرمائے جو تمہارے آباء و اجداد کو عنایت فرمایا ہے۔ والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم۔

"سلسلۂ تجدید دین کی چار کتابیں"

(از مولانا عبدالباری ندوی ——— سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

ہم نے جہل و جہالت نفس نفسانیت کی بدولت دین کی بہت سی سچی پکی باتوں کو بھول بھلا کر اور ان میں بے دینی کی باتیں ملا کر یا اُن پر عمل چھوڑ کر دین ہی نہیں دنیوی بھی ہر طرح کی بھلائیوں اور کامیابیوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیا ہے۔ ——— ان کتابوں میں از سر نو پورے دین کو کھری پکی صاف ستھری صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اس پر نہ صرف آخرت کی نجات کا قطعی وعدہ ہے بلکہ دنیا کی بھی انفرادی و اجتماعی معاشی و سیاسی تمام پریشانیوں سے نجات کی یہی اکیلی راہ ہے۔

۱۔ تجدید دین کامل (معروف بہ جامع المجددین) میں خصوصیت کے ساتھ ظاہری اعتبار سے دین و دنیا کی صلاح و اصلاح پر بحث ہے۔

۲۔ تجدید تصوف میں باطنی یا اخلاقی پر۔

۳۔ تجدید تعلیم و تبلیغ میں اجتماعی یا سماجی پر۔ اور ۴۔ تجدید معاشیات میں معاشی یا رزقی پر

قیمت تیسری کی Rs 3/- ہے۔ ——— باقی سب کی فی جلد -/5 Rs

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ۔ لکھنؤ

بُنیادی عقیدہ

(از مولانا عبدالسلام قدوائی)

(۲)

توحید مذکورہ بالا بیان سے یہ بات تو ذہن نشین ہو چکی ہے کہ یہ دنیا آپ ہی آپ نہیں بن گئی ہے بلکہ تمام چیزوں کی طرح اس کا بھی بنانے والا ہے جسے ہم خالقِ کائنات، خدا اور اللہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ پچھلے اوراق میں خالقِ کائنات کے وجود پر جو دلائل ذکر کیے گئے ہیں اگر آپ نے ان کا مطالعہ غور سے کیا ہے تو آپ اس کے ساتھ اس کے بھی قائل ہو گئے ہوں گے کہ وہ ایک ہی ہے۔ نظامِ عالم پر جتنا غور کیا جائے گا اسی قدر یہ یقین بڑھے گا کہ ایک ہی ذات ہے جس نے اسے بنایا اور وہی اسے چلا رہی ہے۔ عالم کی ظاہری رنگا رنگی دیکھ کر بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں، لیکن حقیقت بیں اس رنگارنگی کے اندر یک رنگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انھیں ہر جگہ ایک اصول اور ایک ضابطہ کار فرما نظر آتا ہے۔ جزئیات کلیات کے تابع ہیں اور پھر سب کلیات ایک کلی کے اندر شامل ہیں۔ موت و حیات، انحطاط و ارتقاء، ضعف و قوت کا ایک جامع قانون ہر جگہ نافذ ہے۔ ایک ظاہر بین قوانینِ قدرت کو الگ الگ دیکھتا ہے اور شرک میں مبتلا ہوتا ہے، لیکن نظرِ غائر سے دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بے شمار قوانین ایک سلسلے سے منسلک اور ایک رابطے میں مربوط ہیں۔

"جس[۱] طرح انسان کے جسم میں سیکڑوں اعضاء و جوارح اور اعصاب ہیں یہ اعضاء و اعصاب

۱ـ الفاظ اور عبارتوں میں تھوڑے رد و بدل اور حذف و اضافہ کے ساتھ یہ خیالات مولانا شبلی کی "الکلام" اور مولانا سید سلیمان ندوی کی "سیرت النبی" جلد چہارم سے ماخوذ ہیں۔

الگ الگ ہیں اور ہر ایک کا کام جدا ہے۔ لیکن کوئی عضو اُس وقت تک کام نہیں دے سکتا جب تک اور تمام اعضاء بالذات یا بالواسطہ اس کے عمل میں شریک نہ ہوں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ یہ قوتیں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے ہیں بلکہ انسان میں کوئی اور عام قوت ہے جو ان اعضاء کی جداگانہ قوتوں سے بالاتر ہو اور جس کی ماتحتی میں یہ سب مل کر کام کرتے ہیں اس عام قوت کو نفس، روح یا مزاج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی حال قوانینِ قدرت کا ہے۔ بظاہر الگ الگ قوانین معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ مستقل بالذات اور ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہیں، بلکہ سب ایک دوسرے کے موافق، متناسب اور معین ہیں۔ ان میں سے ایک بھی اگر باہمی توافق کے مرکز سے ہٹ جائے تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔"

"دنیا میں ایک ذرّہ بھی اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و متناسب نہ ہوں اور ان میں باہم اشتراکِ عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اُس وقت تک نہیں اُگ سکتا جب تک کہ دانہ اُگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اُگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اُس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اُس کو گرمی اور روشنی اُس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہونچے، پھر اس کے اُگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں ۔۔ ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اُگے گا اور پھل لائے گا۔" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی اور بالاتر قوت ہے جو ان سب قوانینِ قدرت کو محکوم رکھتی ہے، جس نے ان تمام قوانین میں باہم توافق، تناسب، ربط اور اتحاد پیدا کیا ہے، یہی بالاتر قوت جو تمام قوانینِ قدرت پر حاکم ہے اور جس نے ان تمام قوانین میں ربط و اتحاد قائم کیا ہے خدا ہے۔ یہی معنی ہیں قرآنِ مجید کی اس آیت کے کہ

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ	زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کا
وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْهًا۔	کہا مانتے ہیں بجبر یا بخوشی۔

مادیین کا یہ کہنا کہ مادّہ خود بخود پیدا ہوا، مادّہ کے ساتھ حرکت خود بخود پیدا ہوئی، حرکت نے خود بخود امتزاج پیدا کیا، پھر خود بخود بہت سے قوانینِ قدرت پیدا ہو گئے، روز مرّہ کے مشاہدہ اور تجربے کے خلاف ہے۔ پھر ان سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں قوانینِ قدرت میں یہ

توافق، تناسب اور اتحاد کہاں سے آگیا؟ کیا خود بخود ان قوانین میں یہ خواص پیدا ہو گئے؟ ایسا دعویٰ ادعائے محض ہے جس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس مرحلہ پر پہونچ کر ہر صاحبِ فکر پکار اٹھتا ہے۔

"یہ اسرار جو روز بروز زیادہ دقیق ہوتے جاتے ہیں جب ہم ان پر زیادہ بحث کرتے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت ہے جس سے تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں۔"[1]

الغرض نظامِ عالم پر غور و خوض کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ بظاہر بہت سے اجزاء علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں لیکن جس طرح ایک مشین کے بہت سے پرزے خواہ وہ کسی جگہ لگے ہوں لیکن سب ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اور مشین کی تحریک سے سب حرکت میں آتے ہیں اسی طرح اس عالم کے تمام پرزے خالقِ عالم کی مشیت سے یکجا ہو کر کام کرتے ہیں۔ جس طرح اگر مشین کو ایک مشین مین کے بجائے کئی شخص بیک وقت مختلف رُخ سے حرکت دیں تو مشین چلنے اور کام کرنے کے بجائے ٹوٹ پھوٹ جائے۔ اسی طرح اگر نظامِ عالم کو متعدد ہستیاں چلاتی ہوتیں تو وہ نہ قائم رہ پاتا اور نہ اس باقاعدگی کے ساتھ چل سکتا نہ اصول و ضوابط کی یہ یکسانی اور قطعیت نظر آتی بلکہ سارا کارخانۂ عالم تہ و بالا ہو کر رہ جاتا۔ اسی حقیقت کی جانب قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ج فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ٥ (انبیاء ر-۲)	اگر ان دونوں یعنی زمین و آسمان میں ایک اللہ کے سوا اور کئی معبود ہوتے تو وہ دونوں (زمین و آسمان) برباد ہو جاتے۔ پس پاک ہے اللہ جو عرش کا رب ہے ان باتوں سے جو وہ (مشرک) بیان کرتے ہیں۔

فلسفیانہ زبان میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

---

[1] ہربرٹ اسپنسر منقول از الکلام شبلی

چونکہ عالم ایک شے ہے۔

اور کسی ایک شے کو وجود میں لانے کے لیے علّتِ تامہ ضروری ہے۔

اس لیے عالم کے وجود میں لانے کے لیے ایک علّتِ تامہ ضروری ہے۔

ایک چیز کی علت تامہ دو نہیں ہو سکتی ہیں کیونکہ علّتِ تامہ اُس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو بلکہ علّتِ تامہ کے وجود کے ساتھ ہی بلا انتظار فوراً معلول وجود میں آجائے۔ اس لیے علتِ تامہ کے بعد پھر کسی اور علّت کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ جب وہ چیز وجود میں آگئی تو پھر وجود کے بعد وجود کے کیا معنی ہیں۔ اسی لیے اہلِ فلسفہ کا یہ مسلم اُصول ہے کہ ایک شے کی علّتِ تامہ ایک ہی ہوتی ہے متعدد نہیں ہو سکتیں ہیں۔ علت تامہ نام ہی اس علّت کا ہے جس کے بعد پھر کسی اور علّت کا انتظار نہ رہے۔ بلکہ بلا توقف وہ شیئے معلول وجود میں آجائے۔ اس لیے جس علّت کے وجود کے بعد شیئے معلول وجود میں نہ آئے وہ علّتِ تامہ نہیں بلکہ علّتِ ناقصہ کہلائے گی۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ عالم کی علت تامہ بھی متعدد نہیں ہوں گی بلکہ ایک ہی ہوگی۔ مذہبی زبان میں اسی کو خدائے واحد لاشریک لہٗ کہتے ہیں۔

اس پیچیدہ فلسفیانہ استدلال کو خراسان کی ایک روایتی بڑھیا نے روزمرہ کی عام فہم زبان میں کس آسانی سے سمجھا دیا تھا۔ امام فخرالدین رازی کے متعلق ایک حکایت زباں زد خلائق ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ امام موصوف کسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت کے پاس سے گزرے۔ اُس وقت اُس کے سامنے ایک چرخہ رکھا ہوا تھا اور وہ کسی سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔ امام رازی نے پوچھا بڑی بی کس خیال میں ہو؟ بوڑھیا ان الفاظ کو سُن کر چونک پڑی اور کہنے لگی میں غور کر رہی ہوں کہ آخر میرا یہ چرخہ چلتا کیوں نہیں ہے۔ امام رازی اُس کی اس سادہ لوحی پر مسکرا دیے اور ہنستے ہوئے کہا کہ بڑی بی چلاؤ جب تو چلے، بلا چلائے یہ کس طرح چل سکتا ہے۔ بڑھیا نے کہا مجھے چلانا نہیں آتا آپ ذرا چلا کر دکھلائیے۔ امام رازی بیٹھ گئے اور چرخے کا دستہ ہاتھ میں لے کر گھمانے لگے۔ چرخہ چلنے لگا۔ لیکن بڑھیا کو شرارت سوجھی وہ چپکے سے چرخے کو دوسری سمت گھمانے لگی یکایک چرخے کی حرکت رُک گئی۔ امام رازی نے زور دے کر گھمایا تو چرخہ بیچ سے ٹوٹ گیا۔ امام اس حادثہ پر اظہارِ افسوس کرنے لگے لیکن بڑھیا نے کہا کوئی حرج نہیں، چرخہ ٹوٹ گیا تو پھر بن جائے گا لیکن اس نے

بڑے پیچیدہ مسائل حل کر دیے۔ چرخے نے ثابت کر دیا کہ خدا ہے اور ایک ہے، اس نے بلا شرکت غیرے اس عالم کو بنایا ہے اور وہی تنہا اسے چلا رہا ہے، چرخا جب تک چلایا نہیں گیا رکا پڑا تھا۔ لیکن جب آپ نے اسے حرکت دی تو چلنے لگا۔ پھر آپ کے چلانے کے بعد جب میں نے آپ کے رُخ کے علاوہ دوسری سمت میں اسے چلانا چاہا تو وہ رک گیا اور جب آپ نے زیادہ زور دے کر گھمایا تو ٹوٹ گیا۔ یہی حال اس دُنیا کا ہے اگر اسے وجود میں لانے والا اور چلانے والا خدا نہ ہوتا تو وہ نہ چلتی اور اگر اس کے چلانے میں کوئی اور دوسرا ارادہ شامل ہو جاتا تو اُس کی حرکت رک جاتی اور پھر دونوں چلانے والوں کی کشاکش اور زور آزمائی کا انجام یہ ہوتا کہ میرے چرخے کی طرح دنیا کا یہ چرخہ بھی نہ چلتا بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر بے کار ہو جاتا۔[لہ]

حسب ذیل آیات میں اسی حقیقت کو اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (مومنون ۵)	اور اس (اللہ تبارک وتعالیٰ) کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو ساتھ لے لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں کسی قدر مزید تفصیل سے یہ بات بیان کی گئی ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۝ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۝ (بنی اسرائیل ۵)	کہہ دیجیے جس طرح یہ (مشرکین) کہتے ہیں اگر اس طرح اس اللہ (تبارک وتعالیٰ) کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے تو وہ ضرور صاحب تخت کی طرف (بڑھنے کی) راہ تلاش کرتے (تاکہ اسکے تاج وتخت پر قبضہ کرلیں) وہ (اللہ) ان باتوں سے بہت زیادہ پاک وبرتر ہے جو وہ (مشرکین) بیان

[لہ] اس حکایت کی تاریخی اصلیت تلاش کرنا بے سود ہو اسے صانع عالم کے وجود اور اسکی یکتائی کو واضح کرنے کی تمثیل سمجھیے۔

کرتے ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور
جو ان کے اندر ہیں اس کی پاکی بیان کرتے
ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تعریف
کے ساتھ پاکی نہ بیان کرتی ہو۔

تمام انبیاء علیہم السلام اور خدا کے برگزیدہ بندوں نے اپنے اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تعلیم دی تھی لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہو امتدادِ زمانہ کی بنا پر یہ تعلیم اپنی صحیح شکل میں کہیں باقی نہیں رہ گئی ہے۔ کہیں مجاز نے حقیقت کا جامہ پہن لیا، کہیں تعبیر و تفہیم کے تمثیلی طریقے واقعہ سمجھے جانے لگے تھے، کہیں صفات عینِ ذات بن گئیں تھیں اور ہر صفت ایک علیحدہ خدا قرار پا گئی اور ایک معبود کے بجائے سیکڑوں معبود و مسجودِ خلائق بن گئے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام غلطیوں کی تصحیح کی اور ہر بات اس قدر وضاحت سے بیان کر دی کہ آئندہ کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہ رہ گیا۔ آپ نے صفاتِ الٰہی کی ایسی تشریح کر دی کہ شرک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ عصرِ حاضر کے ایک نامور مورخ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اسلام نے خدا کو ایک ماننے کا حکم دیا۔ یہودی بھی خدا کو ایک مانتے تھے لیکن وہ اسے خاص اپنا خدا مانتے تھے حضرت عیسیٰ نے خدا کے رحم و کرم کو نسل اور قوم کی قید سے چھڑا دیا مگر عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ اور روح القدس کو خدا کی خدائی میں شریک کر کے اپنے سر میں درد پیدا کیا اور اپنے سماج میں تفرقہ ڈال دیا۔ اسلام نے اس الجھن کو پھر سلجھایا، خدا کو ایک ٹھہرایا۔ اس کے اوصاف کو جہاں تک ہو سکا بیان کر دیا، مگر اس طرح کہ وہ خدا کی مختلف شکلیں ہوں خدا کی مختلف صورتیں نہ ہوں اور انھیں اس طرح ملا دیا کہ انسان اپنی ہر حالت اور کیفیت میں خدا کی قدرت دیکھ سکے۔ مگر خدا کی ذات کو ایک خاص شکل دے کر اسے بت نہ بنا سکے۔" [1]

کسی بات کو سمجھانے کے لیے تشبیہ و تمثیل ناگزیر ہے۔ ہم جن مادی چیزوں کو دیکھتے اور برتتے

---

[1] دنیا کی کہانی۔

ہیں جب اُن کی حقیقت الفاظ سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارے الفاظ حقیقت نمائی کے لیے ناکافی ہوتے ہیں۔ نادیدہ کو دیدہ اور ناشنیدہ کو شنیدہ اور غیر محسوس کو محسوس پر قیاس کر کے حقیقت رسی کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے تجربہ کی بنیاد پر کم و بیش اس نئی چیز کا اندازہ لگاتا ہے۔ مثلاً جس شخص نے گڑ کے سوا کبھی کوئی میٹھی چیز نہ کھائی ہو اسے اگر آپ فلاقند کا مزہ بتانا چاہیں تو اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ وہ گڑ سے بھی اچھی اور بہت مزے کی ہوتی ہے اور اُس کے لیے بھی اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ گڑ کے مزے کو پیش نظر رکھ کر کچھ اس سے بہتر مزے کو سوچے۔ یہی حال دُنیا کی ہر کیفیت کو سمجھانے کا ہے ـــــ آپ اپنی تجربہ کی ہوئی چیز پر دوسری چیز کم و بیش کر کے تصور کریں گے۔ اس کے سوا سمجھنے کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ ورنہ اگر آپ اس طرز کی کسی چیز کا تجربہ نہیں رکھتے ہیں تو اس اندھے کی طرح آپ بھی کھیر کو ٹیڑھی سمجھیں گے جس کے سامنے کھیر کی سفیدی کو سمجھانے کے لیے بگلے کا ذکر کیا گیا اور پھر بگلے کو سمجھانے کے لیے ہاتھ ٹیڑھا کر کے ایک مصنوعی بگلا بنایا گیا اور جب اس نے اسے ٹٹولا تو چلا اُٹھا کہ کھیر تو بڑی ٹیڑھی ہوتی ہے۔

پھر جب مادی چیزوں کے متعلق ہمارے الفاظ کی تعبیر میں یہ نقص ہے تو ان حقائق کو ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں جو ہمارے خیال، وہم اور قیاس سے بھی باہر ہیں، لیکن با ایں ہمہ دشواری ہمیں ان سے کسی حد تک واقف ہونا ضروری ہو تاکہ ہم اپنی سیرت کو ان صفات سے متصف کرنے کی کوشش کر سکیں یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق کو ذہن نشین کرنے کے لیے تمام مذاہب نے کوشش کی ہے، لیکن لوگوں کی ناسمجھی سے مجاز نے رفتہ رفتہ حقیقت کا درجہ اختیار کر لیا اور تمثیل حقیقت واقعی بن گئی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نوعِ انسانی پر بڑا احسان ہے کہ آپ نے ان مشکل مسائل کو اس طرح ذہن نشین کیا کہ ان سے مفید اثرات تو مرتب ہوئے مگر کوئی گمراہی نہیں پیدا ہونے پائی۔ آپ نے باپ، ماں، بیوی، بیٹے اور شوہر کی مادی اصطلاحوں سے خود بھی اجتناب کیا اور دوسروں کو بھی منع کیا کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان محبت کے تعلق کو ان جسمانی رشتوں سے ادا نہ کریں، آپ نے بتایا کہ اللہ کی بے شمار صفات ہیں، ہر اچھا نام اس کا ہے جو اس کی کسی صفت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس کی ذات ایک ہی ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاءُ　　　اللہ ہے اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہو

الحسنیٰ ط (طٰہٰ - ۱) تمام اچھے نام اسی کے لیے ہیں۔

صفات تعدد الٰہ کا باعث نہ ہونے پائیں اس کے لیے اتنی احتیاط کی کہ سارے قرآن مجید میں صفات کے بیان میں حرف عطف نہیں لایا گیا ہے۔ بعض جگہ ایک ساتھ بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں لیکن ان کے درمیان عطف کے لیے واؤ نہیں لایا گیا۔ بلکہ حرف عطف کے بغیر یونہی یکے بعد دیگرے صفات بیان کردی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ج هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔

(حشر - ۳)

وہ اللہ وہ ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں پوشیدہ اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا ہے، وہ رحمٰن ہے رحیم ہے۔ وہ اللہ وہی ہے جیکے سوا اور کوئی معبود نہیں، بادشاہ، پاک سلامتی والا، امن والا، محفوظ رکھنے والا، غالب، سب پر قابو والا، بڑائی والا، ہر اُس چیز سے پاک جس کو (مشرک) شریک قرار دیتے ہیں۔ وہی اللہ پیدا کرنے والا، بنانے والا، صورت بخشنے والا۔ اسی کے لیے تمام اچھے نام ہیں آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے وہ غالب حکمت والا ہے۔

آیات بالا میں کتنی صفات بیان کی گئی ہیں مگر درمیان میں کسی جگہ حرف عطف نہیں لایا گیا ہو اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلام میں اسکی کتنی احتیاط کی گئی ہے کہ صفات ذات نہ بننے پائیں۔ کہیں اگر سمجھانے کے لیے ہاتھ اور منھ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کردی گئی کہ

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ اس کی جیسی اور کوئی چیز نہیں ہے۔

وہ ہر قسم کی خوبیوں سے متصف اور ہر قسم کے محاسن و کمالات سے موصوف ہو۔ اسکی ذات بے عیب ہو۔ وہ ہر قسم کے نقائص، کمزوریوں اور کوتاہیوں سے پاک ہو وہ نہ کسی کا باپ ہو نہ رشتہ دار، بلکہ خلاق عالم رب العٰلمین ہے

(تمام)

عربی سے ترجمہ*

زکوٰۃ کے مقاصد اور منافع

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں

از استاذ یوسف القرضاوی

(۱)

زکوٰۃ کی اولین حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ اُن فرائض کی ایک کڑی ہے جن کی ادائیگی سے انسان کی عبدیت نکھرتی اور آخرت کی اُن نعمتوں سے سرفراز ہونے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے جو اس دنیاوی زندگی میں صرف عبدیت کا ثبوت دینے ہی کا ثمرہ ہوں گی۔

زکوٰۃ کی اسی حیثیت کی بنا پر قرآن مجید میں اٹھائیس بار نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ہی ساتھ کیا گیا ہے، اور اسی طرح احادیث نبوی میں یہ دونوں دسوں بار ایک جڑواں وجود بن کر ہی مذکور ہوئی ہیں، فقہ اسلامی کی کتابوں میں بھی اسی بنا پر زکوٰۃ کا بیان عبادات ہی کے ذیل میں آتا ہے۔

لیکن عبادتی پہلو کی اس حیثیت واہمیت کے باوجود زکوٰۃ میں کچھ دوسرے معنیٰ بھی ہیں۔ کچھ انسانی اور اخلاقی نوعیت کے عظیم مقاصد بھی یہاں اور ہیں جن کا وسیلہ فرضیتِ زکوٰۃ کو بنایا گیا ہے۔

یہ مقاصد نہ فقط مادی ہیں نہ فقط معنوی، علیٰ ہذا نہ خالی انفرادی ہیں نہ خالی اجتماعی۔ بلکہ مادی اور معنوی، انفرادی اور اجتماعی سب ہی طرح کے مفادات ومصالح زکوٰۃ کے نظام میں

---

*۔ اس ترجمہ میں کہیں کہیں آزاد ترجمانی بھی ہے، طوالت کم کرنے کے لیے حذف وتلخیص سے بھی کام لیا گیا ہے۔

ہم آہنگ ہیں۔

زکوٰۃ کا مقصد اور اُس کی منفعت دینے والے کے اعتبار سے

اسلام نے زکوٰۃ کا حکم دے کر بظاہر کمزور طبقوں اور حاجتمندوں کی حاجت براری کا انتظام کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے بھی پہلا مقصد، انسان کو مادے کی غلامی سے چھڑا کر اُس کی آقائی کی سطح پر اُٹھانا ہے۔ یعنی زکوٰۃ دینے والوں کی منفعت زکوٰۃ دیئے جانے والوں سے کچھ کم ملحوظ نہیں ہے۔

قرآن پاک نے ایک مختصر سے جملے میں اس حقیقت کو کھول دیا ہے، فرمایا ہے

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔ (اے نبی!) ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کرو اس کے ذریعہ تم ان کی تطہیر اور ان کا تزکیہ کروگے۔

تطہیر اور تزکیہ کے دو لفظ جو اس آیت میں وارد ہوئے ہیں بتلاتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے والے کے اعتبار سے کس حکمت و منفعت کا لحاظ اس حکم میں رکھا گیا ہے۔ یہ تطہیر و تزکیہ مادی بھی ہے اور معنوی بھی، مال و دولت کی بھی تطہیر زکوٰۃ کی ادائیگی سے ہوتی ہے اور خود صاحبِ دولت کے نفس اور اُس کی رُوح بھی۔

زکوٰۃ انسان کی طبیعت کو بخل سے پاک کرتی ہے

ایک بندۂ مسلم اللہ کے حکم کی تعمیل اور اُس کی رضایابی کی اُمید میں جو زکوٰۃ نکالتا ہے اُس سے اُس کے گناہ تو عام طور پر دُھلتے ہی ہیں لیکن خاص طور سے جو چیز اس عمل سے اُسے حاصل ہوتی ہے وہ ہے بخل اور حرص کی نجاست کا ازالہ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں کچھ خاص میلان اور تقاضے اس نوعیت کے رکھے ہیں جو اسے اس زمینی زندگی میں سعی و حرکت پر آمادہ کریں اور جب تک خدا کو منظور ہے اس دنیا میں آبادی کی صورت رونما رہے۔ انسان میں ملکیت کی خواہش، اپنی ذات سے لگاؤ اور بقاء کی فکر انہی طبعی تقاضوں میں سے ہے، لیکن ان میں جہاں خیر و فلاح ہے وہاں شر و فساد کا پہلو بھی ہے۔ یہیں سے انسان میں بخل کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور خود غرضی جنم لیتی ہے۔ پس ایک انسان جو

واقعی انسان بن کر اس دُنیا میں رہنا چاہے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ انسان جس نے ایمان کی روشنی میں اپنے فرائض پہچان لیے ہوں اُس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اس معاملے میں اپنے نفس پر قابو پائے ورنہ دُنیا اور آخرت میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔

بخل اور حرص کا مریض اپنے لیے بھی خطرہ ہے اور اپنی جماعت کے لیے بھی۔ ایسا آدمی کبھی ذراسے مال پر جان دینے اور جان لینے کی حرکت کر بیٹھتا ہے، کبھی اپنی عزت خاک میں ملالیتا ہے، کبھی دین تک کا سودا حرص میں کر لیتا ہے اور کبھی موقع لگے تو اپنے وطن کی آبرو اور آزادی کا مول کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے اسے تین تباہ کن خصلتوں میں شمار کیا ہے۔ فرمایا:- "تین چیزیں انسان کو تباہ کر دینے والی ہیں، بخل اور حرص کی تابعداری، خواہشِ نفس کی پیروی اور خود بینی۔"

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

اور جو بچا دیئے جائیں طبیعت کے بخل سے بس وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔

یہ بات قرآن پاک میں دوبار اسی طرح فرمائی گئی ہے۔ ایک جگہ سورہ حشر میں اور دوسری جگہ سورہ تغابن میں۔

آنحضرت نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

إِيَّاكُمْ وَالشُّحَّ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالشُّحِّ، أَمَرَهُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوا وَأَمَرَهُمْ بِالْقَطِيعَةِ فَقَطَعُوا، وَأَمَرَهُمْ بِالْفُجُورِ فَفَجَرُوا۔

(ابوداؤد۔ نسائی)

خبردار! شُح سے خبردار! تم سے پہلے لوگوں کو شُح نے ہلاک کیا ہے۔ اس خو نے اُن کو بخل کا حکم کیا اور وہ بخل کرنے لگے۔ اس نے انھیں قطع رحم کا حکم کیا، وہ قطع رحمی کرنے لگے۔ اس نے انھیں بدزبانی کا حکم کیا اور یہ اس راہ پر بھی چل کھڑے ہوئے۔

پس زکوٰۃ ایک طرح کی روحانی طہارت ہے۔ یہ انسان کی طبیعت سے بخل اور حرص کی گندگی صاف کرتی ہے۔ جبقدر، دینے والا دے گا، جتنی خوش دلی سے دے گا اور جس قدر اپنی سعادت اس عمل میں سمجھے گا اسی قدر زکوٰۃ بھی اپنا یہ اثر دکھلائے گی۔

اس طہارت نفس سے آدمی کے لیے ایک معنوی رفعت کا دروازہ اور کھلتا ہے۔ یہ ہے حریتِ نفس۔ مال کے لگاؤ اور اُس کی غلامی سے آزادی، درہم و دینار کی بندگی کے بجائے اس کی آقائی! اسلام کا اولین سبق ہے کہ انسان صرف اور صرف اللہ کا بندہ بنے اور اُس کے سوا اس عالم عناصر و اشیا میں ہر چیز سے اپنے کو برتر جانے۔ یہ انسان جسے اللہ نے اپنی خلافت اور کائنات کی سیادت سے سرفراز فرمایا ہے وہ اگر مال و منال یا اور کسی شئی کی غلامی میں مزہ پانے لگے تو اس سے بڑھ کر بے نصیبی کیا ہوگی؟ ــــ ارشاد نبوی ہے۔

تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ، تَعِسَ عَبْدُ الْقَطِيفَةِ، تَعِسَ وَانْتَكَسَ وَإِذَا شِيكَ فَلَا انْتَقَشَ۔

(صحیح بخاری۔ ابن ماجہ)

نامراد اور بے نصیب ہے دینار کا غلام۔ نامراد اور بے نصیب ہے درہم کا غلام۔ نامراد اور بے نصیب ہے لباس کا غلام، وہ نامراد اور ذلیل رہے گا اور کبھی اس کے کانٹا لگے تو کوئی نکالنے والا نہ ہوگا۔ (یعنی کسی کو اس سے ہمدردی نہ ہوگی۔)

زکوٰۃ سے امورِ خیر میں خرچ کی عادت پڑتی ہے

زکوٰۃ میں جس طرح نفس کے لیے تطہیر کا پہلو ہے۔ ایسے ہی یہ ہاتھ کھولنے اور امورِ خیر میں خرچ کرنے کی تربیت بھی ہے علمائے اخلاق و تربیت متفق ہیں کہ انسان کے اخلاق و عمل میں عادت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی لیے عادت کو "طبیعت ثانیہ" کا نام دیا جاتا ہے۔

اب ایک مسلمان کو لیجیے جو ہر فصل پر اپنے کھیت اور باغ کی پیداوار سے زکوٰۃ نکالتا ہے ہر ایک سال کے پورا ہونے پر نقدی کے نصاب کی زکوٰۃ دیتا ہے۔ مویشی پالنے کا کاروبار ہے تو اس کی متعینہ زکوٰۃ پابندی سے نکالتا ہے۔ کوئی تجارت کر رکھی ہے تو اس پر سالانہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ عید آئے تو زکوٰۃِ فطر کا اہتمام کرتا ہے۔ لازمی بات ہے کہ اس مسلمان کے لیے انفاق فی سبیل اللہ ایک عادت بن جائے گی۔ قریب قریب اُس کے فطری اوصاف و میلانات کی طرح یہ بھی ایک مستقل اور پائیدار صفت ہوگی جو اس کے اعمال و اخلاق پر حکمرانی کرے گی۔ اور یہی چیز ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور پہلو بھی ہے۔ جس آدمی کو اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنے کی عادت ہوگی جو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوگا کہ حاجتمندوں کی حاجت روائی میں حصہ لے اُس سے بہت ہی بعید ہے کہ دوسرے کے مال پر دست درازی کرے۔ جو خدا کی رضا جوئی میں اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے وہ دوسروں کے مال پر نظر ڈال کر خدا کی ناراضگی مول لینے کو کب تیار ہوگا؟

اخلاق الٰہی سے متصف ہونے کا ذریعہ

انسان جب بخل و حرص کی طینت سے پاک ہو کر جود و عطا کا خوگر ہوا تو وہ انسان کی عام طبعی پستی سے اُٹھ کر گویا اُس بلندی کی طرف گامزن ہوگیا جو پروردگارِ عالم کی شان ہے۔ انسان کا مزاج ہے کہ اپنی فکر کرے، اپنے مال میں کسی دوسرے کا حصہ نہ سمجھے اور کچھ خیال آئے بھی تو اندیشہ فردا اُسے دبا دے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝ (اور انسان تو ہے ہی تنگ دل۔ سورہ اسرا آیت ۱۰۰) وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۝ (اور بخل کا میلان تو طبیعتوں میں رکھا ہی ہوا ہے۔ سورہ نساء آیت ۱۲۸) اس کے برعکس پروردگارِ عالم کی صفت ہے 'خزانے لٹانا' جود و کرم کے دریا بہانا اور بلا کسی عوض معاوضے کے بس نہال کرتے رہنا۔ ان اوصاف کی تحصیل میں انسان اپنے بس بھر کوشش کرے تو اسی کا نام "تخلّق باخلاق اللہ" ہے اور یہ منتہیٰ ہے کمالاتِ انسانی کا۔

امام رازی نے فرمایا ہے کہ "نفس ناطقہ — یعنی وہ جوہر جس سے انسان انسان ہوتا ہے — کے اندر دو قوتیں ہیں۔ ایک نظری۔ دوسری عملی۔ قوت نظری کی صحت اور اس کا کمال ہے حکم الٰہی کی تعظیم۔ قوت عملی کی صحت اور اُس کا کمال ہے خلق اللہ پر شفقت۔ پس اللہ نے زکوٰۃ اس لیے واجب فرمائی ہے کہ جوہرِ انسانی اپنے کمال کو پہنچے یعنی خلق کا محسن بنے، اس کی مصیبتیں دور کرنے اور ضرورتیں بہم پہنچانے میں اپنی پوری طاقت سے کوشاں ہو۔ اور اسی نکتے کے پیش نظر آنحضرت نے ترغیب دی کہ اخلاق الٰہی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ۔" (تفسیر کبیر ج ۱۶ ص ۱۰۴)

اسلام نے زکوٰۃ کے ذریعہ سے یہ جو انفاق فی سبیل اللہ اور شفقت علیٰ عیال اللہ کی روح کی پرورش مسلمانوں میں کی تھی، یہ اسی کا طفیل تھا کہ صدقات جاریہ کا رواج ان میں پیدا ہوا۔ اوقاف علی الخیر کا نظام اسی کا فیض تھا جس میں جذبۂ خیر اور روحِ احسان کی صداقت

اور وسعت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اپنے وقت میں انسانی حاجتوں کی کوئی شکل نہیں تھی جس کو اس نظام وقف نے سمیٹ نہ لیا ہو۔ نسلوں اور طبقوں کی کسی تفریق کے بغیر۔ بلکہ بعض اوقات انسان اور غیر انسان کی بھی تفریق کے بغیر۔

حب دنیا کا علاج دنیا کی محبت، مال کی محبت، آدمی کے دل پر رفتہ رفتہ اس طرح قبضہ کرلیتی ہے کہ پھر نہ اسے خدا کا دھیان رہتا ہے نہ آخرت کی فکر۔ زکوٰۃ اس دنیوی استغراق کے خلاف ایک روک ہے جس سے بڑا خسارہ انسان کے حق میں کوئی دوسرا نہیں۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ڈوب کر رہ جانے کے اس خطرے ہی کے پیش نظر حکمتِ شریعت نے ضروری سمجھا کہ مال والوں کو مال کا ایک حصہ لازمی طور پر اپنی ملک سے نکالتے رہنے کا مکلف کیا جائے تاکہ مال کی اُس محبت پر مسلسل چوٹ پڑے جو انسان کو ہمہ تن مال کے چکر میں ڈال دیتی ہے (اور پھر اس سے بڑا کوئی نصب العین اُس کے سامنے نہیں رہ جاتا) زکوٰۃ فرض کرکے (اور اُس کے سلسلے کا ثواب و عذاب بتاکے) شریعت نے انسان کے دل میں یہ بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان خالی مال کی طلب میں مشغول رہ کر کوئی سعادت نہیں حاصل کرتا، اس کی سعادت کا ذریعہ یہ مال اُس وقت بنتا ہے جب وہ راہ خدا میں اسے خرچ کرنے کے لیے ہاتھ کھولے۔ اس طرح زکوٰۃ حب دنیا کے مرض کے لیے ایک مناسب ترین علاج ہے۔" (تفسیر کبیر حوالہ سابق)

اللہ نے مال جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔ طیبات دنیا سے مستفید ہونے کو مباح ٹھہرایا مگر وہ اس بات پر راضی نہیں کہ بندہ اسی کا ہو رہے اور اسے زندگی کی اصل ہم اور اصل مقصد قرار دے۔ وہ ایک بہت اونچے مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک سدا بہار عالم اُس کا اصل مستقر ہے، وہ اس دنیا کے لیے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ خود یہ دنیا اُس کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ وہ پیدا ہوا ہے آخرت کے لیے، اللہ کی عبادت کے لیے۔ یہ دنیا صرف اُس منزل آخرت کا راستہ ہے۔ راستہ کی درستی اور سازگاری کی تدبیروں میں کوئی حرج نہیں لیکن اس مصروفیت میں منزل نہیں فراموش ہو جانی چاہیے۔ حالت سفر کا دھیان بہرحال رہنا چاہیے۔

مال، اللہ تعالیٰ انھیں بھی دیتا ہے جو اُسے پسند ہیں، انھیں بھی دیتا ہے جنھیں پسند

نہیں کرتا۔ یہ خزانہ مومن و کافر اور نیک و بد سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ	ہم ان کو اور اُن کو سب کو دیتے ہیں تیرے رب
عَطَآءِ رَبِّكَ ۖ وَمَا كَانَ عَطَآءُ	کی بخشش سے اور تیرے رب کی بخشش کسی پر
رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (سورہ اسرا آیت ۲۰)	بند نہیں ہے۔

پس مال بذات خود آدمی کے فضل و خیر کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ فضل و خیر کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ مال کو اللہ کے لیے خرچ کرنے سے اور اُس کی محبت کو مال کی محبت پر مقدم کرنے سے۔

مال خود بھی خیر و نعمت ہے۔ لیکن ایسا خیر اور ایسی نعمت جس میں اُسی طرح آزمائش ہوتی ہے جس طرح شر اور سختی میں "وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً۔" (اور ہم تمہیں آزماتے ہیں، شر و خیر (دکھ اور سکھ) دونوں طرح کی حالتوں سے۔ سورہ الانبیاء) اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ "یہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد سب ایک آزمائش ہیں۔ سورہ تغابن) زکوٰۃ ایک مسلمان کو اسی آزمائش میں پورا اترنے کے قابل بناتی ہے۔

جب لوگ کسی انسان کو دیکھیں کہ وہ ان کی رفع رسانی میں دلچسپی رکھتا ہے، ان کی پریشانیاں دور کرنے میں اپنا مال خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تو یہی مال (جو	زکوٰۃ مال والوں کو محبوبیت بھی عطا کرتی ہے ان کے مال کو پاک بھی کرتی ہے اور انہیں برکت کا باعث بھی بنتی ہے

دوسروں کے دلوں میں حسد اور جلن پیدا کرنے کا باعث ہوا کرتا ہے) اُس شخص کے حق میں محبت کا ذریعہ بنے گا۔ برا چاہنے کے بجائے لوگ اس کے لیے دعاگو بنیں گے۔

علیٰ ہٰذا جب اہل حاجت کا حق مالداروں کے مال میں ہے (جسے خدا نے بھی بتایا اور وحدت انسانی کا شعور بھی جس کی تصدیق کرتا ہے) تو پھر یہ مال اُس وقت تک پاک نہیں جب تک اس میں سے حقداروں کا حق نہ ادا کر دیا جائے۔ ایسا مال اپنے اندر ایک شر اور خطرہ لیے ہوئے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی بنا پر ارشاد ہے۔ "جب تم نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو تم نے اُس کا شر دور کر دیا۔" (صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم)

ضعفاء و فقراء کے حق کا مال سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ بعض فقہاء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ زکوٰۃ مالدار کے ذمہ نہیں بلکہ عین مال سے متعلق ہوتی ہے۔ بہر حال عین مال اُس وقت

تک ہلاکت ونقص کے خطروں کی زد میں ہے جب تک اُس سے میں سے زکوٰۃ کا حق نہ نکالا جائے
آنحضرت کا ارشاد ہے "صدقہ (یعنی حق صدقہ) جس مال میں بھی ملا رہ جائے اُس کو برباد کرکے
چھوڑتا ہے۔" (حوالہ ایضاً)

یہ ذکر صرف حلال ذرائع سے حاصل ہونے والے مال کا ہے کہ زکوٰۃ اُس کو پاک کر دیتی
ہے لیکن حرام اور ناروا ذرائع سے حاصل ہونے والے مال کو کوئی زکوٰۃ کے ذریعہ پاک
کرنے لگ جائے تو وہاں زکوٰۃ قبول ہی نہیں جو اسے پاک کردے

مال میں برکت ونمو ہاں زکوٰۃ مال کی طہارت کے ساتھ اس کی برکت کا بھی ذریعہ ہے۔ ظاہر بینوں
کو یہ بات عجیب سی معلوم ہو سکتی ہے کہ مال میں سے کچھ نکل جانا اُس میں نمو اور برکت کا سبب
کیسے بن سکتا ہے۔ مگر ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس ظاہری کمی کے پیچھے حقیقی زیادتی ہے۔
مال ہی میں نہیں خود مالدار کی شخصیت میں بھی۔ یہ تھوڑا سا حصہ جو آدمی اپنے مال سے نکال دیتا
ہے یہ چند در چند ہو کر جانے اور انجانے راستوں سے اُسے واپس ملتا ہے۔ محض سمجھنے کے
لیے اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ آج متمول حکومتیں غریب حکومتوں کو جو طرح طرح کی امداد
دیتی ہیں اُن سے بالآخر ان دینے والی حکومتوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھئے ایک آدمی کے پاس ایک دینار ہے لیکن وہ آدمی اپنی داد
و دہش کی طبیعت کی وجہ سے معاشرہ میں ایک وقار و اعتبار رکھتا ہے۔ ایسے آدمی کا ایک
دینار اس سے مختلف قسم کے دوسرے آدمی کے چند دیناروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ
کام دے سکے گا۔ نمو و برکت کی اس اقتصادی تشریح کے لیے قرآن کی ان چند آیتوں میں
بھی ایک گونہ اشارہ تو سمجھا ہی جا سکتا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (سورہ سبا)	اور تم جو کچھ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہو تو وہ اُس کا بدل عطا کرتا ہے اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔
اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً	شیطان تم سے وعدہ کرتا ہے (یقین دلاتا ہے) فقر کا اور حکم دیتا ہے بخل کا۔ اور اللہ

مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ)

تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی مغفرت اور فضل کا اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔

وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (الروم)

اور تم جو زکوٰۃ دیتے ہو اللہ کی رضاجوئی کے جذبے سے تو (جان لو) کہ ایسے ہی لوگ ہیں دراصل (اپنی پونجی) بڑھانے والے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (البقرہ)

اللہ گھٹاتا اور بے برکت کرتا ہے سود کو اور بڑھوتری دیتا ہے صدقوں کو۔

یہاں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اس بدل ملنے اور اضافہ ہونے میں عنایت الٰہی ہی اصل عامل ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو جس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔ (باقی)
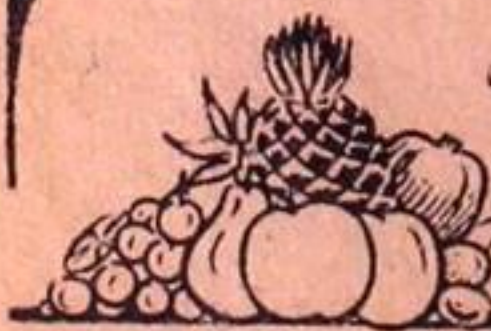
مُلّا عبدُ القادر بدایونی

(از سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم - اے)

(۳)

ملّا صاحب کا قلم علمائے سوء، اکبر کے دین الٰہی اور اس کے مریدوں اور معتقدوں کے خلاف ضرور تیغ برہنہ ہوگیا ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ ابوالفضل نے اپنی انشاء پردازی کے زور سے اکبر کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی جو گنگا بہائی تھی، اس کے پانی کو ملّا صاحب نے اپنی تحریر کی قوت سے تلخ بلکہ زہرناک بنا دیا۔ اس لحاظ سے ابوالفضل کا قلم ملّا صاحب کے قلم سے شکست کھا گیا ہے، اکبر کا دین الٰہی زیادہ تر ملّا صاحب کی تحریروں ہی کے ذریعہ سمجھا گیا، کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ پورے وثوق کے ساتھ لکھا، ابوالفضل کے گومگو طرز بیان کے مقابلہ میں ان کے بیانات میں کوئی شک کی گنجائش نظر نہیں آتی، دونوں کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل کا ضمیر اکبر کے دین الٰہی پر خوبصورت الفاظ کا ایک پردہ ڈالنا چاہتا ہے، اور ملّا صاحب اسی پردے کو چاک کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اگر دین الٰہی اور اس کے مریدوں سے متعلق تحریروں کی تلخی اور صاف گوئی کو نظر انداز کر کے منتخب التواریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملّا صاحب نے اس دور میں بیٹھ کر جو تاریخ لکھی وہ موجودہ دور کے مذاق کے مطابق ہے، اس بے تکلف انداز میں اس زمانہ میں کوئی اور تاریخ نہیں لکھی گئی۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربار اکبری میں ملّا صاحب کی جا بجا چٹکیاں لی ہیں، لیکن ان کی منتخب التواریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی ہے کہ انھوں نے

اس میں غیر کی یا اپنی کوئی بات نہیں چھپائی ہے (دربار اکبری ص ۲۷۴) صاف گوئی اور حق پسندی انکی فطرت میں تھی، اس لیے انھوں نے جب اپنے عشق کا ذکر کیا ہے تو اس پر بھی کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے اور اس عشق کو شہوت دا آزے تعبیر کر کے اپنے اوپر بھی لعنت بھیجی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی جو درگت بنی اس کو بھی صاف صاف لکھدیا ہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

تاریخ نویسی میں ان کی یہ صاف گوئی جہانگیر کو پسند نہ آئی تھی، کیونکہ اس سے اکبر کی ایک بری تصویر سامنے آتی تھی، اس لیے اس نے اپنے زمانہ میں اس کی اشاعت بند کردی تھی[1]۔ لیکن اس کتاب پر سب سے اچھا تبصرہ الیٹ کا ہے:-

"یہ ان چند کتابوں میں ہے جس کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوگا لیکن اس کے لیے فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ معصر تاریخوں سے کامل واقفیت بھی چاہیے، کیونکہ مصنف نہ صرف نامانوس الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ مذہبی مناظرے، تعریف وتوصیف، ہجو و ذم، ذاتی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیلات تو اس طرح بیان کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہتا، پھر سلسلۂ تاریخ قائم کرنے میں کافی دقت ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی غیر متعلقات اس کی تصنیف کے دلچسپ حصے ہیں۔ بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں، یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجہی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں۔" (الیٹ جلد ۵ ص ۴۸۲)

یہ صحیح ہے کہ اس میں تعریف وتوصیف کے ساتھ ہجو و ذم بھی ہے، ہم اس کی تھوڑی سی مثالیں دے چکے ہیں، لیکن پوری کتاب میں ہجو و ذم کا پہلو کم نکلے گا، تیسری جلد جو چار سو صفحے پر مشتمل ہے، مشائخ، علماء، اطبا اور شعراء کی مدح ہی مدح ہے۔ ملا صاحب کی تینوں جلدوں کے ماخذ ان کے ذاتی مشاہدات کے علاوہ ان کے بیان کے مطابق صرف دو کتابیں ہیں۔ ایک تو خواجہ نظام الدین احمد بخشی کی تاریخ طبقات اکبری ہے، جس کو وہ نظام التاریخ لکھتے ہیں، اور دوسری بخشی ابن احمد بن عبد اللہ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی ہے۔ (دیکھو دیباچہ منتخب التواریخ) لیکن ان ہی دو

---

[1] ماثر الامرا جلد اول ص ۴۹

کتابوں کے سہارے انھوں نے اپنی یہ ضخیم جلدیں تیار کردیں، جن میں ان کی قوت آخذہ کے طرح طرح کے جلوے نظر آتے ہیں، وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ تاریخ لکھتے وقت اختصار سے کام لیا ہے، اور عبارتی تکلفات اور استعارات سے پرہیز کیا ہے (ج ۲ ص ۶) یہ گویا ابوالفضل کی انشاء پردازی پر ایک قسم کی ضرب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کے قلمبند کرنے میں انشاء پردازی کا سہارا نہیں لیا، بلکہ ان کی انشاء پردازی خود تاریخی واقعات کو قلمبند کرنے میں سہارا بنتی چلی گئی جس سے ان کی قدرت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر الفاظ لاکر اپنی تحریروں کو سجانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی کتاب زمانہ کی زبان (زبان روزگار) میں لکھ کر عام آدمیوں کے لیے بھی مائدۂ افضال بچھایا ہے، جس کو ابوالفضل پسند نہیں کرتا تھا، (جلد دوم ص ۳۰۱)

وہ دربار کے امراء اور علماء کا ذکر کرتے وقت ان سے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا بھی اظہار کرتے جاتے ہیں، خواہ ناظرین ان کی رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں، لیکن ان کے اس ناقدانہ انداز بیان سے اُن کا طرز دلچسپ ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں تو ان کو اتنا اشتعال آگیا ہے کہ وہ ہرزہ سرائی پر بھی اتر آئے ہیں۔ وہ تو اپنی اس جھلاہٹ کو دینی درد اور دلسوزی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن موجودہ دور کے ناقدین اس کو ان کے مذہبی تعصب کی شدت پر محمول کرتے ہیں۔ مگر ان کا یہ غصہ بلکہ ان کے قلم کا چوکہ پن ان کی تحریروں کو بعض اوقات جاندار بھی بناتا رہتا ہے۔

وہ تصنع اور آورد سے دور رہ کر بے تکلفانہ انداز میں واقعات کی ترتیب دیتے چلے جاتے ہیں، جس سے رزم اور بزم دونوں کی مرقع آرائی میں جان پڑتی نظر آتی ہے، اکبر کی فوج اور میواڑ کے رانا سے جو لڑائی ہوئی، وہ اس دور کی بڑی اہم معرکہ آرائی تھی، اکبر کی طرف سے مان سنگھ اس کی فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ ملا صاحب خود اس مہم میں شریک رہے۔ انھوں نے میدان جنگ کی جو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کا کوئی جنگی نامہ نگار تمام واقعات کو قلمبند کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ہاتھیوں کی خوفناک لڑائی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

> "فیلان رانا مقابل فیلان افواج بادشاہی در آمدہ از ان جملہ دو فیل قوی مست نامی با یکدیگر در افتادند، و حسین خان فوجدار فیلان کہ عقب مان سنگھ بر فیل دیگر سوار بود ... نیز افتاد و مان سنگھ بجائے مہاوت بران فیل خود سوار شد، و ثبات قدمی ورزید کہ فوق آن متصور

بنا شد و یکے از اں دو فیل کہ یکے خاصہ پادشاہی بود ..... جنگ عظیم کرد و ہر دو یکدیگر را می راندند، از قضا بر مقتل فیلبان فیل رانا تیر رسید و از صدمۂ حملۂ فیلان بر زمین افتاد، فیل بان فیل پادشاہی بہ چستی و چالاکی از فیل خود جستہ بر فیل رانا نشست، و کاری کرد کہ ہیچ کس نکند و از مشاہدۂ ایں حال رانا تاب نتوانست آورد و جلو ماندہ رواں شد و تذبذب در افواج رانا افتاد و جوانانیکہ کمان ہا محافظت می نمودند، پیش در آمدند چپقلشی کردند کہ کارنامہ بود و از سرداری مان سنگھ آں روز معلوم شد کہ ایں مصرع ملا شیری چہ معنی داشت کہ ہندو می زند شمشیر اسلام (ج ۲ ص ۲۳۲)

بزم کی تصویر بھی کھینچنے میں ان کے قلم میں بڑا زور آجاتا ہے، اکبر کے عبادت خانہ کی مرقع آرائی تو طرح طرح سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ آخر میں اس مباحثہ میں نبوت، کلام، رویت، تکوین، حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے طرح طرح کے شبہات وارد کیے جاتے، ہر ایک کا تمسخر اور استہزا کیا جاتا، اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تو اس کی روک دیا جاتا اس طرح مناظرہ میں ثابت کرنے والے کے مقابلہ میں انکار کرنے والے کا پلہ بھاری رہتا، پھر اسی سلسلہ میں سارے مناظرے کو یہ کہکر باطل قرار دیدیتے ہیں۔

خانمانہا بر سر ایں مباحثہ رفت و حاشا کہ ایں مباحثہ باشد، بلکہ مکابرہ و مشاغبہ بود و دین فروشاں برائے خوش آمد شکوک سترک را از ہر جا پیدا کردہ بہ تحفہ می آوردند۔" (ج ۲ ص ۳۰۷)

اور پھر اس عبادت خانہ کے آخری نتائج کی نقشہ آرائی اس طرح کرتے ہیں، جس میں درد ناکی بھی ہے اور دل سوزی بھی (ج ۲ ص ۹۔۳۰۸)

سنیاں مغلوب و اخیار ہمہ جا خائف و اشرار امین بودند۔ ہر روز حکمے تازہ و قدحی جدید و شبہۂ نوبروئی کار می آمد و اثبات خود در نفی دیگراں دیدند، و ازین نکتہ کہ ہر نانی منفی می باشد ذاہل بنابراں مقبولاں مردود و مردوداں مقبول و نزدیکاں دور و دوراں نزدیک بودند سبحان من تصرف فی ملکہ کیف یشاء و بر زبان عام کالانعام جز دروادہ اکبر چیزے دیگر نبود و غوغائے عظیم برخاست و ملا شیری دراں وقت قطعہ گفتہ مشتمل بر دہ بیت و ایں از اں جملہ است۔

تا بزاید ہر زماں کشود بر اندر آفتی	فتنہ دورکوی حوادث کہ خدا خواہد شدن
با عقاب قرض خواہ تیغ در ارباب شرک	بار سر از ذمۂ گردن ادا خواہم شدن

شورش معتزلست اگر در خاطر آرد حاملی | کہ خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زیں بیت بس کہ ظرفگی | نقل بزم منعم و درد گہ خواہد شدن
بادشاہ امسال دعوی نبوت کردہ است | گر خدا خواہد پس از سالی خدا خواہد شدن

لیکن کچھ دنوں کے بعد ان مباحثہ کرنے والوں کو یاد کرتے ہیں تو پھر ان کی تحریر میں بڑی خستگی اور برشتگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور بڑے درد و گداز کے ساتھ لکھتے ہیں (ج ۲ ص ۸۹-۱۸۸)

مدت دہ سال از اں تاریخ الی الیوم گزشتہ و آں جماعۃ مباحثین و مناظرین چہ محقق و چہ مقلد کہ از صد نفر متجاوز بودند، یک کس نمی بیند، و ہمہ روی در نقاب۔ کل نفس ذائقۃ الموت ماندہ۔

جرت الریاح علی مکان دیارھم | فکانھم کانوا علی میعاد
زخیل دردکشاں غیر ما نماند کسی | بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسی

حالانکہ بمقتضائے النعمۃ اذا فقدت عرفت آں ہم صحبتان را یاد می کنند خونابۂ حسرت از دیدۂ غم دیدہ فرو می بارد و می زارد و می نالد و می گوید کہ دریں حسرت آباد کاشکی روزی چند دیگر ہم اقامت می نمودند کہ بہر حال مغتنم بودند و خطاب منحصر با ایشان بود

پائے در زنجیر پیش دوستاں | بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

ایں پشۂ مفرد ایں نقشۂ مصدر را غیر از داغ حرماں و نالۂ پنہاں چہ درماں غفر اللہ الماضین و رحم الباقین۔

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند | در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنیک شراب در مجلس عمر | یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

ملا صاحب عربی کے بھی بہت بڑے عالم تھے، اس لیے اپنی تحریروں میں بکثرت عربی الفاظ، فقرے، ترکیبیں حتیٰ کہ اشعار استعمال کرتے جاتے ہیں جن کو سمجھ کر وہی لطف لے سکتا ہے جو عربی بھی اچھی طرح جانتا ہو، اسی لیے الیٹ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ نامانوس الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ ایسی عبارت بھی لکھ جاتے ہیں جو صرف فارسی جاننے والوں کے لیے بڑی گراں گزرتی ہے۔ مثلاً

ایں را باعث دواعی بسیار بود۔ و بموجب النقلین یدل علی الکثیر و الخلیفۃ تدل علی

> الغدیر الموذجی ازان در سلک تقریر و تحریر می آورد و اشتر المستعان حاصل آنکہ دانایان از ہر دیار و ادبا
> ادیان و مذاہب بدربار جمع شدہ بشرف ہم زبانی مخصوص بودند۔ (ج ۲ ص ۲۵۶)

ان کی تحریروں میں "قوادح" "مطاعن" "ملت سہلہ بیضا" "حنیفیہ غرا" "مظہر اسم المضل" "مظہر اسم الہادی" "ضال و مضل" "علما نافعا و عملا متقبلا" وغیرہ جیسے الفاظ بہت آتے ہیں لیکن اس قسم کے الفاظ مذہبی مباحث کے سلسلہ ہی میں عموماً استعمال ہوتے ہیں، ان کو جب کسی سے جھلاہٹ آتی ہے تو اس کے لیے "ملعون" سگ ملعون، ملاعین، ولد الزنا، بدبخت، فاسق، فاجر، ملحد، بے دین، بے حیا، پاجی طبیعت، پاجیاں، مردود، مکار، دنیا ساز، رذیل، خبیث، مردم اراذل و سفلہ وغیرہ جیسے الفاظ لکھنے پر اتر آتے ہیں۔

منتخب التواریخ کی تیسری جلد ان کی تحریر کا شاہکار ہے، اس میں ان کے طرز بیان میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس سے انشراحی کیفیت بھی محسوس کرتے جاتے ہیں، خصوصاً مشائخ اور علماء کے توکل، قناعت، عبادت، ریاضت، زہد، تقویٰ، معرفت الٰہی، استغنا، گوشہ نشینی، علمی تبحر وغیرہ کے ذکر میں تو ان کے قلم میں بڑی گرمی اور ان کے قلب میں بڑی حرارت پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کی ہر سطر سے ان کے ادب احترام کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ان کی کتاب کا یہ حصہ اس دور کی علمی و مذہبی تاریخ کا بڑا بیش بہا خزانہ ہے۔

وہ شعر و ادب کے بڑے اچھے نقاد بھی تھے، جیسا کہ ان کی اس تیسری جلد کے اس حصہ سے اندازہ ہوگا جہاں وہ اپنے زمانہ کے شعراء کا ذکر کرتے ہیں، اس نقد و تبصرہ میں کچھ چٹکیلی باتیں لکھ کر مزاحیہ رنگ بھی پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً قاسم کاہی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ اس کو کتوں سے بڑا پیار تھا، غالباً کتے سے پیار ملک الشعرائی کا لازمی شیوہ ہے۔ یہ اشارہ ملک الشعراء فیضی کی طرف ہے۔ اس کو بھی کتوں سے بڑا لگاؤ تھا۔

> اختلاط با سگاں بے تحاشی داشت، غالباً ایں شیوہ لازمۂ ملک الشعراء بودہ۔ (ج ۲ ص ۱۷۳)

سانبر کے راجہ لون کرن کا بیٹا منوہر تھا، فارسی میں شاعری بھی کرتا تھا، اس کا تخلص توسنی تھا۔ ملا صاحب اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ سانبر کا نمک زار مشہور ہے۔ توسنی کے کلام میں بھی بڑا نمک ہے، وہاں کا سارا نمک اس کے کلام میں چلا آیا ہے۔

منوہر نام وار د ولد لون کرن راجہ سانبر است کہ نمک زار مشہور امت و ایں ہمہ نمک در سخن او تاثیر آں سرزمین است (ج ۳ ص ۲۰۱)

بیرم خاں کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک رات کی مجلس میں وہ ہمایوں سے باتیں کر رہا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی، ہمایوں نے اس سے کہا ہاں بیرم تم سے کچھ کہہ رہا ہوں بیرم نے جواب دیا۔ ہاں بادشاہ سلامت میں حاضر ہوں، لیکن میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے حضور میں آنکھوں کی حفاظت، درویشوں کے نزدیک دل کی نگہداشت اور عالموں کے سامنے زبان کی احتیاط کرنی چاہیے، میں یہی سوچ رہا تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی ہیں اور عالم بھی ہیں، کن کن چیزوں پر نگاہ رکھوں، بادشاہ کو یہ جواب پسند آیا، اور تعریف کی۔

شبے ہمایوں بادشاہ مخاطبہ با بیرم خاں داشتند و از انبا ہر غنودگی دست داد بادشاہ بہ تنبیہ فرمودند کہ ہاں بیرم با تو می گویم، گفت بلے بادشاہم حاضرم، اما چوں شنیدہ ام کہ در ملازمت بادشاہاں محافظت چشم و پیش درویشاں نگاہداشت دل و نزد عالماں حفظ زبان باید کرد، بنا براں دریں فکر بودم کہ چوں حضرت ہم بادشاہ و ہم درویش، و ہم عالمند کدام کدام را نگاہ توانم داشت، بادشاہ مغفرت پناہ را ایں ادا از و خوش آمد و تحسین فرمودند (ج ۲ ص ۱۹۲)

ملا صاحب کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی بڑی مہارت تھی۔ اس کی چند مثالیں ہیں: انکے والد صاحب کی وفات ۹۶۹ھ میں ہوئی تو یہ تاریخ نکالی: (ج ۱ ص ۵۲)

سر دفتر افاضل دوراں ملوک شاہ　　آں بحر علم و معدن احسان و کان فضل
چوں بود در زمانہ جہانی ز فضل ازاں　　تاریخ سال فوت وے آمد جہانِ فضل

۹۶۸ھ میں بیرم خاں کی شہادت کے موقع پر انھوں نے بہ لحاظ تعمیہ یہ تاریخ نکالی:

گفت گل گلشن خوبی نماند

گلشن خوبی کے اعداد ۱۰۱۸ ہوتے ہیں۔ اس میں گل کے ۵۰ نکال دیے جائیں تو ۹۶۸ ہو جاتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۴۸)

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ۹۷۱ھ میں خواجہ مظفر علی تربتی کو خاں کا خطاب دیکر دکیل کل کے عہدہ پر مامور کیا گیا، اس کے تقرر کا مادہ تاریخ "ظالم" ہے، غالباً یہ تاریخ انھوں نے خود نکالی (ج ۲ ص ۶۵)

۹۷۶ھ میں فتح پور سیکری میں اکبر نے شیخ سلیم چشتی کے لیے مسجد اور خانقاہ بنوائی تو ملا صاحب نے عربی میں ان کی یہ تاریخ نکالی (ج ۲ ص ۱۰۹)

هذه البقعة قبة الاسلام　　رفع الله قدر بانيها
قال روح الامين تاريخه　　لا يرى فى البلاد ثانيها

یعنی یہ مسجد قبۃ الاسلام ہے۔ خدا اس کے بنانے والے کے رتبہ کو بلند کرے، روح الامین نے اس کی تاریخ یہ کہی، اس کا ثانی دوسرے ملکوں میں نہیں۔

ایک دوسری تاریخ یہ کہہ کر بھی نکالی۔

بیت معمور آمدہ از آسمان

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں پٹنہ فتح ہوا، تو ملا صاحب نے یہ تاریخ اکبر کی خدمت میں گزرانی۔ (ج ۲ ص ۱۸۰)

چتر شہ دیں بہر کشاد پٹنہ　　انداخت چو سایہ بر سواد پٹنہ
فی الحال رقم زد از پے تاریخش　　منشی خرد فتح بلاد پٹنہ

ملا صاحب اپنے زمانے کے ایک زاہد، متوکل اور گوشہ نشین بزرگ شیخ برہان سے بہت متاثر تھے، ان کی وفات ۹۷۰ھ میں ہوئی، تو یہ مادۂ تاریخ نکالا۔

دل گفت کہ شیخ اولیاء بود　　(ج ۳ ص ۷)

۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں اپنی کتاب منتخب التواریخ ختم کی تو اس کا یہ مادۂ تاریخ کہا۔

شکر للہ کہ با تمام رسید　　منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم گفت　　انتخابی کہ ندارد ثانی

لفظ "انتخاب" سے ۱۰۵۴ ہوتا ہے، لیکن "ن" کے ۵۰ نکال دیے جائیں تو ۱۰۰۴ ہو جاتا ہے۔

ملا صاحب کو تاریخ گوئی سے بڑا ذوق رہا، اس لیے اپنی منتخب التواریخ میں دوسروں کے مادۂ تاریخ کو جا بجا درج کرتے گئے ہیں۔

ملا صاحب شاعر بھی تھے، اس لیے اسی شاعرانہ کمال کی بدولت شعر میں بھی مادہ نکال لیا کرتے تھے۔ ان کا تخلص قادری تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں شعراء کے تذکرہ میں اپنی شاعری کی تفصیل نہیں لکھی ہے، البتہ کہیں کہیں اپنے کچھ اشعار نقل کر دیے ہیں، مثلاً اپنے زمانہ

کے ایک عالی مقام بزرگ میر سید علاء الدین اودھی کے ذکر (ج ۳ ص ۶۲) میں لکھتے ہیں کہ انکی ایک ترجیع بند کا ایک بند حسب ذیل ہے۔

ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست　　کہ بچشمانِ دل مبیں جز دوست

اس سلسلہ میں وہ عرفی کا یہ شعر بھی نقل کرتے ہیں:

در بمعنی نظر کنی ہمہ اوست　　کہ جہان صورت است و معنی دوست

پھر کسی اور شاعر کا یہ بھی شعر درج کرتے ہیں۔

جملۂ کائنات سایۂ اوست　　کہ جہان پرتویست از رخ دوست

آخر میں لکھتے ہیں کہ اسی مضمون کا ان کا بھی ایک شعر یہ ہے۔

خود چہ مغز و چہ پوست چوں ہمہ اوست　　اوست مغز جہاں جہاں ہمہ پوست

ملا صاحب کے ہم عصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے، شیخ ابن حجر سے درس حدیث کی سند لی تھی، کئی کتابوں کے مصنف تھے، شعر بھی کہا کرتے تھے، ملا صاحب سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے، ان کو ایک خط لکھا، تو اس میں ان کی تعریف میں یہ اشعار لکھ بھیجے (ج ۳ ص ۱۴۴)

در فنون فضیلت است فزوں　　از دوانی بدادنی بے شک

کہ بنایش بصورت ست فزدں　　پس دلیں زیادت معنیش

ملا صاحب نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا۔

دلِ پاکت نتیجۂ لاریب　　اے زبانت کلید نامۂ غیب

گنج ہائے نہان کن فیکون　　دادہ اعجاز کلک تو بیرون

کز دوانی بدادنی خوشتر　　گفتی از منطق گہر پرور

ہمہ از گنج فضل تو غنیند　　گر دوانی و گر بدادنیند

مظہر فیض لایزال تو شد　　دلم آئینہ جمال تو شد

خویشتن را درو ہمی بینی　　چہ عجب گر زروئے حق بینی

اپنی منتخب التواریخ کے خاتمہ پر اپنی ایک مناجات بھی لکھی ہے، جس سے ان کی

قلبی اور دینی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس مناجات کے کچھ اشعار یہ ہیں، زبان بہت ہی سلیس اور رواں ہے۔

سراپا ز عصیان مرا پیش بیں — مبیں جرم ما رحمتِ خویش بیں
نگہدار از من بد روزگار — ز ہر بد کہ باشد مرا دور دار
چناں کار دنیا و دینم بساز — کہ از ہر دو عالم شوم بے نیاز
بالطاف خود دارم در امان — ز آفات و آشوبِ آخر زمان
بزاری مرا و من مستمند — ز دنیا و دین سازیم بہرہ مند
مکن در کف نفس بے چارہ ام — اماں بخش از نفس امارہ ام
تمنا کنم مہر پیش کس — تمنائے من از در تست بس
ز کسبِ حلالم بدہ توشۂ — ز خلقِ جہاں گیریم گوشۂ
گناہم بیامرز و پوشیدہ دار — کہ ہم ستر پوشی ہم آمرزگار
ز فیض ازل بخش آگاہیم — خلاصی دہ از جہل و گمراہیم
نگہدارم از صحبت ناکساں — بہ صاحب دلے اہل دردی رساں
سوئے خویش کن روی بردہ مرا — خلاصی دہ از ماسوی اللہ مرا
مکن بے مرادے مرا کامگار — کہ خجلت مرا در سر انجام کار
نداند کسے جز تو بہبود من — تو دانی زیان من و سود من
غنی کن ز گنج قناعت مرا — حضوری دہ از ذوق طاعت مرا

(ختم)

(بشکریہ معارف، اعظم گڈھ)

نوٹ:۔ مندرجہ بالا مضمون کا آخری کچھ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح درمیان کا کچھ حصہ بھی بنظر اختصار ترک کرنا پڑا۔ یہ حصے معارف بابت ستمبر ۱۹۷۱ء میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

"الفرقان"

کیا ہم میں غلطی تسلیم کر لینے کی جرأت ہے؟

(از جناب شاہد رام نگری ایڈیٹر نقیب پھلواری شریف پٹنہ)

یہ دنیا مسلسل تبدیلیوں اور پیہم انقلابات کا نام ہے۔ اس کارخانۂ عالم میں نہ کسی شئے کو قرار و قیام ہے نہ ثبات و دوام، ہر صبح کی مقدر میں شام ہے اور ہر شب تار نمود صبح کی نقیب، پیامبر، افراد کا معاملہ ہو یا قوموں کا کوئی بھی تغیر و تبدل کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ زندہ قومیں ہر لمحہ انقلابات کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ تبدیلیوں سے سراسیمہ ہونے کے بجائے وہ انکو اپنی ترقی اور کامیابی وکامرانی کا زینہ بنا لیتی ہیں، تبدیلیوں کے خوف سے الگ تھلگ رہنا یعنی اور بے حسی کی زندگی پر قناعت کر لینا گویا جمود اور موت کو اپنے اوپر مسلط کر لینا ہے۔

اس برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کتنے ہی نشیب و فراز ملیں گے، کامیابیوں کے جشن اور کامرانیوں کے چراغاں کے ساتھ اس میں مایوسیوں۔ اور نامرادیوں کے اندھیرے بھی ملیں گے، لیکن ملت اسلامیہ کا کارواں ہر موڑ پر اپنے نقش قدم چھوڑتے ہوئے رواں دواں ہے۔ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران برصغیر ہند و پاک میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں، جن سے ہم مبہوت رہ گئے ہیں، ہماری آرزوؤں، تمناؤں اور امیدوں کے خلاف حالات کی ایک ایسی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آئی ہے جس کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے اپنے آپکو رضامند کرنے میں ہمیں کافی دشواری محسوس ہو رہی ہے۔ فکری اور ذہنی طور پر ہمارے پاؤں اکھڑ گئے ہیں، لیکن ابھی تک ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس پسپائی کے بعد ہماری دوسری دفاعی لائن کہاں ہوگی، ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میدان میں ڈٹے رہو، مایوسی گناہ ہے، لیکن تلوار

ٹوٹ جانے کے بعد خالی میدان سے کب تک بھرم قائم رہ سکے گا۔

کچھ عرصہ قبل انھیں اوراق میں ہم نے لکھا تھا کہ ہر آغاز میں اس کا انجام پوشیدہ ہوتا ہے پودا کیسا ہوگا اس کا بہت حد تک انحصار بیج پر ہوتا ہے۔ اگر بیج میں خرابی ہوگی تو پودے میں بھی کبھی وہ خرابی ضرور نمایاں ہوگی۔ آج ۱۹۷۲ء میں جن حالات کا ہم کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کا بیج ۱۹۴۷ء میں ہی پڑ گیا تھا، اس وقت جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے ایک ایسا فیصلہ کر ڈالا تھا جو ایک طرح سے پسپائی کے مترادف تھا، اسلام نے ہمیں ساری دنیا میں پھیلنے بڑھنے اور شرق تا غرب چھا جانے کی بشارت دی، جب تک ہمارے اندر صحیح اسلامی روح کارفرما تھی ہم خیر و برکت بن کر پھیلتے بڑھتے اور ساری دنیا پر چھاتے چلے گئے، لیکن ۱۸۵۷ء میں انگریز حاکموں نے ہمیں اپنا آلۂ کار بنانے کے لیے اکثریت اور اقلیت کا ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہم کم تعداد میں ہیں اس لیے زیادہ تعداد والے لوگوں سے ہماری تمام چیزوں کو خطرہ ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ کم تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اس سرزمین پر سات سو سال تک ہم حکومت اور سرداری کے منصب پر فائز رہے۔ انگریز حاکم ہمیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ ہمیں اپنی پسندیدہ چیزوں کی حفاظت کے لیے ایک ایسے خطۂ ارض کی ضرورت ہے۔ جہاں ہم غالب تعداد میں ہوں۔ یہ فلسفہ ایک زخم تھا، لیکن ہم نے اس کو مرہم سمجھ کر اپنے سینے سے لگایا اور زمین پر ایک مصنوعی لکیر کھینچ کر اس فریب کا شکار ہوگئے کہ اُس طرف سب غیر محفوظ اور اِس طرف سب کچھ محفوظ، اسپین کے ساحل پر کشتی جلانے والی قوم نے ایسی ٹھوکر پہلے کبھی نہیں کھائی تھی، لکیر کھینچنے کے بعد پتہ چلا کہ جتنے لکیر کے اُس پار ہیں اُس کے آدھے پھر بھی اس پار بچ گئے۔ ہم جس چیز کو مسئلے کا حل سمجھ رہے تھے اس سے اور نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے، پاکستان، سندھ، سرحد، پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کے لیے نہیں باقی صوبوں کی مسلم اقلیت کے لیے وجود میں لایا گیا تھا، لیکن یہ مسلم اقلیت آج اسی پاکستان کے سینے پر بارگراں بن گئی ہے۔ آج بنگلہ دیش میں ہندوستانی فوج اسی مسلم اقلیت کے جان و مال کے تحفظ کی ضامن ہے، اور ہمیں یہ سوچنا پڑ رہا ہے کہ کاش ایسی کوئی صورت پیدا ہو جاتی کہ یہ لوگ اپنے عزیز و اقارب اور اپنی جنم بھومی سے آن ملتے، بظاہر یہ ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں، کل تک ہمیں بنگلہ دیش

کا قیام ناممکن نظر آتا تھا۔ آج وہ ناقابلِ تردید حقیقت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

آج ہمارے گرد و پیش جو حالات ہیں ان کو بدلا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار ہوں، بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان غلطیوں کو محسوس کریں جو ہم نے پچھلے ۲۵ برسوں میں کی ہیں۔ دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ جب بھی غلطی کا احساس ہو جائے تو اس کو فوراً سدھار لیا جائے۔ اگر ہماری منزلِ مقصود مغرب میں ہے اور غلطی سے ہم مشرق کی طرف چل پڑے ہیں تو خواہ کتنا ہی آگے نکل جائیں منزل سے دور ہی ہوتے جائیں گے۔ ۲۵ برس کے بعد کسی غلط فیصلے سے پلٹنا آسان نہیں لیکن اس کے بغیر چارۂ کار بھی کیا ہے۔ ہمارے لاکھوں عزیز و اقارب جو مشرقی بنگال میں تھے ان کی سلامتی کے لیے ہم چاہتے تھے کہ پاکستان ٹوٹنے سے بچ جائے۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان ٹوٹ گیا، دراصل پاکستان ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے اس کا دار و مدار ان لوگوں پر تھا جن کے ہاتھوں میں پاکستان کی باگ ڈور ہے، وہ نااہل اور ناکارہ ثابت ہوئے۔ وہ پاکستان کو ثابت نہ رکھ سکے، کل بھی پاکستان کا جو کچھ ہوتا ہے اس میں ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ ہوگا وہی جو وہاں کے لوگ چاہیں گے۔ اس طرح ہندوستان میں ہمارا مستقبل کیا ہوتا ہے، یہ خالصۃً ہمارے اوپر منحصر ہے۔

پاکستان خوف اور نفرت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا، اسی خوف اور نفرت نے پاکستان کو کھا لیا، جو ڈر انگریزوں نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندو اکثریت کے خلاف پیدا کیا تھا اسی طرح کا ڈر پاکستان کی بنگالی اکثریت کو غیر بنگالی اقلیت سے پیدا ہو گیا تھا، اس کے ڈر کے خاتمے کے لیے انھوں نے جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا، لیکن جب فوجی حکمران جمہوری حقوق کا گلا گھونٹنے پر تیار ہو گئے تو ڈر نے نفرت اور تشدد کی شکل اختیار کر لی اور عوام نے ہتھیار اٹھا لیا۔ خوف اور نفرت منفی بنیاد ہے اس بنیاد پر ایک صحت مند قوم کی تعمیر ممکن نہیں ہو اگر پاکستان نے نفرت اور خوف کے زہریلے احساسات کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی تو مغربی بازو کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا۔

خوف اور نفرت کی وجہ سے ہی اسے کبھی امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر رہتی ہو تو کبھی چین کی کبھی روس کو دوست بنانے کی کوشش کرتا ہو تو کبھی برطانیہ کو۔ یہ طاقتیں اسے ہتھیار دیکر اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں اگر نفرت اور خوف کا جذبہ نہ ہوتا تو ہندوستان اور پاکستان دوست اور ہمدرد بنکر دوسرے ملکوں کی مدد کرنے کے قابل ہو گئے ہوتے

مولانا نعمانی کی تالیفات

جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی ترجمان اور دینی اصلاح کا مکمل نصاب ہیں

اسلام کیا ہے؟ نہایت آسان زبان اور جدید دلنشین انداز میں اسلامی تعلیمات کا مکمل خلاصہ۔ جو دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ کافی ہے۔ ۲/۵۰

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس کتاب میں سیکڑوں عنوانات کے تحت قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، جو پڑھنے والے کو قرآنی دعوت اور تعلیم کے ساتھ اس کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔ غیر مسلموں کے لیے خاص تحفہ
قیمت مجلد -/۵ انگریزی ایڈیشن -/۱۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس جن لوگوں نے حضرت مولانا محمد الیاس کو نہیں پایا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لیے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔
مجلد ۲/۵۰ غیر مجلد -/۲

تذکرہ مجدد الف ثانی اس کتاب میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کی سوانح حیات آپ کی عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم کارنامے کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس نے سلطنت مغلیہ کا رخ الحاد سے اسلام کی طرف موڑ دیا۔ قیمت -/۵

مکتوبات خواجہ محمد معصوم یہ کتاب حضرت خواجہ کے ارشاد و ہدایت کے پورے کام کا آئینہ ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ ہیں۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیر کو ایک مثالی حکمران بنا دیا تھا۔ قیمت مجلد ۵/۰۴

کلمہ طیبہ کی حقیقت توحید اور رسالت کی شہادت کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے اور کیا مطالبے ہیں۔ -/۵۰

نماز کی حقیقت اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے اور اس میں روح پیدا کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجئے، شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی اور دیگر اکابر کے افادات کا نچوڑ ہے۔ قیمت -/۱

برکات رمضان اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ -/۱

دین و شریعت اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت، اور احسان و تصوف پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۳/۷۵

معارف الحدیث احادیث نبوی کا ایک جامع انتخاب، اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ۔ اس کتاب میں صرف وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے اور جن کا انسانوں کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے۔
جلد اول -/۵، جلد دوم ۵/۷۵، جلد سوم -/۶، جلد چہارم ۵/۲۵ جلد پنجم ۶/۵۰ (مجلد کے لیے ۲۵/- فی جلد مزید)

صحبتے با اہل دل (مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی (پیر نھے میاں) آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہم آج بھی ان کی اصلاحی مجالس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے ارشادات سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب اُن کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔
قیمت مجلد -/۶

انسانیت زندہ ہے مولانا نعمانی کے چار چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں کے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پرتاثیر واقعہ اور تجربہ نہایت سادہ انداز میں بیان کیا ہے قیمت -/۵۰

شاہ اسمٰعیل شہید حضرت شاہ اسمٰعیل شہید پر لگائے گئے معاندین اہل بدعت کے الزامات کا مدلل اور مسکت جواب۔ قیمت -/۱

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مُستند تفاسیر و عُلومِ قُرآنی

تفسیر ماجدی

از مولانا عبدالماجد دریا بادی
قرآن مجید کی یہ تفسیر متعدد حیثیتوں سے منفرد و ممتاز اور بیحد قابل قدر ہو۔ عربی کی تمام مستند تفاسیر اور مفردات القرآن پر لغوی تحقیقات کا عطر کشید کر دیا گیا ہو۔ ایک عام آدمی کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتا ہو۔

قیمت مجلد اول -/۱۵ ، دوم مجلد -/۱۸

تفسیر ابن کثیر محشّٰی (اردو)

علامہ ابن کثیرؒ کی عظیم الشان تفسیر جس کو جدید و مفید حاشیہ اور مسائل کی وضاحت کے ساتھ چھاپا گیا ہو۔ نہایت ہی جامع و مفید کتاب ہو۔ چار جلدوں میں مکمل غیر مجلد -/۴۰ مجلد -/۴۵

تفسیر بیان القرآن

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور زمانہ تفسیر تین جلدوں میں مکمل سٹ مجلد -/۶۳ ۔ مکمل سٹ کی خریداری پر رعایتی قیمت -/۶۰

تفسیر حقانی مکمل

مولانا عبدالحق حقانی دہلوی کی شہرۂ آفاق تفسیر الگ الگ پاروں میں ۲۷ قسطوں میں مکمل ہوئی ہو جس میں مقدمہ بھی شامل ہو۔ مجلد پانچ جلدوں میں مکمل ہے۔ قیمت کامل مجلد -/۷۰

تفسیر موضح القرآن

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کی مشہور و مقبول تفسیر جو تفاسیر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑے سائز کی ایک ہی جلد میں مکمل ہدیہ مجلد -/۲۶

کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن و تسہیل القرآن

(از مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ) قرآن شریف کا ترجمہ اور تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی ترتیب و تالیف، مولانا موصوف کی ۱۰ سالہ محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ قیمت مکمل -/۳۰

تفسیر مظہری

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ تفسیر اب تک عربی زبان میں چھپتی رہی۔ اب اسے اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ نہایت معتبر اور مشہور و مقبول تفسیر ہے۔ ۱۰ پاروں کی تفسیر چھپ کر آ چکی ہے۔
قیمت .... -/۹۰

قصص القرآن

(از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم) جس میں امم سابقہ کے سلسلے میں قرآن کے بیانات پر تاریخ و حدیث اور علوم عمرانی کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہو اور ان واقعات کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔
قیمت جلد اول -/۱۰ جلد دوم -/۸ جلد سوم -/۷ چہارم -/۹
(مجلد کے لیے -/۲ فی جلد مزید)

ارض القرآن

یعنی قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر، سرزمین قرآن (عرب) کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا تذکرہ ہو ان کی تاریخی اور اثری تحقیق مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قیمت مکمل غیر مجلد -/۱۰.۵۰

قرآن اور تعمیر سیرت

(از ڈاکٹر میر ولی الدین) اس کتاب میں سیرت و کردار سازی کے جامع نقطۂ نظر سے قرآن کی بعض اہم تعلیمات کا جائزہ لیا گیا ہو۔ یہ کتاب متعدد مقالوں پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف -/۶

قرآن اور تصوف

یہ بھی ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف ہو۔ ڈاکٹر صاحب اپنی جدید تعلیم کے باوجود تصوف کے حامل اور داعی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے تصوف کے بارے میں بہت سے شکوک رفع ہو جاتے ہیں۔ قیمت -/۳

قاموس القرآن (نیا ایڈیشن)

تالیف مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ اس میں الحمد سے لے کر والناس تک بہ ترتیب حروف تہجی تمام الفاظ قرآنی کے معانی اور اُن کی مکمل صرفی و نحوی تشریح درج کر دی گئی ہے۔
طباعت و کاغذ اعلیٰ، صفحات آٹھ سو، قیمت مجلد -/۱۱

لغات القرآن

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب حل کرنے اور سمجھنے کے لیے اردو زبان میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ ایک عام آدمی اسکے پڑھنے سے قرآن کا ترجمہ اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔
قیمت کامل غیر مجلد -/۳۲ ، مجلد -/۴۰

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا کن علوم و شرائط پر موقوف ہو؟ قیمت -/۴

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

علم حدیث اور فقہ پر اہم اور مستند کتابیں

کتاب الزہد والرقائق

امت کے جلیل القدر امام عبد اللہ بن مبارک کی مقبول و مشہور تالیف جو عرصہ سے نایاب تھی اس کو ہمارے ملک کے مایۂ ناز محدث مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے ایڈیٹ کر کے نہایت مفید اور ایمان افروز مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا ہے کوئی کتب خانہ اور لائبریری اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں۔ قیمت مجلد صرف -/۳۰

ترجمان السنہ مکمل

(تالیف: مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی) اردو زبان میں ضروری تشریح و مباحث کے ساتھ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ ہے۔ حدیث کے مستند لٹریچر میں یہ کتاب بلاشبہ عدیم النظیر ہے۔

قیمت جلد اول -/۱۲ جلد دوم -/۱۰ جلد سوم -/۱۲ جلد چہارم -/۱۲

(مجلد کے لیے فی جلد -/۲)

نصرۃ الحدیث

کیا حدیث بھی قرآن کی طرح واجب العمل ہے؟ ہمارے وقت کے مشہور صاحب نظر فاضل اور محقق حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اپنی اس کتاب میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور حدیث کی حجیت کے مسئلہ کو بے غبار کر دیا ہے۔ قیمت ۲/۵۰

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے

مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

اس کتاب میں ائمہ اربعہ اور ارباب صحاح ستہ اور امام طحاوی کا تحقیقی تذکرہ اور تاریخ تدوین حدیث اور محدثین عظام کی کوششوں کا ذکر ہے نیز محدثین عظام کے علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت ۶/۵۰

فن اسماء الرجال

یعنی تاریخ رجال حدیث کی تدوین و تحقیق، کتب اسماء الرجال سے استفادہ کا طریقہ، اہم مشہور کتب رجال پر تبصرہ و تعارف۔ مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی کا قیمت ۱/۷۵

مظاہر حق (اردو مع متن عربی)

حدیث کی مشہور و مقبول ترین کتاب "مشکوٰۃ شریف" کی اردو زبان میں شرح۔ پانچ جلدوں میں مکمل۔ قیمت غیر مجلد کامل -/۲۵

ایضاح البخاری

احادیث کی سب سے مستند کتاب بخاری شریف کی اردو شرح۔ افادات حضرت مولانا فخر الدین صاحب (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) ۱۲ حصے طبع ہو چکے ہیں۔ قیمت فی حصہ ۲/۲۵

زاد سفر

"ریاض الصالحین" کا اردو ترجمہ۔ از امۃ اللہ تسنیم۔ یہ کتاب بہترین مصلح و مرشد کا کام کرتی ہے۔ عنوان کے نیچے پہلے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ پھر احادیث ہیں۔

قیمت جلد اول ۴/۵۰

شمائل ترمذی و خصائل نبوی (اردو)

شمائل ترمذی کی عارفانہ و فاضلانہ شرح جس میں احادیث کی روشنی میں حضورؐ کی سیرت و صورت، عادات، خصلتیں، معمولات و لباس وغیرہ کی تفصیل ہے۔ قیمت -/۶

فتاویٰ دار العلوم دیوبند

افادات حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی قدس سرہ۔ دار العلوم دیوبند سے پوچھے گئے ہزارہا فقہی سوالات اور ان کے جوابات کا یہ بے نظیر مجموعہ جو اب تک بطون اوراق میں محبوس تھا۔ مولانا ظفیر الدین صاحب نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے قیمت کامل سٹ -/۵۶

فتاویٰ رشیدیہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی شخصیت علمی حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کو تمام علوم اسلامیہ میں منصب امامت حاصل تھا مگر خصوصی مناسبت آپ کو فقہ و حدیث میں تھی۔ زندگی کے تمام ضروری مسائل کے بارے میں آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ -/۸

فتاویٰ مولانا عبد الحی فرنگی محلی (اردو)

مولانا عبد الحی لکھنوی کا مجموعہ فتاویٰ جو فقہی اور اعتقادی مسائل کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ اردو فتاویٰ کے ساتھ عربی و فارسی فتاویٰ کا نہایت سہل و سلیس اردو میں ترجمہ بھی ہے۔

تینوں حصے یکجا، قیمت مکمل مجلد -/۱۶

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

سیرت نبوی پر منتخب کتابیں

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندوی کی مشہور و مقبول تالیف ۔۔ یہ رسول اللہؐ کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشادات کا ذخیرہ ہے۔ سیرت کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار ہے۔ چھ جلدوں میں مکمل قیمت مکمل غیر مجلد ۸۵/-

رحمۃ للعالمین از علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری یہ کتاب جامعیت و کاملیت اور تاریخیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ حوالہ جات مستند، دلائل مضبوط، انداز بیان شگفتہ اور عشق نبوی میں سرشار کر دینے والا ہے۔ تین ضخیم جلدوں میں مکمل، حسین و رنگین گردپوش سے مزین۔ قیمت کامل سیٹ ۔۔ ۔۔ ۲۰/-

سیرت طیبہ از مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی سیرت نبوی کے موضوع پر ایک عظیم شاہکار۔ حدیث کی مستند کتابوں کی بنیاد پر جدید انداز تعبیر کے ساتھ۔ ۴۵۰ صفحات قیمت صرف ۵/-

رحمت عالم علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت کے موضوع پر یہ کتاب خاص طور سے مدارس کے طلباء کے لیے لکھی ہے۔ قیمت صرف ۲/-

محسن انسانیت اس میں سیرت رسول ایک نئے اور دلآویز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ آپ کے عہد کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ ایک مفید ترین کتاب۔ قیمت ۔۔۔ ۱۰/-

خطبات مدراس حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں پر علامہ سید سلیمان ندوی کے خطبات جو مرحوم کے علم و تحقیق کا نچوڑ ہیں۔ قیمت ۳/-

مقالات سیرت سیرت نبوی پر آٹھ گرانقدر مقالات کا مجموعہ۔ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ قیمت ۵/-

تقریر سیرت سیرت پاک پر مولانا احمد سعید صاحب دہلوی کی دو معرکۃ الآرا تقریریں۔ پہلی تقریر سیرت ۱/۷۵ دوسری تقریر سیرت ۲/۷۵

نبی عربیؐ اس کتاب میں متوسط استعداد کے بچوں کیلئے سیرت نبوی کے تمام واقعات کو اختصار کیساتھ سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۔۔ ۱/۷۵ مجلد ۔۔ ۲/-

ہمارے حضورؐ سیرت نبوی کے صحیح اور مستند واقعات پر مبنی یہ کتاب خاص طور پر کم سن طالب علموں کے لیے نہایت شیریں و آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ۔۔۔ ۱/۸۰

سیرت صحابہ و تابعین

حیاۃ الصحابہ حضرت جی حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی حیاۃ الصحابہؒ کا اردو ترجمہ صحابہ کرامؓ کی دعوت اسلام کے لیے محنت و جدوجہد، ان کے سرفروشانہ مجاہدات مخصوص صفات و کمالات، پاکیزہ حالات، فقر و صبر، زہد و قناعت اور ایمان و یقین سے متعلق احادیث و قصص کا دلکش مجموعہ ہے۔ تین جلدوں میں مکمل۔ قیمت مکمل سیٹ ۳۳/-

سیرت خلفاء راشدین سیرت خلفاء راشدین پر مولانا عبدالشکور لکھنوی کی عظیم تصنیف۔ ضمناً اس میں اس دور کے اہم تاریخی واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ قیمت مجلد ۲/۵۰

صدیق اکبرؓ اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیق کے مفصل سوانح حیات اور ان کے عہد کے تمام حالات کا محققانہ اور فاضلانہ تذکرہ ہے۔ اس کتاب نے ایک بڑے خلاء کو پر کر دیا ہے۔
از مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ قیمت ۹/-

الفاروق علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ کے مفصل سوانح حیات عادات و خصائل، علمی کمالات ان کے عہد کے تمام ملکی اور فوجی انتظامات اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد ۶/-

سیرت عائشہ از علامہ سید سلیمان ندوی۔ اس کتاب میں حضرت عائشہؓ کے واقعات زندگی اور اخلاق و عادات کی تفصیل اور ان کے علوم و مجتہدات پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت صرف ۔۔ ۷/-

خلفاء راشدین از مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی اس کتاب میں خلفاء راشدین کے سوانح حیات اور انکے سیاسی انتظامی، مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ قیمت ۶/۵۰

مہاجرین اس میں بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ و اکابر بنی ہاشم اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے اکثر صحابہ کرام کے حالات مجاہدات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت اول ۷/- دوم ۶/-

سیر انصار اس کتاب کے پہلے حصے میں پچاس انصار کرامؓ اور دوسرے حصہ میں ۴۶ انصار کرامؓ کے سوانح حیات اور ان کے فضائل و کمالات کا تذکرہ ہے۔
قیمت اول ۸/- دوم ۵/-

نوٹ:۔ تفصیلات کے لیے کتب خانہ کی مکمل فہرست مفت طلب کیجیے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

Monthly "ALFURQAN" Lucknow.

VOL 39 NO. 12 FEBRUARY 1972 Regd. No. L-35